سلسلۂ تالیفات و افاداتِ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ
مہتمم سابع دارالعلوم دیوبند
تواریخ و شخصیاتِ حکیم الاسلام
حصہ ہفتم
ترتیب و تصحیح
مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی

سلسلۂ تالیفات وافاداتِ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ
مہتمم سابع دارالعلوم دیوبند

تواریخ وشخصیاتِ حکیم الاسلامؒ

جلد ہفتم

✱ اس مجموعہ میں شامل رسائل ✱

- یادِ ایام
- پچاس مثالی شخصیات
- ایک جامع شخصیت (شیخ الاسلام حضرت مدنی)
- مشاہیر امت
- جذباتِ الم
- تاسیس دارالعلوم دیوبند تاریخ وحقائق کی روشنی میں
- علمائے ہند کی شاندار تاریخ کا ایک ورق
- علامہ کی یاد (علامہ بلیاوی)
- دارالعلوم دیوبند ایک نظر میں
- یادِ خلیل (محدث سہارنپوری)
- شاہ فیصل مرحوم
- مختصر تاریخ دارالعلوم دیوبند
- نور الانوار (علامہ کشمیری)
- آہ! احمد غریب

ترتیب وتصحیح: — (مولانا) محمد عمران قاسمی بگیانوی
فاضل دارالعلوم دیوبند، ایم-اے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

تصریحات

نام کتاب	تواریخ وشخصیاتِ حکیم الاسلامؒ
مؤلف	حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ
ترتیب وتصحیح	مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی 9456095608
تعداد صفحات	۶۴۰
باہتمام	الحاج محمد ناصر خاں صاحب
کتابت	عمران کمپیوٹرس مظفر نگر (PH: 0131-2442408)
سن اشاعت	نومبر 2006
قیمت	

ناشر

فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ، دریا گنج نئی دہلی 110002

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست عنوانات تواریخ وشخصیاتِ حکیم الاسلامؒ

تاثرات علمائے کرام

مشاہیر امت ۵۹

صفحہ نمبر	عنوان

عنوان	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عنوان

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عنوان

صفحہ نمبر	عنوان
۳۰۶	حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب امروہویؒ
۳۰۶	حضرت مولانا حکیم جمیل الدین صاحب نگینویؒ
۳۰۶	حضرت مولانا عبد العلی صاحب دہلویؒ
۳۰۷	حضرت مولانا نواب محی الدین خاں صاحبؒ
۳۰۷	حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھویؒ
۳۰۸	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ
۳۰۹	حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ
۳۰۹	حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن صاحب امروہویؒ
۳۱۰	حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ
۳۱۱	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی دیوبندیؒ
۳۱۱	مولانا حکیم عبد الوہاب صاحبؒ یوسف پوری (ضلع غازی پور) المعروف بہ حکیم نابینا
۳۱۱	حضرت مولانا سید مرتضٰی حسن صاحب چاند پوریؒ
۳۱۳	حضرت مولانا نجم الدین صاحبؒ
۳۱۳	حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ
۳۱۳	حضرت مولانا شاہ وارث حسن صاحب لکھنویؒ
۳۱۴	حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ
۳۱۴	حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ
۳۱۵	حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھیؒ
۳۱۶	حضرت مولانا محمد یحیٰ صاحب سہسرامیؒ
۳۱۶	حضرت مولانا عبد الرزاق صاحب پشاوریؒ

صفحہ نمبر	عنوان

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر
جذباتِ الم (بروفاتِ رفیقۂ حیات حنیفہ خاتون)	۵۲۷
✪ حرفِ آغاز	۵۲۹
✪ حنیفہ خاتونؒ	۵۳۱
✪ تاثراتِ الم	۵۳۶
✪ ماماتا کے پھول	۵۳۸
✪ خطاب بہ رفیقہ حیات حنیفہ خاتون رحمہا اللہ تعالیٰ	۵۴۵
✪ تعزیت کیلئے آنے والے مقامی حضرات	۵۵۳
✪ دہلی سے آنے والے حضرات	۵۵۳
✪ سہارنپور سے آنے والے حضرات	۵۵۴
✪ میرٹھ سے آنے والے حضرات	۵۵۴
✪ دیگر مختلف مقامات سے بروقت تشریف لانے والے حضرات	۵۵۴
✪ تار اور خط سے تعزیت کرنے والے حضرات	۵۵۵
علمائے ہند کی شاندار تاریخ کا ایک ورق	۵۶۱
یادِ خلیل (تذکرہ حضرت محدث سہارنپوریؒ)	۵۸۱

رہبرِ منزل تصانیف

ازقلم

حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم

مہتمم وقف دارالعلوم دیو بند، نائب صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

الحمد للّٰہ و کفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ. امابعد.

خاکیٔ نوری نہار ونوریٔ خاکی اساس خواجۂ بندہ نواز و بندۂ یزداں شناس

ملت اسلامیہ کے محسنِ اکبر حضرت الامام محمد قاسم النانوتوی قدس سرہٗ (بانی دارالعلوم دیوبند) کی ذاتِ گرامی، آپ کی علمی رفعت، گہرائیٔ فکراور ندرتِ استدلال سے غیر معمولی طور پر متأثر ایک وسیع النظر عرب عالم فضیلۃ الشیخ علامہ عبد الفتاح ابو غدّہ رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند میں تشریف لانے اور حضرت الامام النانوتویؒ کے علوم کے ترجمے کے ذریعہ تھوڑے سے استفادہ کے بعد، حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ سے، بکمالِ تأثر، قدردانی سے شکایتاً فرمایا کہ حضرت الامام النانوتوی کی بعض مصنفاتِ وقیعہ کے چند مختصر مفاہیمِ عالیہ ترجمۃً سن کر میں نے ایک پوری کتاب کا ماحصل مرتب کرلیا ہے، جسے بار بار پڑھنے کے بعد مجھے علمائے دارالعلوم دیوبند سے یہ بجا اور برمحل شکایت پیدا ہوئی کہ حضرت الامام کے یہ بیش قرار علوم نادرہ ہیں کہ ان سے مستفید کو ''رازی'' اور ''غزالی'' سے بے نیازی نصیب ہوسکتی ہے۔ لیکن اس بیش بہا ذخیرہ کو عربی زبان میں منتقل نہ کرکے آپ حضرات نے ہم غیر اردو دانوں کے ساتھ بڑی ناانصافی ہی نہیں بلکہ مجھے معاف فرمائیں اگر یہ کہوں کہ زبردست زیادتی فرمائی ہے، تو بے جا نہیں ہوگا۔

یہ ندرتِ استدلال پر مشتمل الہامی علوم چونکہ انسانیت کو رہنمائی دینے والے ابدی علومِ نبوت سے مستنبط ہیں، اس لئے یقین ہے کہ ان علومِ قاسمیہ کی روشنی سے عالم کو منور کرنے والی شخصیات بھی

ہر دور کو حق تعالیٰ اسی طرح عطا فرماتا رہے گا جیسا کہ:

حضرت شمس تبریزؒ کو ان کے علوم کا ترجمان بنا کر جلال الدین رومیؒ دیئے گئے.......... حافظ ابن تیمیہؒ کو ابن قیمؒ دیئے گئے.......... حافظِ حدیث ابن حجر عسقلانیؒ کو علامہ سخاویؒ دیئے گئے...... ......حافظ ابن ہمامؒ کو قاسم ابن قطلو بغاؒ دیئے گئے.......... مسندِ ہند شاہ ولی اللہؒ کو شاہ عبدالعزیزؒ دیئے گئے...... ......سید الطائفہ حاجی امداد اللہؒ کو امام محمد قاسم نانوتویؒ دیئے گئے.......... حضرت الامام محمد قاسم النانوتویؒ کو شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ دیئے گئے.......... شیخ الہندؒ کو شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور جامع المعقول والمنقول علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ دیئے گئے.......... اور علامہ عثمانیؒ اور علامہ بلیاویؒ کے توسط سے علومِ قاسمیہ کی عالمگیر ترجمانی کے شرف سے فضیلۃ الشیخ حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحبؒ کو منجانب اللہ مشرف فرمایا گیا۔

حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کے اس علمی بیش بہا سرمائے کو ہندوستان، پاکستان اور انگلینڈ وغیرہ کے دینی کتب خانے اپنی حسبِ ضرورت اور حسبِ صوابدید متفرق کتابوں کی صورت میں شائع کرتے رہے، اس لئے جہاں بہت سی کتبِ طیبہ بہ تسلسل اشاعت پذیر ہوتی رہیں وہیں بہت سی کمیاب اور نایاب بھی ہوتی رہیں۔

نیز جہاں یہ حقیقت ہے کہ سائنسی ترقیات سے مغرب کے ''بے خدا تمدن'' اور ''بے حیا تہذیب'' نے اسلام کے باخدا تمدن اور باحیا تہذیب کے برخلاف زبردست محاذ قائم کر کے عقائدی الحاد اور عباداتی اشتباہات کے بے شمار دروازے کھول دیئے ہیں، وہیں یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ گذشتہ صدی میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے ایشیاء، افریقہ، یورپ اور امریکہ کے چالیس سے زیادہ ملکوں کے دوروں میں حکیم الاسلامؒ کے پر تاثیر خطابات، فکری طور پر الحاد کی طرف مائل اور اشتباہات سے دوچار لاتعداد افراد کے لئے وسیلۂ نجات اور دین پر ذریعۂ استقامت بھی بنے ہیں۔

اس عظیم تجربے سے عالمی دینی فیض رسانی کی جانب التفات وتوجہ سے محترم گرامی مولانا محمد عمران صاحب قاسمی ایم، اے (علیگ) کو مشیتِ ربانی نے، علومِ حکیم الاسلامؒ کی موجودہ ذوق کی رعایت کے ساتھ، تدوینِ جدید کی توفیق سے مشرف فرمایا۔ چنانچہ مولانا موصوف نے اپنی بالغ نظری

سے، حضرت حکیم الاسلامؒ کی زیادہ سے زیادہ تصانیف کو غیر معمولی کاوش و کوشش سے جمع فرمایا اور اس کے بعد علمی سلیقۂ خداداد سے ان تمام قیمتی کتب کو:

تحقیقاتِ حکیم الاسلام...... تنقیحاتِ حکیم الاسلام...... تشریحاتِ حکیم الاسلام...... کمالاتِ حکیم الاسلام...... ارشاداتِ حکیم الاسلام...... مشاہداتِ حکیم الاسلام...... شخصیاتِ حکیم الاسلام...... تقریظاتِ حکیم الاسلام...... منظوماتِ حکیم الاسلام...... توضیحاتِ حکیم الاسلام ...... اور افاداتِ حکیم الاسلام کے عنوانات پر منقسم فرما کر ان کی افادیت کو وسیع اور ان سے استفادے کی راہوں کو انتہائی آسان و دلکش بنادیا، اور ساتھ ہی اکابر رحمہم اللہ کے قرار واقعی قدر شناس اور خدمتِ دین کے رمز شناس جناب محترم الحاج محمد ناصر خاں صاحب (مالک فرید بک ڈپو، دہلی) نے نہ صرف اپنے مقبول عند اللہ دینی ذوقِ سلیم سے ایک سو کے قریب ''کتبِ طیبہ'' کی اشاعت کا وعدہ ہی فرمایا بلکہ غیر معمولی خواہش و اصرار کے ساتھ اشاعت کے لئے جلد از جلد فراہمیٔ کتب کے لئے تقاضا بھی فرمایا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر کے ساتھ ان کے کاروبار میں غیر معمولی برکات و ترقیات عطا فرمائے۔

میں محسن ملت الحاج جناب ناصر خاں صاحب اور محسن جماعتِ اہلِ حق مولانا محمد عمران صاحب قاسمی بگیانوی (ایم-اے علیگ) کی خدمات میں اپنے والد ماجد حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی مصنفاتِ ثمینہ کی انتہائی جذّاب و دلکش تدوین و طباعت و اشاعت پر بصمیمِ قلب تشکّر کے ساتھ ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں، اور دعاء گو ہوں کہ حق تعالیٰ اس عظیم ذخیرۂ علم و دین سے علمی اور عرفانی عالمی افادیت کے ساتھ مادّی، مالی اور عزتمندی کے ساتھ مرتبِ محترم اور طابع و ناشر مکرم کے لئے منفعتِ عظیمہ کا وسیلہ بنا کر موجبِ اجرِ ابدی فرمائے۔ آمین برحمتک یا ارحم الراحمین۔

(دستخط) محمد سالم

مہتمم دار العلوم دیوبند (وقف)

۱۰/ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ (۹/مئی ۲۰۰۶ء)

حکیم الاسلام، خطیب، مصنف، متکلم

از: مفسر قرآن حضرت مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی دہلوی

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تمام بڑی، درمیانی اور چھوٹی تصانیف کو زندہ رکھنے کا فرض ہم متوسلین ومعتقدین پر عائد ہوتا ہے، کیونکہ حضرت نے اس مقصد کے لئے کوئی کاروباری ادارہ قائم نہیں کیا تھا۔ اور فضلاءِ دیوبند کے بارے میں بعض تعلیمی ادارے یہ چرچا کرتے تھے کہ دارالعلوم کے فضلاء صرف تقریر وموعظت کے میدان کے شہسوار ہیں، تصنیفی اور تحریری میدان ہمارے ہاتھوں میں ہے اور موجودہ دور تحریر وانشاء کا ہے، زبانی تقریر وخطابت کی عمر بہت کم ہوتی ہے، سننے والے اِدھر کے کان سے سنتے ہیں اور اُدھر کے کان سے نکال دیتے ہیں۔ تحریر وتصنیف کی عمر جاوداں ہے اور اس کی افادیت ہمیشہ رواں دواں رہتی ہے۔

اس تصور کو توڑنے والی ایک بڑی شخصیت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔ حضرت مرحوم وعظ وتحریر دونوں شعبوں میں ایک کامیاب عالم، مرشد اور داعی تھے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ اس زمرہ میں نہایت اہم شخصیت کے مالک تھے۔ بہترین عوامی اور علمی خطیب بھی تھے اور قدیم وجدید موضوعات پر مختلف کتابوں کے مصنف ومؤلف بھی تھے۔

آج کے دور میں سہل اور آسان اردو کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ عربی اور فارسی کے بھاری الفاظ اور مشکل ترکیبوں کو سمجھنے والے نایاب ہوتے جارہے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے سامنے بھی یہ مسئلہ تھا اور مولانا نے اس ضرورت کو محسوس کرکے آخری دور کے مضامین میں الہلال اور البلاغ کی آسمانی اردو سے کنارہ کرلیا تھا۔

حکیم الاسلامؒ کی اردو یقیناً عربی کی بلند کتابوں کی تدریس کی زبان تھی، لیکن حضرت کوشش کرتے تھے کہ عوامی وعظوں میں، اصلاحی اور دعوتی کتابوں میں زبان ہلکی پھلکی استعمال کی جائے،

اوراس کوشش میں مرحوم کو کامیابی حاصل تھی۔

اجتماعی طور پر کمزوری کے اس تصور کو توڑنے اور فضلاءِ دیوبند کے اندر تحریر وتصنیف کا ذوق پیدا کرنے کے لئے دارالعلوم کے فضلاء، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے ایک تصنیفی ادارہ ''ندوۃ المصنفین'' کے نام سے قائم کیا، جس کی طرف سے تاریخ، مذہب اور اخلاق پر نہایت اہم کتابیں شائع ہوئیں۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی نے ایک روز مفتی صاحب سے فرمایا:

''مفتی صاحب! مجھے افسوس ہوتا ہے کہ آپ جیسا صاحبِ علم وانشاء فاضل کتابوں کی تجارت میں گھر گیا۔''

مفتی صاحب ہنس کر خاموش ہوگئے۔ بعد میں فرمایا: مولانا موصوف صحیح فرماتے تھے لیکن میں نے اس بات کو ترجیح دی کہ اپنے قابل فضلاء کے اندر تصنیف وتالیف کا شوق پیدا ہو اور اُن کی تحریری کاوشیں اہتمام سے شائع ہوں۔ میں اگر قلم دوات لے کر کنارہ بیٹھ جاتا تو یہ فرض کون ادا کرتا۔

اور حقیقت یہ ہے کہ مولانا اکبرآبادی، مولانا محمد تقی امینی، مولانا قاضی سجاد میرٹھی، قاضی اطہر مبارک پوری وغیرہ حضرات کی نہایت بیش قیمت کتابیں مفتی صاحب کی محنت سے نہایت اعلیٰ پیمانہ پر شائع ہوئیں۔

جمعیۃ علمائے ہند کے ناظم مولانا سید محمد میاں صاحب علیہ الرحمہ کو تحریر وانشاء پر وہ قدرت حاصل تھی کہ بعض اکابر اس قدرت کو مولانا کی کرامت کہتے تھے۔ مولانا مرحوم بس کے سفر میں بلاتکلف مضامین تحریر کرتے تھے اور بس کے مسافر کی طرح ان کا سارا جسم حرکت کرتا تھا مگر ان کے قلم میں جنبش پیدا نہیں ہوتی تھی۔ مولانا نے ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' اور صحابہ کرام کے ''عہدِ زریں'' جیسی اہم تصنیفات امت کو عطیہ دیں۔

دلّی کی آسان اردو میں دین کی بنیادی کتابوں کی تیاری کے لئے مولانا احمد سعید صاحب دہلوی نے موتمر المصنفین کے نام سے ادارہ قائم کیا اور اردو کے آسان ترجمہ والے قرآن ''کشف الرحمٰن'' کے علاوہ چھوٹی چھوٹی دینی کتابیں نہایت آسان اور دلچسپ ناموں کے ساتھ شائع کیں۔

اساتذۂ دارالعلوم میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو تعلیم وتدریس کے دور ہی سے تصنیف وتالیف کا شوق تھا، چنانچہ مفتی صاحب کے قلم سے حدیث، تفسیر اور فقہ کے موضوعات پر نہایت قیمتی ذخیرہ امت کے سامنے آیا۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی حدیث وتفسیر اور فقہ کے بلند پایہ مدرس تھے، مرحوم کے قلم سے سیرتِ پاک پر ''سیرت المصطفیٰ'' کے نام سے مکمل سیرت وجود میں آئی۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، جہاں حدیث شریف کے بلند پایہ عربی زبان کے مصنف اور بہترین اردو خطیب تھے، وہیں انکے قلم سے حضرت شیخ الہند کے ترجمہ (موضح فرقان) پر اردو زبان کا نہایت پر اثر اور لفظی ثقالت سے پاک تفسیری حاشیہ وجود میں آیا جو حضرت تھانوی کے بیان القرآن کے علمی اجمالات اور شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی کے الہامی تشریحی نکتوں پر مشتمل بہترین علمی ذخیرہ ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کے بقول، اس ناچیز نے حضرت شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی کے ترجمہ (موضح قرآن) پر جو تصحیحی اور تشریحی کام کیا ہے، وہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش کی تکمیل اور حضرت کی روحانی توجہ کا ثمرہ ہے۔

بہر حال فضلاءِ دارالعلوم دیوبند کے بارے میں جو تصور (تحریر وانشاء سے دوری) پھیلایا جارہا تھا اُسے توڑنے میں حضرت حکیم الاسلام کی شخصیت کا بڑا حصہ رہا ہے۔ یہ اہمیت تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ دارالعلوم کے نظام میں جو اہمیت تعلیم وتدریس کے شعبہ کو رہی ہے، تصنیف وتالیف کے شعبہ کو اتنا اہم نہیں سمجھا گیا، وجہ کچھ بھی ہو۔

اس کے علاوہ دوسری بعض دینی جماعتوں کو بین الاقوامی تعاون حاصل ہوا اور اُن جماعتوں نے اپنا تحریکی لٹریچر کثرت سے پھیلا دیا، وہ تعاون دارالعلوم دیوبند کو حاصل نہیں ہوا، اور نہ ہوسکتا تھا، بلکہ اس کے مقابلے میں ملکی تحریکِ حریت سے تعلق رکھنے کے سبب اس جماعت (ولی اللّٰہی) کو فقر وغربت کے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز فضلاء میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردِ عزیز مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی کی تحریری صلاحیت کا تذکرہ نہ کیا جائے تو یہ مضمون ادھورا رہے گا۔

مفتی صاحب مرحوم کے جلسۂ تعزیت (منعقدہ اردو پارک، دہلی) میں مفتی صاحب کوخراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمہ نے فرمایا تھا۔

مفتی صاحب ہماری جماعت میں اصابتِ رائے کے معاملہ میں منفرد شان کے مالک تھےاوران کی اصابتِ رائے اُن کی تحریر کردہ تجاویز جمعیۃ علماءِ ہند میں ظاہر ہوتی ہے۔ اہم تجاویز کے وقت ہم لوگ قلم دان مفتی صاحب کے سامنے رکھ دیا کرتے تھےاور مرحوم ہی اہم سیاسی اور معاشرتی تجاویز قلم بند کرتے تھے۔

جمعیۃ علماءِ ہندک عام اجلاسوں کی تجاویز شائع ہوتی ہیں وہ مفتی صاحب ہی کی تحریری صلاحیت کاثمرہ ہیں۔ اور فقہی مسائل میں مفتی صاحب کی فقیہانہ تحریریں مرحوم کے مرتبہ فتاویٰ (کفایت المفتی مشتمل بر۸ جلد) کے اندر دیکھی جاسکتی ہیں۔

یہ نازک ترین معاملات ومسائل کوسلجھانے کی تحریری صلاحیت رکھنے والا اگر حدیث وفقہ اور تاریخ کے موضوع پر مستقل کتابیں تحریر کرنے کا وقت پاتا تو ان موضوعات پر مستقل تصنیفات کا مصنف قرار پاتا، البتہ قدرت نے مفتی صاحب کی تحریری مقبولیت کا اظہار ان کی ابتدائی دینی تعلیمات پر مشتمل چار کتابچوں (تعلیم الاسلام چہار حصے) کے ذریعہ آشکارا کردی۔ چنانچہ تعلیم الاسلام اردو، ہندی اورانگریزی میں ہرسال ہزاروں چھپتی ہےاور ناشر کوفرصت نہیں ملتی۔ ان کتابوں کابدل آج تک پیدانہیں ہوسکا۔

ایک معرکۃ الآراء تقریر وتصنیف

یہ آزادی کے ابتدائی دور کی بات ہے، جب تحریک اسلامی کے رہنما مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے جسٹس منیر (لاہور) کی عدالت میں اپنے مقدمہ (قادیانی تحریک) کے سلسلہ میں پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہونے کی صورت میں پاکستان کے ہندوؤں اورعیسائیوں کوذمی اوراہل ذمہ قوم کی حیثیت سے رکھنے کا عزم ظاہر کیا، اور جب عدالت کی طرف سے یہ کہا گیا کہ کیا آپ اس کے ردِعمل میں ہندوستانی مسلمانوں کوبھی ہندوستان کی ہندوحکومت کا ذمی شہری، شہری نمبر دو کی حیثیت سے رہنے پرراضی ہوں گے؟ تو مودودی صاحب نے ہاں میں جواب دیا۔

یہ خبر پاکستانی اخباروں سے ہندوستانی اخبارات نے نقل کی اور پرتاپ جیسے فرقہ پرست

اخبارات نے نہایت زہریلے آرٹیکل تحریر کیے۔

ہندوستان میں چاروں طرف رہ رہ کر فرقہ وارانہ فسادات رونما ہو رہے تھے اور پاکستانی ہندوؤں کو نمبر دو کا شہری بنا کر رکھنے کا پروپیگنڈہ کیا جا رہا تھا۔ دلّی میں کانگریس کی طرف سے ایک جلسہ ہوا جس میں جے پرکاش نرائن جیسے صاف دماغ لیڈر نے بھی جسٹس منیر کی عدالت میں دیئے گئے مودودی صاحب کے بیان پر نہایت اشتعال انگیز تبصرہ کیا۔

جمعیۃ علماءِ ہند کے رہنماؤں نے مسلمانوں کے خلاف پھیلنے والی نفرت انگیز فضاء کو صاف کرنے کیلئے ایک بڑے جلسے کا پروگرام بنایا، جس میں تقریر کرنے کیلئے حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کا نام تجویز ہوا۔ اردو پارک میں دوروزہ ''رحمتِ عالم کانفرس'' منعقد ہوئی جس میں پہلی تقریر مولانا مرحوم کی کرائی گئی۔

مولانا کو سارے حالات بتا دیئے گئے تھے، جلسہ میں حکومت کے کئی بڑے رہنما شریک ہوئے جنہیں خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ جلسہ کی صدارت مولانا احمد سعید صاحب نائب صدر جمعیۃ علماءِ ہند نے کی۔ حضرت حکیم الاسلام نے ''اسلام میں نمبر ایک شہری اور نمبر دو شہری'' کے نازک مسئلہ پر نہایت واضح اور پر اثر تقریر کی۔ ڈھائی گھنٹہ کی تقریر میں مولانا نے ثابت کیا کہ اسلام مذہب وعقیدہ کی بنیاد پر قوموں کے درمیان کسی قسم کی تفریق جائز نہیں رکھتا۔ مسلمانوں کی شخصی اور خاندانی حکومتوں کے دور میں مذہبی جنگیں ہوتی تھیں اور ان حالات میں برسرِ جنگ حربی اور صلح پسند ذمی کہلاتے تھے۔

اہل ذم اور ذمی کا مطلب ذلیل اور گھٹیا طبقہ نہیں بلکہ وہ غیر مسلم صلح پسند ہیں جن کے جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری مسلم حکومت پر عائد ہوتی ہے، وہ ہیں اصحابِ ذمہ۔

ہمارے استاذِ محترم حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ نے جمعیۃ علماءِ ہند کے سالانہ اجلاس (منعقدہ پشاور) میں موجودہ بین الاقوامی دور کے تعلق سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سماجی میل جول اور سماجی باہمی اعتماد کو عملی معاہدہ کی فقہی صورت دی ہے اور اس اجتہادی اصطلاح کے تحت دنیا کے ہر خطہ میں بسنے والے مسلمانوں کی شرعی ذمہ داری قرار پاتی ہے کہ وہ اپنے غیر مسلم وطنی بھائیوں کے ساتھ برادرانہ اخوت اور برادرانہ محبت کے ساتھ رہیں۔

راقم الحروف (اخلاق حسین) کہتا ہے کہ اسی فقہی اصطلاح پر مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کے خلیفہ مجاز مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے مزید روشنی ڈالی ہے۔ (دیکھو معارف القرآن) ذمی اور حربی کی فقہی اصطلاحیں دورِ ماضی کی یادگار ہیں۔

پھر مولانا نے اسلام کے تین بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالی۔

اسلام کا بنیادی اصول...... تکریمِ آدم۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (سورہ بنی اسرائیل)

انسانی اخوت کا نبوی اعلان......

اللّٰھم انا شھید ان العباد کلھم اخوۃ (ابوداؤد، جلد اول کتاب الدعوات)

اسلام کا دوسرا اصول...... احترامِ مذاہب۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (سورہ بقرہ)

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورہ انعام)

رسولِ پاکؐ کا اعلان ......

الانبیاء اخوۃ لعلاتٍ امھاتھم شتّٰی و دینھم واحد (عن ابی ہریرۃ، متفق علیہ مشکوٰۃ)

دین کے بنیادی اصولوں میں وحدت کا اعلان......

اسلام کا تیسرا اصول......

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (سورہ نحل)

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (سورہ شوریٰ)

عادلانہ سیاست، نظامِ عدل......

میثاقِ مدینہ، نحن امۃ واحدۃ کا اعلانِ مساوات......

پھر آخر میں فرمایا......

ہمارے بزرگوں نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں برابر کا حصہ لیا اور پھر آزاد ہند کے لئے ایک جمہوری دستور بنانے کی جدوجہد میں کانگریسی رہنماؤں کے ساتھ تعاون کیا اور فرقہ پرستوں کی

اس سازش کو نا کام بنایا کہ ہندوستانی مسلمان ہندوستان سے بددل ہوکر پاکستان بھاگ جائیں۔ ہمیں امید ہے کہ بہت جلد ہندوستان کی فضاء مسلمانوں کے خلاف نفرت سے پاک ہو جائے گی اور مسلمان برادرانِ وطن کے دوش بدوش اپنے ملک کی تعمیر وترقی میں حصہ لیں گے۔

میں نے مولانا کی یہ تقریر نوٹ کی اور اسے مرتب کر کے دیو بند بھیجا، جسے مولانا نے پسند کیا اور پھر میں نے اس تقریر کو اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں ''قومی اتحاد اور اسلام'' کے نام سے چھپوا کر ملک کے سیاسی رہنماؤں اور دانش وروں کے پاس پہنچایا اور قومی اخبارات نے اس کتاب پر نہایت عمدہ تاثرات تحریر کرنے کے بعد ان نظریات کو دارالعلوم دیو بند اور جمعیۃ علماءِ ہند کا مشن قرار دیا۔ مولانا کی وہ تقریر جو ایک تصنیف کی صورت میں ہے، میرے ریکارڈ میں ہے اور میں اسے دوبارہ چھپوانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آسان فرمادے۔

آخر میں یہ ناچیز مرتب مجموعۂ تصانیف مولانا محمد عمران صاحب قاسمی کی محنت اور صلاحیت پر اُنھیں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے اور کتاب کے مقبولِ عام ہونے کی دعاء کرتا ہے۔

اخلاق حسین قاسمی

ادارہ رحمتِ عالم لال کنواں دہلی

۳؍مئی ۲۰۰۶ء

کلماتِ بابرکت

فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیری دامت فیوضہم

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم (وقف) دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خاندانِ قاسمی کی ممتاز اور نمایاں شخصیت حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب المغفور کا حضرت النانوتویؒ کی شخصیت کو اجاگر کرنے اور ان کے علوم کی اشاعت میں کلیدی کردار رہا۔ قاری صاحبؒ بنیادی طور پر شریں بیان واعظ وخطیب تھے، حضرت نانوتویؒ کی نسبتِ عظیم اور اس سے بھی بڑھ کر دار العلوم کا منصبِ اہتمام مزید اُن کے ذاتی محاسن وکمالات، ان سب نے مل کر قاری صاحبؒ کو نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ پورے برصغیر کی شخصیت بنانے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔

حضرت قاری صاحبؒ اپنے مواعظ میں حضراتِ اکابرِ دیوبند اور بالخصوص حضرت نانوتویؒ کے واقعات وکمالات کا تذکرہ بڑے دل نشیں انداز اور پرکشش لب ولہجہ میں کرتے، پند وموعظت کا یہی رنگ قاری صاحبؒ کی تالیفات ورسائل میں بھی جھلکتا ہے اور اس سے عوام الناس کو بڑا فائدہ پہنچا۔

قاری صاحبؒ کی شخصیت کے ساتھ غیروں نے تو نہ جانے کیا کیا اور کیسے کیسے ستم ڈھائے مگر ان کے معتقدین نے بھی کچھ کم ناانصافی مرحوم کے ساتھ نہ کی۔ احقر نے اپنی بساط کی حد تک قاری صاحبؒ پر متعدد اہل قلم سے مضامین ومقالات لکھوائے، کئی ایک محققین کو ان کی حیات وخدمات پر تحقیقی مقالات مرتب کرنے کی جانب متوجہ کیا اور ان میں سے دو مقالے ملک کی دو یونیورسٹیوں سے پی. ایچ. ڈی. کے لئے منظور بھی ہو گئے ہیں۔

فاضلِ گرامی مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی کی سعادت ہے کہ انھوں نے اپنی ذاتی دل چسپی،

علمی شغف اور قاری صاحب المغفور سے عقیدت ومحبت کے تحت ان کے بعض رسائل وتالیفات کو ''تحقیقاتِ حکیم الاسلام'' کے عنوان سے جمع کر دیا ہے اور دہلی کا ایک نامور اشاعتی ادارہ طباعت کے تمام اخراجات برداشت کر رہا ہے۔ فاضل گرامی کی اس کاوش پر مبارک باد نہ دینا کوتاہ نظری ہوگی، حق تعالیٰ انہیں مزید علم وتحقیق کی خدمات کے لئے قبول کرے۔ البتہ یہ گذارش ضروری ہے کہ آئندہ اس طرح کی علمی کاوشوں میں عصر حاضر کے ذوق ورحجان کے مطابق حوالہ جات کی تحقیق وتعلیق اور فروگذاشتوں پر نقد وگرفت کی اہم خدمت سے صرفِ نظر نہ کریں۔ واللّٰہ لا یضییع اجر المحسنین۔

وانا الاحقر الافقر
محمد انظر شاہ مسعودی کشمیری
۲۵؍مئی ۲۰۰۶ء

طیبِ والا صفات

ازقلم ادیبِ شہیر حضرت مولانا عبدالخالق مدارسی مدظلہم العالی
نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر		کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

ملک الشعراء مرزا اسداللہ خاں غالب نے اس شعر میں اپنے دور کی جس مذہبی وروایتی اور تمدنی وتہذیبی کشاکش کا ذکر کیا ہے وہ دور پورے عالم میں مشرق ومغرب، کلیسا وکعبہ اور اسلام ومسیحیت کی کشمکش کے عروج کا دور تھا، دراصل اٹھارہویں صدی کے انقلابِ فرانس اور پورے مغرب میں پیدا ہونے والے اقتصادی ومعاشی انقلابات اور ان کے نتیجے میں رونما ہونے والی فکری وعلمی اور سیاسی وفوجی یلغار کی آہٹ اس سے تقریباً ایک صدی قبل سنی جا چکی تھی۔ اور چوں کی تکوینی طور پر عالم اسلام کا علمی ودینی مرکزِ ثقل مشرق وسطیٰ اور خلافتِ عثمانیہ سے منتقل ہوکر برِ صغیر ہند کو آنے والا تھا۔ اس لئے ۱۴ رشوال ۱۱۱۴ھ میں شاہ عبدالرحیم کے گھر میں پیدا ہوانے والے ژرف نگاہ سپوت کی عقابی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ مغرب سے ایک گھٹا ٹوپ طوفان اٹھ رہا ہے جو صرف مشرق ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کے دینی وفکری اور علمی وسیاسی افق پر چھا جائے گا۔ اس مردِ مومن کی فراستِ ایمانی اور فطانتِ فاروقی نے بھانپ لیا کہ آنے والا پرآشوب وپرفتن دور نہ صرف برصغیر کی ملت اسلامیہ کے لئے بلکہ پوری امت مسلمہ کے لئے انتہائی کرب ناک اور ہلاکت خیز واقع ہوسکتا ہے۔

چنانچہ اس نے ' فك كل نظام ' کا جو نعرہ مستانہ بلند کیا اس کی گونج آج تک ہند کے مرغزاروں سے لے کر افغانستان کے کوہساروں تک سنائی دیتی ہے ؎

تا ابد گوشِ جہاں زمزمہ زا خواہد بود زیں نواہا کہ دریں گنبدِ گردوں زدہ ایم

مسند الہند شاہ ولی اللہ الدہلوی قدس سرہ نے ہمہ گیر انقلاب کی جو بنیاد ڈالی اس کے کلیدی عناصر یہ تھے، قرآن وعلوم قرآنی کی توضیح وتوسیع، احادیث نبویہ کی نشر اشاعت، عصری اسلوب میں دین کی صحیح تعبیر وتشریح، منہج اہل سنت والجماعت کی تحقیق وترویج اور اعلاءِ کلمۂ حق کیلئے جہاد وقتال۔

شاہ صاحب کے بعد آپ کے لائق وفائق فرزندوں اور ان کے تلامذہ نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور تحریکِ ولی اللّٰہی کا ایک ایک محاذ سنبھال لیا۔ شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ اسماعیل شہید، سید احمد شہید رحمہم اللہ وغیرہ اہل علم وعزیمت نے قرآن کی تفہیم وتشریح، حدیث و فقہ کی خدمت، شریعتِ مطہرہ کی دعوت وتبلیغ اور راہِ خدا میں سرفروشی، غرضے کہ ہر میدان کو اپنی جہدِ مسلسل اور حرارتِ ایمانی سے متحرک ومتموّج رکھا۔ وقت کے ساتھ جب یہ قافلۂ ولی اللّٰہی آگے بڑھا تو شاہ اسحاق صاحب دہلویؒ، مولانا مملوک علی نانوتویؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ وغیرہ حضرات اس کے جلو میں داخل ہوتے گئے تا آں کہ ۱۸۵۷ء کے تاریخ ساز انقلاب کے بعد یہ قافلہ دیوبند میں خیمہ زن ہوگیا۔

حضراتِ اکابرین دیوبند نے اس ولی اللّٰہی فکر وفلسفہ کا پرچم اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور شرق وغرب میں اس کے زمزمے چھیڑ دیئے۔ اکابرین دیوبند کے صف اول کے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی، فقیہ النفس مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی ہوں یا حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی، علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، سب ہی حضرات کے سینوں میں وہی روح اور وہی جذبہ کارفرما تھا جس کی جوت حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے جگائی تھی۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ انہیں اربابِ علم وعزیمت، جبالِ فکر وفن اور عبقری شخصیات میں سے تھے، خصوصاً اپنے جد امجد حجۃ الاسلام الامام النانوتوی قدس سرہ کے علوم وافکار کے سچے وارث وامین تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اسلامی علوم وافکار کو اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق ڈھال کر اسلامی فکر وفلسفہ میں انقلاب پیدا کیا۔ حضرت نانوتویؒ نے باطل کے فکری سیلاب کے سامنے اسلامی تعلیمات واحکامات کو مضبوط علمی وفکری بنیاد فراہم کی۔

حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ نے اپنے اساتذہ خصوصاً علامہ شبیر احمد عثمانی وعلامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمہما اللہ سے یہی قاسمی وولی اللّٰہی وراثت حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلاف کی عظیم روایت وامانت کے تحفظ وبقاء اور نشر اشاعت کی عظیم الشان خدمت آپ سے لینا مقدر تھی، چناں چہ نہایت ہی کم عمری میں مرکزِ تحریک ولی اللّٰہی اور مہبطِ علومِ قاسمی دارالعلوم دیوبند کے اہتمام وانصرام کا بارِ گراں آپکے کاندھوں پر ڈال دیا گیا۔ آپ کو ایک طویل عرصہ تک دارالعلوم جیسے عظیم الشان اور بین الاقوامی شہرت کے حامل ادارہ کی خدمت اور ترقی کا موقعہ ملا۔ آپ نصف صدی تک مسلسل اس مؤقر اور عظیم ادارہ کے منصبِ اہتمام پر فائز رہے اور آپ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم نے بے مثال ترقی کی۔ آپ نے اپنا نام اور زندگی دارالعلوم کے ساتھ ایسے وابستہ کر دی تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے جزو لاینفک ہو گئے تھے۔

حضرت قاری صاحبؒ کی زندگی علم وبصیرت، وسعتِ نظر کی پختگی ورسوخ، وعظ وارشاد، عوام سے رابطہ، دعوت وتربیت، بیعت وارشاد اور تصنیف وتالیف جیسے پہلوؤں اور گوشوں پر محیط تھی۔ حضرت قاری صاحب کو عام طور پر لوگ وعظ وارشاد اور اصلاح وتربیت کے حوالے سے زیادہ جانتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ حسن تقریر اور دعوتی اور اصلاحی رنگ ان کا امتیاز تھا۔ آپ جیسا خوش بیان، جامع العلوم اور پراثر واعظ ومقرر اس اخیر دور میں مشکل ہی سے چشم فلک نے دیکھا ہوگا۔ عالم اسلام کے طول وعرض بلکہ پوری دنیا میں گھوم گھوم کر آپ نے مشربِ دیوبند کی اشاعت کی اور اسلامی پیغام کو عام کیا۔ ہزار ہا ہزار انسانوں کو آپ کی ذات سے رہنمائی نصیب ہوئی۔ آپ کے مطبوعہ خطبات جو تقریباً دس جلدوں میں دستیاب ہیں، ان سے آپ کی علمی وسعت وگہرائی اور اثر آفرینی کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کو جو ہر دلعزیزی، عام شہرت ومقبولیت اور مختلف دینی اداروں وجماعتوں کا اعتماد حاصل رہا وہ شاید ہی ہندوستان میں کسی علمی ودینی شخصیت کو حاصل رہا ہوگا۔

لیکن حکیم الاسلام حضرت قاری صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے زبان وبیان کے ساتھ قلم کی دولتِ بے بہا سے بھی خوب نوازا تھا، کم ہی لوگوں کو معلوم ہے کہ گوناگوں انتظامی مصروفیات اور روزمرہ کے دعوتی واصلاحی اسفار کے ہجوم میں بھی آپ تصنیف وتالیف کا وقت نکال لیتے تھے۔ اس وقت مختلف

اسلامی موضوعات پر آپ کا قلمی سرمایہ ایک سو کے قریب چھوٹی بڑی کتابوں پر مشتمل ہے اور کتابیں بھی ایسی جو اپنے موضوع پر شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

قرآن وحدیث سے براہِ راست استدلال واستنباط کے ساتھ علمی وعقلی دلائل کی وہ کثرت کہ پڑھنے والا آفریں کہہ اٹھے۔ عصری اسلوب وآہنگ اور علمی رنگ وڈھنگ میں ڈوبی ہوئی یہ تحریریں عصر حاضر کے تقاضوں وضروریات سے کس حد تک میل کھاتی ہیں اس کا اندازہ اہل علم وبصیرت ہی کر سکتے ہیں۔

یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ ماشاءاللہ جناب مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی (مظفرنگری) کی محنت وجانفشانی سے یہ ''گنج ہائے گراں مایہ'' منصۂ شہود پر لایا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے اور نئی نسل کو ایمان ویقین کی مستحکم بنیادوں پر قائم ہونے کی توفیق بخشے۔ آمین! واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین.　　والسلام

عبدالخالق مدراسی
نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند
۲۵؍مئی ۲۰۰۶

ایک تاریخ ساز عبقری شخصیت

از حضرت مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی زید فضلہ

نائب مہتمم وقف دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم. نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم.

میرے جد امجد عارف باللہ حضرتِ اقدس حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہ' (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، بانی وصدرِ اول آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ) کی عبقری شخصیت کو حق تعالیٰ جل مجدہ' نے اپنی عطائے خاص اور بے پایاں فضل وکرم سے بے شمار فضائل وکمالات سے سرفراز فرمایا تھا۔ اگر حضرت علیہ الرحمہ کی حیاتِ طیبہ کے محض سرعنوان کی ترتیب ہی قائم کیا جائے تو علماء، صلحاء، دانشورانِ امت، مشاہیرین ملت اور اہلِ فکر ونظر کے نزدیک اس کی تصویر کچھ اس طرح بنتی ہے کہ:-

حضرت حکیم الاسلام علیہ الرحمہ اپنے دور کے جید ترین حافظِ قرآن، صاحبِ کمال عالم دین، قوی النسبت شیخ طریقت، بے مثل وبے بدل خطیب، صاحبِ طرز ادیب، نامور متکلم، نکتہ رس فلسفی، قادر الکلام شاعر، کامیاب ترین مدرس، شگفتہ قلم مصنف، حکمتِ قاسمیہ کے شارح، روایاتِ سلف کے امین، مسلکِ دیوبند کے امام، اور نہ صرف اپنی نسبی اور علمی اولاد واحفادِ قاسمی کے لئے بلکہ بلاتفریق وامتیاز امت کے ہر اصلاح طلب فرد کے لئے یکساں طور پر مجسم شفیق وخلیق تھے، قدرتِ فیاض نے حضرت علیہ الرحمہ کو مذکورہ صفاتِ جمیلہ کے ساتھ ساتھ عقل ودانش، فہم وفراست، حلم ووقار، تعمقِ فکر ونظر، علوم ومعارف اور اسرارِ شریعت وطریقت کے گنجلک وپیچیدہ مسائل کو بالتسہیل بیان کرنے کی موہباً من اللہ صفتِ عالیہ، حسن تدبیر انتظام وانصرام کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے

خزانوں سے قابل رشک حصہ عطا فرما کرامتِ مسلمہ کے قلوب میں محبوبیت، مرجعیّت ومرکزیت کی پہچان اور علامت بنادیا تھا۔

بالخاصہ وعظ وخطاب کے ملکۂ راسخہ اور قوتِ بیانیہ کو حق تعالیٰ نے عالمی سطح پر ایسی مقبولیت عطا فرمائی تھی کہ معاصرین میں فکر ونظر سے اختلاف رکھنے والے اربابِ علم بھی اس صفتِ موہبہ کے باب میں مبنی برحقیقت وصداقت اعتراف کے ساتھ رطب اللسان نظر آتے ہیں، اور بلاشک وشبہ واقعہ بھی یہ ہے کہ عنداللہ وعندالناس مقبولیت کی اس سے زیادہ روشن دلیل اور کیا ہوسکتی ہے کہ آج حضرت علیہ الرحمہ کی وفات پر ربع صدی گذر جانے کے باوجود تصانیف وتقاریر کا محفوظ شدہ گنج گرانمایہ موجودہ نسل کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ کے طور پر مقبول ومطلوب ہے۔

بواسطۂ حضرت الامام مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہٗ بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت الامام الکبیر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ کے بلیغ علوم ومعارف اور اسرارِ شریعت سے حضرت حکیم الاسلامؒ نے متوارثاً جو علمی ذوق پایا تھا اس کا عکسِ جمیل حضرت علیہ الرحمہ کی تصانیف میں صاف جھلکتا ہے، گویا قرآن کریم کے مراداتِ ربانی اور احادیثِ طیبات کی تشریحات کو علم کلام کے مستدلات سے عقل انسانی کے لئے مزید قابل رسا اور قابل فہم بنادیا ہے، اور یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے کہ جس کی بنیاد پر برصغیر ہندوپاک اور بنگلادیش کے علاوہ ساؤتھ افریقہ اور انگلینڈ کے متفرق طباعتی اداروں نے علمی اور عوامی حلقوں کی طلب کے پیش نظر ہزار ہا ہزار ایڈیشن شائع کئے ہیں اور تادمِ تحریر مانگ اور طلب نہ صرف وہی ہے بلکہ روزافزوں ہے۔

برادرِ محترم جناب مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی صاحب نے تصانیفِ حکیم الاسلام کو اپنی شبانہ روز محنتوں اور کاوشوں سے نہایت عرق ریزی کے ساتھ نئے انداز میں ترتیب دیکر جہاں ایک طرف یہ عظیم الشان کام انجادیا ہے اس کے لئے مولانا موصوف بلاشبہ لائق مبارک باد ہیں، وہیں دوسری طرف ان تصانیف سے کماحقہٗ استفادہ کو مزید سہل اور آسان بنادیا ہے۔ مولانا موصوف کے ساتھ تمام اکابرین کی مخلصانہ دعائیں شامل حال ہیں، اور نئی ترتیب کے ساتھ منظر عام پر آجانے کے بعد یہ یقین ہے کہ لاکھوں قارئین کی مستجاب دعائیں شامل ہوکر نہ صرف مولانا موصوف کے لئے بلکہ ان

تمام افراد کے لئے جنہوں نے اس کارِ عظیم میں کسی بھی درجہ میں کسی بھی طرح کا حصہ لیا ہے انشاء اللہ ثم انشاء اللہ ذخیرۂ آخرت بن جائیں گی۔

کتابوں کی اس سیریز کی طباعت میں مالکانِ فرید بک ڈپو دہلی کا شکریہ ادا کرنا بھی شائقین علومِ حکیم الاسلام کے لئے ضروری ہے۔ جنھوں نے اپنے مشہورِ عالم ادارے سے ان وقیع کتابوں کی اشاعت کی ذمہ داری اٹھائی۔ والد محترم جناب مولانا محمد سالم صاحب قاسمی نے مرتب تصانیف حکیم الاسلام جناب مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی اور جناب محمد ناصر خاں صاحب (مالک فرید بک ڈپو دہلی) اور دیگر معاونین کے لئے اپنی تاثراتی تحریر میں جو بلند کلمات وخطابات کا استعمال فرمایا وہ ان ہر دو حضرات اور جملہ معاونین کے لئے کسی توصیفی سند اور دستاویز سے کم نہیں۔

ماہ نومبر ۲۰۰۶ھ کی ۱۵/۱۶/۱۷ تاریخوں میں دارالعلوم دیوبند (وقف) میں منعقد ہونے والے حکیم الاسلام عالمی سیمینار کی غرض وغایت بھی دراصل یہی ہے کہ حضرت علیہ الرحمہ کی ساٹھ سالہ علمی، تعلیمی، تبلیغی، انتظامی اور دعوتی خدمات کا نہ صرف ایک جائزہ لیا جائے، بلکہ مختلف الجہت اور مختلف النوع خدماتِ جلیلہ کی روشنی میں اپنے اخلاف کے لئے بطور مقصدِ حیات اور بطور خدمتِ اسلام جو نشانِ منزل متعین کئے ہیں، ان کی ناقابل انکار افادیت واہمیت اور اس کے دور رس مثبت نتائج کو بھی واضح کیا جائے، بلکہ ان نقوشِ راہ سے نسل نو کے لئے بدلتے حالات کی روشنی میں اہداف کا تعین کیا جائے، ٹھیک اسی طرح جس طرح ہمارے اسلاف نے ہمارے لئے راہیں اور اہداف متعین کئے تھے، اور گذشتہ ایک پوری صدی ان راہوں کی کامیابی پر دلیل وشاہد ہے۔

یقین ہے کہ دورِ حاضر میں رئیس الاکابرین خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم دیوبند (وقف) کی رہنمائی اور اکابرین ومشاہرین امت کے نہایت گرانقدر مشوروں، علمی اور عملی تجربات کی روشنی میں، اور اکابرین امت کی قابل تقلید خدمات کے پس منظر میں طے کیا جانے والا لائحہ عمل رواں صدی میں انشاء اللہ ثم انشاء اللہ ٹھیک اسی طرح کارگر اور مفید ثابت ہوگا جس طرح گذشتہ صدی میں ہو چکا ہے۔

ناسپاسی وناانصافی ہوگی اگر برادرِ محترم مولانا عبداللہ ابن القمر الحسینی صاحب کنویز حکیم الاسلام

سیمینار رو ناظم شعبۂ نشر واشاعت وقف دارالعلوم دیوبند کی شبانہ روز علمی، فکری اور عملی جہدِ مسلسل کا ذکر نہ کیا جائے، جن کے شب وروز کی تمام تر سرگرمیوں کا محور سیمینار کی حتی المقدور کامیابی کی منصوبہ بندیوں پر محیط ہے۔

مجھ جیسا عاصی بھی بارگاہِ رب العزت میں دعا گو ہے کہ حق تعالیٰ جل مجدہ' مستجاب الدعوات حضرت کی دعائے نیم شبی کے طفیل حکیم الاسلام عالمی سیمینار کی شکل میں منعقد ہونے والی اجتماعیت کو حاسدین کے شرور وفتن سے محفوظ و مامون فرماتے ہوئے، حضرت حکیم الاسلام علیہ الرحمہ کی خدمات کو ان کے حق میں بلندیٔ درجات کا ذریعہ اور اس لوجہ اللہ مخلصانہ علمی مشن کو کامیاب فرماتے ہوئے دامے، درمے، قدمے، سخنے حصہ لینے والے تمام افرادِ امت کے لئے ذخیرۂ آخرت بنا دے۔ آمین یارب العالمین۔ وماتوفیقی الا باللّٰہ۔

محمد سفیان قاسمی

نائب مہتمم، دارالعلوم دیوبند (وقف)

۵ رجب المرجب ۱۴۲۷ھ مطابق ۳۱ / جولائی ۲۰۰۶ء

قیامِ عالم تک اہل علم وقلم کیلئے رہنما

ازجناب مولانا محمد عبداللہ ابن القمرالحسینی صاحب مدظلہ العالی

کنویز حکیم الاسلام عالمی سیمینار، ناظم شعبۂ نشرواشاعت

وقف دارالعلوم دیوبند

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ الہ وصحبہ اجمعین.

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ کی حیات وخدمات پر ہونے والے عالمی سیمینار کی تاریخوں کا اعلان ہوتے ہی عالمِ اسلام میں پھیلے ہوئے فضلائے دارالعلوم دیوبند نے اپنی اپنی بساط کے مطابق حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمات کو منظرعام پر لانے کی کوششیں شروع کردیں۔

حکیم الاسلام عالمی سیمینار کی مرکزی کمیٹی نے اولین مرحلے میں ہی اس چیز کی یقین دہانی کرائی تھی کہ سیمینار کے عظیم مقاصد میں اولین مقصد حضرت حکیم الاسلامؒ کی تمام تصنیفات وتالیفات کو یکجا کرکے کتابی شکل میں تشنگانِ علوم اور عوام الناس کی خدمت میں پیش کرنا بھی ہے، جو قیامِ دنیا تک اہل زبان وقلم اور جویانِ حق وصداقت کے لئے رہنما ثابت ہوں گی۔

اس کارِعظیم کے لئے حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی مدظلہ العالی آرگنائزر حکیم الاسلام عالمی سیمینار ونائب مہتمم وقف دارالعلوم دیوبند نے ملک گیر سطح پر کتابوں کو یکجا کرنے کی مہم چلائی اور کچھ کتابیں بیرونِ ملک سے حاصل فرماکر ''دفتر حکیم الاسلام عالمی سیمینار'' کو مہیا کرائیں۔

اب دوسرا مرحلہ ان کتابوں کو یکجا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی سلیقہ مندانہ ترتیب اور صحتِ کتابت ودیگر امتیازات پیدا کرنے کا تھا، اس سلسلہ میں سیکڑوں افراد کے رابطے سامنے آئے، کئی اداروں اور اشخاص نے اس سلسلہ میں اپنی خدمات پیش کیں، ابھی ہم ان تمام تیاریوں میں مصروف ہی تھے کہ سیمینار کے اعلان کے بعد اپنے طور پر خاموشی سے کام شروع کرنے والے ایک شخص نے اپنے کام کا خاکہ جب احقر کے سامنے پیش کیا اور اس سلسلہ میں سیمینار کے ذمہ دار کی حیثیت سے احقر سے تعاون طلب کیا تو احقر کی مناسب اور قابل شخص کے لئے متلاشی اور جویا نظروں نے اس اہم اور عظیم خدمت کے لئے ان کا انتخاب کرلیا۔

مولانا موصوف ملک کے ممتاز مکتبہ (فرید بک ڈپو، دہلی) سے وابستہ اور اس ادارے کے لئے ترجمہ وتصحیح کی اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔ فاضل موصوف کئی کتابوں کے مصنف اور اردو سے ہندی مترجم کی حیثیت سے خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہ' کے اردو ترجمہ کو ہندی کا قالب بھی دیا ہے۔ قریب تین سال قبل حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ پر ان کی ایک کتاب بھی منظر عام پر آئی ہے۔ جن کا وطن مردم خیز خطہ (مظفر نگر) ہے۔ وہ ایشیاء کی عظیم علمی درسگاہ -دارالعلوم دیوبند- کے فاضل ہیں اور ان کا دل حضرت حکیم الاسلام علیہ الرحمہ کی عقیدت ومحبت میں غوطہ زن ہے۔ میری مراد جناب مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی ایم-اے (علیگ) سے ہے۔

موصوف نے قریب دو جلدوں کا مبیّضہ احقر کو دکھلایا اور اپنے کام کرنے کے انداز اور کام کی ترتیب کا جو خاکہ پیش کیا، راقم الحروف نے یہ محسوس کیا کہ اس کارِ عظیم کے لئے موصوف کا انتخاب من جانب اللہ ہے۔ چنانچہ میں نے ان کی اس خدمت کی تحسین کی۔

احقر نے مولانا محمد سفیان قاسمی مدظلہ العالی کی خدمت میں مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی کے اس خاکہ اور ترتیب کا ذکر کیا تو مولانا نے بھی اظہارِ مسرت کیا اور خود دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ مولانا محمد عمران قاسمی نے حضرت خطیب الاسلام مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہ العالی (مہتمم وقف دارالعلوم دیوبند) کی خدمت میں اس عظیم کام کا مجوزہ خاکہ پیش کیا تو حضرت نے دل کی عمیق

گہرائیوں سے ایک تقریظ تحریر فرمائی جو حضرت کے دلی احساسات اور مسرت وشادمانی کی مظہر ہے۔

وقت کم، کام بڑا اور معیار بلند، ان تمام باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی طباعت کے لئے ملک کے ممتاز اشاعتی ادارے (فرید بک ڈپو، دہلی) نے کمر ہمت باندھی، جو دراصل مرتب کتاب ہی کی کوششوں اور توجہ دلانے کا ثمرہ ہے۔ اس کے لئے ذمہ دارانِ ادارہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

دعاء گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس ادارے کو مزید ترقیات سے نوازتے ہوئے ذمہ داران اور جملہ معاونین کے لئے اس خدمت کو ذخیرۂ آخرت بنائے اور مرتب جناب مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی کی عمر میں طوالت اور قلم میں جولانی نصیب فرما کر وقت میں برکت عطا فرمائے، تاکہ ان کو زیادہ سے زیادہ دینی خدمات کی سعادت نصیب ہو۔ آمین

عبداللہ ابن القمر الحسینی

کنوینر حکیم الاسلام عالمی سیمینار، دیوبند

۲۸ رمئی ۲۰۰۶ء

سطورِ اوّلین

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین

وعلی آلہ واصحابہ اجمعین.

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر واحسان ہے کہ افادات وتالیفاتِ حکیم الاسلام کی ساتویں جلد بنام ''تواریخ و شخصیاتِ حکیم الاسلام'' پیش کرنے کی توفیق بخشی۔

بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس جلد کی ترتیب وتصحیح میں غیر معمولی تاخیر پیش آئی، اسی کا نتیجہ ہے اس سلسلۂ زریں کی بقیہ جلدیں کتابت کے مراحل سے گذرنے کے باوجود ''حکیم الاسلام عالمی سیمینار'' کے عظیم الشان وتاریخی موقع پر منظرِ عام پر نہ آسکیں، لیکن تااختتامِ سیریز یہ کوشش جاری رہے گی۔ انشاء اللہ

ابھی کئی جلدیں باقی ہیں جن میں ''افاداتِ حکیم الاسلام، سیرتِ خیرالا نام لحکیم الاسلام، منظوماتِ حکیم الاسلام ،مشاہداتِ حکیم الاسلام اورتقریظاتِ حکیم الاسلام'' ہیں، جن کی ترتیب وکتابت کا مرحلہ جاری ہے اور انشاء اللہ بہت جلد نذرِ قارئین کی جائیں گی۔

اس جلد میں شامل حضرت حکیم الاسلام کا وقیع مضمون ''تاسیس دارالعلوم دیوبند تاریخ وحقائق کی روشنی میں'' موضوعِ زیرِ بحث پر افراط وتفریط سے مبرا ایک معتدل الفکر تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ تعجب ہے کہ شعبہ نشرواشاعت دارالعلوم دیوبند سے اس کی اشاعت ہونے کے باوجود اس کا نام ونشان بھی حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی تالیفات کے ضمن میں کہیں نظر نہیں پڑا۔ یہاں تک کہ ''حکیم الاسلام عالمی سیمینار'' کی جانب سے مجریٰ دعوت نامہ میں حضرت حکیم الاسلام کی تصنیفات وتالیفات میں جہاں احتیاط وجستجو کا دامن یوں ہاتھ سے چھوٹتا دکھائی دیا کہ بعض بعض تصانیف کو دودو مرتبہ بلکہ بعض کو تین تین مرتبہ تک فہرست تالیفات میں تعددِ اسماء کا سہارا لے کر جگہ دی گئی وہیں یہ امر تعجب خیز ہے کہ اس اہم موضوع ''تاسیس دارالعلوم دیوبند'' پر نہ ان کے مختصر مضمون ''بانیٔ دارالعلوم

دیوبند'' کا ذکر آیا اور نہ ہی اس مبسوط تحریر ''تاسیس دارالعلوم دیوبند تاریخ وحقائق کی روشنی میں'' کی طرف مرتبین دعوت نامہ کا ذہن ملتفت ہوسکا۔

''پچاس مثالی شخصیات'' دیوبند اور دہلی کے کئی اداروں سے شائع ہو رہی ہے لیکن چند صفحات پڑھنے ہی سے اندازہ ہوجائے گا کہ اکابر اور اسلاف کے ذکر خیر اور ادبی چاشنی سے بھرپور اس کتاب میں کتابت وتصحیح کی خامیوں نے بھی اپنا حصہ وصول کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا ہے اور بھرپور طریقہ سے اپنی موجودگی درج کرائی ہے۔ اس کتاب کے شروع میں مختصر تاریخ دارالعلوم دیوبند کے عنوان سے جو صفحات شامل ہیں ہم نے انہیں حذف کردیا ہے، چونکہ اسی جلد میں وہ تحریر اپنے اصل ماخذ ''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' میں شامل ہے۔

حضرت حکیم الاسلام نے دارالعلوم دیوبند کے حالات پر مشتمل کئی کتابچے وقت وقت پر مرتب فرمائے جو ''دارالعلوم دیوبند ایک نظر میں، دارالعلوم کی سرسٹھ سالہ رپورٹ، دارالعلوم کے ایک سو سترہ سال'' وغیرہ ناموں سے شائع ہوئے، ظاہر بات ہے کہ ان سب تحریروں کا حاصل دارالعلوم کی تاریخ اور اس کی خدمات پر روشنی ڈالنا ہے اور ان میں تکرارِ مضمون ایک لابدی شئے ہے۔

ہم نے ''دارالعلوم دیوبند ایک نظر میں'' اور ''مختصر تاریخ دارالعلوم دیوبند'' شامل مجموعہ کی ہیں جو اپنے موضوع پر بقیہ دیگر تحریروں کو تقریباً حاوی اور شامل ہیں۔

یہاں اس بات کا اظہار افسوس کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ اس جلد کے موضوع کے مناسب ایک مجموعۂ تحریر ''روایات الطیب'' شامل مجموعہ نہ ہوسکا، دراصل مجھے جو نسخہ مذکورہ کتاب کا حاصل ہوا اس میں پچھتّر حکایات تھیں، جب میں ان کی تصحیح سے فارغ ہوا اور بعض مقامات کے مقابلہ کے لئے کتاب ''ارواحِ ثلاثہ'' دیکھنے کی نوبت آئی تو دیکھا کہ مذکور الصدر کتاب میں ''روایات الطیب'' کے حوالہ سے اور بھی متعدد روایات نقل کی گئیں ہیں۔

کوشش یہ رہی کہ یہ جلد سیمینار کے موقع پر ہدیۂ ناظرین کردی جائے، اب اتنا وقت باقی نہ تھا کہ ''ارواحِ ثلاثہ'' سے ان سب حکایات کو نکال کر ان کی کتابت وتصحیح کا عمل انجام پاسکے۔ لہٰذا اس نشاندہی کے ساتھ کہ حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کے قلم سے نکلی سوانحی اور واقعاتِ اکابر پر مشتمل

تحریر ''روایات الطیب'' مشہور کتاب ''ارواحِ ثلاثہ'' کا حصہ ہے، فی الحال اس جلد میں اس کی شمولیت سے قاصر ہونا پڑا۔

میری کوتاہ نظر میں حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی جو بعض سوانحی تحریریں تھیں ان کو بھی میں نے شامل مجموعہ کیا ہے، جیسے ''تذکرہ حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی''، ''تذکرہ مولانا انور شاہ کشمیری'' وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ قصورِ معلومات اور عدم دستیابی کے سبب تمام سوانحی تحریروں کا احاطہ تقریباً ناممکن ہے، اس لئے اور بھی ایسے مضامین ضرور ہوں گے جو اس عنوان کے تحت آسکتے تھے۔ اگر بعد میں کوئی نشاندہی ہوئی تو انشاءاللہ اس کا اضافہ کردیا جائے گا۔

مجھے امید ہے کہ قارئین حضرات اور اہل ذوق کو میری یہ کوشش پسند آئے گی اور ان کی وقیع نگاہوں میں درجۂ قبولیت حاصل کرے گی۔ وباللّٰہ التوفیق وھو المستعان۔

محمد عمران قاسمی بگیانوی

مقیم حال محمود نگر، مظفرنگر (یوپی) PH: 0131 2442408

۶ رنومبر ۲۰۰۶ء بروز پیر

9456095608 , 8218609823

سلسلہ تالیفات وافاداتِ حکیم الاسلامؒ

* اپنے متعلق حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی ایک نادر تحریر
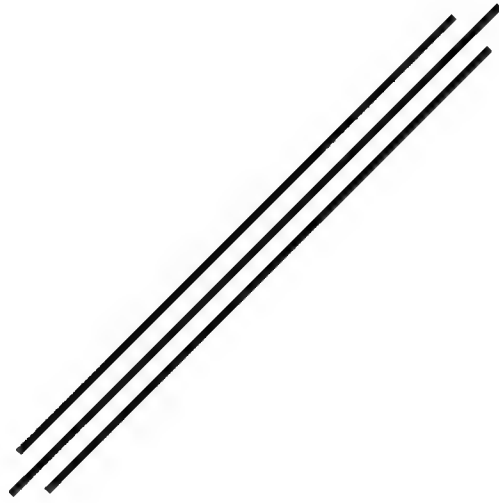
یادِ ایام

• •

یادِ ایام

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند کی یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئی جو''ماہنامہ دارالعلوم'' دیوبند کے شکریے کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

چودھویں صدی ہجری کے شروع اوراٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں میری پیدائش ایسے ماحول میں ہوئی کہ ہندوستان کے قدیم تہذیب وتمدن کے سانچے ٹوٹ رہے تھےاورایک نئی تہذیب وتعلیم کا غلغلہ تھا۔میری پیدائش میرے جدامجد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے گھرانہ میں ہوئی ہے جواپنے وقت میں علم دین کے مجدد تھےاوران کی زندگی سادگی،توکل پسندی،کم سے کم اسبابِ معیشت اور جفاکشی کانمونہ تھی،ان کی اہلیہ مرحومہ میری دادی صاحبہ حضرت نانوتویؒ کے فیضانِ صحبت اور رفاقت سے براہِ راست مستفید تھیں۔دادی صاحبہ اپنی عبادت وریاضت،سخاوت،کشادہ دلی،شعائر دین پر پختگی،نماز روزہ،ذکروشغل کی پابندی میں اپنی مثال آپ تھیں۔

میرے والد مرحوم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور ان کی والدہ صاحبہ میری دادی مرحومہ کے زیرسایہ مجھے تعلیم وتربیت نصیب ہوئی،ان کی ساری ضروریاتِ زندگی میں بے حد سادگی، مزاج میں انکساری اور تواضع کے ساتھ ان سینکڑوں طلبہ دارالعلوم کے لئے جوملک اور بیرونِ ملک سے لمبی لمبی مسافتیں طے کرکے آتے اوردارالعلوم میں جمع ہوتے تھے،میری دادی صاحبہ،والدمرحوم اورسارے گھرانہ کی طرف سے غیر معمولی شفقت اور ہروقت ان کی تعلیمی زندگی کوبہتر بنانے کی دھن تھی،بس یہی ماحول تھاجس میں میں نے آنکھ کھولی۔

والدمرحوم کا یہ ایک قصہ ضرور قابل ذکر ہے کہ ایک طالب علم نے دھلے ہوئے گیلے کپڑے سکھانے کے لئے دارالعلوم کی مسجد میں ڈالے،والدصاحب مرحوم نے دیکھاتوخفاہوئے اورڈانٹ ڈپٹ کی مگر بعدمیں آپ اپنے جذبۂ ترحم سے اپنی سخت گیری پر جوصرف مسجد کی حرمت کے لئے تھی اتنے متاسف ہوئے کہ اس طالب علم کو بلاکراس سے معذرت کی اورکئی ہفتے اپنے ساتھ کھانے میں

شریک رکھا، یہ گویا طلبہؒ دارالعلوم کے حق میں ان کی پدرانہ شفقت کا ایک بے اختیارانہ جذبہ تھا جو طلبہ میں معروف تھا۔

یہاں ایک واقعہ یہ بھی بیان کرنا مناسب ہوگا کہ میری دادی اماں ایک بار امروہہ ضلع مرادآباد تشریف لے گئیں جہاں میرے دادا صاحبؒ کے ممتاز شاگرد حضرت مولانا احمد حسن صاحب محدث امروہی تشریف فرما تھے، وہ امروہہ ہی کے باشندے تھے۔ حضرت مولانا مرحوم دادی اماں کو اسٹیشن سے پالکی میں اس شان سے گھر لائے کہ کہاروں کے ساتھ پالکی کو اٹھانے میں خود بھی شریک تھے، یہ تھا اس دور میں اپنے اساتذہ اوران کے متعلقین کے ساتھ، ان کی اولاد کے ساتھ شاگردوں کا ادب واحترام۔

تعلیمی زندگی میں مجھے وقت کے یگانۂ روزگار علماء اور فضلائے کرام سے استفادہ کا موقع ملا۔ حفظ قرآن اور تجوید وقراءت میں مولانا قاری عبدالوحید صاحب، فارسی میں مولانا محمد یٰسین صاحب، فنون میں ابوالاساتذہ حضرت مولانا غلام رسول صاحب ہزاروی اور علومِ کتاب وسنت میں علامۂ دہر، یگانۂ روزگار الاستاذ الاکبر مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا رسول خان صاحب ہزاروی، مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی، مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہم اجمعین میرے اساتذہ رہے۔

اپنے رفقائے درس میں وقت کے بڑے بڑے فضلاء کو جمع پاتا ہوں، لیکن جن رفقاء کے ساتھ تعلیمی دور کا اکثر وقت گذرا ان میں مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی حال مفتیٔ اعظم پاکستان، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا میرک شاہ کشمیری، مولانا یوسف، واعظ کشمیر، مولانا محمد علی حیدرآبادیؒ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا سید محمد میاں دیوبندی، مولانا بدرعالم صاحب مہاجر مدنی یہ سب حضرات میرے بعد کے فضلائے دارالعلوم میں سے ہیں۔

اساتذہ نے کس قدر غیر معمولی شفقت کا ثبوت دیا اس ذیل میں دو واقعے قابل ذکر ہیں۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حدیث شریف کے استاذِ اعلیٰ تھے مگر بے حد نازک مزاج اور حساس

طبیعت کے بزرگ تھے۔ طلباء کی ذرا سی غفلت پر خفا ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ کسی کی غلطی پر خفا ہو کر گھر بیٹھ گئے اور دار العلوم میں سبق پڑھانا موقوف کر دیا۔ طلبا پر استاذ کی خفگی کا بہت اثر ہوا۔ مشوروں کی مجلس منعقد ہوئی اور طلباء نے یہ طے کیا کہ حضرت مولانا کو منانے کے لئے ان کے سامنے سفارش کے لئے مجھے پیش کیا جائے، اور حال یہ کہ میں خود بھی اس سال حضرت کے ہاں ایک طالب علم ہی تھا۔ چنانچہ میں نے مولانا کی خدمت میں جا کر عرض ومعروض کی اور طلباء کی طرف سے ندامت کا اظہار کیا تو حضرت مولانا نے خندہ پیشانی سے میری سفارش قبول فرمالی اور فوراً ہی مدرسہ تشریف لے آئے اور اسباق کا سلسلہ شروع کر دیا۔

میرے ساتھ بزرگوں کی یہ شفقت دیکھ کر اکثر اکابر کی کشیدگیوں کو دور کرنے کے لئے اساتذہ کی طرف سے مجھ ہی کو منتخب کیا جاتا تھا۔

تحریر وتقریر میں مجھے دلچسپی لڑکپن سے ہی تھی، اسے بڑھانے اور ترقی دینے، نیز اس لائن پر سفر کرانے میں یہ اکابر پیش پیش رہتے تھے۔ میری اس طالب علمی کے دور میں حضرت الاستاذ علامہ کشمیریؒ نے جو مجھے اپنے ساتھ پنجاب کے ایک تبلیغی دورہ میں لے گئے۔ بڑے بڑے شہروں میں بڑے بڑے اجتماعات میں میری تقریریں کرائیں۔ یہ واقعہ اب سے ساٹھ سال پہلے کا ہے لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ملتان کے ایک جلسہ میں اس طرح شریک ہوا کہ بارش میں کپڑے بھیگ چکے تھے اور میں نے ستر پوشی کے لئے ایک بڑا سا کمبل اپنے بدن پر لپیٹ رکھا تھا۔ نہ سر پر ٹوپی تھی نہ پیر میں جوتا، اسی ہیئت سے میں اس بڑے اجتماع کے سامنے آ گیا۔ حضرت علامہ نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے میرا تعارف ان الفاظ میں کرایا کہ یہ فقیر صاحب جو آپ کے سامنے کھڑے ہیں مستقبل کے ایک بہت بڑے مقرر ہیں۔ ہرگز خیال نہ کیجئے کہ فقیروں کی طرح کمبل پوش ہیں تو ان کے پاس کچھ نہیں بلکہ یہ سمجھئے کہ اس گدڑی میں لعل بھی مخفی ہے۔ یہ حضرت الاستاذ مرحوم کی حوصلہ افزائی تھی ورنہ کہاں ایک معمولی سا طالب علم اور کہاں لعل ویاقوت!

یہ اکابر تو مربی تھے ہی، حوادثِ زمانہ بھی ایک مستقل مربی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ماضی کے گم شدہ اوراق الٹتا پلٹتا ہوں تو اس دور کے سینکڑوں واقعات نے بھی میرے لئے عبرت وموعظت اور

تربیت کا راستہ ہموار کر دیا ہے۔ ۱۹۱۵ء میں جنگِ عظیم کے خاتمہ پر سیدنا شیخ الہندؒ کا سفر حجاز ان کے ہزاروں معتقدین میں یہ عام شہرت تھی کہ حضرت مولانا ہجرت کے ارادہ سے ہندوستان چھوڑ رہے ہیں، ملک میں عام سراسیمگی پھر حجاز میں حضرت کی گرفتاری، ساڑھے چار سال مالٹا میں نظر بندی، ان کی عدم موجودگی میں سارے ہندوستان میں حکومت کے خلاف غیر معمولی غم وغصہ کے جذبات اور ان کی طویل نظر بندی پر دار العلوم اور اس کے اکابر واصاغر نیز ملک کے سبھی حلقوں کا احتجاج، ۱۹۲۰ء میں حضرت کی مالٹا سے رہائی، ممبئی میں تشریف آوری، ساحل بمبئی پر لاکھوں ہندوؤں اور مسلمانوں کا استقبال، استقبال میں گاندھی جی، مولانا شوکت علی کی قیادت اور ساحل پر سب سے پہلے حضرت شیخ الہندؒ سے میرے والد محترم مولانا حافظ محمد احمد صاحب کے ساتھ میری پہلی ملاقات، بمبئی دہلی اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کے استقبالیہ اجتماعات میں حضرت کی شرکت اور تقریریں، یہ سب ایک لمبی چوڑی داستان ہے جو حالاتِ زمانہ کو سمجھنے اور طرزِ زندگی سیکھنے میں معاون ومددگار رہوئے اور بنتے رہے اور ماضی کے تجربات مستقبل کے لئے قدم قدم پر مشعلِ راہ ثابت ہوتے گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحبؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، ڈاکٹر انصاری صاحبؒ، حکیم اجملؒ، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد، نیز بیرونِ ملک کے مشاہیر علم وادب اور ناموران سیاست سے بار بار ملاقاتیں خاموش مربی کا کام دیتی رہیں اور ساتھ ہی توفیق خداوندی سے دار العلوم کے علمی اور دینی نقطۂ نظر کو ان کے سامنے واضح کرنے کا موقع بھی ملتا رہا۔ ۱۹۴۹ء میں مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اس ملک کے تعلیمی مسائل پر لکھنؤ میں ایک بہت بڑی کانفرنس طلب کی، اس میں احقر کو بھی طویل تقریر کرنے کا اتفاق ہوا۔ حضرت مولانا نے میری گزارشات کی جو تحسین فرمائی اور اپنی تقریر میں جس طرح میری تقریر کے الفاظ کی تائید کی اس سے مجھ کو اندازہ ہوا کہ مولانا آزاد کو اپنے چھوٹوں تک کی بھی رائے کو ماننے میں کوئی تامل نہ ہوتا تھا۔

میری زندگی کی ساخت وپرداخت میں حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ عمر کا ایک بہت بڑا حصہ حضرتِ مرحوم کے ہاں آتے جاتے گذرا۔ مسائل دینیہ میں ان کی فقہ سنجی، بیدار مغزی، حکیمانہ تنقیحات، معاشرتی معاملات میں غیر معمولی ضبط ونظم، ان کا وسیع وعمیق

علم ،ان کی سینکڑوں تصانیف، ان کی محبت وبابرکت اور حکیمانہ اندازِ تربیت نے زندگی کے بہت بڑے سبق سکھائے۔ حضرت کو اللہ رب العزت نے مرجع خلائق بنایا تھا۔آج بھی ان کی تصانیف اور ان کے خلفائے کرام شریعت وطریقت کے میدان میں بڑی بڑی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس دور میں حرام وحلال اور جائز وناجائز کا اہتمام کم ہی ملتا ہے جتنا کہ حضرت کے یہاں تھا۔آپ کو اپنے والد مرحوم کے بعد جائیداد ملی،اس کے متعلق آپ نے سرکاری کاغذات ودستاویزات ترکہ سے اپنے لئے ازسرنو تحقیقات فرمائی اور اپنے شہر اور دوسرے شہر کے رہنے والے جس شخص کے متعلق ذرا سا بھی معلوم ہوا کہ اس کا ذرا سا کوئی حق اس جائیداد میں ہے، پورے اہتمام کے ساتھ اس کا حق اسے پہنچایا۔

میرا تعلق ایک ایسے ماحول سے رہا ہے جس میں دین کے سب ہی شعبوں بالخصوص دینی تعلیم اور اس ذیل میں دین کے نادار طلباء سے محبت وشفقت کو زندگی کا ایک بہت بڑا فرض سمجھا جاتا تھا۔ میرے آباء واجداد نے طلبۂ علومِ دینیہ کو اپنی اولاد کی طرح پالا ہے اور یہاں تک کہ بعضوں کے شادی بیاہ کی تقریبات بھی خود ہی انجام دیں۔ کتنے ہی مشہور علماء وفضلاء ہیں جن کی مجلس نکاح ہمارے گھر پر آراستہ ہوئی۔ حضرت قبلہ مولانا سید انور شاہ صاحب کی شادی بھی میرے والد صاحب کے اہتمام سے ہوئی۔ حضرت مولانا عبدالحقؒ مدنی مہتمم مدرسہ شاہی مرادآباد جامعہ قاسمیہ خود دیوبند کے ایک اونچے خاندان کے فرد تھے،ان کی تقریب شادی بھی میرے والد نے کی۔اس تقریب کے شروع میں کہا تھا کہ میرا گھرانہ علماء وفضلائے عصر کا مورد تھا۔دوسرے متعدد علماء وفضلاء نے سالہا سال تک میری دادی صاحبہ اور والدہ صاحبہ کے زیر سایہ راحت وآرام سے وقت گزارا۔

دارالعلوم دیوبند جیسے مرکزی ادارہ سے پچاس پچپن سال کے تعلق میں مجھے ہزاروں نامور حضرات سے ملنے کا اتفاق ہوا،مگر وہ موقع مجھے نہیں بھولتا جب عالمِ اسلام کے مشہور فاضل علامہ رشید رضا مصری مدیر ''المنار'' قاہرہ دیوبند تشریف لائے تو ان کے استقبالیہ اجتماع میں استاذِ محترم حضرت علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ نے فنِ حدیث اور اس کے مدارجِ حجیت نیز دوسرے علومِ دینیہ کی روشنی میں دارالعلوم کے مسلک کی وضاحت فرمائی تھی۔تقریر کے دوران علامہ موصوف کچھ تنقیحی

سوالات بھی کرتے جاتے تھے، تقریر عربی میں تھی، حضرت علامہ صاحب برجستگی سے جوابات بھی ارشاد فرماتے جاتے تھے، جس سے شاہ صاحب کی عظمت کا سکہ ان کے دل پر بیٹھ گیا، بالآخر انہوں نے رخصت ہوتے ہوئے یہ جملہ فرمایا:

''اگر میں ہندوستان آکر دیوبند نہ دیکھتا تو ہندوستان سے غمگین جاتا۔''

بطور خاص حضرت شاہ صاحب کے متعلق علامہ رشید رضا مصری نے فرمایا:

''خدا کی قسم میں نے ان جیسا شخص کبھی نہیں دیکھا۔''

میری بیاسی سالہ زندگی کا ایک بڑا حصہ تینوں براعظموں کے طویل سفروں میں گذرا ہے۔ برما، افغانستان، حجاز، عدن، جرمنی، جنوبی افریقہ، کینیا، انڈونیشیا، مڈغاسکر، رنجبار، سری لنکا، ایسٹ افریقہ، حبشہ، ری یونین، کویت، لبنان، اردن، انگلستان، فرانس اور بہت سے ممالک میں مجھے بار بار آنے جانے اور وہاں مذہبی اور علمی سوسائٹیوں میں شرکت کا موقع ملا ہے، میں حق تعالیٰ کے اس فضل وکرم پر ہزاروں ہزار شکریہ ادا کرتا ہوں اور عہدہ برآ نہیں ہوسکتا ہوں کہ ان لاکھوں بندوں تک مجھے اسلام، ایمان، انسانیت اور دیوبند کے مسلک کے تحت اخوت ورواداری کا پیغام پہنچانے کی توفیق ہوئی، وہیں اس اعتراف پر بھی مجبور ہوں کہ اپنے اساتذہ اور مربیوں کی نظیر شاذ ونادر ہی کہیں دیکھنے میں آئی جن سے میری علمی اور اخلاقی تربیت کا تعلق رہا ہے۔ میری ماضی کی داستان اتنی لمبی ہے کہ اس کے بیان کرنے کے لئے وقت کا طویل اور عریض حصہ ناکافی ہے اس لئے ۔

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر

کے تحت جستہ جستہ منتشر واقعات کے اس اختصار کو اس مجلس یارانِ دار العلوم کیلئے ناکافی سمجھتے ہوئے ختم کرتا ہوں۔

سلسلہ تالیفات وافاداتِ حکیم الاسلامؒ
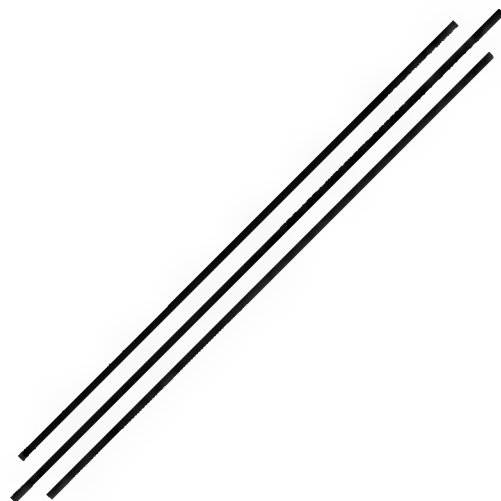
مشاہیر امت

تقریظ

از حضرت حکیم الامت سیدی وسندی
مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب دامت برکاتہم

بسم اللّٰہ والحمد للّٰہ والصلوٰۃ والسلام علٰی رسول اللّٰہ ھادی السبل وسید الرسل. وعلٰی الہ واصحابہ اعیان الامۃ وکاشفی الغمۃ۔

بعد حمد وصلوٰۃ اشرف علی عفی عنہ نے یہ قصیدہ نونیۃ الآحاد یعنی مشاہیر امت پورا اور ان آحاد کا تاریخی حصہ کہیں کہیں سے دیکھا، مدح تو وہ کرے جو ادب وتاریخ کا ماہر ہو، میرا منصبِ شہادت سے عاری ہونا ظاہر ہے، اس لئے بجائے مدح کے دو واقعی امر کا اظہار کرتا ہوں، ایک اپنی خوشی اور پسندیدگی کا، دوسرے دعائے برکت ومقبولیت ونافعیت کا۔ اور اس کے ساتھ ہی موضوعِ رسالہ کے متعلق ایک امر پر متنبہ کرتا ہوں، حاجتِ تنبیہ نہیں مگر محض احتیاط مقصود ہے، وہ یہ کہ اصل مقصود اہل کمالات کا تذکرہ ہے، باقی بعض اہل نقائص کا ذکر وہ اس اصل کے تحت میں ہے ”بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم“ اور اگر کسی کی فلسفیت اس توجیہ سے مانع ہو تو وہ **تعرف الاشیاء باضدادھا** کے تحت میں سمجھ لے۔ ع

والناس فیمایعشقون مذاھبٌ

خود صاحبِ قصیدہ نے بھی اپنے ترجمہ میں اس پر تنبیہ کی ہے۔ فقط

اشرف علی تھانوی

آخر شوال ۱۳۵۱ ہجری

حرفِ آغاز

کوئی قوم اسی وقت تک اپنے امتیاز کے ساتھ دنیا میں باقی اور ممتاز رہ سکتی ہے جب تک وہ اپنے شعائر اور اسلاف کی روایات کے دامن کو نہیں چھوڑتی۔ مصر کے قبطیوں نے اپنی تاریخ سے منہ موڑا تو بنی اسرائیل میں مدغم ہو گئے۔ بدھ قوم نے ہندوستان میں اپنے شعائر سے روگشی برتی تو آرین ہندوؤں میں ضم ہو کر رہ گئے۔ ایران کے آتش پرستوں نے اپنی روایات گم کیں تو مسلمانوں کا ایک جزء بن گئے۔ سسلی اور اسپین کے عربوں نے عظمتِ اسلاف سے روگردانی برتی تو اپنی عربیت کو تج دیا وار اٹلی اور اسپین والوں میں سما کر رہ گئے۔

ساڑھے تیرہ سو سال کے طویل عرصہ میں مسلمان اس سنگین تاریخی جرم کے مرتکب نہیں ہوئے اور اگر ہوئے تو بہت کم، اسی وجہ سے آج بھی مسلم قوم دنیا کی صفِ اول کی اقوام میں سے ایک قوم شمار ہوتی ہے اور قیامت تک ہوتی رہے گی انشاء اللہ۔

لیکن آج کے مادہ پرستی کے دور میں متمدن اقوام کے رنگین تمدن نے مسلم عوام کے غفلت کوش طبقہ کو بڑی حد تک اپنی رنگینیوں میں جذب کر لیا ہے۔ جس کا قدرتی نتیجہ ہے کہ عوام ہی نہیں بلکہ خواص میں بھی میں بھی عظمتِ اسلاف اور ان کی تاریخ سے مجرمانہ غفلت برتی جا رہی ہے، جس کے بھیانک نتائج محتاجِ بیان نہیں ہیں۔

تاریخ سے بدمذاقی بلکہ بے مذاقی کے اس دور میں ''مشاہیر امت'' تاریخ کے ''درسِ اول'' کی حیثیت رکھتی ہے جس میں نہ دور اَز کار موشگافیاں ہیں نہ تاریخی پیچیدہ اندازِ بیان، بلکہ نہایت سلیس و دل چسپ طرزِ ادا میں امت کے ممتاز افراد کے امتیازی اوصافِ جمیلہ کا ذکر اور مختصر مگر جامع انداز میں ان کی زندگیوں کا خلاصہ بیان فرمایا گیا ہے اور چوں کہ کسی کا فضل و کمال ظاہر نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس کے مدِ مقابل نقص و جہالت کو واضح نہ کیا جائے، اسلئے اس میں چند اُن افراد کا ذکر بھی کیا گیا ہے کہ جو کسی مذموم صفت مثلاً بخل، طمع وغیرہ میں مشہور ہیں۔ اگر عوام اور بالخصوص بچوں اور عورتوں کو سبقاً سبقاً پڑھایا جائے تو یہ توقع بے جا نہیں ہے کہ ان کے قلوب میں صحیح اسلامی روح بیدار ہو گی جو ان کے

اور امت کے مستقبل کیلئے ایک تابناک پیش خیمہ ثابت ہوگی جس کو ادارۂ تاج المعارف اپنی خدمت کے تحت نہایت بلند امیدوں کے ساتھ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

احقر محمد سالم قاسمی
رئیس جامعہ دینیات اردو دیوبند
۲۳/اپریل ۱۹۵۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مشاہیرامت

حمد وتمہید

یا مَن ھدیٰ قلبی وزان بیانی		فنظمتُ عقد جواھر الازمان

اے وہ ذات جس نے میرے دل کو راستہ دکھایا اور بیان کو آراستہ کیا، کہ میں نے زمانہ کے جواہر پاروں کو بیان کی لڑی میں گوندھ دیا۔

اعنی بھا اعلام من فاق الوریٰ		فمضی الدھور ومالھم من ثان

میری مراد ان جواہر پاروں سے وہ بلند ہستیاں ہیں جو مخلوق پر مختلف جہات سے فوقیت لے گئی ہیں اور زمانے گذر گئے کہ ان کا کوئی ثانی نہیں پیدا ہوا۔

من کان فردَ زمانہ فی فنّہ		سمیتُہ فیھا بحسن بیان

ان میں سے جو بھی اپنے فن میں یکتا گذرا ہے میں نے عمدہ بیان کیساتھ اس لڑی میں ٹانک دیا ہے۔

یسّر مرادی لی فانتَ مُیسِّرٌ		کل الصِّعاب عززْتَ من رحمان

پس تو میری مراد کو میرے لئے سہل فرمادے، تو ہی تمام مشکلات کو سہل فرمانے والا ہے کہ تو بیحد مہربان ہے۔

سَرَدَ السیوطی حبرنا واَجلُّنا		اعنی جلال الدین ذاالا تقان

ان جواہر پاروں کو سیوطی جیسے متبحر عالم اور برگزیدۂ امت نے سلسلہ وار بیان فرمایا ہے جس سے میری مراد شیخ جلال الدین جیسے ثابت قدم ہیں۔

ولقد راٰھا الشیخ فی خط من الذّ		ذَھبیّ ذی العرفان والاحسان

اور شیخ نے یہ اسماء صاحبِ عرفان واحسان علامہ ذہبی کے ایک خط میں دیکھے تھے (جس کو انہوں نے بجنسہٖ تاریخ الخلفاء میں نقل کردیا ہے)۔

ومتٰی رفعتُ لك الروایة مسندًا		فارع بسمعك ولاعیا تبیانیْ

اور جب کہ میں نے تمہارے سامنے ان جواہر پاروں کی روایت سند کے ساتھ بیان کردی تو اب اپنے قلب کو میرا مدلل بیان محفوظ کرتے ہوئے متوجہ کرلو (کہ میں اصل مطلب شروع کرتا ہوں)۔

واللّٰہ المستعان وعلیه التکلان.

اخلاق وعلم نبوت

قد کان ارحمَ امة مرحومةٍ		صدیقھا بالصِّدق والاحسان

امتِ مرحومہ کے سب سے زیادہ رحیم وکریم فردسچائی اورخوبی کے ساتھ صدیق امت (ابوبکرؓ) تھے۔

ابوبکرعبداللہ ابن ابی قحافہ رضی اللہ عنہ خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ جاہلیت کا نام عبدالکعبہ ہے، اسلامی نام جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ تجویز فرمایا۔ اسلامی لقب عتیق ہوا، اور بارگاہِ نبوت سے صدیق کا خطاب عطا ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بحلف فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے ابوبکر کا خطاب صدیق نازل فرمایا۔

ایک دفعہ جبرئیل علیہ السلام اترے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور کچھ عرصہ کھڑے رہے کہ صدیق اکبر قریب سے گذرے۔ جبرئیل نے کہا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہی تو ہیں ابن ابی قحافہ (ابوبکر)؟ آپ نے فرمایا کہ تم ملائکہ بھی انہیں جانتے ہو؟ انہوں نے بحلف فرمایا کہ ابوبکر صدیق آسمانوں میں زمین سے زیادہ مشہور ہیں اور آسمانوں میں انکا لقب حلیم ہے۔ صدیق اکبر کی مخصوص صفات میں سے صفتِ رحمت ہے، ارشادِ نبوی ہے:

ارحم امتی بامتی ابوبکر (وفی روایة) ارحم ھذہ الامة بعد نبیھا ابوبکر.

میری امت میں ساری امت سے زیادہ رحیم ابوبکر ہیں اور بعض روایات میں ہے کہ اس امت میں اس کے نبی کے بعد سب سے زیادہ رحم دل ابوبکر ہیں۔

صفتِ رحمت میں صدیق اکبر کا فائق ہونا درحقیقت تمام صفاتِ کمال میں ساری امت سے فائق ہونا ہے۔ کیوں کہ تربیت خلق اللہ کا تعلق صفتِ رحمت ہی سے ہے۔ حق تعالیٰ نے خود اپنے بندوں سے جس صفت کے ذریعہ ربط قائم فرمایا وہ صفتِ رحمت ہے، جس کی تکوینی صورت یہ ہے کہ عرش کو ساری کائنات پر محیط کردیا اور عرش پر جس صفت کے ساتھ تجلی فرمائی وہ صفتِ رحمت تھی، اس لئے فرمایا **اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى** اور نہ فرمایا **القھار علی العرش استویٰ یا الجبار**

علی العرش استویٰ گویا عرش سب پر محیط اور عرش پر رحمت محیط، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رحمت ساری کائنات پر محیط ہے۔ اس لئے عالم تربیت پاسکا اور ہر چیز اپنی حدِ کمال کو پہنچ سکی ورنہ صفاتِ جلال کسی چیز کو باقی نہ چھوڑتیں۔

پس صفاتِ جمال میں سب سے آگے اور سب صفات پر غالب صفتِ رحمت کو رکھا اس لئے تمام کائنات کی حقیقت میں محبتِ حق جزوِ لاینفک بن گئی کہ رحمت تو منشاءِ تربیت تھی اور تربیت احسانِ کامل ہونے کے سبب منشاءِ محبوبیت ہے اور ظاہر ہے کہ احسان اور وہ بھی انتہائی احسان یعنی ربوبیت قدرتی طور پر جاذبِ محبت وعقیدت ہے۔

پھر حق تعالیٰ نے اپنی اسی صفتِ رحمت کا مظہر اتم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنایا اور قرآن کریم نے آپ کو رحمة للعٰلمین کا خطاب عطا فرمایا اور لسانِ نبوت پر آپ کو رحمة مهداة کا لقب سنایا گیا۔

اس لئے آپ افضل الخلائق بن کر احب الخلائق ہوئے اور اس لئے ساری کائنات کی طرف آپ کی بعثت ہوئی کہ آپ رحمتِ عامہ کے سبب محبوبیتِ عامہ کی شان رکھتے تھے جو آپ کے دین سے ظاہر ہوئی اور قیامت تک کیلئے قائم ہوگئی۔ پھر آپ کی حرمتِ عامہ کے مظہر تام جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہوئے اور لسانِ نبوت پر انہیں ارحم امة کا خطاب ہوا اور اس لئے وہ انبیاء کے بعد افضل الخلائق ہوئے اور خلیفۂ خاتم الرسل قرار پائے اور ان کی خلافتِ عامہ قدمِ نبوت پر قائم ہوئی جو خلافتِ رحمت تھی۔

دورِ خلافت میں جب صدیق اکبر کسی سڑک سے گذرتے تو بچے جگہ جگہ ٹانگوں اور کمر سے لپٹ جاتے اور پکارتے یا ابتِ یا ابتِ (اے باپ اے باپ) اور صدیق غایتِ شفقت ورحمت سے ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے اور کھڑے رہتے۔ ۸/ جمادی الثانی ۱۳ھ کو مغرب اور عشاء کے درمیان وفات پائی، اور روضۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں دفن ہوئے۔ رضی اللّٰه عنه وعن كل الصحابة ورضوا عنه (رياض النضرة فى مناقب العشرة)۔

علمِ انساب

ثم النّسابة حبرُها فی عصره		هو (ا) ذاالرحیم فجاء فرداوانٖ

پھر علم انساب میں اپنے زمانہ کے سب سے بڑے واقف کار یہی رحم والے (صدیق اکبر) تھے جو زمانہ کے یکتا نساب ہوئے ہیں۔

(ا) هذا

علم نسب کی مہارت عرب کی خصوصیت میں سے ہے۔ اشخاص کے ناموں سے قوموں کو پہچان لینا اور قوموں کے نسب ناموں سے اشخاص کی معرفت کر لینا عربوں کا خاص حصہ تھا۔ ان کے یہاں انسانی سلاسلِ نسب کے علاوہ گھوڑوں اور اونٹوں تک کے نسب نامے محفوظ رکھے جاتے تھے۔ اولاد میراث کے قابل جب ہی سمجھی جاتی تھی جب کہ وہ اپنے خاندانی نسب، اصل اور سلسلہ سے واقف ہو جاتی تھی اور اس میں شبہ نہیں کہ طبعی طور پر سلسلۂ نسب کی پہچان انسانی نفسیات میں بہت گہرا اثر رکھتی ہے۔ باہمی میل ملاپ، تعاون وتناصر اور باہمی یگانگت ورواداری کو نسب کا سلسلہ بہت کچھ مستحکم کر دیتا ہے۔ نسبی تعلقات درمیان میں آجانے سے حمیت کی رگیں بھڑک اٹھتی ہیں، دودمانی غیرت جوش کھانے لگتی ہے اور اس کے توسط سے طوعاً وکرہاً برادریاں ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ایسے کار آمد مؤثر کو شریعت نے اعتدال کے ساتھ باقی رکھنے کی سعی فرمائی ہے۔ ہاں نہ اس کو امورِ دینیہ کا مدار ٹھہرایا اور نہ اس کو احکامِ دنیا میں باطل محض قرار دیا، دینی سلسلوں میں تقسیم میراث، صلۂ رحمی اور بہت سے ابوابِ خیر نسب کے سلاسل جاننے پر موقوف ہیں۔ اسی لئے حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

تعلموا من النسب ماتعرفون به احسابکم وتصلون به ارحامکم.

نسب کی معلومات اتنی ضرور پیدا کر لو کہ اپنے خاندانی کمالات کو پہچان سکو اور اپنے قرابت داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کر سکو۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص کم از کم اپنے ذاتی سلسلۂ نسب اور اصل کو بھی بقدر ضرورت نہیں جانتا

وہ لوگوں کو نہیں پہچانتا، اور جو اپنی جنس کے افراد سے ہی واقف نہیں اسے اس جنس میں سے شمار کیا جانا بھی تعجب سے خالی نہیں۔ اسی لئے فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

تعلموا النسب ولاتكونوا كنبيط السواد اذاسئل احدهم عن اصله قال من قرية كذا وكذا.

نسب کی معلومات حاصل کرو اور خودرَو پود کی طرح ان لوگوں میں سے مت ہو جاؤ کہ جب ان میں سے کسی کی اصل کی بابت پوچھا جائے تو کہہ دے کہ میں تو فلاں بستی کا ہوں (گویا اس کی نظر میں اس کی اصل گاؤں کی زمین ہے کوئی شخص اور خاندان نہیں)۔

آج تک بھی ہندوستان کے عربی خاندانوں میں ان کا یہ آبائی فن کسی حد تک محفوظ چلا آتا ہے۔ تقریبات کے سلسلہ میں نسب کی چھان بین کافی حد تک کی جاتی تھی۔ ہر خاندان میں علماءِ نسب موجود تھے جن کی طرف وقت پر رجوع کیا جاتا تھا۔ دودمانی خصوصیات کے تحفظ اور گھرانوں کے مخصوص اخلاق کی بقاء کیلئے خاندانی سلسلوں کی پوری تفتیش کی جاتی تھی۔ دورِ حاضر کی طرح تزویج و مناکحت کا مدار محض مال و منال یا تلاشِ بر کیلئے اشتہارات و اخبارات کے ایک اعلان پر نہ تھا، انگریزی حکومت کی نحوست اور اسلام دشمنی کی مضر پالیسی نے جہاں مسلمانوں کے بہت سے مخصوص علوم وفنون فنا کر دیئے ہیں وہیں یہ جوہر بھی علماً وعملاً ضائع کر دیا ہے۔

بہر حال علم الانساب کو عربوں نے کافی اہمیت دی اور ایک مستقل فن کی حیثیت سے پیش کیا اور اس سے دین و دنیا کے بڑے بڑے امور میں مدد ملی، عرب میں علم الانساب کے ذوقِ عام کے ساتھ مخصوص علماءِ نسب بھی تھے اس سلسلے میں سب سے بڑے نسّاب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ شمار کئے گئے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منجانبِ حق ارشاد ہوا کہ قبائل اور خاندانی مجالس میں جا کر تبلیغ دین فرمائیں تو آپ ایک دن اس قصد سے تشریف لے چلے، میں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ساتھ تھے، ایک مجلس پر پہنچے تو صدیق اکبر آگے بڑھے (اور وہ ہر چیز میں ہم سب سے آگے ہی رہتے تھے) اہل مجلس کو سلام کیا اور فرمایا کہ آپ لوگ کون قوم ہیں؟ انھوں نے کہا ربیعہ۔ فرمایا کہ کونسے ربیعہ میں سے ہو؟ کہا ہامہ عظمٰی میں سے۔ فرمایا کون سے ہامہ عظمٰی میں سے؟ کہا ذہل اکبر میں سے ہیں۔ اس پر فرمایا کہ اچھا تو تم میں ہی سے ہے

بنی عوف ابن محکم جس کے حق میں یہ مقولہ مشہور ہے (لاحرّبوادی عوف) انھوں نے کہا نہیں۔

فرمایا کہ پھر تم ہی میں سے ہے حساس ابن مرة جو حامی الذمّار ومانع الجار کی مثل سے مشہور ہے؟ کہا نہیں۔ فرمایا کہ پھر تم ہی میں سے ہیں سلاطین کندہ کے اخوال، انھوں نے کہا نہیں۔ فرمایا پھر تم ہی میں سے ہیں شاہان لخم کے داماد؟ انھوں نے کہا نہیں۔ فرمایا کہ پھر تم ذہل اکبر میں سے نہیں ہو، بلکہ ذہل اصغر میں سے ہو۔

بہر حال صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جس طرح رحم وکرم میں یکتا تھے اسی طرح قبائل کے نسب پہچاننے اور قبائل کی مشہور شخصیتوں کی معرفت میں فردِ زمانہ تھے۔

پس جس طرح صفتِ رحمت میں ان کا یکتا ہونا سلاسلِ روحانیت اور معارفِ الٰہیہ میں ان کے فردِ کامل ہونے کی دلیل ہے۔ اسی طرح فنِ نسب میں ان کا حافظِ وقت ہونا سلاسلِ جسمانیت اور معارفِ بشریہ میں یکتا ہونے کی شہادت ہے اور اس طرح یہ افضل الخلائق بعد الانبیاء ہستی علومِ دنیا ودین دونوں کے اصولی سلسلوں کی ماہر ثابت ہوتی ہے۔ رضی اللّٰہ عنہ وعنھم اجمعین۔

(عقدالفرید)

شدت فی الدین

واَشدھم فی دینہ فاروقہ		عُمرُ بن خطاب جلیل الشان

اور سب سے زیادہ امورِ دین میں سخت اور قوی دین اسلام کے فاروق تھے جو کہ جلالت کی شان رکھنے والے عمر بن خطاب ہیں۔

ابو حفص عمر بن الخطاب خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ۔ جاہلیت اور اسلام میں نام عمر ہی رہا، کنیت ابو حفص تھی جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز فرمودہ تھی حق تعالیٰ نے مخصوص لقب مفتاح الاسلام عطا فرمایا اور آسمانی لقب فاروق ہے جو بقول جبریل علیہ السلام زمین سے زیادہ آسمانوں میں مشہور ہے۔ انجیل میں کافی کے لقب سے معروف ہیں اور تورات میں منطق الحق کے لقب سے اور جنت کا معروف لقب سراج ہوگا، بغض فی اللہ اور شدة فی امر اللہ مخصوصاتِ فاروقی میں سے ہے۔

جلالِ حق کا مظہر اتم تھے، حضور نے دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ دو عمروں میں سے جونسا تجھے محبوب ہو اس سے دین کو عزت بخش، یا عمر بن خطاب سے یا عمر بن ہشام (ابوجہل) سے۔

فاروقِ اعظم محبوبِ حق ثابت ہوئے اور انہی کے بارہ میں یہ دعاء مستجاب ہوئی، چنانچہ ان کے یومِ اسلام ہی سے اسلام کی شوکت اور قوت کا آغاز ہو گیا، دشمنانِ دین کے حق میں شمشیر برہنہ تھے۔

ایک یہودی اور ایک منافق میں جھگڑا ہو گیا، یہودی نے چاہا کہ مقدمہ بارگاہِ نبوی میں جائے اور منافق نے چاہا کہ کعب بن اشرف (عالم یہود) کے پاس ہو، مگر یہودی نے انکار کیا اور بالآخر مقدمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ نے یہودی کے حق میں مقدمہ فیصل فرمایا، منافق نے فیصلۂ نبوی تسلیم نہ کرتے ہوئے فاروقِ اعظم کے پاس اپیل کی اور سارا قصہ بیان کیا۔ فاروقِ اعظم نے فرمایا ٹھیرو میں ابھی آتا ہوں، گئے اور گھر میں سے تلوار لے کر آئے اور آتے ہی منافق کی گردن اڑا دی، اور فرمایا کہ فیصلۂ نبوی نہ ماننے والوں کے حق میں میں اسی طرح فیصلہ کیا کرتا ہوں، اس پر جبریل نازل ہوئے اور فرمایا کہ عمر نے حق و باطل کو الگ الگ کر دیا اور فاروق کا لقب مشہور ہو گیا۔

زمانۂ کفر میں جن جن مجالس میں فاروقِ اعظم کی نشست و برخاست تھی اسلام لانے کے بعد بلاخوف و دہشت ان تمام مجالس میں اپنے اسلام کا اعلان کرتے ہوئے پھر گئے اور کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ ان کے قریب بھی آسکے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ عرض کر کے کہا کہ یا رسول اللہ آپ مخفی کیوں ہیں؟ باہر تشریف لایئے، چنانچہ آپ باہر تشریف لائے، آگے آگے حضرت عمر و حمزہ رضی اللہ عنہما جا رہے تھے یہاں تک کہ آپ نے علی الاعلان کعبہ کا طواف فرمایا اور ظہر کی نماز پڑھی اور آپ نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے خدا کی آج کے بعد عبادت چھپ کر نہ ہوگی، چنانچہ اس کے بعد اسلام کی شوکت بڑھتی ہی چلی گئی۔ فتوحات کی کثرت ہوئی، غنائم سے اسلامی خزانے پر ہو گئے، قومیں کی قومیں دائرۂ اسلام میں آنی شروع ہو گئیں حق اور سکینہ حضرت عمر کی زبان پر تھے، حق گوئی شعار تھا اگر چہ تلخ معلوم ہوتا ہو، بنصِ حدیث شدت فی اللہ اور ہیبت کے سبب شیطان اس کوچے سے نہیں چلتا تھا جس سے فاروقِ اعظم چلتے تھے۔

تین دفعہ شیطان کو پچھاڑا ہے اور فرمایا کہ کیا جنات ایسے ہی بودے ہوتے ہیں، اور ان کے بازو کتوں کے سے کمزور بازو ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی نسبت حدیث نبوی میں فرمایا گیا:

اشد امتی فی امر اللّٰہ عمر

میری امت میں سب سے زیادہ امورِ الٰہیہ میں سخت عمر ہیں۔

خلافت کے بعد فرمایا کہ ابوبکر کا لقب خلیفہ رسول اللہ تھا، مگر مجھے خلیفہ رسول کس طرح کہا جا سکتا ہے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ ہمارے امیر ہیں اور ہم مومنین ہیں، اس لئے آپ امیر المومنین ہیں، اسے قبول فرمایا اور یہ لقب سب سے پہلے فاروقِ اعظم ہی کا مشہور ہوا۔ چوتھی ذی الحجہ ۲۳ھ کو شہادت کے ساتھ وفات پائی، نزع کے وقت اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی گود میں سر تھا اور فرما رہے تھے، گنہگار ہوں مگر نمازیں سب پڑھی ہیں اور روزے سب رکھے ہیں، فرشتہ موت نے دوسرے فرشتہ سے فرمایا کہ یہی ہے امیر المومنین کا گھر جس میں کچھ بھی سامان نہیں، گویا قبر ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے ملک الموت! جس گھر میں تم آنے والے ہو اور تم ہی خلف بنو، وہ گھر ایسا ہی ہونا چاہئے، **رضی اللّٰہ عنہ وعنہم ورضوا عنہ۔**

صفتِ حیاء

عثمان اصدقهم حیاءً صاحبَ		النورین ثمة جامع القراٰن

سب سے بڑے حیادار عثمان غنی ہیں جو ذی النورین اور جامع القرآن تھے۔

ابو عمر عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ثالث الخلفاء الراشدین ہیں، حضرت عمرؓ کے بعد انہی کا مرتبہ امت میں مسلمہ ہے۔ جاہلیت و اسلام میں نام عثمان ہی رہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو صاحبزادیاں ان کے نکاح میں دی ہیں، اس لئے (بروایت حضرت علی رضی اللہ عنہ) ان کا لقب ملاءِ اعلیٰ (اور دنیا) میں ذوالنورین مشہور ہوا۔

صورت وسیرت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت اشبہ تھے، جس کی شہادت

حضور نے دی ہے۔ وصفِ مشہور اور صفتِ غالبہ حیاء تھی، جس کی احادیث میں تعریف فرمائی گئی ہے، **احیی الامة** (امت کا سب سے بڑا حیادار) بارگاہِ رسالت سے خطاب عطا ہوا تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس میں خود بھی حضرت عثمان سے حیاولحاظ فرماتے، بعض بے تکلف مجالس میں جب حضرت عثمان کی آمد ہوتی تو آپ کپڑے سنوارتے اور خود بھی سنور کر بیٹھ جاتے اور فرماتے کہ حیادار آ رہا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ اللہ کے ملائکہ بھی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے حیا کرتے تھے۔

بعض روایات میں فرمایا گیا ہے کہ عثمان استحیاءِ ملائکہ ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مشابہ ہیں جیسے ان سے فرشتے حیا کرتے تھے، ایسے ہی ان سے بھی حیا کرتے ہیں۔ حضرت حسن فرماتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ اگر ایسے مکان میں بھی ہوتے جس کا دروازہ بند ہوتا اور ان کے سوا کوئی دوسرا نہ ہوتا تو بھی حیا کی وجہ سے بدن سے کپڑا اہٹانا گوارہ نہ فرماتے تھے۔ لغتِ قریش پر قرآن کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی نے جمع فرمایا ہے، اور پھر اسی مصحف کو تمام بلادِ اسلامیہ میں منتشر کرایا، یہاں تک کہ امت قرآن کے الفاظ میں اختلاف وتحریف کرنے سے مامون ہوگئی۔

۳۵ھ میں بدھ کے دن ایام تشریق میں بحالتِ مظلومی شہید ہوئے، قتل کے بعد تین دن تک نعش مبارک بلا دفن پڑی رہی اور ظالم دفن تک سے مانع تھے۔

نمازِ جنازہ حضرت جبیر بن مطعم نے صرف تین مقتدیوں کے ساتھ ادا فرمائی اور چھپا کر رات کے وقت مدفن میں لے گئے، وہاں بنی مازن کی ایک قوم مقابل آئی کہ اگر یہاں دفن کیا تو ہم صبح کو اسے مشہور کر دیں گے، اسی لئے وہاں سے پھر نعش مبارک اٹھا کر لائے اور حس کوکب میں (جو بقیع غرقد میں حضرت عثمانؓ ہی کا اضافہ کیا ہوا قطعۂ زمین تھا) دفن فرمائے گئے۔ رضی اللہ عنہ وعنہم ورضوا عنہ۔

علم القضاء

وکذاك اقضاهم علیّ حامی الی		احسان ثمة ماحی العدوان

اور حضرت علی عدل وانصاف کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر قاضی اور مقدمات فیصل کرنے والے تھے جو خوبی کو تھامنے والے اور بیجا امور کے مٹانے والے تھے۔

ابوتراب علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ چوتھے خلیفۂ راشد ہیں، جاہلیت واسلام میں نام علیؔ ہی رہا، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت ہی محبوب صحابہ اور بلحاظِ قرابت حضور کے سب سے زیادہ خویش اور قریب ہیں۔ چچازاد بھائی ہیں۔آپ فرماتے ہیں کہ علی میری نسبت سے ایسے ہیں جیسے میرے جسم اطہر کے لحاظ سے میرا سر ہے اور فرمایا کہ علی کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تھی، الّا یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

بعض مواقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو اپنے سے تشبیہ بھی دی ہے کہ وہ میری مثل ہیں، صحابہ میں دینی بھائی بندی قائم کراتے ہوئے آپ نے خود اپنا دینی بھائی حضرت علی کو منتخب فرمایا۔نہایت ہی کثیر المناقب صحابی ہیں، آپ کا وصفِ مشہور اور کمالِ غالب قضا اور فصلِ خصومات ہے۔ابتداءِ سن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا، حضرت علیؓ نے عرض کیا یارسول اللہ میں نوعمر ہوں اور فصلِ قضایا کے متعلق مجھے کوئی علم حاصل نہیں اور آپ اتنا عظیم الشان عہدہ مجھے دے رہے ہیں؟ آپ نے تسلی دے کر فرمایا کہ عنقریب حق تعالیٰ تیری زبان کو سیدھی چلائیگا اور تیرا قلب قابو میں فرمادے گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد مجھے کسی فیصلہ میں کبھی شک اور تردد نہیں ہوا، چنانچہ بڑے بڑے حسابی معاملات اور الجھے ہوئے مقدمات بے تکلف کھڑے کھڑے فیصل فرمادیا کرتے تھے۔

رزین ابن حبیش فرماتے ہیں کہ دو شخص بیٹھے ہوئے کھانا کھارہے تھے، ایک کے پاس پانچ روٹیاں تھیں اور دوسرے کے پاس تین، اتفاقاً ایک تیسرا شخص قریب تھا بے تکلفی سے اس نے بھی

ساتھ کھانے کی درخواست کی ان دونوں نے خندہ پیشانی سے اجازت دیدی، کھانے سے فارغ ہوکر اس مہمان نے آٹھ درہم اپنے دونوں میزبانوں کے سامنے پیش کئے۔ ان دونوں میں تقسیم پر نزاع ہوگیا، پانچ روٹیوں والے نے کہا کہ فی روٹی ایک درہم کے لحاظ سے پانچ درہم تو میں لوں گا اور تین درہم تجھے لینے چاہئیں۔ تین روٹیوں والے نے کہا کہ نہیں یہ آٹھ درہم ہم دونوں میں مساوی تقسیم ہونے چاہئیں، کیونکہ کھاتے وقت مشترکہ کھانا کھایا گیا ہے جس میں تین اور پانچ روٹی کا کوئی سوال نہ تھا۔ آخر کار یہ مقدمہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا، آپ نے تین روٹی والے سے فرمایا کہ تمہارے ساتھی نے جو فیصلہ کیا ہے اسے مان لو اور تین درہم پر راضی ہو جاؤ، پانچ درہم اس کے لئے چھوڑ دو۔ اس نے نہ مانا اور کہا کہ میں تو آپ کا فیصلہ چاہتا ہوں۔

فرمایا کہ پھر حق تو یہ ہے کہ ان آٹھ درہموں میں سے صرف ایک درہم تم کو ملے اور تمہارے ساتھی کو سات درہم۔ اس نے تعجب سے پوچھا کہ یہ کس طرح؟ فرمایا اس طرح کہ جب ان آٹھ روٹیوں کو تین آدمیوں نے کھایا تو ان آٹھ روٹیوں کی مساوی تقسیم تین پر ۲۴ ثلث سے ہو جاتی ہے، گویا آٹھ آٹھ ٹکڑے (ثلث) فی کس بیٹھتے ہیں۔ پس اب ان ۲۴ ثلث میں سے ۹ ثلث کے تو تم مالک ہوئے کہ تمہاری روٹیاں تین تھیں، اور تین کی مساوی تقسیم تین پر نو تہائیوں سے ہوتی ہے اور ۱۵ ثلث کا تمہارا ساتھی مالک ہوا کہ اس کی پانچ روٹیاں تھیں اور پانچ کی مساوی تقسیم تین پر ۱۵ تہائیوں سے ہوتی ہے۔ پس اب ان ۲۴ تہائیوں کو (جن میں سے ۹ تمہاری اور ۱۵ تمہارے ساتھی کی ہیں) جب تین آدمیوں نے لیا تو فی کس آٹھ ثلث حصہ میں آتے ہیں۔ پس جب تم نے آٹھ ثلث کھالئے اور کل تمہارے ثلث ۹ تھے اس لئے صرف ایک ثلث تو تمہارا باقی بچا اور تمہارے ساتھی نے بھی آٹھ ثلث کھائے اور اس کے کل ثلث ۱۵ تھے تو سات ثلث اس کے باقی رہے، لہٰذا ان آٹھ درہم میں سے صرف ایک کے تم مالک ہو سکتے ہو، اور بقیہ سات کا تمہارا ساتھی، اور اپنے مہمان کے عطیہ آٹھ دراہم کو تم چوبیس کے عدد سے اسی طرح تقسیم کر سکتے ہو۔

اسی طرح اور بہت سے قضایا ہیں جو حسابی رنگ رکھنے کی وجہ سے پیچیدہ ترین ہیں، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جودتِ طبع بے تکلف انھیں سلجھا دیتی تھی اور فریقین راضی ہوکر اٹھتے تھے۔ اسی لئے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں علم وحکمت کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں، یعنی علوم ِنبوت کی بعض مخصوص شانیں لسانِ علی پر ظاہر ہوں گی۔

چنانچہ ہوئیں جن میں سے فصلِ قضایا کو خاص اہمیت ہے، انھی علوم میں سے علومِ معرفت اور علومِ باطن بھی ہیں جن میں آپ امام ہیں، عموماً اہل باطن کے تمام سلاسل حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی پر ختم ہوتے ہیں۔ پس علومِ معاملہ میں آپ کا کمال تو فصلِ قضایا سے ثابت ہوتا ہے اور علومِ مکاشفہ کا کمال بیانِ حقائق اور مدارِ معرفت وطریقت ہونے سے نمایاں ہو رہا ہے۔

بنقل ابن عبدالبر ۱۶ / رمضان ۴۰ھ کو اشقی القوم ابن ملجم کے ہاتھ سے شہید ہوئے اور کوفہ میں شب کے وقت دفن کئے گئے۔ جس وقت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو آپ کی شہادت کی خبر پہنچی تو حسرت سے فرمایا کہ اب عرب کا جو چاہے کرے آج سے اس کا روکنے والا کوئی نہ رہا۔ رضی اللہ عنہ وعنہم ورضوا عنہ۔

حق گوئی

اما ابو ذر فاصدق لھجۃ		فیھم واتقاھم من النیران

حضرت ابوذر غفاری صحابہ میں سب سے بڑے حق گو اور نارِ جہنم سے نہایت ہی بچنے والے تھے۔

ابوذر جندب ابن جنادہ بن سفیان بن عبد بن حرام بن غفار رضی اللہ عنہ صاحبِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ غفار سے تعلق رکھتے ہیں۔ مشہور صحابی ہیں اول الاسلام میں چوتھے یا پانچویں مسلم ہیں جو ابتداءِ عہد میں اسلام لائے ہیں۔ مسلمان ہو کر اپنی قوم میں واپس ہوئے اور پھر مدینہ طیبہ اس وقت حاضر ہوئے جب کہ جنگِ بدر واحد وخندق ہو چکی تھی۔ پھر وفاتِ نبی تک مدینہ ہی میں مقیم رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اس پر بیعت لی تھی کہ حق گوئی میں کسی ملامت کی پرواہ نہ کریں گے اور راست گفتار رہیں گے اگرچہ وہ لوگوں کو تلخ معلوم ہو۔ چنانچہ یہ وصف نمایاں طور پر ان میں غالب رہا۔ امر المعروف، نہی عن المنکر اور تنقید میں شمشیر برہنہ تھے۔ بارگاہِ نبوت سے جو خطاب اصدق لہجہ (راست گفتار) انہیں دیا گیا تھا اس کا حق ادا فرما دیا۔

خلافتِ صدیقی کے بعد شام چلے گئے اور خلافتِ عثمانی تک وہیں مقیم رہے۔ حق گوئی کی بناء پر ہر ایک سے جھگڑا رہتا تھا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی شکایت پر حضرت ذی النورین رضی اللہ عنہ نے انہیں شام سے بلوالیا اور شہر سے باہر ربذہ میں مقیم ہو جانے کا ارشاد فرمایا۔

امامِ حق کی سمع وطاعت کرتے ہوئے شہر سے باہر ویرانہ میں ہی رہ پڑے اور عمر زہد وقناعت کے ساتھ ربذہ ہی میں پوری کر دی۔ وفات کے قریب ان کی بیوی رونے لگیں، فرمایا کیوں روتی ہو عرض کیا اس لئے کہ کوئی کپڑا اتنا بھی نہیں ہے کہ آپ کو کفن ہی دے دوں۔ فرمایا روؤ نہیں میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے ہمراہیوں کی ایک بھری جماعت سے خطاب فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تم میں سے ایک شخص ویرانہ میں مرے گا اور مسلمانوں کی ایک جماعت اس کی تجہیز و تکفین کرے گی، میرے ان ہمراہیوں میں سے سب بستیوں میں انتقال کر چکے ہیں، میرے سوا کوئی باقی نہیں، اور میں ہی ویرانہ میں مر رہا ہوں، ضرور ہے کہ کوئی جماعت میرے کفن دفن کی متکفل ہو، تم جاؤ اور راستہ پر کھڑی ہو کر اس جماعت کا انتظار کرو۔ یقیناً تم وہ سب کچھ دیکھو گی جو میں کہہ رہا ہوں۔

چنانچہ وہ راہ پر چشم براہ کھڑی ہو گئیں، اچانک ایک مختصر سا قافلہ دور سے نظر پڑا جو سواریاں دوڑاتا ہوا آ رہا تھا، قریب پہنچ کر انھوں نے ان سے پوچھا کہ تم کون ہو اور یہاں جنگل میں تنہا کیوں کھڑی ہو؟ انھوں نے کہا کہ ایک مرد مسلمان کا انتقال ہو رہا ہے اور تم اس کی تجہیز و تکفین کر کے اجر حاصل کرو گے۔ انھوں نے پوچھا وہ کون ہیں؟ کہا کہ ابوذر غفاری۔ یہ سب لوگ دوڑ کر حضرت ابوذر کے پاس پہنچے، حضرت ابوذر غفاریؓ نے فرمایا کہ تم لوگ خوش ہو کہ تم ہی وہ جماعت ہو جس کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیشین گوئی فرمائی تھی اور فرمایا کہ میرے پاس کوئی کپڑا نہیں ہے جس میں مجھے کفن دیا جا سکے تم کفن کے لئے ایک کپڑا مہیا کر لو، مگر مجھے وہ شخص کفن نہ دے جو کسی قوم کا امیر یا ذمہ دار ہو یا عریف ہو یا عامل ہو (یہ اس احتیاط اور تقویٰ کی بناء پر فرمایا کہ عموماً اہلِ مناصب اور امراء اپنے فرائض منصبی پوری طرح انجام نہیں دیتے اور ان کی گردن پر حقوق رہ جاتے ہیں، اور وہ اپنے وظائف ناحق وصول کر لیتے ہیں، اس لئے ان کا مال مشتبہ ہو جاتا ہے، خلافِ تقویٰ ہوتا ہے گو کسی صورت میں خلافِ فتویٰ نہ ہو)۔

پورے قافلہ میں سے صرف ایک انصاری آگے بڑھے، انھوں نے کہا کہ میرے پاس دو کپڑے ہیں جو میری ماں کے کاتتے ہوئے سوت سے بنے ہوئے ہیں، ان میں سے یہ ایک کپڑا میرے جسم پر ہے۔ فرمایا ہاں بس مجھے اس کپڑے میں کفنا دینا۔ ۳۲ھ میں بعہدِ خلافتِ عثمانی وفات پائی ہے، دراز قامت گندم گوں تھے، سر اور داڑھی سفید ہو چکے تھے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

امانتداری

وابوعبیدة فی الامانة واحد		فهو الامین لكل ذی ایمان

ابوعبیدہ امانت داری میں یکتا تھے، وہ بذاتہ بھی امین تھے اور ہر ایماندار کے حق میں بھی امین تھے۔

ابوعبیدہ عامر بن الجراح رضی اللہ عنہ، اسلام اور جاہلیت میں نام عامر ہی رہا اور لقب امین الامت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر ایک امت میں امین ہوئے ہیں میری امت کے امین ابوعبیدہ ابن جراح ہیں۔ وصفِ امانت ان کی عظمتِ ایمان کی خبر دیتی ہے، کیونکہ امانت درحقیقت ایمان کی زمین ہے، نیز قبائل کے امین عظمت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ امت کے امین کی عظمت جس کی امانت منصوص ہو کس درجہ باعظمت ہوگی، اس لئے حضرت ابوعبیدہ پر امارت وخلافت کی حیثیت سے بھی نظر پڑی ہے۔

خلافتِ عمری کے دوران میں ۱۸ھ میں بعمر اٹھاون سال وفات پائی اور اردن کے علاقۂ شام میں مدفون ہوئے ہیں۔ نمازِ جنازہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے پڑھائی، اور حضرت معاذ وعمرو بن العاص وضحاک ابن قیس رضی اللہ عنہم نے قبر میں اتارا۔ رضی اللہ عنہ وعنہم ورضوا عنہ۔

شجاعت

این الشجاعة من شجاعة خالد		قد كان اشجع ناز لی المیدان

کسی کی شجاعت حضرت خالد بن ولید کی شجاعت کو کہاں پہنچتی ہے، وہ میدان میں کود پڑنے والوں میں سب ہی سے بڑھ کر شجاع وبہادر تھے۔

سیف صیقل من سیوف اللّٰہ فی		اعنـاق اهـل الشرك والكفران

خدا کی تلواروں میں سے ایک بھاری تلوار تھے، مشرکوں اور اہل کفر کی گردنوں کے لئے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مشہور اور جلیل القدر صحابی ہیں، اشرافِ قریش میں سے ہیں، دورِ جاہلیت میں بھی بڑے بہادر مانے جاتے تھے۔ فتح خیبر کے سات سال بعد اسلام میں داخل ہوئے۔ رشتہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھانجے ہوتے ہیں، ان کی والدہ لبابہ صغریٰ بنت الحارث حضرت میمونہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا (ام المومنین) کی بہن ہیں۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں فتح مکہ سے قبل اسلام لانے کی غرض سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ بابرکت میں جارہا تھا، راستہ میں حضرت خالد سے ملاقات ہوگئی، میں نے کہا اے ابوسلمان! کہاں کا ارادہ ہے؟ فرمانے لگے کہ واللہ اسلام لانے جارہا ہوں۔ میں نے کہا واللہ میں بھی اسی نیت سے نکلا ہوں، چنانچہ ہم دونوں مل کر بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے، اور حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کر کے واپس ہوئے اور راستہ میں غزوۂ موتہ میں شریک ہوئے، تیسرے امیر جیش کی شہادت پر جنگی جھنڈا حضرت خالد نے اپنے ہاتھ میں لیا، جس کی خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں لوگوں کو دی تھی، پھر فتح مکہ میں پھر حنین میں شریک ہوئے، شجاعت وبہادری میں حضرت خالد کا خاص پایہ اور ممتاز درجہ رہا ہے، اسلام کی بڑی بڑی فتوحات ان کے ہاتھ پر ہوئی ہیں۔ بارگاہِ نبوت سے سیف اللہ کا معزز خطاب حاصل کیا۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک منزل پر اترے اور لوگ گذر رہے تھے، آپ ہر گذرنے والے کی نسبت پوچھتے کہ یہ کون ہے، اور میں بتلاتا جاتا تھا یہاں تک کہ خالد بھی گذرے اور آپ نے فرمایا یہ کون ہے؟ میں نے عرض کیا کہ خالد بن الولید۔ فرمایا خدا کا بہترین بندہ، اور اس کی تلواروں میں سے ایک تلوار۔

اہم معرکوں کے لئے زمانۂ نبوی اور بعد کی خلافتوں میں انھیں کا انتخاب کیا جاتا تھا، عہدِ نبوی میں عزیٰ (مشہور بت) کے توڑنے کے لئے انہی کو طائف بھیجا گیا۔

خلافتِ صدیقی میں اہل ردّت کی گوشمالی کے لئے یہی تجویز ہوئے، مسیلمہ کذاب مدعیٔ نبوت کے معاملہ کے لئے انہی کا انتخاب ہوا، دمشق اور شام کی مہم انہی سے سر ہوئی، فارس کے میدان اور سنگین قلعے انہی کی تلواروں نے فتح کئے، ان ممتاز فتحیابیوں کی ایک خاص وجہ تھی جس کو حضرت خالد خود ہی فرماتے ہیں، اور وہ یہ کہ جنگِ یرموک میں حضرت خالد کی ایک ٹوپی گم ہوگئی جس کی تلاش میں نہایت سرگرداں اور پریشان تھے، خود ڈھونڈتے پھر رہے تھے اور لوگوں کو بھی اسکی تلاش پر مامور کیا۔ آخرکار ٹوپی مل گئی، لوگوں نے اس معمولی ٹوپی پر اس غیر معمولی پریشانی کا سبب دریافت کیا، فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار عمرہ فرمایا اور سر منڈایا، لوگ سر مبارک کے بال حاصل کرنے کے لئے ٹوٹ پڑے، مجھے سامنے کے کچھ موئے مبارک ہاتھ آ گئے، جن کو میں نے اس ٹوپی میں سی لیا تھا اور میں آج تک کسی غزوہ میں اس ٹوپی کو پہن کر شریک نہیں ہوا کہ مجھے فتح نہ ہوئی ہو۔

۲۱ھ میں مدینہ طیبہ یا شہر حمص میں وفات پائی، اور وفات کے وقت حسرت سے فرماتے تھے کہ میں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر مواقع قتال کو تلاش کیا اور شریکِ جہاد ہوا، لیکن افسوس کہ آج چارپائی پر پڑ کر مر رہا ہوں۔ رضی اللہ عنہ وعنہم اجمعین۔

علم تجوید وقراءت

اما ابن کعب فی القراءۃ رتبۃ		فیھم ناضحی اقرء الاقران

حضرت ابی ابن کعب کا رتبہ تجوید وقراءت کے لحاظ سے بہت بلند تھا کہ وہ ہم عصروں میں سب سے بڑے قاری شمار ہوئے۔

حضرت ابی ابن کعب انصاری رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی اہل بدر میں سے ہیں، کنیت ابوالمنذر رہے۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ انھیں سید المسلمین فرمایا کرتے تھے۔ علماء وفقہاء صحابہ میں سے ہیں۔ حضرت مسروق نے انھیں بھی ان چھ مفتیوں میں سے شمار کیا ہے جن پر فتویٰ کا مدار تھا۔

فاروقِ اعظم عموماً حوادث ونوازل اور پیش آمدہ مسائل میں ان کی طرف رجوع فرماتے اور انھیں حکم تسلیم کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ارشاد فرمایا تھا کہ اے ابومنذر! علم مبارک

ہو، قراءت وتجوید میں آپ کا خاص پایہ تھا، اقرأ القوم ان کا لقب تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا کہ مجھے حق تعالیٰ نے امر فرمایا کہ میں تجھ پر قرآن کی قراءت کروں، کبھی آپ خود ہی ان سے قرآن سنانے کی فرمائش فرماتے اور جب یہ پڑھتے تو آپ رونے لگتے تھے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ان امراض میں جو ہمیں لگ جاتے ہیں ہماری کوئی منفعت ہے؟ ارشاد فرمایا کہ یہ گناہوں کا کفارہ ہوتے ہیں۔ حضرت ابی ابن کعب نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر چہ مرض حقیر اور خفیف ہی ہو؟ فرمایا اگر چہ ایک کانٹا بھی چبھ جائے، بلکہ اس سے بھی کم کوئی اذیت پہنچ جائے۔

اس پر حضرت ابی ابن کعب نے اپنے لئے دعا کی کہ مجھ سے بخار کبھی جدا نہ ہو مگر حج وعمرہ اور صلوٰۃ جماعت وغیرہ میں حارج بھی نہ ہو۔ یہ دعاء قبول ہوئی اور بخار ہر وقت رہنے لگا، بدن پر ہاتھ رکھنے سے دوسروں کو بخار کی گرمی محسوس ہوتی تھی، مگر اعمال وطاعات میں کبھی فرق نہیں پڑا۔

۲۰ھ میں اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔ رضی اللہ عنہ وعنہم اجمعین۔

علم تفسیر

اما ابن عباس فواحد عصره		فی کشفه لمعارف القراٰن

اور حضرت عبداللہ ابن عباس قرآن دانی اور علم تفسیر میں یکتائے زمانہ تھے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس ابن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ جلیل القدر اور کثیر المناقب صحابی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں، علم وفضل کے وفور کے سبب ان کا لقب حبر الامۃ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اپنے سینۂ مبارک سے لگا کر دعا دی تھی کہ اے اللہ! اسے حکمت عطا فرما۔ معانیٔ قرآن اور لطائف ونکات کلامِ ربانی میں ان کا پایہ نہایت بلند اور امتیازی تھا۔ اغیار بھی ان کے فضل وکمال کے قائل تھے، جب کہ آپ عبداللہ ابن ابی سرح کے ہمراہ افریقیہ کے غزوہ میں شریک ہوئے ہیں تو جرجیر ملک العرب نے ان سے فرمایا تھا کہ اے ابن عباس! حبر العرب

کہلائے جانے کے تم ہی تنہا مستحق ہو۔

ابوبکرہ فرماتے ہیں کہ ابن عباس بصرہ تشریف لائے تو ہم نے کمال اور جمال اور علم اور لباس اور حشمت میں ان سے بڑھ کر کسی عربی کو نہیں پایا۔ مسروق کہتے ہیں کہ میں جب ابن عباس کو دیکھتا تو کہتا کہ یہ اجمل الناس ہیں اور جب وہ بولتے تو میں کہتا کہ افصح الناس ہیں اور جب حدیث بیان کرتے تو کہتا کہ اعلم الناس ہیں۔ طویل القامت تھے بھاری بدن اور جسیم تھے، چمک دار اور سرخ وسفید چہرہ تھا جس میں ملاحت بھی تھی، سر کے بال کانوں کے نیچے رکھتے تھے جن پر مہندی کا خضاب فرماتے تھے۔ ابوحمزہ کہتے ہیں کہ ابن عباس جب بیٹھتے تھے تو دو آدمیوں کی جگہ گھیر لیتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور ان کے منہ میں اپنا لعاب مبارک ڈالا اور دعا دی تھی کہ اے اللہ ابن عباس کو دین کی سمجھ (تفقہ) عطا فرما اور تفسیر قرآن کی قوت عطا کر۔ اس دعا کا ظہور ہوا، اور تفسیر قرآن میں یکتائے زمانہ ہوئے۔

اعمش کہتے ہیں کہ میں نے صحابہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ ابن عباس بہترین ترجمانِ قرآن ہیں، بڑے بڑے صحابہ قرآنی مسائل ان سے حل کرتے تھے، فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ بایں جلالتِ شان وعلم مسائل قرآنیہ میں ان کی طرف رجوع فرماتے تھے، اور دربارِ خلافت میں انھیں ممتاز جگہ عطا فرماتے تھے۔

مہاجرین نے فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ آپ ہماری توقیر اور آؤ بھگت اتنی نہیں کرتے جتنی کہ ابن عباس کی کرتے ہیں (حالانکہ وہ ہم سے متأخر اور عمر میں کم ہیں)؟ فرمایا کہ ابن عباس ایسے نوجوان ہیں کہ عقل سے بھرا ہوا دل رکھتے ہیں، اور سوال کنندہ زبان رکھتے ہیں۔

حضرت زید بن ثابت سواری پر سوار ہوئے تو ابن عباس نے رکاب تھام لی، حضرت زید نے گھبرا کر فرمایا کہ اے ابن عم رسول اللہ! یہ آپ کیا کرتے ہیں؟ ایسا نہ کیجئے۔ فرمایا کہ ہمیں امر کیا گیا ہے کہ ہم اپنے علماء وکبراء کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کریں۔ اس پر حضرت زید نے ابن عباس کے ہاتھ چوم لئے اور فرمایا کہ ہمیں امر کیا گیا ہے کہ ہم اپنے رسول کے اہل بیت کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کریں۔ اس سے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تواضع اور اس کے ساتھ عظمت وجلالت واضح ہوتی ہے۔

حضرت عطاء فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مجلس سے بڑھ کر جامع مجلس نیز فقہ اور خشیت اللہ سے پرُ مجلس نہیں دیکھی۔ جامعیتِ مجلس کا یہ عالم تھا کہ ہر طبقے کے اہل کمال جمع ہوکر استفادہ کرتے تھے۔ اصحابِ فقہ، اصحابِ تفسیر، علماء، شعراء وغیرہم مجلس میں جمع ہوتے اور اپنے اپنے دائرہ میں آپ سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

مجاہد کہتے ہیں کہ علمی تبحر کی وجہ سے ابن عباس کا لقب بحرؔ پڑ گیا تھا، اعمش کہتے ہیں کہ ابن عباس نے موسم حج میں اس طرح تقریر فرمائی کہ آیاتِ قرآنیہ تلاوت فرماتے جاتے اور ساتھ ساتھ ان کی جامع تفسیر فرماتے جاتے تھے۔ میں دل میں کہہ رہا تھا کہ کاش یہ تقریر اہل روم وفارس سنتے تو یقیناً سب کے سب ایمان لے آتے۔

۶۵ھ میں بمقام طائف ۷۱ سال کی عمر میں وفات پائی، آپ کی وفات پر کہا گیا تھا کہ آج امت کا ربانی اٹھ گیا۔ جب جنازہ تیار ہو چکا تو سب کے سامنے ایک بہت بڑا سفید پرندہ کفن میں گھسا اور سما گیا، پھر نہ نکلا نہ اس کا پتہ چلا۔ دفن کے وقت ایک غیبی آواز سنی گئی کہ:

يَآاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ o ارْجِعِىْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً o فَادْخُلِىْ فِىْ عِبَادِىْ o وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ o رضى الله عنه وعنهم اجمعين۔

علم فرائض

حاز الفرائض علمها متفردًا		زيد بن ثابت ذا الكريم الشان

علم فرائض کو یکتائی کے ساتھ حضرت زید بن ثابت نے جمع کیا جو کہ کرامت کی شان رکھتے تھے۔

حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں، علماء وفقہاء صحابہ میں سے ہیں۔ یہ انہی چھ صحابہ میں سے ہیں جن کے فتویٰ پر امت کے سر جھک گئے تھے۔ کاتبِ وحی ہیں، رزم وبزم دونوں کے جامع ہیں۔ غزوات میں حضرتِ نبوی کے ساتھ جانبازی میں پیش پیش رہتے تھے اور ہر علمی مجلس کی رونق اور روشنی تھے۔

ثابت ابن عبید کہتے ہیں کہ میں نے زید بن ثابت سے زیادہ خانگی زندگی میں پرُ مذاق اور

ظریف اور مجلسی زندگی میں باوقار اور متین کسی شخص کو نہیں دیکھا۔ جنگِ یرموک میں تقسیم غنائم پر انھیں کو امیر مقرر کیا گیا تھا، غزوۂ خندق میں جھنڈا بھی انہی کے ہاتھ میں تھا، تیز طبع اور ذہین وذکی بلا کے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی قوم کو نامۂ مبارک لکھا جس کی زبان سریانی تھی اور عربی سے نابلد تھی، حضور نے زید بن ثابت سے یہ خطرہ ظاہر فرمایا کہ یہ قوم ناقابل اطمینان ہے کہیں میری تحریر میں کچھ گھٹا بڑھا دے یا کچھ کا کچھ کر دے۔ حضرت زید نے اشارہ پاتے ہی فوراً سریانی زبان سیکھنی شروع کر دی اور سات دن میں تکمیل کر کے سریانی کے ماہر ہو گئے۔

بڑے بڑے صحابہ ان کے فضل وکمال اور علم کی وجہ سے ان کی عظمت کرتے تھے۔ ایک دفعہ گھوڑے پر سوار ہو رہے تھے، ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بڑھ کر رکاب تھام لی، گھبرا کر فرمایا اے ابن عم رسول اللہ! ہٹ جایئے، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم اپنے علماء کبراء کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتے ہیں۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا وصفِ مخصوص علم اور خصوصاً علم فرائض کی مہارت ہے جس کی شہادت میں بارگاہِ نبوت کا ارشاد ہے:

افرضهم زيد بن ثابت.

سب سے زیادہ فرائض کے ماہر زید بن ثابت ہیں۔

قبیصہ فرماتے ہیں کہ زید بن ثابت مدینہ میں قضا اور فتویٰ اور قراءت میں امام اور رأسِ رئیس کہے جاتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دورِ خلافت میں جب کبھی سفر فرماتے تو حضرت زید بن ثابت کو سریرِ خلافت پر اپنا نائب اور قائم مقام بنا کر جاتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ امتِ محمدیہ کے محفوظین (اولیاء) حضرت زید کو راسخین فی العلم میں سے جانتے تھے۔

۴۳ھ میں وفات پائی ہے، ان کی وفات پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آج خیرِ امت دنیا سے اٹھ گیا اور شاید ان کی قائم مقامی ابن عباس فرما سکیں۔ ان کی وفات پر حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے مرثیہ لکھا ہے جس کا ایک شعر یہ بھی تھا:

فمن للقوافی بعد حسّان وابنه		ومن للمعانی بعد زيد بن ثابت

رضی اللہ عنه وعنهم اجمعين ورضوا عنه۔

علم الوعظ

حَسَنٌ بِبَصرة قدْ اقام مذكرا		فَغَدا فريدا ماله من ثانٍ

حسن بصری بصرہ میں تذکیر ووعظ کے لئے جو کھڑے ہوئے تو اس فنِ وعظ وپند اور تذکیر میں ایسے یکتا نکلے کہ کوئی ان کا ثانی نہ ہوا۔

ابوسعید حسن بصری رضی اللہ عنہ اجلہ تابعین میں سے ہیں، زہد وورع اور علم وعبادت میں یگانۂ روزگار ہوئے ہیں، ان کے والد حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے غلام تھے، جو عراق کے ایک ناحیہ میسان کے قیدیوں میں گرفتار ہو کر آئے تھے، اور ان کی والدہ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی منتخب باندی تھیں۔ جب کبھی ان کی والدہ کسی کام کو چلی جاتیں اور یہ روتے تو ام المومنین اپنی چھاتی انکے منہ میں دیدیتی تھیں اور اس سے دودھ آنے لگتا تھا، یہ پی کر چپ ہو جاتے۔ علماء لکھتے ہیں کہ ان کی یہ غیر معمولی فصاحت وبلاغت اور حسنِ تذکیر اسی دودھ کی برکت سے تھی۔

خلافتِ عمری کے آخری دو سال میں ان کی پیدائش مدینہ طیبہ میں ہوئی ہے، اور والدین کی غلامی ہی کی حالت میں ہوئی، خدا نے غلاموں کے زمرہ میں احرارِ عالم کا مولیٰ پیدا فرمایا، حسن وجمال اور بدن کے طول وعرض میں بھی فرد تھے۔ اصمعی فرماتے ہیں کہ میں نے اتنی چوڑی کلائی کسی کی نہیں دیکھی جتنی حضرت حسن کی تھی۔ اس کا چوڑان تقریباً ایک بالشت تھا۔

ان کے منتخب اوصافِ حمیدہ میں سے مخصوص وصفِ تذکیر وموعظت ہے جن کی فصاحت وبلاغت ضرب المثل ہوگئی تھی۔ ابوعمرو بن العلاء کہتے ہیں کہ میں نے حسن بصری اور حجاج بن یوسف سے زیادہ افصح انسان نہیں دیکھا، کہا گیا کہ ان میں کون زیادہ بلیغ تھا تو فرمایا کہ حسن بصری۔ ان کا کلام نہایت شیریں، بلیغ اور دل پذیر ہوتا تھا، عموماً حکمت کے کلمات بولتے تھے، جو جوامع الحکم کے مشابہ ہوتے تھے۔

ایک دفعہ عمر بن ہبیرہ فرازی نے (جو یزید بن عبدالملک کی طرف سے والیٔ عراق وخراسان تھا) حسن بصری، ابن سیرین اور شعبی کو بلایا اور یزید کی اطاعت وتسلیمِ خلافت کا ان کو امر کیا، ابن

سیرین اور شعبی نے تو کچھ ذومعنی الفاظ فرما کر جان چھڑالی، آخر میں والی نے حضرت حسن بصری سے کہا کہ آپ کیا فرماتے ہیں تو فرمایا:

یا ابن هبیرة خف اللّٰه فی یزید ولا تخف یزید فی اللّٰه ان اللّٰه یمنعك من یزید وان یزید لا یمنعك من اللّٰه.

اے ابن ہبیرہ! اللہ سے ڈر یزید کے بارہ میں، اور یزید سے مت ڈر اللہ کے بارہ میں۔ اللہ تجھے یزید سے تو روکتا ہے اور یزید تجھے خدا سے نہیں روکتا۔

ایک دفعہ فرمایا:

ما رأیت یقینا لا شك فیه اشبه ولا یقین فیه الا الموت.

میں نے نہیں دیکھا ایسا یقین کہ جس میں شک کا نشان نہ ہو مشابہ ایسے شک کے کہ جس میں یقین کا نام نہ ہو سوائے موت کے۔

اس بلاغت کی وجہ اوپر مذکور ہو چکی۔ رجب ۱۱۰ھ بصرہ میں وفات ہوئی ہے، حمید طویل کہتے ہیں کہ شب جمعہ میں وصال ہوا، بعد جمعہ نمازِ جنازہ ہوئی، شہر بصرہ کا کوئی بچہ بڑا شہر میں باقی نہ رہا کہ شریکِ جنازہ نہ تھا، حتیٰ نشاۃِ اسلام سے لے کر آج تک کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ شہر کی جامع مسجد میں عصر کی نماز نہ ہوئی، کیونکہ شہر خالی تھا۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ (من اخبار ابن خلکان)۔

القصص والتاریخ

وفریدھم قصصًا ھو ابن منبه		فی العصر وھو العالم الربانی

قصص و تاریخ قدیم میں وہب بن منبہ یکتائے روزگار اور ایک عالم ربانی تھے۔

وہب ابن منبہ یمانی، ان کا لقب صاحب الاخبار والقصص ہے۔ اگلوں کے واقعات قیامِ دنیا کی تاریخ، احوالِ انبیاء علیہم السلام اور سیر ملوک کی معرفت میں ان کو یدِطولیٰ حاصل تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے حق تعالیٰ کی نازل کردہ بہتّر (۷۲) کتابیں پڑھی ہیں۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے تلمیذ ہیں یہ ابناء میں سے شمار کئے جاتے تھے، ابناء ان فارسیوں کا لقب تھا جن کو بادشاہِ یمن سیف ابن ذی

یزن حمیری کی درخواست پر کسریٰ انوشرواں نے بطور کمک حبشیوں کی مقامت کیلئے یمن بھیجا تھا، وہ لوگ وہیں آباد ہوگئے، انھوں نے یمنیوں سے مناکحت کے تعلقات قائم کر لئے اور بالآخر یمن کی سلطنت انہی کے قبضہ میں آگئی۔ جب اسلام آیا اور اسکی دعوت پہنچی تو یہ لوگ اسلام میں داخل ہوگئے۔

پس ان فارسی الآباء اور یمنی الامہات کو ابناء کہا جاتا ہے، انہی میں سے وہب بن منبہ بھی ہیں، جلیل القدر تابعی ہیں۔ محرم ۱۱۰ھ صنعاء (یمن) میں نوّے سال کی عمر میں وفات پائی۔ رضی اللہ عنہ

تعبیر رؤیا

اما ابن سیرین فاعبر عصرہٖ		فالقول منہ فیہ ذواتقانٖ

ابن سیرین اپنے زمانہ کے سب سے بڑے معبر تھے، پس تعبیر خواب کے بارے میں ان کا قول نہایت ہی پکا قول ہے۔

ابن سیرین بصری، ان کے والد حضرت انس رضی اللہ عنہ کے غلام تھے۔ میسان سے پکڑے ہوئے آئے تھے، ان کی والدہ صفیہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی باندی تھیں، ابن سیرین فقہائے بصرہ میں سے تھے۔ بزازی کا کام کرتے تھے، تعبیر رؤیا میں مشہور تھے۔ ہاتھ کے ہاتھ ان کی تعبیر واقعات کی صورت میں ظاہر ہو جاتی تھی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے کاتب تھے، قرضہ کے سبب جیل بھیجے گئے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی اور انھوں نے وصیت فرمائی کہ ابن سیرین نمازِ جنازہ پڑھائیں، حاکم سے اجازت دلا کر ان کو بلوایا گیا، آئے اور نماز پڑھا کر بغیر گھر گئے ہوئے جیل ہی کو لوٹ گئے۔ ان کے شیوخ حضرت ابو ہریرہ، عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن الزبیر، انس بن مالک وغیرہ اجلہ صحابہ ہیں، اور خالد الحذاء، ایوب سختیانی وغیرہ ائمہ دین ان کے تلامذہ ہیں۔ جب وفات ہوئی تو تیں بیٹے ایک بیوی سے اور گیارہ بیٹیاں چھوڑیں، اور تیس ہزار درہم قرضہ چھوڑا، جو ان کے بیٹے عبد اللہ نے ادا کیا، اور جب عبد اللہ کی وفات ہوئی تو تین لاکھ درہم کی مالیت کا ترکہ انھوں نے چھوڑا۔ رحمہما اللہ تعالیٰ۔

علم التصوّف

وجنید القطب الزمان اما مهم		عَلَم التصوف كامل العرفان

اور حضرت جنید صوفی تصوف میں رأسِ رئیس اور معرفت کے استاذ گذرے ہیں۔

حضرت جنید رضی اللہ عنہ مشہور صوفی اور زاہد ہیں، ان کے آباء واجداد نہاوند کے رہنے والے ہیں، مگر خود ان کا مولد ومنشاء عراق ہے۔ شیخ وقت اور فرید عصر ہوئے ہیں، حقائق ومعارف ان کے مشہور ہیں۔ ایک واسطہ (ابوثور) سے امام شافعیؒ کے شاگرد ہیں، اس لئے فقیہ بھی زبردست تھے۔ اپنے ماموں حضرت سری سقطی رحمہ اللہ اور حارث محاسبی جیسے اجلہ مشائخ کی خدمت میں وقت گذارا ہے۔ ابو العباس ابن سُریج مشہور شافعی فقیہ حضرت جنید کی خدمت میں رہے ہیں، جب اصول وفروعِ دین میں کلام کرتے تھے تو حاضرین کو حیرت میں ڈال دیتے تھے، اور پھر خود ہی کہتے کہ تم جانتے ہو کہ میری یہ حقائق بیانی کہاں سے ہے؟ یہ سب پرتو ہے میرے شیخ جنید کی صحبت کا۔

حضرت جنید کو کسی نے خواب میں دیکھا کہ تسبیح لئے ہوئے ہیں تو عرض کیا کہ باوجود اس جلالتِ قدر کے پھر بھی آپ تسبیح نہیں چھوڑتے؟ فرماتے یہی تو راستہ تھا جس کے ذریعہ میں اپنے رب تک پہنچا، میں اسے کیسے چھوڑ دوں۔ وعظ نہیں فرماتے تھے، ان کے ماموں حضرت سری سقطی نے وعظ کے لئے فرمایا مگر نہ مانے، رات کو خواب میں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وعظ کا حکم فرمارہے ہیں تو صبح ہونے سے پیشتر ہی ماموں کے دروازہ پر پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا، ماموں نے آواز سنتے ہی کہا کہ آخر ہماری بات کو سچا نہ جانا جب تک کہلوا نہ لیا۔ فرماتے ہیں کہ مجھے کسی چیز نے اتنا نفع نہ دیا جتنا کہ چند اشعار نے جو ایک لڑکی گا رہی تھی اور وہ یہ ہیں۔

اذا قلتُ اهدى الهجرلى حلل البلى		تقولين لولاالهجر لم يطلب الحب
وان قلت هذا القلب احرقه الهوى		تقولى بنيران الهوى شرف القلب
وان قلت ما اذنيت قالت محيبة		حيائك ذنب لا يقاس به ذنب

۱۹۸ھ میں شنبہ کے دن اور بعض روایتوں میں جمعہ کے دن آخری ساعات میں وفات پائی، اور وفات کے وقت پورا قرآن ختم کیا ہے، اور دوسرا شروع کیا اور بقرہ کی ستر آیتوں پر پہنچ کر وفات ہوگئی۔ بغداد میں مقبرۂ شونیزیہ میں اپنے ماموں سری سقطی کے پاس دفن ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

علم المعرفت

وفضیل ن ابن عیاض البر التقی		قد کان اعبد عابدی الرحمٰن

اور فضیل ابن عیاض جو مشہور اہل خیر اور متقی ہیں، اللہ رحمٰن کے عبادت گذاروں میں سب سے بڑے عابد گذرے ہیں۔

ابوعلی فضیل ابن عیاض مشہور عابد وزاہد ولی ہیں، شجرۂ چشتیہ کے انتہائی افراد میں سے ہیں، عبادت وزہد میں شہرۂ آفاق ہوئے، اپنے اوائل دور میں زبردست ڈاکو تھے۔ ان کی ڈاکہ زنی سے سرخس اور بیورد کی درمیانی راہیں مسدود ہوگئی تھیں، اتفاقاً ایک لڑکی پر عاشق ہوگئے، کسی شب میں اس کی لڑکی کے مکان کی دیوار پر چڑھ رہے تھے کہ کسی قاری کی آواز کان میں پڑی جو یہ آیت تلاوت کر رہا تھا۔

اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَانَزَلَ مِنَ الْحَقِّ.

کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت اور نازل شدہ دین حق کے سامنے جھک جاویں۔

یہ صدا سنتے ہی چلا اٹھے کہ بلٰی یا رب قد اٰن (ہاں اے میرے پروردگار وہ وقت آگیا) اس مکان سے لوٹے اور رات ایک ویرانے میں بسر کی جہاں چند مسافر اور تھے، بعض کہتے تھے کہ کیسے چلیں فضیل ڈاکو لوٹ لے گا، تو حضرت فضیل ابن عباس نے اپنی توبہ کا ان سے اظہار کیا اور پھر کبارِ عباد وزہاد میں سے ہوئے۔

ایک دفعہ ہارون رشید نے کہا کہ اے فضیل! تو کیسا بڑا زاہد ہے۔ فرمایا کہ اے ہارون! تو زاہدوں سے بڑھ کر کتنا بڑا زاہد ہے کہ میں نے تو زہد فی الدنیا ہی اختیار کیا تھا اور تو نے زہد

فی الآخرت اختیار کرلیا۔ ابوعلی رازی کہتے ہیں کہ میں تیس برس فضیل کی صحبت میں رہا میں نے کبھی ان کو ہنستے یا تبسم کرتے ہوئے نہیں دیکھا، الآیہ کہ جس دن ان کے بیٹے کا انتقال ہوا تو ہنس رہے تھے، میں نے کہا یہ کیا؟ فرمایا کہ خدا نے یہ چیز پسند کی میں نے بھی اسے پسند کیا، حالانکہ یہ بیٹا جوان صالح اور کبارِ اہل اللہ میں تھا۔

عبداللہ ابن مبارک فرماتے ہیں کہ جب فضیل دنیا سے اٹھے حزنِ آخرت بھی اسی دن اٹھ گیا۔ حضرت فضیل فرمایا کرتے تھے جب حق تعالیٰ کسی سے محبت فرماتے ہیں تو اس کا غم بڑھ جاتا ہے اور جب کسی سے بغض فرماتے ہیں تو دنیاوی نعمتوں کا دروازہ اس پر کھول دیتے ہیں۔ سمرقند یا بیورد میں پیدا ہوئے، کوفہ میں حدیث سنی پھر مکہ مکرمہ میں چلے گئے اور بیت اللہ کے مجاور ہوگئے، یہاں تک کہ محرم ۱۸۷ھ میں وفات پائی، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

علم القراءۃ

هذا وانفعهم واقرء هم لهم		هو نافع بقراءة القرانِ

لوگوں کیلئے نافع اوران میں قراءتِ قرآن کو بہترین طریقہ پرادا کرنے والے امام نافع مدنی ہیں۔

ابورویم نافع ابن عبدالرحمٰن مدنی قرائے سبعہ میں سے ہیں۔ اہل مدینہ کے امام تھے اور فنِ قراءۃ میں قدوہ ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد طبقۂ ثالثہ میں ان کا شمار ہے۔ ابونعیم نے تاریخ اصبہان میں انھیں اصبہانی الاصل بتلایا ہے، رنگ نہایت سیاہ تھا، ابی میمونہ مولیٰ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے تلامذہ میں سے ہیں، ان کی قراءۃ کے دو مشہور راوی ورش اور قالون ہیں۔ امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ قراءۃ میں ان کے شاگرد تھے۔ ۱۶۹ھ میں بمقام مدینہ طیبہ وفات پائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

علم تاویل القرآن

تاویل اھل الحق و الایمان		ومقاتل قد سابق التاویل ای

اور مقاتل ابن سلیمان تفسیر قرآن میں بہت آگے ہیں، یعنی اہل حق کی تعبیر میں نہ کہ اہل باطل کی تاویل میں۔

تاویل اھل الجھل والخذلان		فمدارہ تاویل اھل العلم لا

ان کی تفسیر کا مدار اہل علم کی تاویل وتفسیر پر ہے نہ کہ اہل جہالت اور ذلت کی تاویلاتِ رکیکہ پر۔

مقاتل ابن سلیمان بلخی الاصل ہیں پھر بصرہ میں منتقل ہوئے ہیں اور پھر بغداد میں علم حدیث میں مشغول ہوئے۔ تفسیر قرآن میں ان کا شہرہ تھا۔ ان کی ایک مشہور تفسیر بھی ہے۔ مجاہد، عطا ابن ابی رباح ابواسحاق سبیعی، ضحاک ابن مزاحم اور محمد بن مسلم زہری انکے شیوخ میں سے ہیں۔ علماءِ اجلہ میں سے ہیں، زبردست مفسر ہیں، حتیٰ کہ امام شافعی رحمہ اللہ لوگوں کو تفسیر میں ان کی عیال فرماتے ہیں۔

حاضر جواب بہت تھے، ابوجعفر خلیفہ منصور ایک دفعہ اپنے قیصر میں بیٹھا تھا، اس پر ایک مکھی آکر بیٹھ گئی، اس نے اڑادیا، پھر آکر بیٹھ گئی، پھر اڑادیا، وہ چمٹ ہی گئی۔ منصور کو بہت ہی گھٹن ہوئی، کہا دیکھو کوئی باہر ہے؟ عرض کیا گیا کہ مقاتل ابن سلیمان ہیں۔ حکم دیا کہ بلالو، جب مقاتل آگئے تو منصور نے کہا آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مکھیاں کیوں پیدا فرمائی ہیں، کہا ہاں اس لئے کہ مکھیوں کے ذریعہ متکبروں کو ذلیل کرے، منصور چپ رہ گیا اور پھر نہ بولا۔

اسی حاضر جوابی کے زعم میں کبھی کبھی اس شیخ کو مجمعوں میں ساکت بھی ہونا پڑا ہے۔ ایک دفعہ دعویٰ کیا کہ عرش سے نیچے نیچے کے متعلق جو چاہو مجھ سے پوچھو، ایک شخص نے کہا کہ جب آدم علیہ السلام نے حج کیا تھا تو ان کا سر کس نے مونڈا ہوگا، سکوت کے بعد فرمایا کہ خیر یہ سوال تو تمہارے درجہ کا نہ تھا، لیکن حق تعالیٰ نے مجھے مبتلا فرمادیا تاکہ میرا عجب ٹوٹ جائے۔

ایسے ہی سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ اور ایسا ہی دعویٰ کیا کہ عرش سے نیچے نیچے کی بات جو چاہے مجھ سے پوچھے، ایک شخص نے کہا کہ چیونٹی کا معدہ آگے ہوتا ہے یا پیچھے، مقاتل چپ رہ

گئے اور کچھ جواب نہ دے سکے۔ سفیان کہتے ہیں کہ میرا گمان یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کے ادعاء کی سزادی، محدثین ان کے قائل نہیں، درجۂ روایت سے ساقط مانتے ہیں۔ ۱۵۰ھ میں بصرہ میں وفات ہوئی ہے، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

علم القصص

وتفرد الكلبي في قصص القرا		نِ فكان يرويه على الا تقان

اور کلبی قصصِ قرآن کی روایت میں یکتا گذرے ہیں۔ پس قصص کو نہایت ہی پکی روایتوں میں لاتے تھے۔

ابونصر محمد بن السائب الکلبی قصص قرآن، عام تفسیر اور علم نسب میں امام گذرے ہیں۔ سفیان ثوری اور محمد بن اسحاق ان کے تلمیذ ہیں۔ حدثنا ابوالنصر سے مراد ان کے نزدیک کلبی ہی ہوتے ہیں، نسب کے متعلق ان کی معلومات نہایت ہی وسیع تھیں، خود ہی کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ کوفہ میں ضرار بن عطارد کے پاس چلا گیا دیکھا کہ ان کے پاس ایک شخص بیٹھا ہے جس کو میں بجز اس کے اور کیا کہوں کہ گویا ایک لانبا چوہا ہے کہ بَل کھا رہا ہے (اور وہ فرزدق مشہور شاعر تھا جس کو میں نہ جانتا تھا)۔ ضرار نے مجھے آنکھ کے اشارہ سے کہا کہ اس سے (فرزدق سے) اس کا نام ونسب پوچھ، میں نے کہا آپ کس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں، اس نے (فرزدق نے) کہا کہ آپ ہی بتلایئے آپ بڑے نساب مشہور ہیں۔ میں بنی تمیم کا ایک شخص ہوں، میں نے بنی تمیم کا نسب نامہ پڑھنا شروع کیا، جب میں پڑھتے پڑھتے غالب کے نام پر پہنچا جو فرزدق کے باپ کا نام تھا اور پھر میں نے کہا کہ غالب سے ایک بیٹا ہوا جس کا نام ہمام تھا (وہ فرزدق کا نام تھا) تو فرزدق ایک دم سیدھا ہو بیٹھا اور کہا خدا کی قسم میرے والدین نے میرا نام ہمام نہیں رکھا نہ کوئی ساعت دن کی ایسی آئی کہ میرا یہ نام ہو، میں نے کہا کہ خدا کی قسم میں تو اس دن کو بھی جانتا ہوں جس میں تیرا نام فرزدق رکھا گیا ہے۔ اس نے کہا وہ کونسا دن ہے، میں نے کہا کہ جس دن تیرے باپ نے تجھے ایک کام کے لئے بھیجا تھا اور تیرے دوش پر ایک لمبی آستینوں کا جبہ تھا، اس بے ہیئت جبہ کو دیکھ کر تیرے باپ نے کہا تھا کانك فرزدق

دهقان قرية قد سما ها بالجبل ۔

فرزدق نے کہا واللہ سچ کہتے ہو، محمد کلبی کی وفات ۱۴۶ھ میں کوفہ میں ہوئی، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

علم الفقہ

والفقـه فيـه ابو حنيفة فردهم		فی جودة الرای البديع الشان

اور فقہ تو بس قیاس ودرایت کی خوبی اور اپنی شان کی ندرت میں ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کا فقہ ہے۔

مشہور اور جلیل القدر امام ہیں، آج دنیا میں کروڑوں نفوس ان کے فقہ پر چل رہے ہیں۔ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے ہیں، علم، عمل زہد، ورع، تقویٰ، خشوع، خشیت اور تضرع وزاری میں یکتا ہوئے۔ یزید بن الکمیت کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ خوف وخشیتِ الٰہی میں حظِ وافر رکھتے تھے۔

ایک دفعہ عشاء کی نماز میں علی بن حسین نے اذا زلزلت پڑھی، امام صاحب بھی پیچھے نماز میں تھے، جب نماز ہو چکی تو میں نے دیکھا کہ امام ابوحنیفہ مضطرب وپریشان ہیں اور سانس اکھڑا ہوا، میں چلا گیا جب میں صبح کو آیا تو مسجد میں اسی حالت میں امام صاحب کو دیکھا اور یہ دیکھا کہ کھڑے ہوئے ہیں اور اپنی داڑھی پکڑ رکھی ہے اور کہہ رہے ہیں کہ اے ذرہ برابر خیر کا بدلہ خیر سے دینے والے، اور اے ذرہ برابر شر کا بدلہ شر سے دینے والے اپنے بندے نعمان کو جہنم سے بچالے اور جہنم تک پہنچانے والے اعمال سے اپنی پناہ میں رکھ۔

اسد بن عمرو کہتے کہ امام نے چالیس برس صبح کی نماز عشاء کی وضو سے پڑھی، تمام رات ایک رکعت میں پورا قرآن ختم فرماتے اور اتنا روتے اور بلبلاتے تھے کہ ان کے رونے کی آواز پر پڑوسیوں کو رحم آتا تھا۔ جس موضع میں وفات ہوئی ہے اس میں ستر ہزار قرآن ختم فرمائے ہیں۔ آخر عمر میں کامل تیس برس روزہ سے گذارے، حسین وجمیل اور وسیط القامت تھے، کلام نہایت دل پذیر، آواز نہایت سریلی اور مجلس نہایت پاکیزہ اور جاذبِ توجہ تھی۔

بزاز تھے، ریشمین کپڑوں کی تجارت پر گذر اوقات فرماتے تھے، فقہ اور درایت وقیاس میں امتِ اسلامی میں ان کا خاص پایہ ہے، اور بے نظیر شان رکھتے ہیں۔ یحیٰی ابن معین فرماتے ہیں کہ

میرے نزدیک قراءت تو حمزہ کی ہے اور فقہ ابوحنیفہ کا ہے اور اسی پر میں نے لوگوں کو پایا ہے۔ حرملہ ابن یحییٰ امام شافعی رحمہ اللہ کا مقولہ یہ بیان کرتے ہیں کہ تمام انسان پانچ لوگوں کی عیال ہیں پانچ چیزوں میں۔ جس نے فقہ میں تبحر پیدا کیا وہ تو ابوحنیفہ کے عیال میں ہے، کیونکہ ابوحنیفہ کو فقہ کی توفیق دی گئی تھی، اور جس نے شعر میں تبحر پیدا کیا وہ زہیر بن ابی سلمیٰ کے عیال میں سے ہے اور جو مغازی میں تبحر بننا چاہے وہ محمد بن اسحاق کے عیال میں سے ہے، اور جو نحو میں تبحر بنا وہ کسائی کے عیال میں داخل ہے، اور جو تفسیر میں تبحر بنے وہ مقاتل بن سلیمان کے عیال میں ہے (نقلہ الخطیب فی تاریخہ)۔

گویا یہ پانچ انسان مذکورہ پانچ فنون میں بمنزلہ باپ کے ہیں، اور سارے انسان ان فنون میں ان کی اولاد ہیں، رحمہم اللہ تعالیٰ۔ **کشف المحجوب** میں ہے کہ امام یحییٰ بن معاذ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کو کہاں ڈھونڈوں؟ فرمایا کہ ابوحنیفہ کے علم میں مجھے تلاش کرو۔ جعفر بن ربیع کہتے ہیں کہ میں پانچ برس امام ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر رہا میں نے اتنا کم گو اور کثیر السکوت کسی کو نہیں پایا، ہاں جب فقہ کا کوئی سوال کیا جاتا تو امام صاحب کھل پڑتے اور سیل وادی کی طرح بہہ پڑتے۔ رجب ۱۵۰ھ میں بغداد میں وفات ہوئی ہے، اور ۴۵۹ھ میں ان کے مزار پر بادشاہ الپ ارسلاں کے زمانہ میں ابوسعد محمد بن منصور نے قبہ بنوایا اور اس کے نزدیک ایک عظیم الشان مدرسہ بنایا جس میں فقہ حنفی کی تعلیم دی جاتی تھی، جب یہ عمارات بن چکیں اور اپنے اعیان کے جلو میں بانیٔ موصوف معائنہ کے لئے آیا تو ابوجعفر مسعود شاعر جو بیاضی کے نام سے مشہور تھا سامنے آیا اور اس نے یہ قطعہ پڑھا۔

الم تر ان العلم کان مبدّدا		فجمعه هذا المغيّب فی اللحد
كذلك كانت هذه الارض ميتة		فانشرها فعل العميد ابی سعد

معرفت الحدیث

والشافعی من الا ئمة کان فی		فقه الحدیث مسلّم الاقران

ائمہ کرام میں سے امام شافعی رحمہ اللہ حدیث کے احوال و کیفیات سمجھنے کے علم میں یکتائے روزگار تسلیم کئے جا چکے ہیں۔

امامِ جلیل اور حبرِ نبیل ہیں، کثیر المناقب اور فریدِ عصر ہوئے ہیں، علماء نے ان کی ثقة وعدالت اور نزاہت وامانت، زہد وورع، حسن سیرت، علو قدر اور عفتِ نفس پر اتفاق کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل نے اپنے بیٹے عبداللہ سے خطاب فرمایا کہ بیٹا امام شافعی ایسے ہیں جیسے عالم کے لئے آفتاب اور بدن کے لئے عافیت، پس بتلاؤ کہ ان دونوں چیزوں کی کیا نظیر ہے اور کون چیز ان کا بدل ہو سکتی ہے۔ امام محمد بن حسن شیبانی ان کی سب سے زیادہ تعظیم وتکریم فرماتے تھے، علم حدیث اور اس کے متعلقات نیز تفقہ میں ان کا عظیم پایہ ہے۔

کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ، کلامِ صحابہ، آثارِ سلف اور اختلافِ اقاویلِ علماء، پھر معرفتِ کلامِ عرب، لغت وعربیت اور شعر وغیرہ میں علم عمیق حق تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ میں حدیث کے ناسخ ومنسوخ کو ہرگز نہ جان سکتا اگر امام شافعی کی مجلس میں نہ بیٹھتا۔ پندرہ سال کی عمر میں اس درجہ پر پہنچ گئے تھے کہ لوگ آپ سے استفسار کرنے لگے، اصولِ فقہ کی بنیاد فن کی شکل میں سب سے پہلے امام شافعیؒ نے رکھی، کثرت سے یہ دعاء کرتے تھے: **اللّٰهم یا لطیف اسئلك اللطف فیما جرت به المقادیر.** تواضع اور خاکساری کا یہ عالم تھا کہ خود اپنا ہی یہ شعر پیش نظر رہتا تھا۔

کلما ادبنی الدهر ارانی نقص عقلی

واذا ما ازددت علما زادنی علما بجهلی

مستجاب الدعوات مشہور تھے، اور ان کے فضائل شمار سے زیادہ ہیں۔ ۱۵۰ھ میں شہر صخرہ میں پیدا ہوئے، دو سال کی عمر میں مکہ مکرمہ لائے گئے، وہیں سن شعور کو پہنچ کر قرآن کریم پڑھا اور پھر تحصیل

علم کے لئے امام مالک بن انس کی طرف مدینہ کا سفر فرمایا، موطا حفظ سنایا اور امام مالک سے یہ بشارت حاصل کی کہ اگر کوئی فلاح کو پہنچنے والا ہے تو یہ لڑکا ہے۔ ۱۹۵ھ میں بغداد تشریف لائے، دوسال ٹھہر کر پھر مکہ مکرمہ واپس ہوئے، پھر ۱۹۸ھ میں بغداد واپس ہوئے، ایک ماہ ٹھہر کر پھر ۱۹۹ھ میں مصر پہنچے اور یہیں مقیم ہوگئے، یہاں تک کہ رجب آخری جمعہ ۲۰۴ھ میں بعمر ۵۵ سال انتقال فرمایا اور اسی دن بعد العصر قرانت الصغری (مقبرہ) میں دفن ہوئے۔ مقطع کے قریب مزار ہے، آج تک زیارت گاہ بنا ہوا ہے۔

ہلال ابن شعبان فرماتے ہیں کہ میں نے امام شافعی کو بعد وفات خواب میں دیکھا، میں نے پوچھا کہ اے ابوعبداللہ! حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ فرمایا کہ مجھے حق تعالیٰ نے ایک سونے کی کرسی پر بٹھلایا اور مجھ پر موتی نچھاور کئے۔ **رحمہ اللّٰہ تعالیٰ ورضی عنہ واسکنہ الفردوس فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر. آمین۔**

علم حدیث

من کان أعلم دھرہ ھومالك		نشر العلوم بسائرا لمدان

اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم امام مالک تھے، جنھوں نے تمام بلادِ اسلامیہ میں علوم کو پھیلایا۔

مالک ابن انس امام دارالہجرۃ، ائمہ اعلام میں سے ہیں۔ ۹۵ھ میں تین برس ماں کے پیٹ میں رہ کر پیدا ہوئے، سن شعور کو پہنچ کر اجلہ تابعین سے علم حاصل کیا، ربیعہ اور نافع مولیٰ ابن عمر کے خاص تلمیذ ہیں، اور امام اوزاعی، یحییٰ ابن سعید جیسے علماء ان کے تلامذہ ہیں، خود امام مالک نے اپنی ایک خصوصیت یہ بیان فرمائی ہے کہ جس جس سے میں نے علم حاصل کیا ان میں سے کوئی ایسا نہیں رہا کہ اس نے پھر مجھ سے فتوے نہ لئے ہوں، اور مجھ سے علم حاصل نہ کیا ہو۔ **سبحان اللّٰہ وذٰلك فضل اللّٰہ۔**

ابن وہب فرماتے ہیں کہ میں نے مدینہ میں یہ منادی سنی ہے کہ مدینہ میں مالک ابن انس اور ابن ذئب کے سوا کوئی فتویٰ نہ دیا کرے۔ امام ہمام علم کی تعظیم وادب میں بھی فرد ہوئے ہیں، جب

حدیث کا بیان کرنے کا ارادہ فرماتے تو وضو فرماتے، پھر مسند کے صدر پر بیٹھتے، داڑھی میں کنگھی کرتے اور پھر نہایت ہی وقار وہیبت اور سکون وتمکنت کے ساتھ حدیثِ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کا بیان فرماتے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ آپ ہر دفعہ ایسا تعب کیوں برداشت فرماتے ہیں؟ فرمایا کہ میں احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کرتا ہوں اور بلا طہارت احادیث بیان کرنا مجھے ناگوار ہے۔ راستہ چلتے ہوئے یا کہیں کھڑے ہوئے یا گھبراہٹ وعجلت میں کبھی حدیث نہیں بیان فرماتے تھے، ادب اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ مدینہ کے سکان میں تھے مگر کبھی سواری پر نہیں ہوتے تھے، حالانکہ کبرسنی کی وجہ سے ضعیف تھے اور فرماتے کہ اس مدینہ میں میں کیسے سوار ہوؤں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک مدفون ہے۔

حق گوئی کی حالت یہ تھی کہ ۱۴۷ھ میں ایک ایسے فتویٰ پر جو سلطانِ وقت کی غرض کے موافق نہ تھا ستر کوڑے اس بڑھاپے میں کھائے مگر بات حق ہی فرمائی۔ یہ سب **اعلم دھر** ہونے کے ثمرات تھے، ربیع الاول ۱۷۹ھ میں بعمر ۸۴ برس وفات فرمائی اور مدینہ طیبہ کے مبارک قبرستان بقیع میں دفن ہوئے، رحمہ اللہ۔ سرخ وسپید رنگ تھا، ڈیل ڈول کے آدمی تھے، سامنے سے سر کے بال اڑے ہوئے تھے، کپڑا نہایت پاکیزہ عدنیہ استعمال کرتے تھے۔ واللہ اعلم

عمل بالسنۃ

والمقتفی سنن النبی فاحمد		للّٰہ درّك من امام زمانٖ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن پر چلنے والے تو بس امام احمد تھے، خدا بھلا کرے اس امامِ وقت کا۔

امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ ائمہ اربعہ میں سے ہیں، صاحبِ مذہب ہیں، ان کی والدہ مرو سے بغداد آئی ہیں اور یہ بطن مادر میں تھے۔ بغداد میں ربیع الاول ۱۶۴ھ میں ان کی ولادت ہوئی، امام المحدثین تھے۔ امام ہمام بخاری اور امام مسلم ان کے شاگرد تھے، اور یہ خود امام شافعی کے شاگرد تھے۔

امام شافعی کے مصر چلے جانے تک برابر انہی کی خدمت میں رہتے تھے، امام شافعی نے مصر

روانہ ہوتے ہوئے فرمایا کہ میں بغداد جارہا ہوں اور میں نے کوئی خلف امام احمد سے زیادہ اتقی اور افقہ نہیں چھوڑا۔امام موصوف ایک لاکھ حدیث کے حافظ تھے، اپنی کتاب مسند احمد میں وہ وہ احادیث جمع فرمائی ہیں جن کی جمع کا دوسروں کو کم اتفاق پڑا ہے۔ ثابت قدمی ،حق گوئی، اتباعِ سنت اور اقتفائے آثارِ سلف میں بے نظیر تھے۔فتنۂ خلقِ قرآن میں امام ہی کا استقلال تھا کہ روزانہ کوڑے کھاتے اور خلقِ قرآن کا ہرگز اقرار نہ فرماتے۔ ۲۲۰ھ میں رمضان کے عشرۂ آخر میں بحالتِ صوم کوڑے لگائے جاتے تھے اور امام حق واتباعِ سلف ہی کو اپنے لئے راحت سمجھتے اور اس اذیتِ جسمانی کی پرواہ نہ فرماتے تھے۔

خوبصورت اور حسین وجمیل تھے۔۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ کو بغداد میں بعمر ۷۷ سال وفات ہوئی، اور مقبرۂ باب الحرب میں دفن ہوئے۔قبر مشہور اور زیارت گاہ ہے، مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کے جنازہ میں آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں شریک ہوئیں۔ابن جوزی نے بشر حافی رحمہ اللہ کے تذکرہ میں نقل کیا ہے کہ ابراہیم حربی نے بشر حافی کو خواب میں دیکھا کہ وہ مسجد اصافہ سے نکل رہے ہیں اور ان کی آستین میں کوئی چیز ہے جو ہل رہی ہے، میں نے کہا آپ کے ساتھ حق تعالیٰ نے کیا معاملہ فرمایا؟ فرمایا کہ مجھے بخش دیا اور میرا اکرام فرمایا۔میں نے کہا کہ یہ آپ کی آستین میں کیا چیز ہل رہی ہے؟ کہا کہ آج کی رات احمد بن حنبل کی روح یہاں عالمِ بالا میں پہنچی تھی اس پر موتی اور یاقوت نچھاور کئے گئے تھے، میں نے بھی چن لئے ، یہ آستینوں میں وہی ہیں۔رحمہ اللہ

امام احمد نے دو بیٹے زبردست عالم چھوڑے صالح اور عبداللہ۔صالح اصبہان کے قاضی ہوئے اور رمضان ۲۶۶ھ میں وفات پائی اور عبداللہ کی عمر دراز ہوئی ، انھوں نے ۲۹۰ھ اتوار کے دن جمادی الاولیٰ میں انتقال فرمایا۔رحمہم اللہ تعالیٰ

علم معرفت العلل

وکذا علی ابن المدینی فی العلل		فی عصرہ اضحی وحید زمان

ایسے ہی علی ابن مدینی عللِ حدیث کے علم میں اپنے زمانہ کے فرد اور یکتا ہوئے ہیں۔

علی ابن عبداللہ ابن المدینی مشہور محدث ہیں، ۱۶۲ھ میں بمقام بصرہ پیدا ہوئے۔ فنِ حدیث میں حدِ کمال کو پہنچے ہیں۔ نسائی نے ان کو ائمہ حدیث میں شمار کیا ہے، خود بڑے بڑے ائمہ حدیث مثل امام بخاری، ابوداؤد سجستانی، احمد بن حنبل وغیرہ ان کے تلامذہ میں سے ہیں، اکابر محدثین مثل حماد بن زید، سفیان ابن عیینہ، یحییٰ ابن سعید قطان، عبداللہ ابن وہب جیسے حضرات ان کے شیوخ ہیں، جن سے فنِ حدیث حاصل کیا ہے۔ حدیث اور معرفتِ عللِ حدیث میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔

امام احمد ابن حنبل تعظیم کے سبب ان کا نام نہیں لیتے تھے بلکہ کنیت سے یاد کرتے تھے، ان کے اساتذہ وشیوخ کو ان پر ناز تھا۔ حضرت سفیان ابن عیینہ باوجود استاذ ہونے کے فرماتے ہیں کہ لوگ مجھے علی ابن مدینی کی محبت میں ملامت کرتے ہیں حالانکہ جتنا علم ابن مدینی نے مجھ سے پڑھا ہے اس سے کہیں زیادہ خود میں نے ان سے حاصل کیا ہے۔ کبھی فرماتے کہ علی ابن مدینی نہ ہوں تو میں علمی مجلس منعقد نہ کروں، مجلس سے جب کبھی ابن مدینی اٹھ کھڑے ہوتے تو حضرت سفیان بھی کھڑے ہوکر مجلس برخاست فرمادیتے اور کہتے کہ جب لشکر میں سے سوار اٹھ گئے تو ہم پیادوں کے ساتھ نہیں بیٹھتے۔ علی ابن مدینی نے خواب دیکھا تھا کہ ثریا ستارہ نیچے اتر آیا ہے اور میں نے اسے پکڑ لیا، ابوقدامہ نے تعبیر دیتے ہوئے کہا کہ خدا نے علی کا خواب سچا کردیا ان سے فنِ حدیث کو وہ عروج ہوا کہ اس دور میں دوسروں سے کم ہوا ہے۔

لوگ ابن مدینی کی ہر حرکت وسکون پر گرویدہ تھے اور اس کی اقتدا کرتے تھے، ان کا قیام وقعود، لباس ومعاشرت اور ہر قول وفعل لکھا جاتا اور اس کی تقلید کی جاتی۔ جب بغداد آتے تھے تو مجلس میں بڑے بڑے اہل کمال ائمہ دین مثل یحییٰ ابن معین، احمد بن حنبل اور معیطی وغیرہ جمع ہوتے اور علمی مذاکرہ کرتے، جب کسی امر میں اختلاف پڑ جاتا تو علی ابن مدینی زبان کھولتے اور ناطق فیصلہ کرتے تھے، دیکھا گیا کہ علی ابن مدینی لیٹے ہیں اور احمد بن حنبل دائیں جانب اور یحییٰ بائیں جانب بیٹھے ان سے حدیث کی املاء کررہے ہیں۔

امام بخاری سے پوچھا گیا کہ آپ کی دلی خواہش کیا ہے؟ فرمایا یہ ہے کہ میں عراق میں ہوں، علی ابن مدینی زندہ ہوں اور میں ان کا مجلس نشین رہوں، اور فرمایا کہ میں نے اپنے نفس کو کسی کے

سامنے حقیر اور کم نہیں سمجھا بجز علی ابن مدینی کے۔ فریابی سے یحییٰ ابن معین، احمد بن حنبل، ابوخیثمہ اور علی ابن مدینی کے بارہ میں سوال کیا گیا تو کہا کہ علی ابن مدینی تو حدیث اور علل میں اعلم ہیں، یحییٰ ابن معین رجال اور جرح وتعدیل میں اعلم ہیں، احمد بن حنبل فقہِ حدیث میں اعلم ہیں اور ابوخیثمہ بڑے لوگوں میں سے ہیں۔ نووی نے فرمایا کہ علی ابن مدینی نے فنِ حدیث میں دوسو تصنیفیں کی ہیں اور بخاری نے ۳۰۳ حدیثیں ان سے لی ہیں۔

حق گوئی اور نہی عن المنکر میں شمشیر برہنہ تھے، فتنۂ خلقِ قرآن کے بارہ میں جب کہ کلمۂ حق زبان سے نکالنا اپنی جان نکال دینے کا مرادف تھا، برسر منبر علانیہ فرمایا کہ جو شخص قرآن کو مخلوق خیال کرے وہ کافر ہے اور جو رویتِ الٰہی کا منکر ہو وہ کافر ہے اور جو کلامِ الٰہی کا موسیٰ علیہ السلام سے منکر ہو وہ کافر ہے۔ ذیقعدہ ۲۳۴ھ میں ۷۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

(تہذیب التہذیب جلد ۷)

علم الخلافیات

علم الخلاف امامه وزعیمه		هو ابن نصر السابق الاعیان

مذاہبِ سلف کے علم میں امام اور اس کے ذمہ دار ابن نصر تھے جو اعیان پر گوئے سبقت لے گئے۔

ابوعبداللہ محمد ابن نصر مشہور محدث اور فقیہ گذرے ہیں۔ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے، یحییٰ ابن یحییٰ، امام اسحاق ابن راہویہ اور یزید بن صالح جیسے اکابر محدثین اور ائمۂ حدیث سے سندِ حدیث حاصل کی، مذاہبِ صحابہ وتابعین اور ان کے اختلافی مسائل میں اعلم الناس تھے، مختلف فیہ مسائل میں ہر ہر مسئلہ کے اجماعی اور اختلافی حصہ کو پورے امتیاز کے ساتھ پہچانتے تھے۔

ابومحمد ابن حزم فرماتے ہیں کہ صحابہ کے بعد مسائل کے اجماع وخلاف کا جاننے والا ابن نصر مروزی سے زیادہ کوئی نہ تھا، حاکم فرماتے ہیں کہ اپنے وقت میں بلا اختلاف امام المحدثین تسلیم کئے گئے ہیں، ساتھ ہی نقاہت میں بلند پایہ تھا، بقول ابوبکر صیرفی کے اگر محمد ابن نصر اپنی صرف ایک ہی تصنیف کتاب القامت چھوڑتے تو وہ ہی ان کے تفقہ کی کافی شہادت تھی، چنانچہ خراسان میں یحییٰ

کے بعد محمد بن نصر سے بڑھ کر کوئی فقیہ نہیں ہوا، اور ظاہر ہے کہ ملکۂ تفقہ و اجتہاد کے لئے مذاہبِ سلف کی کامل واقفیت جزءِ اعظم ہے، جیسا کہ شعر گوئی کے لئے کلامِ شعراء کا پیش نظر ہونا لابدی ہے اور مذاہبِ سلف کی واقفیت ان کے خلاف و اجماع کا وسیع علم ابن نصر کا مخصوص فن تھا اس لئے تفقہ میں ان کا یدِ طولیٰ رکھنا ایک قدرتی امر تھا۔

ابن عبد الحکم فرماتے ہیں کہ محمد ابن نصر جب کہ مصر میں بھی امام تسلیم کئے جاتے تھے جو علماء کا مرکز و مخزن تھا تو خراسان میں کس طرح ان کی امامت قابل تسلیم نہ ہوتی، امامِ موصوف کا ذریعۂ معاش تجارت تھا، تجارت مضاربت کے ساتھ کرتے تھے، یعنی روپیہ اپنا ہوتا تھا اور عمل کسی ایک شریک کا، تاکہ خود علم کی خدمت کے لئے فارغ رہیں، اکثر تجارتی سفر بھی فرماتے تھے، چنانچہ ۲۶۰ھ میں جب کہ عمر بھی خاصی ہو چکی تھی ایک تجارتی سفر نیشا پور کا فرمایا، اور وہاں کچھ عرصہ قیام کر کے ۲۷۵ھ میں سمرقند تشریف لائے۔

علم کے ساتھ عبادت و عمل میں بھی ممتاز شان تھی، ابوبکر ضبعی فرماتے ہیں کہ میں نے محمد ابن نصر سے زیادہ خوش ادا اور مطمئن نماز پڑھتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا، اور ہم سب ان کے حسنِ صلوٰۃ اور استغراق پر متعجب ہوتے تھے۔ نماز میں ٹھوڑی اپنے سینے پر رکھ کر کھڑے ہو جاتے اور اس درجہ ساکن قیام فرماتے کہ گویا ایک چوبِ خشک ہے جس میں کوئی حرکت نہیں۔

ایک دفعہ نماز میں ان کی پیشانی پر تتیہ آ بیٹھا اور اس نے اس درجہ نیش زنی کی کہ پیشانی سے خون بہہ پڑا مگر امام موصوف کو ذرا بھی جنبش نہ ہوئی، امام نہایت خوبصورت اور وجیہ تھے، ان کا سرخ سپید چہرہ دیکھ کر کہا جاتا تھا کہ گویا چہرے میں انار کا رنگ بھر دیا گیا ہے، والئ خراسان اسمٰعیل ابن احمد چار ہزار درہم سالانہ پیش کیا کرتا تھا، اور اسی قدر اس کا بھائی اسحاق اور پھر اسی مقدار میں اہل سمرقند سال بھر میں نذر کرتے تھے، لیکن امام موصوف اس بارہ ہزار درہم کی پوری رقم کو فقراء و مساکین پر اور فی سبیل اللہ صرف فرما دیتے اور لوگوں کے عرض کرنے پر فرماتے کہ میری روزی تو میرے شہر میں ہے (یعنی تجارت کا کسب کرتا ہوں) اور میرے کپڑوں اور کاغذوں کا سالانہ صرفہ بیس درہم سے زائد نہیں (جو اسی سے نکلتا رہتا ہے) پھر اس رقم کو ذخیرہ کرنا نہ صرف فضول ہی ہے بلکہ بے کار اپنے سے

فنا بھی کر دینا ہے۔

علم وعمل اور زہد وقناعت کے ساتھ صاحبِ کرامات بھی تھے، خود ہی فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنی ایک مملوکہ باندی کے ساتھ مکہ کا سفر کر رہا تھا، راستہ میں غرقابی کا حادثہ پیش آیا، میرے بھی دو ہزار جزو مکتوبات کے غرق ہوگئے، اور میں اس باندی سمیت ایک ایسے جزیرہ میں پہنچ گیا جہاں نہ کسی آدم زاد کا نشان تھا نہ دانہ پانی کی کوئی نمود تھی، میں پیاس کی شدت سے بیتاب تھا اور جاں بلب ہوگیا، آخر کار پانی سے مایوس ہو کر اپنی باندی کی ران پر سر رکھ کر لیٹ گیا اور مرنے کے لئے مستعد ہو کر موت کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک اسی ویرانے میں سے ایک شخص سرد پانی کا کوزہ لے کر آیا اور مجھے پلا کر چلا گیا، میں نہیں جانتا کہ وہ کون تھا اور کہاں سے آیا اور کس طرح پہنچا۔

اسی طرح ایک دفعہ امام موصوف والیٔ خراسان اسمٰعیل ابن احمد کے اجلاس میں جب کہ وہ مقدمات فیصل کر رہا تھا کسی ضرورت سے تشریف لے گئے، والی تعظیم کے لئے اپنے تخت سے کھڑا ہوگیا، جب امام واپس ہوئے تو والی کے بھائی اسحٰق نے ناگواری سے کہا کہ کیا آپ رعیت کے ایک آدمی کی خاطر بر سر دربار کھڑے ہو کر سلطانی رعب کو پامال کرنا چاہتے ہیں؟ والیٔ موصوف خاموش ہوگیا، شب کو اس والی نے خواب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ فرما رہے ہیں کہ اے اسمٰعیل! تیرا اور تیری اولاد کا ملک باقی رہے گا کہ تو نے محمد ابن نصر کی تعظیم کی اور تیرے بھائی کا ملک زائل ہو جائے گا کہ اس نے محمد بن نصر کی تحقیر کی۔

محدثین میں چار محمد ''محمدین اربعہ'' کے نام سے مشہور ہیں، جن میں سے ایک محمد ابن نصر ہیں اور بقیہ محمد ابن جریر طبری، محمد ابن منذر اور محمد ابن خزیمہ ہیں۔ ابن کثیر محدث اپنی تاریخ میں فرماتے ہیں کہ یہ ''محمدین'' دیارِ مصریہ میں کتابتِ حدیث کے لئے جمع ہوئے، سامانِ خورد ونوش بقدرِ قوت بھی کسی کے پاس نہ تھا، باہم مشورہ ہوا کہ قرعہ اندازی کر کے ایک شخص کو متعین کیا جائے کہ وہ سب کے لئے معاش کا کوئی سامان کرنے کی تدبیر وعمل کرے۔ چنانچہ (امام موصوف کا نام نکلا) یہ وقت دوپہر کا تھا، جب کہ سب قیلولہ کے لئے تیار تھے، محمد ابن نصر نے بجائے کسی ظاہری تدبیر کے حقیقی تدبیر شروع کی، نماز کی نیت باندھ لی اور سرِ نیاز جھکا کر حق تعالیٰ سے اپنا اور اپنے رفقاء کا رزق مانگنا شروع

کیا۔ اِدھر تو امام دعاء میں مشغول تھے اُدھر والیٔ مصر نے خواب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ فرمار ہے ہیں کہ تو سورہا ہے اور محمد ین کے پاس قوتِ لا یموت بھی نہیں ہے؟ والیٔ مصر بیدار ہوا اور محمد ین کے جائے قیام اور ان کے نام ونشان کی تلاش شروع کی، پتہ چلنے پر ایک ہزار اشرفی بجھوائی۔ امام موصوف نے محرم ۲۹۴ھ میں بعمر ۹۲ سال سمرقند میں وفات پائی، اور اپنے بعد اپنا کوئی مثل ونظیر نہیں چھوڑا۔ رحمه الله رحمة واسعة (تذكرة الحفاظ للذهبی وبعضه للسيوطی)

علم العوالی

اصل العوالی من ابی القاسم جریٰ		قد كان مسكنه لفی الطبران

عوالی میں ابوالقاسم جن کا وطن طبران ہے، اصلِ اصول اور بلند پایہ ہوئے ہیں۔

ابوالقاسم سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر لخمی وطبرانی، حافظِ حدیث اور مشہور محدث ہیں، ۲۶ھ میں شام کے ایک قصبہ طبریہ میں پیدا ہوئے اور تقریباً سو برس کی عمر پائی ہے۔

طلبِ حدیث میں عراق، حجاز، یمن، مصر اور جزیرۂ فراتیہ کے شہروں میں سفر کئے اور تینتیس برس تک سفر ہی کے دور میں رہے، ایک ہزار محدثوں سے حدیث سنی اور حدیث میں متعدد نافع تصانیف یادگار چھوڑیں۔ معجم طبرانی کبیر اوسط اور صغیر مشہور ومقبول تصنیفیں ہیں، ابونعیم صاحبِ حلیہ مشہور محدث انہی کے شاگرد ہیں۔ ماہ ذی قعدہ ۳۶۰ھ میں شنبہ کے دن وفات پائی اور حممۂ دوسی رضی اللہ عنہ صحابی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

علم المغازی

اما ابن اسحاق ففی نقل المغا		زی للنّبی فواحد الازمان

لیکن ابن اسحٰق، سو مغازی اور غزواتِ نبوی کی روایت میں یکتائے روزگار ہوئے ہیں۔

ابوبکر محمد ابن اسحٰق صاحب السیرۃ والمغازی فنِ سیرت اور مغازی میں امام ہوئے ہیں۔

امام زہری اور امام شافعی رحمہما اللہ نے فرمایا ہے کہ جو مغازی میں تبحر پیدا کرنا چاہے وہ ابن اسحٰق کی عیال میں داخل ہوگا، چنانچہ فنِ مغازی اور سیرت میں جو کتاب لکھی گئی اس میں ان پر اعتماد اوران کی جانب استناد لابدی سمجھا گیا ہے۔ ابوجعفر منصور خلیفہ جب کہ حیرہ میں مقیم تھا تو امام موصوف نے مغازی میں کتاب پیش کی اور اسی لئے اہل کوفہ میں مغازی کا علم زیادہ پھیلا۔ محدث بھی زبردست تھے، بڑے بڑے ثقات نے ان کی تعدیل وتوثیق کی ہے۔ ۱۵۱ھ بمقام بغداد وفات پائی اور مقبرہ خیزران میں جانبِ شرق مدفون ہوئے۔

علم اسماء الرجال

قد كان احفظ علم اسماء الرجا		لِ ابنُ المعين البارع الاقران

علم اسماء الرجال میں نہایت بلند پایہ حافظ ابن معین ہیں جو ہم عصروں پر فوقیت لے گئے۔

ابوزکریا یحییٰ ابن معین مشہور محدثین میں سے ہیں، اپنے وقت کے امام ہوئے ہیں، ۲۵۸ھ میں پیدا ہوئے ہیں، ان کے والد رَیُ کے خراج پر محصل تھے، انھوں نے ان کے لئے ایک لاکھ پچاس ہزار درہم ترکہ چھوڑا، یحییٰ ابن معین نے یہ سارا مال علمِ حدیث پر خرچ کردیا، چھ لاکھ حدیثیں اپنے قلم سے لکھی ہیں۔ امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد جیسے ائمہ محدثین کے استاذ تھے، امام احمد ابن حنبل کے ہمعصر ہیں، باہم صحبت والفت اور اشتراکِ عمل تھا، امام احمدؒ کا مقولہ تھا کہ جس حدیث کو یحییٰ بن معین نہ پہچانیں وہ حدیث ہی نہیں۔

علی ابن مدینی کہتے ہیں کہ بصرہ کا علم ختم تھا، یحییٰ ابن کثیر اور قتادہ پر اور کوفہ کا علم ختم تھا اسحٰق اور اعمش پر اور حجاز کا علم ختم تھا ابن شہاب اور ابن دینار پر اور ان چھوؤں کا علم ختم تھا بصرہ میں سعید ابن ابی عروبہ، شعبہ، معمر، حماد بن سلمہ اور ابی عوانہ پر، اور کوفہ میں سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ اور مالک ابن انس پر، اور شام میں اوزاعی پر اور پھر ان سب کا علم ختم تھا محمد بن اسحٰق ہشیم، یحییٰ ابن سعید، ابن ابی زائدہ، وکیع ابن مبارک، ابن مہدی، یحییٰ ابن آدم پر، اوران سب کے سب کا علم ختم تھا، یحییٰ ابن معین پر، یحییٰ ابن معین جرح وتعدیل کے امام گذرے ہیں اور فنِ اسماء الرجال میں یکتائے روزگار۔

۷۷ سال کی عمر میں بمقام مدینہ طیبہ وفات پائی، اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

علم نقد الحدیث

وکذاک فی نقد الحدیث محمد		وھو البخاریّ العزیز الشان

فنِ حدیث کے نقد وتبصرہ میں بلند پایہ فرد امام محمد ابن اسمٰعیل بخاری ہیں، جو غلبہ کی شان رکھتے تھے۔

امام محمد بن اسمٰعیل بخاری مشہور ومعروف امام ہیں، بیوتِ علم وفضل کا ایک بچہ امام بخاری سے واقف ہے۔ ۱۹۴ھ میں بماہ شوال ۱۳ر تاریخ یوم جمعہ کو پیدا ہوئے، نحیف الجسم اور میانہ قامت تھے، حفظ وتثبتِ نقل میں یکتائے روزگار رہوئے ہیں۔ طلبِ حدیث میں مختلف بلاد وامصار کے سفر کئے اور محدثینِ دہر سے حدیث کی تحصیل کی۔ خراسان، عراق، حجاز، شام، مصر اور بغداد وغیرہ میں احادیث کی کتابت کی، بغداد میں پہنچے تو اہل بغداد پروانوں کی طرح جمع ہوگئے اور ان کے علم وفضل اور روایت کے قائل ہوکر ان کے فریدِ عصر ہونے کا اعتراف کیا۔

خطیب نے تاریخ بغداد میں نقل کیا ہے کہ جب امام بخاری بغداد پہنچے اور وہاں کے محدثین نے ان کی آمد کا شہرہ سنا تو ان کے امتحان کا ارادہ کیا اور سو احادیث کو اس طرح الٹ پلٹ کیا کہ کسی کا متن کسی کی سند کے ساتھ اور کسی کی سند کسی کے متن کے ساتھ لگا کر دس دس حدیثیں ایک ایک آدمی کو سمجھا دیں اور ایک مجلس اس امتحان کے لئے مقرر کی، مجلس مقررہ میں تمام محدثین کا اجتماع ہوا، خراسان وبغداد کے اہل علم جمع ہوئے۔ امام بخاری بھی بلائے گئے، حسبِ قرارداد اُن دس آدمیوں میں سے ایک نے پڑھ کر وہی مقلوب حدیثیں سنائیں اور تنقید کی درخواست کی، ہر حدیث پر امام جواب دیتے گئے کہ **لا اعرفہ** (میں اس کو نہیں پہچانتا) دوسرے نے دس الٹ پلٹ کر اور بیان کیں، اس پر بھی یہی جواب دیا، یہاں تک کہ سو کی سو احادیث سے لاعلمی ظاہر کی۔

امام کی اس لاعلمی کو سن کر آپس میں اہل علم ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، بعض نے کہا کہ جوان سمجھ گیا ہے کہ تم نے احادیث مقلوب کردی ہیں، اور بعض نے کہا کہ نہیں شہرت غلط ہے، یہ کچھ بھی نہیں سمجھا۔ جب امام بخاری نے دیکھا کہ یہ سب کے سب فارغ ہوگئے تو امام بخاری علی الترتیب

ان دس سائلوں کی طرف متوجہ ہوئے، پہلے سے کہا کہ تمہاری دس حدیثیں مقلوب ہیں، پہلی حدیث کی سند وہ ہے جو مثلاً دوسری کے ساتھ لگادی گئی تھی، اور دوسری کی وہ ہے جو پہلی کے ساتھ ذکر کی گئی، اسی طرح ترتیب وار دس کی دس احادیث پر تنقید کردی۔

پھر دوسرے کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی دس احادیث کو بھی ترتیب وار کھول دیا کہ فلاں متن کی فلاں سند ہے اور فلاں متن کی فلاں۔ غرض پوری سو احادیث کو پوری ترتیب اور تنقید کے ساتھ واضح کر دیا۔ اس وقت تمام لوگوں نے ان کے حفظ اور نقدِ حدیث اور فضل وکمالِ روایت ودرایت کا اقرار کیا، ان کے فضل وکمال کی بڑی داد خود صحیح بخاری ہے جس نے اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کا ممتاز لقب پایا۔

امام بخاری نے اس کتاب کو سولہ برس میں تصنیف کیا اور چھ لاکھ حدیثوں میں سے منتخب کر کے تقریباً سات ہزار جمع کیں اور اس طرح جمع کیں کہ ہر حدیث کو لکھنے کے لئے پہلے غسل فرماتے پھر دو رکعت نفل پڑھتے اور پھر لکھتے۔

امیر خراسان خالد بن محمد ذہلی نے امام موصوف کو موضع بخارا سے نکال دیا اور خرتنک بھیج دیا جو ایک موضع ہے سمرقند کے دیہات میں سے، اور وہیں امام موصوف نے شبِ شنبہ میں جو عید الفطر کی رات تھی بعد نماز عشاء انتقال فرمایا اور عید کے دن بعد ظہر دفن کئے گئے۔ پھر خالد مذکور نے حج کا ارادہ کیا اور بغداد پہنچا، وہاں موفق ابن متوکل خلیفہ عباسی نے اسے گرفتار کر کے قید کر دیا اور قید ہی میں فوت ہوگیا۔

السیاحۃ

وکذا ابن مندۃ فی السیاحۃ اوحد		جوابهم لسباسب القیعان

اسی طرح ابن مندہ علمی سفر کرنے میں یکتا تھے جنھوں نے تمام میدانوں اور جنگلوں کو چھان مارا۔

نام ابراہیم ہے اور مندہ لقب ہے، حفاظِ حدیث میں سے ہیں، محدث ابن محدث ابن محدث ابن محدث ابن محدث ابن محدث ہیں۔ جلیل القدر وافر الفضل واسع الروایۃ، ثقہ، حافظ، فاضل،

صادق کثیر التصانیف، حسن السیرۃ، بعید التکلّف اور کثیر الاسفار ہوئے ہیں۔ نیشاپور کی طرف سفر کیا اور وہاں ابن مقری سے حدیث حاصل کی، ہمدان کا سفر کیا اور وہاں ابوبکر نہاوندی سے حدیث سنی، بصرہ میں ابوالقاسم سے۔

غرض مختلف اطراف و دیار کے محدثین و علماء سے کتنے ہی سفر کر کے استفادہ کیا، بعض علماء کی یہ روایت کثرت سے بیان کیا کرتے تھے: **لکثرة الضحك امارة الحمق والعجلة من ضعف العقل وضعف العقل من قلة الرأى من سوء الادب وسوء الادب يورث المهانة ۔**

نیز کثرت سے یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

عجبت لمبتاع الضلالة بالهدى		وللمشترى دنياه بالدين اعجب
واعجب من هذين من باع دينه		بدنيا سواء فهومن دين احيب

نویں شوال یوم سہ شنبہ ۴۳۴ھ کو ولادت ہوئی اور یوم عید الاضحیٰ ۵۱۲ھ میں بمقام اصبہان وفات پائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

فن ظاہریہ

وكذا ابن حزم ظاهريّ فى الجمود		وعلى الظواهر سابق الاقران

اور ایسے ہی ابن حزم ظاہری ظواہر نصوص پر جمود رکھنے میں اپنے ہم عصروں سے بڑھے ہوئے تھے۔

ابو محمد علی ابن احمد مشہور بابن حزم ظاہری فارسی الاصل ہیں، فارسیوں میں ان کے دادا سعید سب سے پہلے مسلمان ہوئے ہیں، ان کی ولادت قرطبہ میں یوم چہار شنبہ قبل طلوعِ شمس رمضان کی چاند رات ۳۸۴ھ کو ہوئی ہے۔ علوم حدیث کے عالم اور حافظ ہوئے ہیں، تمام علومِ نقلیہ و عقلیہ و فلسفیہ کے اعلیٰ ماہر تھے، نیز علومِ بلاغت و شعر وغیرہ میں دستگاہِ کامل رکھتے تھے۔ ادیب، شاعر اور طبیبِ حاذق تھے، باوجود جدی ریاست و مناصب کے کہ انکے دادا وزیر تھے، خود زاہد و متواضع تھے۔

حمیدی محدث فرماتے ہیں کہ ذکاوت، سرعتِ حفظ، قوتِ یادداشت، کرمِ نفس اور تدین میں

ان کی نظیر بہت قلیل نکلے گی۔ کثیر التصانیف تھے، ابورافع خودان کے بیٹے کہتے ہیں کہ میرے والد کے قلم کی لکھی ہوئی چارسو مجلدات جوانہی کی تالیفات میں سے تھیں، میں نے خود جمع کی ہیں جن کے اوراق اسّی ہزار ہوتے ہیں۔

فقہ میں کتاب الایصال ان کی عظیم تصنیف ہے جس میں احکامِ فقہیہ کو پہلے قرآن سے پھر اجماع سے، پھر اقوالِ صحابہ وتابعین وعلماءِ مابعد سے ثابت کیا ہے۔ اصولِ فقہ میں احکام لاصول الاحکام، علم کلام میں مشہور زمانہ کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل مراتب العلوم جس میں تمام علوم کے باہمی درجات اوران کی تحصیل کی کیفیت اور بعض کا بعض سے تعلق اور کتاب التقرب جس میں منطقی مسائل کو اصطلاحات کے چکروں سے نکال کر عام فہم الفاظ میں بیان کیا ہے اور اصولِ منطقیہ کی تمثیلات جزئیاتِ فقہیہ سے پیش کی ہیں، ان کی خاص تصانیف ہیں۔

پہلے شافعی المذہب تھے پھر ظاہریہ کی طرف مائل ہوئے اور آخر کار ظواہر پر جمود کرنے میں متشدد ہو گئے، اسی تشدد اور اپنی پچھلی رائے کے سبب علماءِ ماسبق نیز فقہاءِ عصر کو بہت سی چیزوں میں ہدف بنالیا تھا ان کی شان میں تیز کلمات استعمال کر جاتے تھے، اس لئے عام قلوب بھی ان سے نفرت کرنے لگے اور علماء بھی خوش نہ رہے۔ تمام علماء نے ان کی تذلیل وتشنیع کی، سلاطین بھی بدظن ہو گئے اوران کوشہر بدر کر دیا، اس لئے ابن حزم بادیہ نشین ہو گئے اور اپنے ایک گاؤں منت لیشم میں اتوار کے دن شعبان ۴۵۶ھ میں وفات پائی۔

علم الکلام

اما الامام الاشعری فانه		عَلَم الکلام وصاحب البرهان

لیکن امام ابوالحسن اشعری سوعلم کلام کے ایک کھلے نشان ہیں اور صاحبِ حجت وبرہان ہیں۔

امام ابوالحسن علی بن اسمٰعیل اشعری، مشہور امام علم کلام کے عَلم اور متکلمین کے رأسِ رئیس ہیں، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہیں۔ اہل سنت والجماعت کے مشہور ومعروف ناصر ومعین ہیں، ابوبکر صیرفی کہتے ہیں کہ معتزلہ نے بہت سراٹھایا تھا مگر خدانے ابوالحسن اشعری کو ظاہر کیا

کہ انھوں نے ایک دم ان کے سروں کو کچل ڈالا، متکلمین کی ایک جماعت جن کو اشاعرہ کہتے ہیں انہی کی طرف منسوب ہے، امام ابوالحسن ابواسحٰق مروزی فقیہ شافعی کے مجلس نشین ہیں جن کا حلقہ جامع منصور بغداد میں ہوتا تھا۔ ان کی ولادت ۲۷۰ھ میں بمقام بصرہ ہوئی، اور بروایت ہمدانی بذیل تاریخ بغداد (طبری) کچھ اوپر ۳۳۰ھ میں اچانک وفات ہوئی ہے۔ بغداد میں باب الکرخ اور باب البصرہ کے درمیان دفن ہوئے، محدث ابن عساکر نے ان کے مناقب میں ایک جلد تصنیف کی ہے، ان کی شہرت وتعریف مستغنی عن البیان ہے، یہ ابتداءِ دور میں معتزلی تھے، پھر تائب ہوئے اور خود اپنے استاد ابوعلی جبائی سے مناظرے اور مقابلے کئے، جامع بصرہ میں ایک کرسی پر چڑھ کر ایک زور کی آواز لگائی کہ جو مجھے پہچانتا ہے وہ تو پہچانتا ہی ہے، اور جو نہیں پہچانتا وہ اب پہچان لے کہ میں فلاں ابن فلاں ہوں۔ میں پہلے قائل تھا کہ قرآن مخلوق ہے اور خدا کو کوئی آنکھ کبھی نہیں دیکھ سکتی، بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے، خدا پر عدل واجب ہے، لیکن میں ان لغو عقائد سے توبہ کرتا ہوں اور معتزلہ پر رَد کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہوں۔ معتزلہ کے معائب اور فضائح کا افشاء کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں، ملاحدہ معتزلہ، رافضہ، جہمیہ، خوارج اور تمام مبتدعین کے رد میں متعدد کتابیں ان کی تصنیف ہیں، دجلہ کے قریب بازار سے بائیں جانب حمام اور مسجد کے متصل مقبرۂ مشروع الزوایا میں دفن ہوئے، زاہد تھے۔ ابن حزم ظاہری فرماتے ہیں کہ امام ابوالحسن کی تصانیف ۵۵ تک پہنچ گئی تھیں۔

ان کے دادا بلال ابن بردہ ابن ابی موسیٰ اشعری نے جو مختصر سی زمین چھوڑی تھی اسی پر گذر تھا، ان کا یومیہ خرچ سترہ (۱۷) درہم تھے۔

علم اداء القرآن

اما الخطیب ففی القراء ۃ سرعة		فی عصره اضحی فرید الشان

لیکن خطیب پس سرعتِ قراءت میں اپنے زمانہ کے یکتا ہوئے ہیں۔

حافظ ابوبکر احمد بن علی بن ثابت بغدادی المعروف بہ خطیب بغدادی، صاحبِ تاریخ بغداد علمائے متبحرین میں سے گذرے ہیں، سو کے قریب تصانیف ہیں، جمادی الاخریٰ ۳۹۲ھ میں چھٹی

تاریخ یوم پنج شنبہ کو پیدا ہوئے اور یوم دوشنبہ ساتویں ذی الحجہ ۴۶۳ھ میں وفات پائی، پایہ یہ تھا کہ شیخ ابواسحٰق شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا جنازہ اٹھایا، سرعتِ قراءت میں مشہورِ زمانہ تھے۔

ابوسعد صوفی فرماتے ہیں کہ شیخ ابوبکر بن زہراء صوفی نے اپنی حیات ہی میں اپنے لئے ایک قبر بشر حافی کے پہلو میں بنوائی تھی اور ہر ہفتہ اس قبر میں داخل ہوتے اور پورا قرآن ختم فرماتے، اور اسی میں سو رہتے۔ ادھر خطیب بغدادی نے وصیت کی تھی کہ مجھے بشر حافی کے پہلو میں دفن کیا جائے، ان کی وفات پر بہت سے علماء شیخ ابوبکر ابن زہرا کے پاس گئے اور ان کی اس قبر کی فرمائش خطیب بغدادی کے لئے کی جو انھوں نے بشر حافی کے پہلو میں اپنے لئے بنا رکھی تھی، انھوں نے صاف انکار کر دیا اور کسی طرح قبر دینے پر راضی نہ ہوئے، لوگ شیخ ابوسعد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اس بارے میں سفارش چاہی، وہ خود شیخ ابوبکر بن زہرا کی خدمت میں آئے اور فرمایا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ قبر دیدیں، میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر بشر حافی زندہ ہوتے اور آپ ان کے پہلو میں بیٹھے ہوئے ہوتے اور اچانک مجلس میں خطیب بغدادی آجاتے تو کیا آپ وہیں اپنی جگہ بیٹھے رہتے، اور خطیب جیسے شخص کو اپنے سے دور گری ہوئی جگہ بیٹھا دیکھتے ہوئے چپ بیٹھے رہتے؟ فرمایا ہرگز نہیں، بلکہ میں خود اٹھ جاتا اور خطیب کو بشر کے پہلو میں جگہ دیتا۔ فرمایا کہ اس وقت کے لئے بھی تو میں یہی کہتا ہوں، شیخ ابن زہراء نے قبر دیدی اور خطیب حضرت بشر حافی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

علم طب

ومحمد فی الطب سابق عصره		بحذاقة و مهارة و بيان

اور محمد ابن زکریا فنِ طب میں اپنے زمانہ میں بڑھا ہوا تھا، مہارت وحذاقت اور بیانِ مسائل طب میں۔

ابوبکر محمد بن زکریا رازی مشہور طبیب ہے، مکتفی باللہ خلیفۂ عباسی کے زمانہ میں گذرا ہے، ابتداءِ عمر میں موسیقی اور عود نوازی میں منہمک تھا، ڈاڑھی مونچھ نکل آنے پر اسے خیال ہوا کہ جو گانا ڈاڑھی اور مونچھوں کے درمیان میں سے نکلے وہ اچھا نہیں معلوم ہوسکتا، گویا محسّناتِ غنا میں سے حسنِ

صوت کے ساتھ تانّث (امردیّۃ) کو بھی مؤثر اور ضروری خیال کیا، اس لئے اس فن کا اشتغال چھوڑ کر کتبِ طب اور فلسفہ کی طرف متوجہ ہوا اور نہایت ہی تدبیر کے ساتھ ان فنون کی تحصیل وتکمیل کی خصوصاً فنِ طب میں حذاقت ومہارت پیدا کی اور اپنے فن کا مشہور امام بن گیا۔ جوق جوق لوگ تحصیل کے لئے اس کی طرف سفر کرنے لگے، متعدد کتابیں مثل کتاب الحاوی ۳۰ جلد اور کتاب الجامع اور کتاب الاعصاب اور کتاب المنصوری (جو منصور بن اسحٰق بن احمد بن نوح اولاد بہرام گور والیٔ خراسان وکرمان کے نام پر لکھی گئی تھی) وغیرہ نہایت ہی بلاغت اور جامعیت کے ساتھ فنِ طب میں تصنیف کیں، قواعدِ فن سے کتنے ہی جامع کلیات مستنبط کئے اور کلیات سے کتنی ہی نافع طبی ہدایات پیش کیں جو مریضوں کے لئے شفا اور حفظِ ماتقدم کا باعث ہیں۔

اسی طبیب کا مشہور مقولہ ہے کہ جب تک تم غذاؤں سے علاج کر سکو دوا کے پاس مت جاؤ، اور دواؤں میں جب تک مفردات سے علاج کر سکو مرکبات کے قریب مت ہوؤ۔ ایک مقولہ ہے کہ ’’اگر طبیب عالم ہو اور مریض مطیع ہو تو بیماری کی مدت یکلخت گھٹ جاتی ہے، ایک مقولہ ہے: علاج بیماری کی ابتداء ہی میں ایسے نہج سے کر لو کہ قوت گھٹنے نہ پائے۔

ابو بکر رازی نے سلطان منصور ابن اسحٰق والیٔ خراسان کے لئے ایک کتاب فنِ کیمیا میں تصنیف کی، سلطان نے ایک ہزار دینار صلہ عطا کیا اور حکم دیا کہ اس میں کیمیا کا جو طریق علم کے درجہ میں لکھا ہے اس کو عمل کر کے دکھلایئے، رازی نے عذر کیا کہ عمل کیمیا میں رقم کثیر اور آلات ووسائل کثیرہ اور کتنی جڑی بوٹیوں اور جھگڑے کی ضرورت ہوگی جو دشواری سے خالی نہیں، سلطان نے کہا کہ ان تمام چیزوں کی ذمہ داری ہم لیتے ہیں تم صرف وہ کیمیا بنادو جسکا تذکرہ تم نے کتاب میں لکھا ہے۔

رازی نے پہلو تہی شروع کی اور عمل سے عاجز رہ گیا۔ سلطان نے تیزی سے کہا کہ کیا تو نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کتاب میں جھوٹ اور ملمع سازی سے تمام آنے والوں کے لئے تعب اور مشقت کا سامان کیا ہے کہ لوگ کتاب دیکھ کر کیمیا بنانے کے شائق تو ہو جائیں اور عمل کے درجہ میں بنانے کا سامان بھی مہیا کر لیں، لیکن آخر کار عاجز ہو جائیں اور بنا نہ سکیں، اور رنج وکلفت سے دوچار ہوں؟ پھر کہا کہ کتاب لکھنے میں جو تو نے تعب کا سامان دوامی طور پر کر دیا ہے اس کا صلہ بھی تجھے بھگتنا

چاہئے، یہ کہہ کر کوڑے سے رازی کی خبر لی اور حکم دیا کہ یہ کتاب اس کے سر پر اس حد تک ماری جائے کہ کتاب پاش پاش ہو کر قابلِ انتفاع نہ رہے۔ ایسا ہی کیا گیا، اسی کے صدمہ سے رازی کی آنکھوں میں پانی اتر آیا اور آخر عمر میں بالکل نابینا ہو گیا، وفات کا سنہ تقریباً ۳۴۳ھ ہے۔ کہا کرتا تھا کہ میں نے دنیا کو خوب دیکھالیا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

فنِ ادب

وتفرد الحبر الحریری وفی المقا		مات التی نُسجتْ بحسن بیان

اور حریری مقامات نویسی میں یکتا تھا، گویا مقامے ترتیب بیان کے سبب اس نے کپڑے کی طرح بُن دیئے تھے۔

ابو محمد قاسم بن علی بن محمد بن عثمان الحریری البصری اپنے زمانہ کا امامِ فن تھا، لغت وادب اور فنونِ عربیہ کا مالک تھا اور مقامات لکھنے کا خاص سلیقہ حق تعالیٰ نے اس شخص کے لئے ودیعت فرمایا تھا۔ مقامات کلامِ عرب کے کتنے ہی اسالیب اور امثال ومحاورات اور رموزِ کلام وغیرہ کا ایک خزانہ اور مؤلف کی کثرتِ اطلاع کا ایک شاہد عدل ہے، اس کتاب کی مقبولیت اس سے ظاہر ہے کہ اس کی متعدد شروح لکھی گئی ہیں، کسی نے طویل اور کسی نے قصیر اور پھر آج تک اساتذہ وتلامذہ کے ہاتھوں میں متداول اور نصابہائے درس میں داخل ہے، حریری بہت بدصورت تھا، ۴۴۶ھ بمقام بصرہ ولادت ہوئی اور ۵۱۶ھ میں وفات ہوئی۔

علم الشعر

وحبیب ن الطائی ابلغ حکمة		وکذاك احمد صاحب التبیان

اور حبیب طائی شعر میں اور اسی طرح متنبّی صاحبِ تبیان حکمت کے درجہ کو پہنچے ہوئے تھے۔

وحبیب ن الطائی ابلغ حکمة۔ ابوتمام حبیب طائی قبیلہ طے کا مشہور شاعر ہے، دیباچہ،

لفظ اور بضاعت شعر میں فرد گذرا ہے، حسنِ اسلوب اور لطافتِ بیان اس کا حصہ تھا، دیوان حماسہ اس کے حسنِ انتخاب کا شاہد عدل ہے، اس کی دوسری تالیف مخول الشعراء ہے، جس میں جاہلیت اور اسلام کے منتخب شعراء کا کلام جمع کیا ہے، اس کے حسنِ تمیز کی دوسری شہادت ہے اور کتاب الاختیار جس میں منتخب اشعار کی تدوین کی ہے اس کے انہماک شاعریت کی تیسری گواہی ہے، حفظ غضب کا تھا، چودہ ہزار رجزیہ اشعار یاد تھے اور قصائد ومقاطیع اس کے علاوہ ہیں، سلاطین کے لئے مادحانہ قصائد لکھے اور انعامات حاصل کئے۔

علماء نے لکھا ہے کہ قبیلہ طے میں سے تین آدمی نکلے ہیں کہ ہر ایک اپنے باب میں یکتائے دہر ہوا ہے۔ حاتم طائی سخاوت میں، داؤد طائی زہد میں اور حبیب طائی شعر میں۔ ابوتمام کی ولادت ۱۹۰ھ میں بمقام جاسم ہوئی جو دمشق اور طبریہ کے درمیان بلادجیدور میں ایک موضع ہے، اور مصر میں ہوش سنبھالا۔ کہتے ہیں کہ ابتدائے عمر میں ابوتمام گھڑیا لے کر جامع مصر میں لوگوں کو پانی پلایا کرتا تھا، طویل القامت، گندم گوں، فصیح وبلیغ اور شیریں کلام تھا۔ ۲۳۱ھ میں بمقام موصل وفات پائی۔

و کذاك احمد صاحب التبیان ۔ یہ دوسرا مشہور شاعر ابوالطیب احمد بن الحسن متنبّی ہے جس نے عربیت کی سلاست میں مضمون آرائی کا اضافہ کیا۔ اہل کوفہ میں سے ہے اور لڑکپن میں شام پہنچا اور اس کے اطراف میں فنونِ ادبیت کی تحصیل کے لئے چکر لگاتا رہا، نقلِ لغت اور غرائبِ لغت کے تحفظ میں فرد تھا، جب کسی لغت کے متعلق سوال کیا جاتا تو برجستہ جواب دے کر اس پر کلامِ عرب سے نثر اور نظم کی شہادتیں پیش کر دیتا تھا۔

شیخ ابوعلی فارسی نے پوچھا کہ **فُعلٰی** کے وزن پر کتنی جموع آتی ہیں؟ فوراً بولا کہ **ظربٰی** و **حجلٰی**، ظربی جمع ہے ظربان کی جو ایک بدبودار چوپایہ ہے اور **حجلٰی** جمع ہے حجل کی جو ایک پرندہ ہے۔ شیخ کہتے ہیں کہ پھر میں نے تین شبانہ روز لغت کی کتابیں چھان ماریں کہ اس وزن پر کوئی تیسری جمع نکل آئے مگر نہ نکلی، اس کی لطافتِ شعر اور موشگافی آفتاب سے زیادہ روشن ہے۔

دیوانِ متنبّی اس کی باریک بینی اور لطیفہ گوئی کی ایک زندہ شہادت ہے، بڑے بڑے علماء نے اس دیوان کی شرح لکھی، بعض مشائخ کا مقولہ ہے کہ اس دیوان کی چالیس شروح سے تو میں واقف

ہوں، ابوالطیّب کا لقب متنبّی اس لئے پڑ گیا تھا کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور بنی کلب وغیرہ قبیلے اس کے ساتھ ہوگئے۔ امیر حمص نے اسے گرفتار کیا اور اس کے لوگ متفرق ہوگئے اور یہ قید کر دیا گیا، ایک طویل زمانہ کے بعد جب اس نے توبہ کی تو رہا کر دیا گیا، اور بعض کہتے ہیں کہ اس نے کہا کہ میں شعر کا پیغمبر ہوں۔ ۳۳۷ھ میں سیف الدولہ کے دربار میں گیا، پھر ۳۴۷ھ میں مصر پہنچا اور کافور اخشیدی کے یہاں رسوخ حاصل کیا، اور اس شان سے کافور کے سامنے کھڑا ہوتا تھا کہ دونوں پیروں میں خفین اور وسط کمر میں پڑکا اور اس میں تلوار حمائل اور دو مسلح غلاموں کے کندھوں پر ہاتھ ٹیکے ہوئے آتا اور ذرا خلافِ مزاج بات پیش آتی تو ہجو بھی کر ڈالتا۔

پھر بلادِ فارس کا رخ کیا اور عضد الدولہ کے دربار میں مدحیہ قصائد پڑھے اور بڑے بڑے انعامات حاصل کئے، یہاں سے لوٹ کر بغداد کا ارادہ کیا اور پھر وہاں سے آٹھویں شعبان کو کوفہ کا۔ راستہ میں فاتک ابن ابوجہل اسدی سے مقابلہ ہوگیا اس کے ساتھ بھی جماعت تھی اور اس کے ہمراہ بھی، مقاتلہ ہوا اور متنبّی، اس کا بیٹا محسّد اور اس کا غلام مفلح موضع نعمانیہ (قریب بغداد) میں قتل ہوگئے۔

ابن رشیق صاحبِ کتاب العمدہ نے اس میں یہ اضافہ اور بیان کیا ہے کہ متنبّی نے جب کہ اپنے مدِمقابل کا غلبہ دیکھا تو بھاگنے کا ارادہ کیا تو اس وقت اس کے غلام نے کہا کہ بڑے شرم کی بات ہے کہ لوگ بعد میں تیرے فرار کا تذکرہ کریں گے، حالانکہ تیرا خود کا ہی یہ شعر ہے۔

فالخیل واللیل والبیداء تعرفنی		والحرب والضرب والقرطاس والقلم

یہ سنتے ہی متنبّی لوٹا اور قتل ہوگیا۔ پس اس کا قاتل خود اسی کا یہ شعر ہے اور یہ حادثہ ماہ رمضان یوم چہارم شنبہ ۳۵۴ھ میں واقع ہوا، اس کی پیدائش ۳۰۳ھ بمقام کوفہ محلّہ کندہ میں ہوئی، متنبّی کا باپ کوفہ میں سقا تھا، لیکن اس بچہ سقہ نے شام میں نشو ونما پایا اور اس درجہ کو پہنچا۔

علم تشبیہ

والشعر شعر البحتری اجازۃ		اذ کان فی تشبیہ ذا اتقان[1]

اور طرح کے لحاظ سے شعر شعر بحتری کا تھا کہ صنعتِ تشبیہ میں نہایت پختہ ہوتا تھا۔

ابوعبادہ ولید بن عبد طائی بحتری: مشہور شاعر ہے، منبج میں جو ہاونشا کے ضلع کا قصبہ ہے اور ملک شام میں حلب اور فرات کے درمیان واقع ہے۔ کسریٰ کا بنا کردہ ہے، اس میں بحتری پیدا ہوا، سنہ ولادت ۲۰۶ھ ہے شعر گوئی میں نہایت بلند پایہ اور شہرت رکھتا ہے۔

ابوتمام کی طرح اس نے بھی حماسہ لکھا تھا جو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ شام سے عراق چلا آیا اور خلفائے عباسیہ میں سے المتوکل کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اس کی مدح سرائی میں قصائد لکھے اور سنائے، نیز بغداد کے تمام بڑے بڑے امراء کے یہاں رسوخ حاصل کیا اور قصائد وغیرہ سے ان کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ صالح ابن اصبع کہتے ہیں کہ عراق جانے سے پہلے بحتری نہایت معمولی حالت میں پیاز اور ترکاری بیچنے والوں کی مدح میں شعر گوئی کیا کرتا اور مسجد کے ان دو دروازوں سے آتا جاتا تھا اور آمد ورفت میں شعر گنگناتا رہتا تھا، مگر آج عراق ہو آنے کے بعد اس کا وہ بلند پایہ ہے کہ سب جانتے ہیں اور اسے استاد تسلیم کرتے ہیں۔

بحتری کہتا ہے کہ اول اول مجھے فنِ شاعری سے شغف اور اس کے ذریعہ یافت اس طرح ہوئی کہ میں حمص میں ابوتمام کے پاس اپنے چند اشعار لیکر گیا، وہاں شعراء کا ہجوم تھا، لیکن میرے شعر سن کر اس نے ہر طرف سے نگاہ ہٹالی اور صرف میری طرف متوجہ ہوگیا۔ لوگوں کے منتشر ہو جانے پر مجھ سے کہا کہ اس سارے مجمع میں جنھوں نے قصائد سنائے میرے نزدیک تو سب سے بڑا شاعر ہے۔ پھر میرا حال پوچھا، میں نے تنگ دستی کی شکایت کی، ابوتمام نے اہل معرۃ کو میری سفارش لکھی اور میری حذاقت ومہارتِ فن کو سراہا، اور مجھ سے کہا کہ ان کی مدح میں قصیدہ لکھ کر لے جاؤ، چنانچہ میں گیا اور انھوں نے چار ہزار درہم میرا وظیفہ مقرر کردیا، یہ پہلی یافت تھی جو مجھے شاعری کی بدولت ہوئی۔ بحتری کہتا ہے کہ ابوسعید امیر کے دربار میں حاضر ہوا، اور میں نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ

پڑھا، جس کا پہلا شعر یہ تھا۔

أأفاق صب من هوى فافيقا		ام خان عهدا ام اطاع شفيقا

قصیدہ پورا کر لینے پر ابو سعید بہت خوش ہوا اور داد دی، دربار میں سے ایک شخص بول اٹھا کہ اے امیر یہ قصیدہ میرا ہے، اس جوان نے سرقہ کیا ہے، امیر کی طبیعت بگڑ گئی اور اس نے مجھے خطاب کر کے کہا کہ اے جوان! کیا تیرا نسب اور قرابت کافی نہ تھا کہ تو اس کے واسطہ سے مجھ سے عزت وانعام طلب کرتا جو تجھے اس سرقہ کی ضرورت پڑی؟ ہرگز ایسی حرکت مت کر، میں حیران ہوا اور میں نے کہا کہ واللہ یہ شعر میرے ہیں۔ اس شخص نے کہا غلط ہے، قصیدہ میرا ہے، اور یہ کہہ کر قصیدہ سے بہت سے اشعار سنا دیئے۔ ابو سعید کو اور زیادہ میرے سرقہ کا یقین ہو گیا اور اس نے کہا کہ خیر میں تجھے انعام و دولت تو دیدوں گا، جس کے لئے تو نے یہ سرقہ کی کارروائی کی ہے مگر خبردار آئندہ ایسا نہ کرنا، میں حیران ہو کر واپس آ گیا اور دل میں سخت نادم اور خجل تھا۔ اچانک ابو سعید نے مجھے واپس بلایا اور کہا کہ جانتا ہے یہ شخص کون ہے جس نے تجھ پر سرقہ کا دعویٰ کیا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ کہا تیرا چچا زاد بھائی حبیب بن اوس ابو تمام جو تیرا استاد بھی ہے، تب تو میں نے معانقہ کیا۔ ابو تمام نے کہا میں تجھ سے مذاق کر رہا تھا، شعر تیرا ہی ہے مجھے ابو تمام کے حافظہ پر حیرت تھی، تشبیہ میں بحتری کا خاص پایہ تھا جیسا کہ اس کے دیوان اور ابیات سے ظاہر ہے۔

ابوبکر صولی نے حروفِ تہجی کے لحاظ سے اس کے غیر مرتب اشعار کو جمع کیا ہے، اور علی بن حمزہ اصبہانی نے انواع کے لحاظ سے جمع کیا ہے۔ عمر کا اکثر حصہ عراق میں گذرا اور المتوکل خلیفہ عباسی اور فتح بن خاقان کے درباروں میں نہایت عزت و حرمت سے عمر گذاری، جب یہ دونوں قتل ہو گئے تو وطن اصلی منبج کی طرف شام میں لوٹ آیا اور ۲۸۴ھ میں منبج ہی میں انتقال کیا۔ رحمہ اللہ وغفرلہ

علم محاضرة الادباء

رأس محاضرة ابو الفرج الذى		هو اصبهانى لدى استيطان

ادیبوں کے کلام کا جامع اور اس صنعت میں رأسِ رئیس ابو الفرج اصبہانی گذرا ہے۔

ابوالفرج بن الحسن اصبہانی صاحب کتاب الاغانی، بنوامیہ میں سے ہیں۔ ۲۸۴ھ میں ولادت ہوئی ہے، یہ وہی سال ہے جس میں بحتری مشہور شاعر کا انتقال ہوا ہے۔ نہایت زبردست ادیب اور فنون عربیہ میں ماہر وحاذق تھے۔ علم تاریخ اور انساب پر نہایت وسیع نظر تھی، محاضرات ادباء اور ان کے متعلق معلومات میں یگانۂ عصر تھے۔

تنوخی کہتے ہیں کہ ابوالفرج سے زیادہ میں نے شعر اور اغانی اور اخبار وآثار اور احادیث اور انساب کا حافظ کوئی نہیں دیکھا، اس کے ساتھ ہی نحو، لغت اور خرافات وظرافات اور سیر ومغازی کا بھی ایک بڑا حصہ ان کے قبضہ میں تھا۔ پھر علم جوارح، نجوم وطب وغیرہ میں دستگاہ رکھتے تھے۔ علماء، ظرفاء اور شعراء کے چیدہ چیدہ کلام کا حافظ اپنے وقت میں ان کے سوا دوسرا نہ تھا، سفر کرتے تھے تو تیس اونٹوں پر کتب خانہ مطالعے کے لئے ساتھ رہتا تھا، مگر جب کتاب الاغانی لکھی ہے تو پھر صرف اسے ہمراہ رکھ لینا تمام کتب خانہ کے مقابلہ میں کافی سمجھ لیا تھا۔

تصانیف میں کتاب الاغانی، کتاب القیان، کتاب الاماء الشواعر، کتاب الدیارات، کتاب دعوۃ الاولیاء، کتاب مجرد الاغانی، کتاب الالحانات وآداب الغرباء وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اغانی لکھ کر (جس پر علماء کا اجماع ہے کہ اس فن میں اس کے سوا دوسری کتاب لکھی ہی نہیں گئی) سیف الدولہ بن حمدان کے دربار میں پیش کی، سلطان نے ایک ہزار اشرفی عطا کی اور معذرت بھی کی۔

وزیر مہلبی کے یہاں زیادہ رسوخ تھا، اس کی مدح میں متعدد قصائد بھی پیش کئے ہیں، بدھ کے دن ۱۴/ذی الحجہ ۳۵۶ھ میں انتقال کیا اور بغداد میں دفن ہوئے۔ اسی سنہ میں علماءِ شہیر میں سے ابوعلی قالی اور سلاطین میں سے سیف الدولہ بن حمدان مذکور اور معز الدولہ بن بویہ اور کافور اخشیدی کا بھی انتقال ہوا۔ رحمہم اللہ۔

صنعتِ انشاء

والفاضل القاضی غدا فی عصرہ		فی صنعۃ الانشاء ذا اتقان

اور قاضی فاضل صنعت انشاء پردازی میں اپنے زمانہ کا بختہ کار تھا۔

ابوالعلی عبدالرحیم القاضی اشرف بہاؤالدین معروف بہ القاضی الفاضل، سلطان صلاح الدین کے وزیر تھے اور صنعت انشاء پردازی میں متقدمین سے بھی گوئے سبقت لے گئے تھے۔ صنعتِ انشاء میں کثرت سے ان کے عجائب وغرائب ہیں، ان کی انشاء پردازیوں کے اوراق کو جمع کیا گیا تو سو جلدوں سے کم نہ نکلے، اسی لئے عماد کاتب اصبہانی نے ان کا لقب ''رب القلم والبیان'' رکھا تھا، پھر سلطان مرحوم کے بیٹے ملک العزیز کا زمانہ بھی پایا اور وہ ان کی طرف اپنے باپ ہی کی حیات میں مائل تھا، جب ملک العزیز کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا ملک التصور تخت نشین ہوا اور اپنے چچا سلطان نور الدین کی تدبیر سے امورِ سلطنت انجام دیتا رہا، یہاں تک کہ ملک عادل نے دیارِ مصریہ کو فتح کیا اور جب کہ قاہرہ میں فاتحانہ داخل ہو رہا تھا تو شب چہار شنبہ ۷/ربیع الثانی ۵۸۷ھ کو اچانک قاضی فاضل کا انتقال ہو گیا اور قزاقہ صغریٰ میں دفن کئے گئے۔ قاضی فاضل نے قاہرہ میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جس کا افتتاح شروع محرم ۵۸۰ھ یوم سبت سے خود ہی کیا تھا، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

فنِ خطابت

احلاھم خُطبًا فابن نباتۃ		شھدوا بانّ لہ حتی بیان

فن خطابت میں شیریں بیان ابن نباتہ تھا جس کے کھلے کھلے بیانات کی اہل نظر نے شہادت دی ہے۔

ابویحییٰ عبدالرحیم بن محمد بن اسمٰعیل ابن نباتہ خطیب، فنونِ ادبیہ میں امام، خطبات میں یکتائے دہر ہوئے ہیں۔ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ خطابیہ میں ان جیسی طبیعت کسی نے نہیں پائی۔ سیف الدولہ کے دربار میں ابن نباتہ اور متنبّی جمع ہو گئے ہیں، سیف الدولہ چونکہ مجاہد تھا اور بہت سے معرکے اس نے سر کئے تھے اس لئے ابن نباتہ کے اکثر خطبے ترغیبِ جہاد اور نصرتِ سیف الدولہ کے متعلق ہوئے ہیں، ان کا خطبہ منامیہ مشہور ہے جو خواب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر انھوں نے سنایا۔

آپ نے خوش ہو کر فرمایا میرے قریب آ، قریب ہوئے تو آپ نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا اور ان کے منہ میں لعابِ مبارک ڈالا اور فرمایا خدا تجھے توفیق دے۔ جب یہ بیدار ہوئے تو قلب میں

بے انتہا سرور بھرا ہوا تھا، منہ میں مشک کی خوشبو آتی تھی، بھوک پیاس قطعاً نہیں رہی۔ کھانا پینا یک لخت چھوٹ گیا، چہرے پر ایک خاص نور چمکتا ہوا محسوس ہونے لگا اور خوشی اور مسرت ہر وقت بشرہ سے ٹپکنے لگی، اور پھر خطیب موصوف زیادہ مدت زندہ نہیں رہے بلکہ ۱۸/دن کے اندر وفات ہوگئی۔ مؤرخ ابن ارزق کا بیان ہے کہ ابن نباتہ ۳۳۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۷۴ھ میں وفات پائی، میافارقین میں دفن ہوئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

علم النوادر

والاصمعی امامھم وفریدھم		فی حفظہ النوادر الازمان

اور اصمعی امام اور یکتا تھے نوادر اور عجائباتِ عالم کی یادداشت میں۔

ابو سعید عبد الملک المعروف بہ اصمعی لغت اور نوادر میں امام گذرے ہیں۔ ۱۲۲ھ میں پیدا ہوئے، مصری الاصل ہیں مگر غیر معمولی علم کی بدولت بغداد میں ہارون رشید کے دربار نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسکے مقربِ خاص ہوگئے۔ ابو اسحٰق موصلی کہتے ہیں کہ میں نے کوئی دعویٰ اصمعی کا ایسا نہیں دیکھا کہ اس کے بارہ میں سب سے زیادہ انھیں اُعلم نہ پایا ہو۔

اصمعی کہتے ہیں کہ میں اور ابو عبیدہ لغوی ایک دفعہ فضل بن ربیع وزیر کے یہاں جمع ہوگئے، فضل نے مجھ سے پوچھا کہ تو نے گھوڑوں کے اسماء میں کتنی کتابیں لکھی ہیں؟ میں نے کہا ایک جلد، پھر ابو عبیدہ سے پوچھا کہ آپ نے کتنی، انھوں نے کہا ۵۰ جلدیں، فضل نے ابو عبیدہ سے کہا کہ اچھا کھڑے ہو جاؤ اور اس گھوڑے کے عضو عضو پر ہاتھ رکھ کر اس کا لغت بتاتے جاؤ، ابو عبیدہ نے کہا کہ کوئی میں بیکار ہوں، میں نے تو یہ لغات اہل عرب سے سن کر جمع کر دیئے ہیں۔

پھر اصمعی سے کہا کہ کھڑے ہو اور تفصیل وار اعضاء کے متعلق لغت سناؤ، میں کھڑا ہوا اور پہلے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور اس کے لغات گنا دیئے، پھر نیچے اترا اور ترتیب وار تمام اعضاء کے اسماء مع شواہد و اشعارِ عرب تفصیل وار بیان کر دیئے۔ جب فارغ ہوا تو فضل نے کہا کہ یہ گھوڑا تمہارا ہے، میں خوشی خوشی لے آیا اور جب کبھی مجھے ابو عبیدہ لغوی کو بھڑکانا ہوتا تھا تو اسی گھوڑے پر سوار ہو کر اس

کے پاس چلا جاتا تھا۔ صفر ۲۱۶ھ بمقام بصرہ وفات پائی، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

علم النحو

والنحو علم سیبویہ امامہ		فتری النحاۃ لہ ذوُو اذعانٍ

علم نحو کا امام سیبویہ تھا، اسی وجہ سے تم دیکھو گے کہ تمام نحوی اس فن میں اس کا اعتبار کرتے ہیں۔

ابو بشر عمرو بن عثمان بن قنبر الملقب بہ سیبویہ، فن نحو میں تمام متقدمین ومتأخرین سے اَعلم گذرا ہے، اس کی نحوی تصنیف یعنی کتابِ سیبویہ سے بہتر کوئی کتاب فنِ نحو میں نہیں لکھی گئی۔

جاحظ کہتے ہیں کہ میں نے معتصم باللہ کے وزیر (محمد بن عبدالملک الزیات) کے پاس حاضری کا ارادہ کیا تو سوچتا رہا کہ کیا ہدیہ لے جا کر پیش کروں، آخر کار کتاب سیبویہ سے بڑھ کر کوئی اشرف ہدیہ نہ پایا جس کو میں نے فراء (نحوی) کی میراث میں سے خریدا تھا۔ جب میں حاضر ہوا اور یہ ہدیہ پیش کیا تو وزیر نے خوش ہو کر کہا کہ خدا کی قسم اس کتاب سے زیادہ مرغوب ہدیہ میرے لئے اور کچھ نہ ہوتا، سیبویہ نے فنِ نحو خلیل ابن احمد سے اور فنِ لغت اخفش سے حاصل کیا، خلیل کے اعلیٰ ترین تلامذہ میں سے تھا، معاویہ ابن بکر علیمی کہتے ہیں کہ میں نے سیبویہ کی کتاب دیکھی تو اس کے قلم کو اس کی زبان سے زیادہ بلیغ پایا، سیبویہ فارسی لقب ہے جس کا عربی ترجمہ سیب کی خوشبو ہے، یا ویہ حرفِ تشبیہ ہے، جس کے معنی ہیں سیب کی مانند، چونکہ سیبویہ نہایت ہی خوبصورت صاحبِ جمال تھا اور اس کے رخسار سیب کی طرح سرخی سے دمکتے تھے، اس لئے یہ لقب پڑ گیا۔

سیبویہ بغداد پہنچا اور کسائی نحوی سے جو امین (ہارون رشید) کا معلم تھا، ملاقات ہوئی، کسی عربی ضرب المثل کے متعلق علمی بحث چھڑ گئی، آخر کار فیصلہ کسی اعرابی پر ٹھہرا، اعرابی نے سیبویہ کی تصویب کی، لیکن پھر ڈرا دھمکا کر اس کو کسائی کی تائید پر مجبور کیا گیا اور ایک بڑی مجلس میں اس سے کسائی کی ہمنوائی کرائی گئی تو سیبویہ رنجیدہ ہو کر بغداد سے واپس ہو گیا اور بلادِ فارس کا قصد کیا، اور شیراز کے ایک قریبی گاؤں بیضاء میں کچھ اوپر چالیس سال کی عمر میں انتقال کیا۔ سنہ وفات ۱۸۰ھ ہے، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

علم العروض

اما الخلیل ففی العروض قدار تقیٰ		او ج الکمال فصار ذا سلطان[۱]

اور خلیل فنِ عروض میں اس قدر اوجِ کمال پر چڑھا کہ اس فن کا بادشاہ بن گیا۔

یہ وہی خلیل ابن احمد نحوی ہے جس کو سیبویہ کی استادی کا فخر حاصل ہے، فنِ عروض کو اسی نے ایجاد کیا اور عروض کے اقسام کو پانچ دائروں میں منحصر کر کے ان پانچ دائروں سے پندرہ بحریں پیدا کیں۔ اخفش نے صرف ایک بحر (خبب) کا ان میں اضافہ کیا، لیکن **و الفضل للمتقدم** کہتے ہیں کہ خلیل نے مکہ مکرمہ میں دعاء کی تھی کہ مجھے ایسا علم دیا جائے کہ اب تک کسی کو نہ ملا ہو، تو حق تعالیٰ نے علم عروض کی طرف اس کی راہ نمائی فرمادی، اسی لئے حمزہ ابن حسن اصبہانی نے اپنی کتاب التنبیہ میں دعویٰ کیا ہے کہ دولتِ اسلامیہ نے کسی ایسے فرزند کو سوائے خلیل کے پیدا نہیں کیا کہ جس نے ایک ایسے علم کی بنیاد رکھی ہو جس کی کوئی اصل اہلِ عرب کے پاس موجود نہ تھی، کیونکہ یہ فن نہ اس نے کسی حکیم سے اخذ کیا نہ کسی پہلے نقشِ قدم اور مثال کو دیکھ کر اس نے اس فن کی بنیاد ڈالی، بلکہ صفارین کی ایک گذرگاہ پر جاتے ہوئے صرف ایک ہتوڑے کی آواز سے جو کسی طشت میں لگنے سے پیدا ہوتی تھی اک دم اس کی توجہ اس فن کی ایجاد کی طرف پھر گئی، حالانکہ یہ صوتِ محض جس میں نہ کوئی بیان تھا نہ حجت، اس فن کی ایجاد کے لئے کوئی بھی متناسب سبب نہ تھی، اگر اس صوت ہی کو اس فن سے طبعی طور پر کوئی مناسبت ہوتی تو ابتدائے آفرینش عالم سے آج تک کوئی تو خدا کا بندہ اس طرف متوجہ ہوتا، اور اس فن کو ایجاد کر دیتا۔ پس یہ فضلِ تقدم قدرت نے خلیل ابن احمد ہی کے لئے مخصوص فرمایا تھا جو اسے مل گیا، خلیل ایک مردِ صالح، عاقل حلیم باوقار انسان تھا، غناءِ نفس کے سبب کبھی دو پیسے بھی اس کے پاس جمع نہیں ہوئے، حالانکہ اس کے ہم عصروں نے بہتیری دولتیں جمع کیں، اس بارے میں خود اسی کا شعر ہے ؎

والفقر فی النفس لا فی المال نعرفه		ومثل ذاك الغنی فی النفس لا المال

اس کی بیان کردہ حِکم میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کی عقل اور ذہن چالیس برس میں حدِ کمال کو پہنچتی ہے اور یہی سنہ ہے جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کئے گئے، اور عقل وذہن میں تغیر اور نقصان تریسٹھ برس کے بعد شروع ہو جاتا ہے اور یہی سنہ ہے جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات دیئے گئے۔ ۱۰۰ھ میں پیدا ہوا اور ۱۷۰ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ اکثر یہ شعر وردِ زبان رہتا تھا۔

واذاافترقت الی الذخائر لم توجد		ذخرا یکون کصالح الاعمال

علم نجوم

ابو معشر فرد النجوم فریدھم		ضبطَ البروج وکان ذا امعان

علم نجوم کا امام ابو معشر تھا، نجوم کے بروج اور زائچے وغیرہ نہایت گہری نظر سے اس نے ترتیب دیئے ہیں۔

ابو معشر جعفر ابن محمد بن عمر البلخی منجم مشہور۔ فنِ نجوم میں امام گذرا ہے اور اس فن میں متعدد تصانیف مثل مدخل، المذاکرات، الالوف وغیرہ یادگار چھوڑی ہیں۔ عمر کا اکثر حصہ زمرۂ محدثین میں بغداد میں گذرا، چوہتر سال کی عمر میں علم نجوم میں گھسا، طباع اور ذکی تھا اور طبیعت میں اس سلسلہ سے ازلی مناسبت تھی، اس لئے بے روک ترقی کرتا چلا گیا اور مسائل فن میں اس کی رائے اصل نقطہ پر پہنچنے لگی۔ نجومی حساب سے اکثر امور کی قبل از وقت اطلاع کر دیتا اور بہت سے مخفی امور پر مطلع ہو جاتا، اس سے نقصانات بھی اٹھائے، مستعین باللہ خلیفۂ عباسی کے دور میں بعض امور کا قبل از وقت افشاء کر دیا، اس لئے دربارِ خلافت کی طرف سے کوڑے کھائے، مگر فن کا شغف اور مشغلہ طبعی تھا، اس لئے اسے نہیں چھوڑا۔

الموفق ابن المتوکل علی اللہ خلیفۂ عباسی کے دربار میں حاضر باش اور مقرب ہو گیا، اتفاقاً خلیفہ نے بعض امرائے دربار پر کسی جرم میں مقدمہ قائم کر کے سزا کا حکم سنا دیا، مجرم امیر روپوش ہو گیا، چونکہ ابو معشر کی طرف سے یہ خوف بھی لگا ہوا تھا کہ باوجود مخفی ہو جانے کے بھی وہ موقعِ روپوشی کی اطلاع دیدے گا، اس لئے اپنے اخفاء کی یہ عجیب وغریب صورت اختیار کی کہ ایک بڑے طشت میں

خون بھر کر اس میں سونے کی ایک موڑھے نما اوکھلی رکھدی اور اس پر بیٹھ گیا کہ اول تو ابو معشر اس ہیئت کی تعبیر کس طرح کر سکے گا اور اگر کرے گا تو ایسی انوکھی صورتِ اخفاء کی طرف کسی کو التفات کیا ہو سکے گا۔ بہر دوصورت میرا اور جائے اخفاء کا پتہ نہیں چل سکے گا، خلیفہ نے مجرم کی تلاش میں انتہائی سعی کی مگر پتہ نہ چلا، آخر کار ابو معشر کو حکم دیا کہ نجومی حساب سے موقع کا پتہ چلائے، ابو معشر نے اپنے فن کا عمل کیا، لیکن نتیجہ سامنے آنے پر حیرانی اور سکوت میں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ خلیفہ نے امر واقعہ دریافت کیا تو عرض کیا کہ حیران ہوں جس جگہ کا پتہ چلتا ہے وہ ایسی عجیب وغریب جگہ ہے کہ شاید عالم میں کہیں بھی نہ ہوگی، خلیفہ نے مشتاق ہو کر پوچھا کہ آخر کونسی جگہ نکلتی ہے، کہا کہ خون کے سمندر میں سونے کا ایک پہاڑ ہے جس پر وہ مجرم امیر موجود ہے، خلیفہ نے کہا کہ سبحان اللہ! کہیں دنیا میں ایسی جگہ آج تک کسی نے دیکھی یا سنی بھی ہے؟ دوبارہ اپنے عمل کو دیکھو اور نظر ثانی کرو۔

نظر ثانی کے بعد بھی ابو معشر نے موقع کی وہی صورت بیان کی، خلیفہ نے سراغ رسانی سے عاجز ہو کر بالآخر امان کا اعلان کر دیا کہ مجرم اور اس کو پناہ دینے والے خود ہی ظاہر ہو جائیں، جب مجرم مطمئن ہو گیا تو نکل کر حاضرِ دربار ہوا، خلیفہ نے پوچھا کہ آخر تو نے اپنے اخفاء کا کیا حیلہ اختیار کیا تھا؟ اس نے طشتِ خون اور سونے کی ہاون کا قصہ بیان کیا، خلیفہ اور تمام دربار اس کی ذہانت اور اس عجیب حیلہ سازی پر متعجب ہوئے اور ابو معشر کی فن دانی اور لطافتِ طبع کی داد دی گئی۔

۲۷۲ھ میں ابو معشر نے وفات پائی ہے، سنہ ولادت کا تاریخوں سے کوئی پتہ نہیں چلتا۔

(ماخوذ از دائرۃ المعارف وابن خلکان)

صنعتِ خوشنویسی

اما علی ابن الهلال ففردهم		فی حسن خطٍ ماله مثیل

لیکن علی ابن ہلال لوگوں میں یکتا تھا حسنِ خط اور خوشنویسی میں اس کی عجیب شان تھی۔

ابوالحسن علی بن ہلال مشہور کاتب اور خوشنویس ہے، خطِ کوفی کا امام گذرا ہے، چوں کہ علی بن ہلال کا باپ دربان اور پردہ دار تھا اس لئے ابن ابواب اور ابن الستری کے لقب سے بھی مشہور ہے،

گوابوعلی ابن مقلہ سب سے پہلا وہ شخص ہے جس نے خطِ کوفی کا طریقہ رائج کیا، مگر خط کی تہذیب و تنقیح اوراس میں نوک و پلک کا پیدا کرنا ابن ہلال ہی کا کام تھا۔

اس فن میں ابن ہلال کا استاذ ابوعبداللہ بن محمد بن اسد بغدادی تھا جوایک فاضل عالم اور ماہر کاتب تھا۔

کاتبوں میں یہ مثل مشہور ہوگئی تھی کہ فلاں خط حسن میں ابن ہلال کے خط کی مانند ہے۔ابن ہلال کی ایک تحریر کے متعلق جوصابی ابن ہلال شاعر کے رسائل میں سے علی ابن ہلال نے نقل کی تھی، حلب کے ایک فقیہ نے ذیل کے اشعار پڑھے تھے۔

ھمت بہ حتی توھمت لفظہ		نجوم لیال او سموط لآلی
کتاب کوشی الرد من خطت سطورہ		یدین ھلال عن فم ابن ھلال

میں اس عبارت اور تحریر کے متعلق سوچتا رہا یہاں تک کہ مجھے وہم ہوگیا کہ اس تحریر کے نقوش رات کے چمک دارستارے ہیں یا موتیوں کی کوئی لڑی ہے۔..................

ابن بواب کا انتقال جمعرات کے دن دوسری جمادی الاولیٰ ۴۴۳ھ کو بغداد میں ہوا،اور امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے جوار میں دفن کیا گیا۔رحمہ اللہ تعالیٰ

فنِ منطق

اما ابن سینا القرمطی فمصانع		للمسلمین بمنطق الیونان

لیکن ابن سینا قرمطی سواس نے مسلمانوں میں منطقِ یونان کو پھیلایا اوراس میں فائق تھا۔

یونان ما الیونان اکثر اھلھا		اھل الضلالۃ قدوۃ الشیطان

کون یونان؟ وہی یونان جس کا علمی طبقہ عامۃً (بوجہ دماغی تخیلات کو مدارِ عقائد ٹھہرا لینے کے) گمراہ ہوا ہے اور شیطان کا بھی مقلد بن گیا ہے۔

ماعندھم نور من الانوار بل		ھم فی ظلام الجھل کالعمیان

ان لوگوں کے پاس انوارِ الٰہیہ کا کوئی نور نہ تھا، بلکہ وہ اپنے علم نما جہل میں اندھوں کی طرح ہاتھ پاؤں مارتے رہتے تھے۔

شیخ الرئیس ابو علی حسین ابن عبد اللہ ابن سیناء مشہور حکیم ہے، بلخی الاصل ہے۔ اس کا باپ بلخ سے بخارا منتقل ہو گیا تھا۔ ماں کا نام ستارہ تھا۔ خرعثینا ضلع بخارا میں بماہ صفر ۳۷۰ھ ابن سینا کی ولادت ہوئی۔ ابن سینا نے ہوش سنبھال کر تحصیل علم کے لئے مختلف بلاد کے سفر کئے اور علوم وفنون نہایت تندہی سے حاصل کئے۔ دس سال کی عمر میں علومِ قرآن عزیز، ادب، اصولِ دین، حسابِ ہند، جبرو مقابلہ وغیرہ کی تکمیل کر لی۔ اس کے بعد حکیم ابو عبد اللہ ناتلی کے پاس منطق میں ایساغوجی شروع کی، پھر اقلیدس، مجسطی وغیرہ کی تعلیم پائی اور استاد سے اس درجہ فائق ہو گیا کہ اس فن منطق کے کتنے ہی رموز ومبہمات جو استاد پر بھی منکشف نہ تھے اس نے کھول دیئے اور اس کے بہت سے اشکالات حل کر دیئے۔ جب ناتلی خوارزم شاہ مامون بن محمد کے پاس چلا گیا تو بو علی نے علم طبیعی والٰہی وغیرہ کی تکمیل کی اور مطالعۂ کتب میں اوقات صرف کئے۔ طبع رسا اور ذہن وقاد پہلے سے تھا، مطالعہ اور وسعتِ معلومات نے اس کو جلاء دے دی۔ اس فن کے اوائل اور اواخر پر فائق ہو گیا اور اس کی ہستی بے نظیر سمجھی جانے لگی، بڑے بڑے اہل فن استفادہ کے لئے اس کے پاس آنے لگے۔

تحصیل علم کے زمانہ میں پوری رات کبھی نہیں سویا اور دن کا کوئی حصہ مطالعہ اور درس کے سوا کسی اور مشغلہ میں نہیں گذارا، اس پر جب کوئی مسئلہ مشکل ہو جاتا تو وضو کر کے مسجد میں حاضر ہوتا اور نماز پڑھ کے اللہ سے دعا مانگتا اور اس طرح اپنے اشکالات کو حل کر لیتا تھا۔ پھر علم طب میں مشغول ہو کر مہارت پیدا کی اور نئے نئے علاج اپنی طبیعت سے پیدا کئے۔

نوحؔ ابن نصر سامانی والیٔ خراسان بیمار ہوا تو اس نے ابن سینا کو علاج کے لئے بلایا اور اس کے علاج سے شفایاب ہوا۔ صحت یاب ہونے پر اس نے ابن سینا کی قدر کی اور اپنا مقرب بنا لیا اور اپنے بے نظیر کتب خانہ کا دروازہ ابن سینا کے لئے کھول دیا، ابن سینا نے ہر علم وفن کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اتفاقاً کتب خانہ میں آگ لگ گئی اور جل کر خاکستر ہو گیا تو ایک ابن سینا ہی اس کے علوم کا حامل رہ گیا اس لئے اور بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

غرض اٹھارہ سال کی عمر میں تمام علوم وفنون میں کمال حاصل کرلیا۔ابن سینا اوراس کا باپ دولتِ سامانیہ کے صیغۂ حکومت میں ملازمت کرتے تھے، جب دولت سامانیہ کا زوال ہوا تو ابوعلی خوارزم شاہ کی قلم رو میں چلا گیا۔لباس اور طرز ووضع فقیہانہ اور عالمانہ رکھتا تھا۔وہاں اس کی تنخواہ حکومت سے مقرر ہوگئی، پھر یہاں نساء، ابیورد اور طوس وغیرہ کا سفر کیا، وہاں سے دہستان اور وہاں سے جرجان پہنچا جہاں اس نے کتاب اوسط تصنیف کی جو اوسط جرجانی کے نام سے مشہور ہوئی۔ پھر وہاں سے رمی اور وہاں سے قزوین اور وہاں سے ہمدان آگیا اور شمس الدولہ شاہ ہمدان کی وزارت قبول کی، شمس الدولہ کی وفات کے بعد اصبہان چلا گیا اور علاء الدولہ ابوجعفر ابن کاکویہ کا مقرب بن گیا۔جس نے حسن سلوک اور احسان کا برتاؤ کیا، تقریباً ایک سو کتابیں تصنیف کیں، شفاء، اشارات، قانون، نجات، وغیرہ اس کی مشہور اور متداول تصنیفیں ہیں۔

ابوعلی قوی المزاج تھا اور جماع پر حریص تھا۔کثرتِ جماع نے اسے ضعیف کردیا تھا اور قسم قسم کے امراض بالخصوص قولنج نے بدن میں گھر کرلیا تھا۔ایک دن میں آٹھ آٹھ مرتبہ حقنہ کی نوبت آئی مگر جماع نہ چھوڑا۔حالت یہ ہوگئی کہ ہفتہ بھر اچھا اور ہفتہ بھر بیمار، دائم المرض بن گیا۔

پھر علاء الدولہ نے ہمدان کا قصد کیا اور ابوعلی ساتھ تھا راستہ میں قولنج پڑا۔ ہمدان پہنچ کر بیحد ضعیف ہوگیا اور کہنے لگا کہ میری مدبرۂ بدن عاجز ہوچکی ہے، اب کوئی علاج نفع نہ دے گا۔علاج ترک کردیا اور غسل کرکے توبہ واستغفار کی طرف متوجہ ہوا۔تمام مال صدقہ کردیا، لونڈی، غلام آزاد کردیئے اہل حقوق کے سب حق ادا کردیئے اور ہر تین دن میں ایک قرآن ختم کرتا تھا اور آخر کار رمضان ۴۲۸ھ یوم جمعہ کو ہمدان میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیا گیا۔ **یغفر اللہ لنا ولہ آمین۔**

صنعتِ اعتزال

وابو علی قد تفرد مبدعا		للاعتزال فصار ذا بطلان

اور ابوعلی جبائی یکتائے ہوا ہے اعتزال میں، گویا موجدِ اعتزال ہے اور اسی لئے حق کما حقہٗ نہ پاسکا۔

ابوعلی محمد بن عبدالوہاب جبائی ۲۳۵ھ میں پیدا ہوا ہے، مشہور فلسفی معتزلی ہے، ائمہ اعتزال میں سے گذرا ہے۔ مذہب اعتزال میں اس کے بڑے بڑے مقالات مشہور ہیں، شیخ ابوالحسن اشعری رئیس المتکلّمین اس کے تلامذہ میں سے تھے۔لیکن حق تعالیٰ نے انہیں اعتزال سے بچا کر اہل سنت والجماعت کی خدمت کے لئے چھانٹ لیا اور الگ کرلیا، استادو شاگرد میں بگڑنے کی وجہ ایک مشہور مناظرہ ہے جس کو علماء نے روایت کیا ہے کہ شیخ ابوالحسن نے اپنے استاد ابوعلی جبائی سے ایسے تین آدمیوں کی نسبت سوال کیا کہ ایک ان میں سے مومن تقی ہو، دوسرا کافر شقی ہو اور تیسرا بچہ ہو، اور وہ انتقال کر جائیں تو ان کا کیا حال ہوگا؟

جبائی نے کہا کہ مومن درجاتِ جنت میں جائے گا اور کافر درجاتِ جہنم میں رہے گا اور بچہ اہل سلامت میں سے ہوگا، جو نہ درجات پر فائز ہوگا اور نہ درکات میں ڈالا جائے گا۔

اشعری نے کہا کہ اگر بچہ یہ چاہے کہ مجھے بھی مومن تقی کے سے درجات مل جائیں تو کیا اسے حق تعالیٰ کی طرف سے اجازت مل سکتی ہے؟ جبائی نے کہا کہ ہرگز نہیں! کیوں کہ اس سے کہا جائے گا کہ اگر مومن تقی کو درجات دیئے گئے ہیں تو اس کی کثیر طاعات کی وجہ سے جو تو نے انجام نہیں دیں۔ اشعری نے کہا کہ اگر بچہ یوں کہے کہ الٰہی اس میں میرا کیا قصور تھا آپ ہی نے تو مجھے جوان بالغ نہیں کیا اور نہ طاعات پر قادر ہونے دیا؟ جبائی نے کہا کہ حق تعالیٰ فرمادیں گے کہ میں جانتا تھا کہ اگر تو باقی رہتا اور جوان ہوتا تو گناہ کرتا اور جہنم کا مستحق ہوتا۔ پس میں نے تیری مصلحت کی رعایت کی۔ اشعری نے کہا کہ اگر کافر شقی کہنے لگے کہ الہ العٰلمین جیسے تو اس بچہ کا آئندہ حال جانتا تھا میرا آئندہ حال بھی تجھے معلوم تھا، تو اسکی مصلحت کی تو تو نے رعایت فرمائی اور میری رعایت نہ فرمائی؟ جبائی مبہوت وحیران رہ گیا اور غصہ سے ابوالحسن اشعری کو کہا کہ تو پاگل ہے۔ اشعری نے کہا کہ میں تو پاگل نہیں ہوں مگر شاید کہیں شیخ کا گدھا ایڑیوں کے بل کھڑا ہو گیا ہے (جو آگے نہیں چل سکتا اور پیچھے کی طرف چت گرنے کو ہے)۔

پس جبائی بگڑ کر شیخ سے الگ ہو گیا اور آپس میں انقطاع ہو گیا۔ پھر اتفاق سے جبائی نے ایک جلسہ کیا جس کا موضوع تذکیر وموعظت تھا جس میں کثرت سے مرد وعورت شریک ہوئے، شیخ

ابوالحسن اشعری بھی چھپ کر ایک کونے میں بیٹھ گئے اور ایک بوڑھی عورت کو چند سوالات سکھلا دیئے اور یہ کہ اگر جبائی یہ جواب دے تو پھر یہ سوال کرنا اور پھر اس کا یہ جواب دے تو یہ سوال کرنا۔

بڑھیا نے بھرے مجمع میں سوالات شروع کئے اور سوال بعد الجواب شروع کر دیئے۔ آخر کار جبائی خاموش رہ گیا اور ساکت ہوا، اور پھر پتہ چل گیا کہ فلاں کونے میں شیخ ابوالحسن بیٹھے ہیں، یہ انہیں کی کارستانی ہے بڑھیا کی نہیں ہے۔ جبائی جُبِّــــی کا رہنے والا تھا جو ایک طویل وعریض شہر تھا، جس کو کھجوروں اور گنوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ شعبان ۳۰۳ھ میں وفات پائی۔

فنِ موسیقی

والـموصلیُّ ومعبد فکلا ھما		فی حسن صَوت والغناء فردان

اور موصلی اور معبد دونوں کے دونوں حسنِ لحن اور موسیقی میں فرد ہوئے ہیں۔

ابراھیم بن ماھان (یا میمون) بن بھمن بن منسك التمیمی۔ مشہور مغنی ہے ابن ندیم کے نام سے معروف ہے، فارسی الاصل ہے، اس کا باپ ماہان بنی امیہ کے ظلم سے تنگ آ کر ایک جماعت کے ساتھ کوفہ میں چلا آیا تھا، اسی جماعت میں ایک دہقانی کی لڑکی بھی تھی، ماہان نے اس کے ساتھ نکاح کر لیا اور اسی سے ۱۲۵ھ میں ابراہیم پیدا ہوا۔ ابراہیم کو دو سالہ چھوڑ کر باپ کا انتقال ہو گیا اور آلِ خزیمہ نے جو ابراہیم کے قبیلہ کے لوگ تھے اسے اپنی تربیت میں لے لیا، جوان ہو کر نوجوانوں کی صحبت ومعاشرت سے اسے گانے کا شوق پیدا ہوا، مربیوں نے اس بارہ میں سخت گیری شروع کی تو بھاگ کر موصل چلا آیا اور اسی لئے موصلی کی نسبت سے مشہور ہوا۔

علی بن نافع سے جو مہدی خلیفۂ عباسی کا غلام اور ایک ماہر مغنی تھا، تغنی اور موسیقی کی تعلیم پائی ایک بہترین اور یگانۂ روزگار مغنی بن گیا۔ ابراہیم کے اس فن میں ترقی اور شغف کے اسباب میں سے ایک سبب اسی کی روایت کے موافق یہ بھی ہوا کہ وہ رَیّ میں مقیم تھا کہ ابوجعفر منصور خلیفۂ عباسی کا ایک سفیر کسی علاقہ کے گورنر کی طرف سفارت اور مراسلہ لے جاتا ہوا رَی میں سے گذرا، ابراہیم کو گاتے ہوئے سنا اور اس کی آواز اور لب ولہجہ پر فریفتہ ہو گیا، اسے خلعتِ فاخرہ عطا کیا اور چلا گیا، منزلِ

مقصود پر پہنچا تو علاقہ کے گورنر نے خلیفہ کا سفیر ہونے کی حیثیت سے بہت آؤ بھگت کی، سات ہزار درہم اور بہت سے خلعت دیئے، واپسی میں سفیر مذکور پھر رَی سے ہوکر گذرا اور ابراہیم کے پاس پہنچ کر اسے دو ہزار درہم اور آدھے خلعت دیدیئے، ابراہیم نے کہا کہ جس فن کے طفیل میں مجھے اتنا بڑا انعام اک دم ملا ہے میں اسی فن کی تکمیل میں اس دولت کو صرف کروں گا۔ چنانچہ فن میں منہمک ہوگیا، ۹۰۰ راگ کا ماہر ہوا، جس میں سے ۳۰۰ تو عموماً مغنیّوں کے زبان زَد تھے اور چھ سو ابراہیم کی مخصوصات میں سے تھے جن میں اہل فن اسی کی طرف رخ کرنے پر مجبور تھے۔ ہر مجلس میں وقت کے مناسب اور اہل مجلس کی ذہنیت کے موافق راگ شروع کرتا اور مجلس کو تڑپا دیتا تھا۔

الہادی خلیفہ عباسی کے دربار میں منظورِ نظر رہا ہے، خلیفہ نے بھی قدردانی میں کسر اٹھا نہیں رکھی، ایک ایک دن میں ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ درہم کی یافت ہونے لگی، ابراہیم کا بیٹا اسحٰق کہتا ہے کہ اگر ہادی کچھ اور زندہ رہتا تو ہم اپنے گھروں کی دیواریں سونے اور چاندی کی بنا لیتے، صرف ہادی کے دربار سے یک مشت عطا کی صورت میں جو نقود حاصل کئے ہیں ان کی مقدار چوبیس لاکھ درہم تک پہنچتی ہے۔ وظائفِ مقررہ اور سامانِ متفرقہ کی قیمت کا اوسط دس ہزار درہم ماہوار پڑتا ہے، غلہ اور اجناس خلعت وغیرہ اس کے علاوہ ہیں۔ شاہی باورچی خانہ سے تین بکریاں روزانہ مقرر تھیں، ایک پکی ہوئی ایک مذبوح صاف شدہ اور ایک زندہ۔

ابراہیم بھی نہایت بامروت مہمان نواز تھا، اس کا باورچی خانہ بھی امراء کے مطبخوں سے کم نہ تھا، اگر پکی ہوئی سالم بکری کافی نہ ہوتی تو دوسری مذبوح پکائی جاتی، وہ بھی مہمانوں کی کثرت اور اہل مجلس کی وسعت میں ناکافی ہوجاتی تو تیسری ذبح کی جاتی، نیز تین ہزار درہم نقد باورچی خانہ کے اخراجات کے لئے ماہانہ مقرر تھے، پھر سلطانی عطایا کے علاوہ امراء کے یہاں دعوتی رقعوں پر مدعو ہوتا تھا اور بڑے بڑے انعامات حاصل کرتا تھا۔ اس پر بھی مرتے وقت کل تین ہزار دینار چھوڑے ہیں اور سات ہزار دینار قرضہ چھوڑا جو اس کے بیٹے نے ادا کیا۔

ہارون رشید کی خلافت کا زمانہ پایا اور اس کی بھی کافی قدردانی دیکھی، اتفاقاً ہارون نے کسی بات پر ناراض ہوکر ابراہیم کو قید کر دیا تھا، اس کے بعد ایک دن مجلس نشاط ترتیب دی گئی اور اس کی

آرائش وزیبائش میں مبالغہ کیا گیا۔ سرمجلس ہارون رشید نے عیسیٰ ابن جعفر سے خطاب کر کے کہا کہ اس آج کی مجلس میں کوئی کمی اورعیب تو نہیں؟ عیسیٰ نے کہا ایک بڑی کمی یہ ہے کہ اس میں ابراہیم مغنی نہیں ہے، ہارون نے اسی وقت رہائی کا حکم صادر کیا، ابراہیم لایا گیا، قید کاٹی گئی اور گانے کا اشارہ خلیفہ کی طرف سے ہوا۔ ابراہیم نے ساز چھیڑا اور وقت کے مناسب راگ الاپنا شروع کیا، اس جوش سے گایا کہ تمام مجلس پر چھا گیا اور ایک کو دوسرے کی خبر نہ رہی، ہارون نے کہا کہ آج تو نے ہمیں مسرور کیا ہے ہم تجھے مسرور کریں گے، چنانچہ صبح کو دولاکھ درہم اس کے گھر پہنچا دیئے۔

فنِ غنا اس کے عجیب وغریب نوادر ہیں جن کی اس مختصر رسالہ میں گنجائش نہیں، ابراہیم کو آخر میں قولنج کا مرض لگ گیا تھا اور اسی مرض میں بالآخر بعمر ۶۳ سال ۱۸۸ھ میں انتقال کیا۔ عموماً اہل ملک اور خصوصاً موسیقی داں طبقہ تأسف اور ماتم میں سوگوار تھا، کیونکہ ابراہیم فن کی حیثیت سے تو اہلِ فن میں محبوب اور استاد شمار کیا ہی جاتا تھا، اپنی سخاوت اور خلق سے بھی عموماً ہر دل عزیز تھا۔ غفراللہ لہ ولنا (دائرۃ المعارف جلد اول) اسی نوع کے حالات معبد مغنی کے بھی ہیں، یہ دونوں قریب قریب ہم عصر ہیں اور ایک دوسرے میں چشمک بھی رہتی تھی۔

صفتِ کذب وصفتِ بزدلی

اما ابو الحسن الکذوب فانه		فی کذبه قد صار ذا خسران
اما عطاء بنی سلیم قد غدا		فی الجبن فردا سابق الاقران

لیکن ابوالحسن وہ اپنے جھوٹ میں ہی ٹوٹا کماتا رہا اور عطا سلمی بزدلی اور نامردی میں یکتائے زمانہ تھا۔

ابوالحسن مشہور کذاب ہے، زندقہ والحاد کی طرف فطرۃً طبیعت مائل تھی اور تمام عمر اسی قسم کی دسیسہ کاریوں میں مشغول بھی رہا۔ تقریباً چھٹی صدی میں جب کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اپنے علوم سے دنیا کو روشن فرمارہے تھے، ابوالحسن اپنی پُر فریب وکذب سازشوں اور خود مطلبیوں سے دنیا کو تاریک بنا رہا تھا۔ دیلم کے قریب پہاڑیوں کا ایک طویل اور متصل سلسلہ چلا گیا تھا جس پر جا بجا سلسلہ وار قلعے بنے ہوئے تھے، جن کو قلاع الموت کے نام سے پکارا جاتا تھا، لٹیروں اور قزاقوں یا

باغیوں کے لئے یہ مقام ایک محفوظ پناہ گاہ تھا، ابوالحسن نے اپنی ایک جماعت بنا کر ساری عمر کی ریشہ دوانیوں سے قلاع الموت پر قبضہ کرلیا تھا، اس مقام پر مطمئن ہوکر مذہبی رنگ میں کچھ دعوے بھی کئے اور بہت سے عوام الناس کو جھوٹ سچ دکھلا کر اپنے جال میں پھانسا، بعض سلاطین نے حملہ کر کے ان قلعوں کو ابوالحسن کے ہاتھ سے نکال لیا اور قلعوں کا محاصرہ کرلیا۔ ابوالحسن کو اپنی فکر ہوئی تو ایک محفوظ مقام میں چھپ کر روپوش ہوگیا، فاتح افواج نے اس مقام کو بھی گھیر لیا اور ابوالحسن کے لئے بھاگ نکلنے کی کوئی صورت نہ رہی۔

اپنی جان خطرے اور یقینی موت کے منہ میں دیکھ کر مٹی کے ایک بڑے مٹکے میں گھسا اور اوپر سے مٹکے کا منہ بند کرادیا، اور اپنے رفقاء کو وصیت کی کہ مٹکے کے نیچے آگ جلا کر مجھے خاک سیاہ کردیا جائے، اور جب سلطانی پیادے میری گرفتاری کے لئے آئیں تو یہ شہرت کافی طور پر دیدی جائے کہ ابوالحسن آسمان پر اڑ گیا ہے، گویا ابوالحسن نے جس طرح تمام زندگی بھر کذب اور فریب کو اپنا شعار بنائے رکھا، مرتے وقت بھی جھوٹ اور فریب بازی سے باز نہ آیا، اس لئے آج تک جھوٹ کے ساتھ دنیا میں مشہور ہے۔

ابوالحسن کا ترجمہ کسی کتاب میں میری نظر سے نہیں گذرا، مذکوہ چند کلمات حضرت سیدی واستادی علامہ محمد انور شاہؒ کی زبان سے سنے ہوئے ہیں جن کا لکھ دیا جانا موقع کے لحاظ سے کافی خیال کیا، اسی طرح عطاء سلمی مشہور بزدل اور ہیز ونامرد گذرا ہے، ادب کی بعض کتابوں میں اس کے کچھ منتشر حالات موجود ہیں جو اس وقت پیش نظر نہیں اور نہ کتاب ہی کا نام محفوظ ہے۔

صفتِ طمع

والغِرُّ اشعب واحد فی حرصه		مـانـال ذوطمع سوی الحرمان

اور بے چارہ اشعب بھولا بھالا اپنی حرص وطمع میں یکتا تھا، حالانکہ لالچی کو محرومی کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا۔

اشعب طماع، مشہور حریص ولالچی شخص ہے۔ تابعین کے دور میں ہوا ہے۔ مدینہ کا رہنے والا

ہے۔ حضرت عائشہ بنت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے اور ابن ابوالزناد کو اپنے تکفّل اور تربیت میں لے لیا تھا، پالا پرورش کیا، خلقی رخ حرص وطمع کی طرف تھا، یہاں تک کہ حرص وطمع میں مشہورِ زمانہ ہوگیا، عرب میں مثل مشہور تھی کہ فلاں اَشعب سے بھی زیادہ لالچی ہے۔

سالم ابن عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہم نے اشعب سے فرمایا کہ آخر تیری طمع کس حد تک پہنچ گئی ہے؟ کہنے لگا کہ اگر دو شخص کسی جنازے کے بارہ میں بھی سرگوشی کرنے لگتے ہیں تو میں اندازہ لگا لیتا ہوں کہ شاید میت نے مجھے ہی کچھ دینے کے لئے وصیت کی ہے جس کا یہ مشورہ ہو رہا ہے۔ ابن ابی الزناد نے اشعب سے کہا کہ تیری طمع کی کوئی حد بھی ہے؟ کہا کہ بس مدینہ میں جب کبھی کوئی عورت دلہن بنا کر زفاف کے لئے بھیجی جاتی ہے تو میں اپنا گھر اس طمع میں صاف کر رکھتا ہوں کہ شاید بھول کر اس دلہن اور اس کے جہیز کو کوئی میرے یہاں پہنچادے۔

بہر حال حرص وطمع میں اشعب بے اختیار ہو چکا تھا، اس کی حرص وطمع کسی واقعی چیز تک محدود نہ تھی بلکہ خیالی اشیاء پر بھی اس کی حرص اسی طرح دوڑنے لگتی تھی جس طرح واقعیات پر دوڑ سکتی ہے۔

ایک دفعہ اشعب کو بچوں نے ستانا اور پریشان کرنا شروع کر دیا، اشعب نے اکتا کر بچوں کو بہکانے اور ٹالنے کے لئے کہہ دیا کہ جاؤ فلاں جگہ مٹھائی بٹ رہی ہے، بچے اشعب کو چھوڑ کر اسی طرف بھاگ کھڑے ہوئے، کچھ دیر بعد یہ سوچ کر آپ بھی بچوں کے پیچھے پیچھے ہو لئے کہ شاید وہاں مٹھائی بٹ ہی رہی ہو۔ اشعب قبیلہ بنی ہلال کا ایک فرد ہے جو ایک باعزت قبیلہ تھا، مگر اشعب کی مشہورِ زمانہ حرص ولالچ کی بدولت لوگ پورے قبیلہ کو عار دلانے لگے تھے، **نعوذ باللّٰہ من الحرص والطمع الفاسد**۔ (سریشی شرح مقامات جلد ثانی)

صفتِ بخل

والبخل اجمعه بضاعة مادر		والبخل اقبح ديدن الانسان

اور کنجوسی کل کی کل مادر کا حصہ تھا حالانکہ کنجوسی انسانوں کے حق میں بدترین طریقہ ہے۔

مادر بخیل اپنے بخل کے سبب عرب میں سرنام ہوا ہے، مثل مشہور تھی **فلان ابخل من مادر**

(فلانا مادر سے بھی زیادہ بخیل ہے) مادر اپنے بخل میں صرف اسی حد پر نہ رہا تھا کہ اسکے قبضہ میں آئی ہوئی چیز سے کوئی دوسرا فائدہ نہ اٹھائے، بلکہ اس حد پر آ چکا تھا کہ وہ دوسروں کی نفع رسانی بند کرنے کی خاطر خود بھی محروم ہو جانا گوارہ کر لیتا تھا۔ چنانچہ مادر اپنے اونٹ کو پانی پلانے کے لئے ایک حوض پر لایا، پانی تھوڑا تھا جب اونٹ پی چکا تو پانی قلیل بچ گیا، مادر کو یہ گوارہ نہ تھا کہ اب اس پانی سے کوئی دوسرا آدمی یا جانور فائدہ اٹھائے، اور کچھ نہ ہوا تو اس میں پاخانہ ہی کر دیا کہ اس پانی تک کوئی نہ پہنچ سکے، گو خود بھی اس سے محروم ہو جانا پڑا، اسی طرح اس کے بخل کے اور واقعات بھی مشہور ہیں۔

امّا الذنوب قرابَ ارضَ ملئها		ثم العیوب وسائر العصیانٖ
ثم الخطایا والنقائص کلها		ثم الخُلُوّ من الکمال الدانی
فیها فواحد عصره هو طیب		ملءَ الندامة راجی الغفرانٖ

ہاں زمین بھر گناہوں پھر عیوب اور عام کوتاہیوں، پھر خطا کاریوں اور عموماً تمام نقائص پھر کمالات قرین صواب سے عاری ہونے میں ان تمام باتوں میں جو یکتائے زمانہ ہے وہ طیب (ناظم قصیدہ) ہے، مگر ساتھ ہی ندامت سے پُر ہے اور اللہ کی مغفرت کا امیدوار ہے۔

ابو سالم محمد طیب ابن حضرت مولانا محمد احمد رحمہ اللہ ابن حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم قدس سرہٗ بانیٔ دارالعلوم دیوبند، آل ابی بکرؓ میں سے ایک عاصی پُر معاصی شخص ہے، گو نسباً آلِ قاسم میں ہے مگر حسباً اس روشن کا نام بدنام کنندہ ہے۔

۱۸؍ رجب ۱۳۱۵ھ بمقام دیوبند ولادت ہوئی، تاریخی نام خورشید قاسم رکھا گیا، عمر کی ساتویں منزل شروع ہونے پر دارالعلوم کے ایک بھرے جلسہ میں مکتب نشینی کی تقریب ادا ہوئی، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ والد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ نے بسم اللہ کرائی، اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ والد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم نے مبارکباد کا قصیدہ پڑھا، جس سے تاریخ مکتب نشینی نکالی، قصیدہ کا مطلع یہ تھا۔

حبذا مکتبِ طیب کی مبارک تقریب		کچھ عجیب طرح کا جلسہ تھا ئی طرح کی سیر

اور مطلع جس سے تاریخ نکلتی ہے یہ تھا۔

ربِّ یسِّر جو کہا اس نے تو بے روئے ابا		فضلِؔ تاریخ میں بول اٹھا کہ تمِّم بالخیر

نویں سال کے اختتام پر حفظِ قرآن سے فراغت ہوئی اور فارسی تعلیم کا آغاز ہوا، تین چار سال میں یہ مرحلہ بھی اختتام کو پہنچا اور عربی تعلیم کا آغاز ہوا۔ ابتدائی کتب میں سے کافیہ حضرت شیخ الہندؒ نے شروع کرایا، چند سال میں یہ رسم بھی پوری ہوگئی، درسیات پر عبور بھی ہوگیا۔

۱۳۳۹ھ میں حضرت مرشدی ومولائی سیدی وسندی شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کے دستِ کرامت پر بیعت کا شرف نصیب ہوا، اور ایک ناپاک ہاتھ پاک ہاتھوں پر رکھا گیا۔

حضرت کے وصال پر حضرت قبلہ سیدی وسندی قطب العلوم مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی دامت برکاتہم کے دربارِ دُربار کی طرف رجوع کیا، انھوں نے بھی اپنی شفقت بے غایت سے اس غبار سے اپنا دامن نہیں جھٹکا، یہ ساری ہی رسمیں ادا ہوگئیں مگر خاکِ ناپاک خاک کی خاک ہی رہی۔

تہید ستانِ قسمت راچہ سود از رہبرِ کامل		کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

برسات میں ہزاروں کیڑے مکوڑے پیدا ہوجاتے ہیں، یہ وجود بھی اسی طرح صفحۂ ہستی پر ایک دھبہ کی طرح نمایاں ہوگیا۔ ع

وجودك ذنب لا يقاس به ذنب

ہاں ظلمت کا وجود اس لئے ضروری ہے کہ اس سے نور کا امتیاز واضح ہوتا ہے۔ رات کی اندھیری سے دن کی چمک کھلتی ہے، نادانوں کے وجود سے داناؤں کی قدر بڑھتی ہے اور نالائقوں کے تقابل سے لیاقت مندوں کی حقیقی عظمت نمایاں ہوتی ہے۔

اس لئے قصیدہ میں اشعب طماع، ابوالحسن کذوب، مادر بخیل، عطاء جبان اور طیب نالائق کا ذکر ضروری تھا کہ اوپر کے ذکر کردہ مشاہیر علوم وفنون کا امتیاز کھل جائے، ورنہ ع

ہمہ حیرتم کہ دہقان بچہ کار کشت مارا

وصفِ مخصوص اور صفتِ غالبہ بجز غلبۂ ہوا وہوس اور کچھ نہیں، عمر کی ساری گھڑیاں غلامیٔ نفس میں گذر گئیں اور گذر رہی ہیں، حق تعالیٰ کسی مقبول کی ہمتِ باطنی ادھر منصرف فرمادے کہ یہ خاک

ناپاک جوہر پاک ہوجائے، ورنہ ہستیٔ ناکارہ بجز ننگِ اسلاف اور عارِ اخلاف ہونے کے اور کوئی وصف اپنے اندر نہیں رکھتی۔ گناہوں سے شرمسار ہوں، ندامت سے اشکبار ہوں اور رحمت کا امیدوار ہوں، حق تعالیٰ شانہٗ نے آمد کو والدین اور متعلقین کے لئے باعثِ سرور فرمایا تھا، اس کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ روانگی کو میرے لئے باعثِ فرح وسرور فرمادے۔

بیا طیب ز ایں وآں گذر کن	بسوئے رحمت وفضلش نظر کن
یا ربنا اتمم لنا انوارنا	بنبیّك المختار من عدنان

اے ہمارے پروردگار ہمارے لئے نور کو مکمل فرما طفیل میں اپنے برگزیدہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جو آلِ عدنان میں سے ہوئے۔

واغفر لنا اسرافنا فی امرنا	واشمل بعفوك كلّ ذی ایمان

اور دین میں ہمارے حدود سے گذر جانے کو بخش دے اور اس معافی میں تمام ایمانداروں کو شامل فرما، آمین۔

احقر العباد

محمد طیب غفرلہ ولوالدیہ خادم دارالعلوم دیوبند

۲۰؍رمضان المبارک ۱۳۵۱ھ

سلسلہ تالیفات وافاداتِ حکیم الاسلامؒ
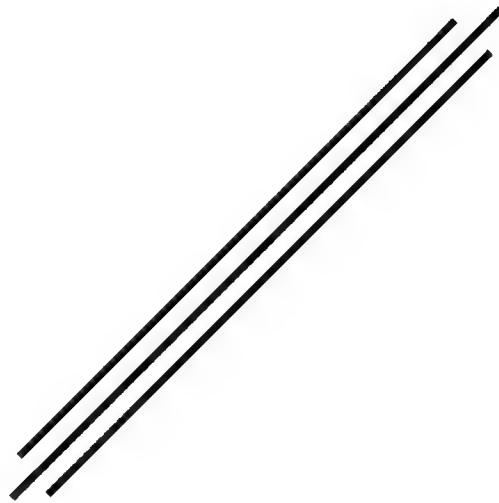
تاسیس دارالعلوم دیوبند
تاریخ وحقائق کی روشنی میں

تاسیس دارالعلوم دیوبند

تاریخ وحقائق کی روشنی میں

آغازِ سخن

سہ روزہ اخبار ''مدینہ'' بجنور کی ۹؍جولائی ۱۹۶۵ء مطابق ۹؍ربیع الاول ۱۳۸۵ھ کی اشاعت میں مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری کا ایک مضمون ''بانیٔ دارالعلوم دیوبند'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، اس کے بارے میں فاضل مضمون نگار نے اسی زمانے میں دارالعلوم دیوبند سے مراسلت بھی فرمائی تھی، اس سلسلے میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ایک طویل مضمون سپردِ قلم فرمایا تھا، جس میں ''دارالعلوم دیوبند کا بانی'' کے عنوان سے تاریخ کی روشنی میں محققانہ بحث ونظر کے ساتھ حقائق کا جائزہ لے کر حقیقتِ حال کو واضح کیا گیا تھا۔

حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کا یہ مضمون اخبار ''مدینہ'' کی ۶ قسطوں (۱۷؍۱۱؍اکتوبر ۱۹۶۵ء، ۲۵؍اکتوبر، ۲۸؍اکتوبر، یکم نومبر اور ۵؍نومبر) میں شائع ہو چکا ہے۔

اس بصیرت افروز مضمون کی جامعیت وافادیت کے پیش نظر مناسب یہ تھا کہ اسے کتابی شکل میں بھی پیش کیا جاتا مگر اتفاق سے اس کی نوبت نہ آسکی، اس دوران میں بعض حضرات کی جانب سے اس کی کتابی صورت میں اشاعت پر توجہ بھی دلائی جاتی رہی، مگر بمصداق کل امر مرھون باوقاتھا اب ۱۴ سال کے بعد اس کی اشاعت کی نوبت آسکی ہے۔

مدت سے حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم کے نزدیک مندرجہ ذیل چار عنوانات پر کتابوں کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے:

(۱) سوانح قاسمی (۲) تاریخ دارالعلوم دیوبند (۳) بانئ دارالعلوم دیوبند (۴) مسلکِ دارالعلوم دیوبند۔

الحمد للہ اول الذکر دو کتابیں، سوانح قاسمی اور تاریخ دارالعلوم دیوبند طبع ہوچکی ہیں، تاسیس دارالعلوم دیوبند اسی سلسلے کی تیسری کڑی پیش کی جارہی ہے، چوتھی کتاب مسلکِ دارالعلوم دیوبند زیر تالیف ہے، اور امید ہے کہ انشاء اللہ جلد شائع ہوگی۔

(مولانا) محمد عبدالحق
معتمد دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند
۲۹ رصفر ۱۳۹۹ھ

قیامِ دارالعلوم

نحمدہ ونصلی ۔انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد جب دہلی کی سلطنت کے ساتھ دہلی کی درسگاہیں مٹ رہی تھیں، علمی خانوادوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تباہ وبرباد کیا جارہا تھا اور بظاہر اسبابِ علم دین کے لئے کوئی ظاہری سہارا باقی نہیں رہ گیا تھا کہ ہندوستان میں ان کا وجود قائم رہ سکے تو اللہ کی فیاض قدرت نے اعجازی طور پر وقت کے چند نفوسِ قدسیہ کے ہاتھوں دارالعلوم دیوبند کو وجود بخشا اور دیوبند جیسی کوردہ بستی میں جہاں علم سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا اور رسوم کی گرم بازاری تھی، یہ علم وہدایت کا سرچشمہ جاری ہوا، جس نے تھوڑی ہی مدت میں صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرونِ ہند یاغستان، افغانستان جزائر شرق الہند، جاوا، سماٹرا، تبت، چینی ترکستان، روسی ترکستان، خیوہ، بخارا، قازان، بلخ، برہما، افریقہ، شام، عراق اور حجاز تک اپنے علم کے دھارے پھیلا دیئے اور جو کام حکومتی یونیورسٹیاں اپنے کروڑوں روپے کے میزانیوں اور اقتدار کے زور وقوت سے نہ کرسکیں وہ کام اس غریب الحال ادارہ نے غریبوں کے معمولی پیسوں سے کردکھایا۔

دارالعلوم کی بناء کا مسئلہ

دارالعلوم کی تاسیس میں پیش قدمی کس نے کی جس پر بانی کا اطلاق کیا جائے؟ سو دارالعلوم اور ملک کے عام علمی حلقوں میں اس عظیم ادارہ کا بانی حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ العزیز کو سمجھا جاتا ہے جو عموماً زبانوں پر مذکور اور قلوب میں متعارف ہیں، لیکن کچھ عرصہ سے اس کے خلاف یہ منفی آواز کانوں میں پڑ رہی ہے کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ بانیٔ مدرسہ نہیں ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس منفی آواز کے لئے کوئی بنیاد نہیں ہے بلکہ کچھ پہلو ایسے ضرور موجود ہیں کہ ان کی رو سے بظاہر اس منفی آواز کی گنجائش بھی نکلتی ہے۔ یہ بحث الگ ہے کہ اس منفی آواز کی بنیادیں تاریخی طور پر کیا مقام رکھتی ہیں، تاہم آواز ہے اور اٹھی ہوئی ہے اور اس آواز کی تصدیق وتکذیب سے قطع نظر اس سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے بانیٔ مدرسہ دیوبند ہونے کی نفی کا تصور بعض حلقوں میں موجود ہے۔

سوانح قاسمی اور تاسیسِ دارالعلوم کا تذکرہ

تقریباً ۱۳۷۲ھ میں جب سوانح قاسمی کا مسودہ حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم کے قلم سے مرتب ہورہا تھا تو اس حلقہ کے بعض حضرات نے اس تصور پر کہ سوانح قاسمی میں یقیناً مدرسہ دیوبند کی تاسیس کا تذکرہ آئے گا اور ممکن بلکہ اغلب ہے کہ دارالعلوم اور عام علمی حلقوں کی شہرتِ عامہ کے مطابق بانیٔ مدرسہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کو ظاہر کیا جائے، ان کے پاس دیوبند سے ایک تحریر پہنچی کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا بانیٔ مدرسہ ہونا خلافِ واقعہ ہے بلکہ اس کے بانی حضرت محمد عابد صاحب دیوبندی ہیں۔

صفر ۱۳۸۵ھ کی مجلس شوریٰ دارالعلوم کے اجلاس سے کچھ قبل پھر اس حلقہ سے اراکین مجلس شوریٰ بشمول مہتمم کے نام الگ الگ مراسلے پہنچے جن میں اس منفی دعویٰ کی تجدید کی گئی تھی کہ حضرتِ والا بانیٔ مدرسہ دیوبند نہیں ہیں۔

پھر اس سے متصل ۹ / ربیع الاول ۱۳۸۵ھ کو اخبار مدینہ بجنور میں ایک مقالہ بعنوان ''دارالعلوم دیوبند کا بانی'' شائع ہوا جسکا مضمون تقریباً وہی ہے جو مذکورہ مراسلوں کا تھا اور بطور سندِ نفی وہی حجتیں اس میں بھی پیش کی گئی تھیں جو ان مراسلوں میں تحریر کی گئی تھیں جو اراکین مجلس شوریٰ کے نام بھیجے گئے تھے۔

مسئلہ بناء کی تنقیح

بہر حال یہ منفی آواز مخصوص حلقہ ہی کی کیوں نہ ہو مگر بار بار ذمہ دارانِ مدرسہ کے سامنے آتی رہی ہے، میرے خیال میں یہ کسی طرح مناسب نہ ہوگا کہ اس آواز کو صدا بصحرا سمجھ کر اس کا جواب خموشی سے دیا جائے جیسا کہ اب تک دیا جاتا رہا ہے، جب کہ اس صدا کی کچھ بنیادیں ہیں اور ان میں سے بعض دل لگتی بھی ہیں، اس لئے معقول بات یہ ہوگی کہ یا تو منفی دعویٰ تسلیم کیا جائے یا عدمِ تسلیم کی وجوہ ظاہر کی جائیں تا کہ دوسرے حضرات بھی مطمئن ہوسکیں اور ایک مسئلہ خواہ مخواہ بے وجہ مختلف فیہ اور نزاعی نہ بنا رہے، جس سے قلب میں بُعد کی آبیاری ہوتی رہے، جبکہ دارالعلوم سب کی مشترک

متاع ہے اور اس کے معاملات سے منفی پہلو کے دعویدار بھی اتنے ہی متعلق ہیں جتنا کہ مثبت پہلو کے مدعی ہو سکتے ہیں، اس لئے مناسب ہوگا کہ اس مشترک اور متفق علیہ پونجی کو ایک مسئلہ کے بے معنی اختلاف سے مختلف فیہ نہ بنایا جائے اور منفی اور مثبت حجتوں پر انصاف واعتدال کی نگاہ ڈال کر حقیقتِ واقعہ کا سراغ لگایا جائے تاکہ یہ مسئلہ نزاعی انداز سے قائم نہ رہے، البتہ حجت وبینہ سے ثابت شدہ چیز بھی کسی کے نزدیک قابل تسلیم نہ ہو تو یہ نزاع واختلاف کہلاتا ہے اور اس میں صاحبِ حجت معذور ہوتا ہے۔

بانیٔ دارالعلوم کوئی بھی فرد ہو یا جماعت، اصل شئے بناء ہے، جس نے مسلمانانِ ہند و بیرونِ ہند کو نظری اور عملی قدروں کے ساتھ راہِ استقامت پر ڈالا اور انھیں ایک خاص فکر عطا کیا، اور سو برس سے آج تک اس کی وہی افادی نوعیت قائم ہے۔ ظاہر ہے کہ بناء وتاسیس اینٹ پر اینٹ رکھ دینے کا نام نہیں ورنہ بانی معمار کو ہونا چاہئے، بلکہ حقیقی بناء وہ فکر ونظر اور وہ نصب العین ہے جس کے لئے کسی ادارہ کا آغاز کیا جائے، یہ الگ بات ہے کہ فکر سامنے آنے سے صاحبِ فکر یا مفکر ذات بھی طبعاً سامنے آجائے اور اس کی تاسیس کی نوبت پر کلام بھی کیا جائے، لیکن حقیقتاً مقصودِ اصلی بناء ہی رہتی ہے، اس لئے میرا روئے سخن بنیاد سے بانی کی طرف جانا ہے بانی سے بنیاد کی طرف آنا نہیں ہے اور اس لئے یہ مضمون محض اصولی اور تاریخی نقطہ نظر سے پیش کیا جارہا ہے جس میں بلحاظ بانی ابتداء ہی سے کوئی خاص متعین شخصیت پیش نظر نہیں، نیز یہ پیش کش بھی مثبت انداز سے ہے منفی طور پر نہیں، اس لئے اگر منفی پہلو کے مدعیوں پر کوئی تنقیدی نگاہ بھی ڈالی گئی ہے تو وہ صرف تحقیق کے ضمن میں ہے خود بذاتہ تنقید اصل یا مقصود نہیں۔

حاجی محمد عابد حسین صاحب اور بنائے دارالعلوم

نفی کے حلقے نے دارالعلوم دیوبند کا بانی حضرت حاجی عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو قرار دیا ہے لیکن عرض کردہ نقطہ نظر سے یہ زیر بحث ہی نہیں اور نہ حضرت ممدوح کے بانی ہونے سے کسی کو انکار ہے، خود احقر نے بھی اپنی متعدد تحریرات میں انھیں بانیانِ مدرسہ میں گنایا ہے، لیکن مسئلہ کا منفی پہلو کہ

انکے سوا کسی دوسرے پر بانی کا اطلاق نہیں ہوسکتا یا تشخیص کے ساتھ کہ فلاں بانی نہیں محلِ بحث ہے۔

بلاشبہ حضرت حاجی محمد عابد صاحب کو جن واقعات کی بنا پر بانی کہا گیا ہے وہ اپنی جگہ صحیح ہیں، لیکن واقعات صرف وہی نہیں بلکہ اور بھی ہیں اور اتنے ہی صحیح ہیں جتنے کہ یہ ہیں، اسلئے اگر کل واقعات کو سامنے رکھ کر نتیجہ اخذ کیا جائے تو وہ پورا اور مکمل ہوگا، ناقص اور ناتمام نہ ہوگا، اسلئے میں چاہتا ہوں کہ دوسرے واقعات بھی سامنے رکھدوں تا کہ اخذ کردہ نتیجہ جامع اور واقعات کا نچوڑ ثابت ہو۔

حضرت نانوتویؒ سے دارالعلوم کی نسبت

واقعہ نگاری کے سلسلے میں یہ خامہ فرسائی اس لئے نہیں، اور نہ ہونی چاہئے کہ ہم خواہ مخواہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو بانئ دارالعلوم ثابت کرنے کی غرض سے کوئی قلمی جدوجہد کریں اور سچ پوچھئے تو یہ کچھ حضرت ممدوح کے لئے فخر کی بات بھی نہیں کہ انھیں وقت کے ایک مقامی مدرسہ کے بانی یا مجوز کی حیثیت سے پیش کرنے کی سعی کی جائے جیسا کہ محترم مقالہ نگار مدینہ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے، کیونکہ ادارہ سے حضرتِ والا کی شخصیت نہیں بنی بلکہ آپ کے دور میں شرفِ مرکزیت ہی وہ ادارہ پاسکتا تھا جسے آپ سے کوئی نسبت ہو جاتی، اس لئے ظاہر ہے کہ دیوبند کے مدرسہ کی طرف آپ کو یا آپ کی طرف مدرسہ کو منسوب کرنے کی غرض یہ نہیں ہوسکتی کہ آپ کے مفاخر کی فہرست میں کوئی اضافہ کیا جائے، جبکہ آپ کی زندگی کے بلند ترین نصب العین کا خاکہ ایک ایسی ہمہ گیر اور جامع تحریک کی نوعیت لئے ہوئے ہے جس کے مختلف مظاہر میں سے یہ مدرسہ بھی ایک مظہر ہونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس مدرسہ کی ابتداء کی حد تک تو شاید حضرتِ والا کا تذکرہ کچھ زیادہ موزوں بھی نہ ہو پھر بھی یہ سطور محض تاریخی حیثیت سے صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے پیش کی جارہی ہیں کہ حقیقتاً تاسیسِ مدرسہ سے حضرت نانوتویؒ کے تعلق کی نوعیت کیا تھی؟ جس کی بنا پر آپ کو بانئ دارالعلوم کہا جاتا ہے۔

بناء کی روایات تحقیق وتجزیہ کی روشنی میں

نیز بانی سے متعلق روایات کے اختلاف وتضاد کی وجہ سے چونکہ یہ مسئلہ پیچیدہ اور معرکۃ الآراء بھی ہے اسلئے بحیثیت ایک مؤرخ کے یہ فریضہ ہر تاریخ نگار کے سامنے آنا چاہئے کہ ساری روایات پرنظر ڈال کر درایت وتنقیح کے ساتھ واقعات کی روشنی میں کوئی قولِ فیصل سامنے لے آیا جائے۔

بانئ دارالعلوم کے بارے میں روایتیں متعدد بھی ہیں اور باہم متعارض بھی، اگر یہ روایتیں افواہی ہوتیں تو ہوسکتا تھا کہ سب کو ساقط الاعتبار قرار دے کر ان میں سے کسی ایک کو قرائن وشواہد کی مدد سے ترجیح دیدی جاتی اور بقیہ کو رد کر دیا جاتا، لیکن آخر لکھی پڑھی دستاویزات کو کیا کہہ کر ٹھکرادیا جائے؟ پھر ایک آدھ کے علاوہ منسوب بھی ایسے ثقہ افراد اور نفوسِ قدسیہ کی طرف ہیں کہ جن کے نام سے ہمارا ہی نہیں ہماری روایت ودرایت ہی کا نہیں بلکہ اس دور کے پورے فنِ روایت کا اعتبار قائم ہوتا ہے۔ درصورتِ ثبوتِ روایات کسی ایک کا رَد اور کسی کا قبول بھی دشوار ہے کہ روایات کا رد وطرد درحقیقت اربابِ روایات کی تردید وتکذیب ہے، جبکہ یہی حضرات بانیانِ مدرسہ اپنے سوا ہر ایک کو بانی کہہ رہے ہیں، تو اضع پر محمول کیا جائے تو ایک ہی راوی کی دو مخالف روایتوں کے باہمی تخالف اور تضاد کو کیا کہا جائے؟ پھر ہر ایک روایت مثبت پہلو پر مشتمل ہے، منفی پہلو کہ ''فلاں بانی نہیں ہے'' کسی روایت میں نہیں، نفی خواہ لازم آجائے مگر اس کا التزام کسی روای یا مدارِ روایت نے نہیں کیا کہ ان روایات کو کسی مجادلہ ونزاع ہی کا ثمرہ کہہ کر رَد کر دیا جائے، اس لئے ان میں کافی احتیاط اور تعمق سے غور کر کے اصلیت کے سراغ لگانے کی ضرورت ہے اور یہ کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے کہ بیک جنبش قلم یہ کہہ کر معاملہ ختم کر دیا جائے کہ ''فلاں بانی نہیں ہے'' اور ''نہ ہوسکتا ہے''۔ ''بانی'' کی تشخیص کے سلسلہ میں روایات حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی روایت

حضرت اقدس مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اولین صدر مدرس دارالعلوم دیوبند نے تو

اپنی مؤلفہ مختصر سوانح قاسمی میں تین افراد کے مجموعہ کو بانی ومجوزِ مدرسہ کہا ہے، چنانچہ ایک جگہ یہ ذکر کرتے ہوئے کہ حضرت نانوتویؒ میرٹھ میں تھے اور میں نے ان سے اسی زمانہ میں ایک جماعت کے ساتھ صحیح مسلم پڑھی، فرماتے ہیں کہ:

''یہی وہ زمانہ تھا کہ مدرسہ دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی، مولوی فضل الرحمٰن اور مولوی ذوالفقار علی اور حاجی محمد عابد صاحب نے یہ تجویز کی کہ ایک مدرسہ دیوبند میں قائم کریں، مدرس کے لئے تنخواہ پندرہ روپے تجویز فرمائی اور چندہ شروع ہوا۔'' (مختصر سوانح قاسمی ص ۳۹)

(۲) سوانح مخطوطہ کے مصنف

حاجی فضل حق صاحب مرحوم کی روایت

سوانح مخطوطہ کے مصنف (منشی فضل حق صاحب مرحوم دیوبندی مہتمم ثالث دار العلوم دیوبند و متوسل خاص حضرت نانوتوی قدس سرہٗ) نے ان تین میں سے دو کو اس تفصیل سے مجوز و بانی کہا ہے کہ محرک مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی تھے اور بانی حاجی محمد عابد صاحب تھے۔ اس روایت میں مولانا ذوالفقار علی صاحب کا نام نہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''مدرسہ اسلامیہ دیوبند کی بناء اول آپ نے (حاجی محمد عابد صاحب نے) ڈالی تھی اور آپ ہی اس کے مربی وسرپرست ہیں۔ مختصر کیفیت اس کی (بنائے مدرسہ کی) جو لطف سے خالی نہیں عرض کرتا ہوں۔ سب سے پہلے مولوی فضل الرحمٰن صاحب دیوبندی سلمہ اللہ تعالیٰ اس مدرسہ کے محرک ہوئے اور چند بار آپ کی (حاجی محمد عابد صاحب کی) خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ اگر ایک مدرسہ علم دین کا جاری کیا جاوے تو خالی نفع سے نہ ہوگا۔'' (سوانح مخطوطہ محفوظ بہ خزانہ دار العلوم)

(۳) تذکرۃ العابدین کے مؤلف کی روایت

تذکرۃ العابدین کے مصنف جناب حاجی نذیر احمد صاحب مرحوم خلیفہ حضرت حاجی محمد عابد صاحب نے اس کے برعکس حاجی محمد عابد صاحب کو مجوز و بانی اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب کو محض

تعمیل کنندہ اور کار پرداز ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''جب حضرت حاجی صاحب (حاجی محمد عابد صاحب) نے دوبارہ چلہ کر لیا تو ایک روز آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، صبح کو مولوی فضل الرحمٰن صاحب وغیرہ کو بلایا اور فرمایا کہ علم دین اٹھا جاتا ہے کوئی تدبیر کرو کہ علم دین قائم رہے۔ جب پرانے عالم نہ رہیں گے تو کوئی مسئلہ بتانے والا بھی نہ رہے گا۔ جب سے دہلی کا مدرسہ گم ہوا ہے کوئی علم دین نہیں پڑھتا، اس وقت سب صاحبوں نے عرض کیا کہ جو تدبیر آپ فرمائیں وہ ہم کو منظور ہے، آپ نے فرمایا چندہ کر کے مدرسہ قائم کرو اور کاغذ لے کر اپنا چندہ لکھدیا اور روپے بھی جمع کر دیئے۔'' (تذکرۃ العابدین ص ۶۹)

(۴) حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کی روایت

حضرت اقدس حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ اجرائے مدرسہ کو تین افراد کی سعی کا ثمرہ ظاہر فرما رہے ہیں، حضرت نانوتوی، حضرت حاجی عابد حسین صاحب اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب۔ چنانچہ حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''اب اس مضمون کو ایک عظیم اور مقدس بشارت و علامتِ مقبولیت پر ختم کرتا ہوں اور وہ بشارت حضرت سیدی و مرشدی الحاج الحافظ الشاہ محمد امداد اللہ قدس سرہٗ کا ایک ملفوظ ہے جو مجموعہ مکتوبات کے مکتوب ہیچد ہم (۱۸) بنام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب و حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا ایک جزو ہے، جو ابتداءِ مدرسہ کے وقت صادر ہوا ہے۔

(ملفوظ) از اجرائے مدرسہ علم دین بسعی آں عزیزاں و عزیزم حافظ عابد حسین صاحب چہ خوش ہا رو نمود کہ بہ بیاں نمی آید۔'' (القاسم دار العلوم نمبر ۳۰ محرم ۱۳۴۷ھ)

(۵) حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب اور ان کے معاصرین کی روایت

حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب اپنی کتاب الھدیۃ السنیۃ میں (جو عربی زبان میں دیوبند، مدرسہ دیوبند اور منتسبین مدرسہ کے حالات پر مشتمل ۱۳۰۷ھ میں لکھی گئی ہے) صرف حاجی محمد

عابد صاحب کو بانی مدرسہ ظاہر فرمارہے ہیں جس کا ترجمہ اور ماحصل اردو زبان میں یہ ہے کہ:

''جب اللہ تعالیٰ شانہ وعز سلطانہ نے ان دیار کی خیر کا ارادہ فرمایا تو سید جلیل ذی نسب عالی فخر امثال وامجاد سید اجل محمد عابد ادامہ اللہ وابقاہ کو اس مدرسہ کی تاسیس کا الہام فرمایا جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی۔''

(الهدية السنية ص۲)

(٦) اسی کی تائید ذیل کی روایت سے بھی ہوتی ہے:

حضرت گنگوہی اور ان کے ساتھ مولانا حکیم ضیاء الدین رامپوری مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی، مولانا فضل الرحمٰن صاحب دیوبندی، حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی، منشی فضل حق صاحب دیوبندی ممبران مدرسہ سب ملکر حاجی محمد عابد صاحب ہی کو بانی ومجوزِ مدرسہ قرار دے رہے ہیں، چنانچہ ان چھ بزرگوں کے دستخطوں سے ۲۳/ جمادی الاولیٰ ۱۳۰۶ھ کو مولانا رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ کے حج کو جانے کے موقعہ پر ایک اشتہار شائع کیا گیا، جس میں حاجی محمد عابد صاحب کو دوبارہ مہتمم مدرسہ بنادیئے جانے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس اشتہار کی عبارت کا متعلقہ ٹکڑا یہ ہے:

''ناچار بجز اس تدبیر کے کوئی چارہ نہ بن پڑا کہ سب مجتمع ہو کر بخدمت بابرکت حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب دامت برکاتہ' (بانی ومجوزِ اول مدرسہ ہذا، وحال سرپرست وسرآمدار بابِ شوریٰ) حاضر ہوں......الخ''　　(اشتہار مطبوعہ ومحفوظ بدار العلوم)

گو بانی ومجوزِ اول وغیرہ کے الفاظ اشتہارِ مطبوعہ میں دو قوسوں کے درمیان لکھے گئے ہیں اور قوسین بہت ہی خفیف لگائی گئی ہیں جس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ قوسین کے درمیان کی عبارت جسے ہم نے بھی اصل اشتہار کے مطابق قوسین ہی میں لکھا ہے، الحاقی ہو، مگر چونکہ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب کی کتاب ہدیہ سنیہ میں تاسیس کو حضرت حاجی صاحب کی طرف اصل عبارتِ کتاب میں منسوب کیا گیا ہے اس لئے اس شبہ کو نظر انداز کر دیا گیا، گو شبہ کا محل کافی موجود ہے۔

(۷) حیدر آباد کمیٹی کی رپورٹ

حیدر آباد دکن کی ایک کارکن کمیٹی نے ۱۳۱۲ھ کے نزاع کے موقعہ پر دار العلوم کی تائید وحمایت کرتے ہوئے اپنی جو رپورٹ موسوم بہ ''تذکرہ'' بتوسط مہتمم وقت مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی

رحمہ اللہ مجلس شوریٰ مدرسہ دیوبند کو بھیجی ہے اس میں وہ بانیٔ مدرسہ اور محرک ومجوز حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی کو قرار دے رہی ہے جس کا ایک جملہ یہ ہے کہ:

''مجلس بعد جلسۂ کامل عرض کرتی ہے کہ بانیان اور محرکِ اعظم اس (مدرسہ) کے دونفس نفیس تھے ایک مولوی محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ اور دوسرے جناب مولوی رشید احمد صاحب مدفیوضہم۔'' (تذکرہ ص ۲۰)

(۸) حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کی روایت

مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماءِ ہند ورکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند بھی اپنے مرتبہ قانون (دستورِ اساسی دارالعلوم دیوبند) میں جو ۱۳۶۷ھ میں ترتیب دیا گیا حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمہما اللہ کو ہی بانیٔ مدرسہ قرار دے رہے ہیں، جس کی اس مجلس کے تمام اراکین شوریٰ نے جنھوں نے باتفاقِ رائے یہ دستور ہر دفعہ پر پوری بحث وتمحیص کے بعد منظور کیا ہے، توثیق کی ہے، جن میں خصوصیت سے قابل ذکر حضرت مولانا حکیم محمد اسحٰق صاحب کٹھوری صدر جلسہ، حضرت مولانا حسین احمد صاحب، حضرت مولانا فخر الدین صاحب، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا حکیم محمد یٰسین صاحب نگینوی، مولانا حکیم مشیت اللہ صاحب بجنوری وغیرہ ہیں۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب ممدوح دستور میں دارالعلوم کے مسلک کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''دارالعلوم کا مسلک اہل السنّت والجماعت حنفی مذہب اور اس کے مقدس بانیوں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی وحضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہما کے مشرب کے موافق ہوگا۔''

(دستوراساسی ص ۵)

(۹) حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی روایت

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ صرف حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ کو بانیٔ مدرسہ قرار دے رہے ہیں، چنانچہ وہ حضرت ممدوح کے فضائل ومناقب ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

''پیشوائے منازلِ دین، رہنمائے مراحلِ یقین، آیۂ قدرتِ الٰہی، مایۂ رحمتِ نامتناہی، غفراں مآب مغفرت جناب حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کہ کدوراین حدیقہ پُر بہار وبانی ایں بنائے فیض آثار بودہ جزاہ اللہ عنا وعن جمیع المسلمین خیر الجزاء۔''

(روداد جلسہ دستار بندی دارالعلوم دیوبند بابت ۱۳۲۸ھ، ص ۲۳-۲۴)

(۱۰) خود حضرت نانوتوی کا ذاتی ارشاد

خود حضرت نانوتویؒ اپنی اس معرکۃ الآراء تقریر میں جو عمارتِ دارالعلوم کا سنگِ بنیاد رکھنے کے دن جامع مسجد دیوبند میں حضرت نے کی ہے، بانی ہونے کی نسبت باشندگانِ دیوبند کی طرف فرمارہے ہیں۔ حضرتِ والا کے جملے حسبِ ذیل ہیں:

''اس مدرسہ کی بنیاد دیوبند والوں نے ڈالی، اس امر میں وہ سب کے امام ہیں...... الخ

(روداد مدرسہ دیوبند بابت ۱۲۹۰ھ) تلك عشرة كاملة

ان دس روایات میں مشترک طور پر بانی کے سلسلہ میں چھ نام تشخیص کے ساتھ آرہے ہیں، حضرت حاجی محمد عابد صاحب، حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب، حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہم اللہ۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے کو بانی کہہ کر گویا خود اپنے بانی ہونے کی نفی کررہا ہے۔

روایت کا قدرِ مشترک اور ماحصل

یہ بحث تو جداگانہ ہے کہ ان روایتوں کی درایتی پوزیشن کیا ہے اور ان کے تضاد کو رفع کرنے کی کیا صورت ہے، یہاں سردست صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان روایات سے حسبِ ذیل دو نتیجے واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ یہ سب روایتیں مثبت انداز کی ہیں جو کسی نہ کسی کو بانی ثابت کررہی ہیں، منفی انداز کی نہیں جو کسی کے بانی ہونے کی نفی کے لئے بیان کی گئی ہوں۔ اندریں صورت اگر کسی روایت کو کسی کے بانی ہونے کی نفی کے لئے استعمال کیا جائے تو دوسری روایت خود اس کی نفی کرکے ثابت

کردہ بانی کی نفی کردے گی، اوراس طرح کوئی ایک بھی بانی باقی نہ رہے گا۔

(۲) دوسرے یہ کہ روایات کے اس قدرِ مشترک سے یہ صاف نمایاں ہے کہ بانی ہونا کسی ایک شخصیت میں منحصر نہیں کیا جاسکتا اور یہ کہ ان روایات کے مدار حضرات جن سے یہ روایتیں صادر ہوئی ہیں، وحدتِ بانی کے قائل نہیں بلکہ تعددِ بانی کے مدعی ہیں، اس لئے حصر کے ساتھ کسی ایک کے بانی ہونے کا دعویٰ کردیا جانا ساری روایات کے خلاف یقیناً ایک غیر تاریخی دعویٰ ہوگا جس سے اس سلسلہ کی ساری تاریخ ہی ختم ہوجائے گی۔

بانیّین کے تعدد کا اثبات

اس لئے اوپر سے لے کر آج تک دارالعلوم کے ذمہ دار حضرات بانی کے تعدد کو تسلیم کرتے رہے، نہ کبھی اسکے اعلان سے گریز کیا اور نہ کبھی اسکی کوشش کی کہ بانی کو کسی ایک شخصیت میں محصور کرکے دوسرے بانیوں کے بانی ہونے کی نفی کی جائے، خواہ ان کے بانی ہونے کی نوعیت کچھ بھی ہو۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے سفر مالٹا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا (حضرت شیخ الہند) کے ارشاد کے مطابق ان میں (کارکنانِ مدرسہ میں جو حضرت شیخ الہند کے تشریف لے جانے سے شکستہ خاطر تھے) تازہ روح پھونک دی اور سب نے ٹھان لیا کہ یہ دینی امانت (مدرسہ دیوبند) جو مقدس بانیان کی وراثت سے موجودہ جماعت کے ہاتھ میں آئی ہے، اس کی حفاظت اس وقت تک ہر ممکن ذریعہ سے پوری طرح کی جائے جب تک کہ محض بفضلِ خداوندی اس کے سنبھالنے کے لئے دوسری جماعت تیار نہ ہوجائے۔'' (روداد مدرسہ دیوبند بابت ۱۳۳۳ھ)

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی اپنے ایک مضمون ''تشریح واقعہ دیوبند'' میں لکھتے ہیں:

''اور باوجود اس کے مولانا محمد احمد صاحب (مہتمم خامس دارالعلوم) کی زبردست شخصیت نے دارالعلوم کی پرانی پالیسی کو تھامے رکھنے میں جو ایک ذمہ دار اور بہادر مہتمم کا سب سے بڑا فریضہ ہے، اپنی کیسی اولوالعزمی، جانفشانی اور تحملِ صدمات کا ثبوت دیا اور کس تدبر اور ہوشمندی کے ساتھ مدرسہ کے کل پرزوں کو باہم مربوط رکھ کر اس فیضِ تعلیم وترویجِ دینِ الٰہی کو بیش از بیش جدوجہد کے ساتھ شائع کیا، جو مدرسہ کے بانیوں نے اس سے ارادہ کیا تھا۔'' (تشریح واقعہ دیوبند ص ۴، ۵۔ ۱۳؍ رمضان ۱۳۴۳ھ)

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''دارالعلوم کے بانیوں اور سرپرست حضرات اور منتظمین میں چونکہ خلوص اور تقدس بدرجہ اتم موجود تھا اسلئے (مدرسہ دیوبند) ابتداہی سے روز افزوں ترقی کے مدارج طے کررہا تھا۔'' (حیات شیخ الہند ص ۲۶)

احقر راقم الحروف نے اپنی ایک ذمہ دارانہ تحریر میں مدرسہ دیوبند کی تاسیس کا ۱۸۵۷ء والا پس منظر دکھلاتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اس وقت چند اہل اللہ اور نفوسِ قدسیہ کے مصفی قلوب میں ارشاداتِ غیب کے تحت علم وعمل کے تحفظ اور صیانتِ دین کا ایک جذبہ صادقہ ڈالا گیا، چند مخلص قلوب مستعد ہوئے کہ قال اللہ وقال الرسول کی صداؤں کو باقی رکھنے کے لئے ایک علمی ادارہ (مدرسہ دیوبند) قائم کیا جائے۔''

(دارالعلوم کی سرسٹھ سالہ زندگی ص ا، بابت ۱۳۵۰ھ)

تعددِ بانی تسلیم، مگر بانیٔ اعظم کا تشخص

بنابریں بانی کے سلسلہ میں اثبات ونفی کا مخلوط طریقہ کہ کسی ایک کو بانی ثابت کر کے دوسروں کے بانی ہونے کی نفی کی جائے، نہ ان تاریخی روایتوں سے جوڑ کھاتا ہے اور نہ ہی مدرسہ کے باخبر اور مبصرین کے تاریخی اسوہ کے مطابق ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ ان ذمہ داروں کے سامنے مذکورہ تاریخی روایتوں کی کتاب کھلی ہوئی تھی اور وہ ان ساری روایات اور ان کے رواۃ کی عدالت وثقاہت اور پختگی وثبوت کی وجہ سے ترجیح وانتخاب اور رد وانکار کا راستہ اختیار کر ہی نہیں سکتے تھے، اس لئے تعددِ بانی کے قائل رہے، البتہ بانیٔ اعظم ایک کو مانتے رہے جس میں دوسروں کے بانی ہونے کی نفی شامل نہ تھی، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

بناءِ حضرت نانوتوی کی نفی کا دعویٰ تاریخ کی روشنی میں

مدعیانِ نفی نے جو زیرِ نظر مقالات میں حصر کے ساتھ حضرت حاجی محمد عابد صاحب کے بانی ہونے اور حضرت نانوتوی کے بانی نہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے وہ یقیناً کوئی تاریخی دعویٰ نہیں کہلایا جاسکتا بلکہ ان کا ایک استنباطی دعویٰ ہوگا اور وہ بھی ناتمام، جبکہ اس سلسلے کی دوسری روایتیں ان کے سامنے

ہیں ہی نہیں جن کے مجموعے ہی سے پورا نتیجہ نکالا جا سکتا تھا، اسی لئے ان کے اس دعوے کو یہ دوسری روایتیں رد کر رہی ہیں۔ اس لئے تاریخی طور پر یہ دعویٰ اور اس کے اثبات کا طرزِ استدلال کوئی تاریخی اہمیت نہیں رکھتا جب تک کہ عرض کردہ روایات کا تضاد رفع کر کے نتیجہ نکالنے کی کوئی آخری اور منقح صورت پیدا نہ کی جائے، درحالیکہ یہ بجائے خود ایک نہایت ہی پیچیدہ مسئلہ اور فنی طور پر سخت ترین مرحلہ ہے کہ اس تضاد کو رفع کرنے کے لئے ترجیح وانتخاب کا راستہ اختیار کیا جائے یا تطبیق اور جمع بین الروایات کا۔

اس سلسلے میں طبعاً سب سے پہلا مرحلہ اسی منفی دعوے پر نظر کرنے کا آتا ہے کہ آیا اس نفی کی وجوہ اس درجہ کی ہیں کہ ان سے یہ نفی کا نتیجہ نکالا جا سکے یا نہیں؟ تا کہ اس کے اور مثبت دعوؤں پر غور کیا جا سکے۔

میں اس سلسلہ میں جو کچھ بھی عرض کروں گا وہ تین مقالات پیش نظر رکھ کر عرض کروں گا، ایک وہ مراسلہ جو ترتیبِ قاسمی کے وقت مولانا مناظر احسن صاحب کے پاس بھیجا گیا ہے، دوسرا وہ مراسلہ جو مجلس شوریٰ صفر ۱۳۸۵ھ کے اراکین کے پاس ارسال کیا گیا ہے اور تیسرا مدینہ اخبار کا وہ مقالہ جو بعنوان ''دارالعلوم دیوبند کا بانی'' ۹ ربیع الاول ۱۳۸۵ھ کو شائع کیا گیا ہے۔

ان تینوں تحریرات کا مجموعہ اس زیر نظر تحریر میں سامنے رہے گا اور یہی تحریریں اس مقالہ کی نگارش کا محرک بھی بنی ہیں۔ اس لئے تنقید وتائید کے سارے پہلو اِن سب ہی پر عائد ہوں گے، کسی ایک کا نام یا حوالہ دیکر الگ الگ کوئی بحث نہ کی جائے گی۔ نیز چونکہ ان مقالات کا اصل موضوع حضرت نانوتوی کے بانی ہونے کی نفی ہے اس لئے میں انھیں منفی نگار حضرات کے عنوان سے تعبیر کروں گا۔

ان حضرات نے بانی سے متعلقہ روایات میں ترجیح وانتخاب اور نفی وانکار کا راستہ اختیار کر کے خصوصیت سے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے بانی ہونے کی نفی اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب کے بانی ہونے کا اثبات بطور موضوع ومقصد اختیار فرمایا ہے، شاید اس لئے کہ ان دو ہی بزرگوں سے متعلق روایتیں ان تک پہنچی ہوں گی، تو انھیں سے حضرت حاجی صاحب کو بانی ثابت کرتے ہوئے صرف حضرت نانوتوی کے بانی ہونے کی نفی کی گئی، گو ''مدینہ'' کے مقالہ کی حد تک حضرت والا کے

وقار کو تھامنے یا یوں کہئے کہ دارالعلوم سے ان کی ایک عمومی نسبت کو کسی حد تک قائم رکھنے کے لئے اعتذار کے لہجہ میں یہ ضرور کہا گیا ہے کہ حضرت والا کی شان سے فروتر ہے کہ وہ کسی ایک مدرسہ کے بانی کہلائیں جبکہ وہ ہندوستان میں ایک عمومی تعلیمی تحریک کے بانی اور ایک عظیم دینی انقلاب کے محرک کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حضرت والا کے عمومی محرک ہونے کا یہ دعویٰ اپنی جگہ صحیح اور بلاشبہ حضرت والا کا ۱۸۵۷ء کے بعد یہ ایک مستقل ذوق یا بطور الہامِ ربانی ایک مستقل داعیۂ باطن تھا کہ ملک میں دینی مدارس کا جال پھیلا دیا جائے، ان کے نزدیک شرحِ صدر کے ساتھ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے پنپنے اور عزت کے ساتھ زندہ رہنے کی صورت بجز دینی تعلیم وتربیت اور قیامِ مدارس کے دوسری نہ تھی، اس لئے وہ یہ تحریک لے کر کھڑے ہوئے جو دارالعلوم دیوبند کے قیام سے ہندوستان میں بصورتِ قیامِ مدارس کامیابی کے ساتھ پھیلی اور اسکے پھل پھول نمایاں ہوئے۔ چونکہ سب سے پہلا چندہ کا مدرسہ ہندوستان میں یہی قائم ہوا اور پھر اس کے نقشِ قدم پر دوسرے سیکڑوں ہزاروں مدارس نے جنم لیا، چنانچہ اس بارے میں خود حضرت نانوتوی کی بھی یہی تصریح ہے۔ آپ نے مدرسہ دیوبند کے جلسہ سالانہ تقسیم اسناد وانعام بابت ۱۲۹۰ھ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> ''چونکہ اکثر مدارس اس مدرسہ کی دیکھا بھالی مقرر کئے گئے ہیں یا کئے جاتے ہیں، تو گو کوئی مدرسہ اس سے ترقی پا جائے پر اہل عقل کے نزدیک وہ بھی دیوبند ہی کا پرتو ہوگا اور اس پر جب یہاں کے باشندوں کی شکستہ حالی اور پریشان روزگاری پر نظر کی جائے تو یہ ان کی ہمت کی بات کسی طرح ان کاموں سے کم نہیں جو اہل سلطنت نے برفاہِ عام کئے ہیں۔'' (روداد مدرسہ دیوبند بابت ۱۲۹۰ھ ص ۱۲)

حضرت نانوتوی ایک نہیں متعدد دینی مدارس کے بانی ہیں

لیکن اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر بعض منفی نگار حضرات کی عبارت کا یہ جملہ کہ ''حضرت مولانا کو کسی ایک مدرسہ کا بانی قرار دینا ایک تاریخی غلطی ہے۔'' بایں معنی تو بالکل صحیح ہے کہ وہ کسی ایک مدرسہ کے بانی نہ تھے بلکہ اپنے اس خاص مکتبِ فکر کی تحریک عام کے سبب اس فکر کے تمام مدارس کے بانی تھے اور انھیں بانیٔ مدرسہ دیوبند ہی نہیں بلکہ بانیٔ مدارسِ ہند کہنا چاہئے اور بلاشبہ اس معنی کے لحاظ

سے یہ جملہ ان کے شایانِ شان اور ان کی عمومی تحریک کی کامیابی کے حسبِ حال ہوگا، لیکن اگر اس جملہ کے معنی یہ ہوں کہ اس عمومی تحریک کی بنیاد پر ان کا کسی بھی مدرسہ کی خصوصی تاسیس سے کوئی تعلق نہیں تھا تو یہ خود ایک تاریخی غلطی ہے، درحالیکہ حضرت والا نے اپنی اس عمومی تحریک اور ہمہ گیر جذبہ کے تحت اپنی خصوصی مساعی سے بھی جگہ جگہ خود پہنچ کر مدرسوں کی بنیادیں رکھیں اور مدارس قائم فرمائے، اور وہ آج تک ان کے بانی کہلاتے ہیں، جیسے مراد آباد، گلاؤٹھی، انبیٹھہ، تھانہ بھون، شاہجہاں پور، بریلی اور نگینہ وغیرہ۔ ان میں اپنے ہی شاگردوں کو مدرس کی حیثیت سے بھیجا حتیٰ کہ بعض مدارس میں تو دیوارِ مدرسہ پر یہ عبارت بھی آج تک کندہ شدہ موجود ہے کہ:

”قائم کردہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ“

جیسے مدرسہ شاہی مراد آباد، چنانچہ حضرت والا کی ان خصوصی تاسیسوں کا یہ علم ویقین اس حد تک عام تھا کہ علماء کے خاص ماحول سے گذر کر دوسرے طبقات میں بھی پھیلا ہوا تھا۔ سرسید بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۴/اپریل ۱۸۸۰ء میں حضرت نانوتوی کی وفات پر اپنے تعزیتی مضمون میں لکھتے ہیں:

”اُن کی (حضرت نانوتوی کی) کوشش سے علومِ دینیہ کی تعلیم کے لئے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا، علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی وکوشش سے اسلامی مدارس قائم ہوئے۔“

مولانا منصور علی خاں صاحب (افسر الاطباء ریاست حیدرآباد دکن) اپنی کتاب ”مذہبِ منصور“ میں حضرت نانوتوی کی مخصوص سوانح درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ہندوستان میں اکثر مقامات پر مدارسِ دینی جناب مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے اور مشورہ سے جاری ہیں، خصوصاً مدرسہ دیوبند، اول مولانا مرحوم نے اسی مدرسہ کو چندہ سے قائم کیا تھا۔“

(مذہب منصور جلد دوم ص ۱۷۷)

یہ دونوں بزرگ ان مدارس کے قیام کو حضرت کی عمومی تحریک کا نہیں بلکہ خصوصی سعی اور مخصوص جدوجہد کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضرت نانوتوی کی عمومی اور ہمہ گیر ذات کو جیسے ایک عمومی تحریک کے بانی کی حیثیت سے کسی ایک مدرسہ کی تاسیس میں محدود ومحصور کر دینا تاریخی غلطی ہے، اسی طرح انھیں خود انہی کی تحریک کے عموم میں نہ لاکر ان کی خصوصی تاسیسوں سے انکار

کردینا اس سے بھی بڑی تاریخی غلطی ہے۔اس لئے مدرسہ دیوبند سے آپ کے بانی ہونے کی نفی کے لئے یہ عمومی تحریک نہ کوئی حجت ہے نہ استدلال، زیادہ سے زیادہ اعتذار ہے مگراس کا نام دلیل نہیں۔

حضرت نانوتویؒ کا چندہ میں پہل نہ کرنے کا مسئلہ

رہا حضرتِ والا کے بانی نہ ہونے کے سلسلہ میں سندِنفی کے طور پر یہ کہا جانا کہ انھوں نے مدرسہ کے ابتدائی چندہ وصول کرنے میں پہل نہیں کی اور نہ وہ چندہ ہوتے وقت دیوبند میں موجود تھے، لیکن یہ عمل حضرت حاجی محمد عابد صاحب کا ہے تو ظاہر ہے کہ کسی کا چندہ ہوتے وقت موجود نہ ہونا یا کسی کا چندہ وصول کرنے میں پہل کرنا نہ بانی ہونے کی نفی کے لئے کافی ہے نہ اثبات کے لئے اور نہ ہی کسی ادارہ کے قیام کے سلسلہ میں یہ کوئی ایسی بنیاد ہے کہ اسے دلیل کی حیثیت دی جائے گو اس تنقیح کا یہ ہرگز منشاء نہیں کہ میں حضرت حاجی محمد عابد صاحب کے بانیانِ مدرسہ میں سے ہونے کی نفی کا قائل ہوں، یا اس کا ادعاء کررہا ہوں، ہرگز نہیں! میں تو جیسا کہ عرض کرچکا ہوں خود اپنی متعدد تحریرات میں تعددِ بانی کا قائل ہوکر انھیں بانیوں میں شمار کرتا ہوں اور ہمارے قلوب میں انکی وہی عظمت وتقدیس موجود ہے جو ایک باخدا بزرگ کی ہونی چاہئے، لیکن جہاں تک استدلال کی نوعیت کا تعلق ہے محض ان مذکورہ طریقوں سے نہ حضرت حاجی محمد عابد صاحب کے بانی ہونے کا کوئی پختہ ثبوت ہوتا ہے اور نہ حضرت قاسم العلوم والخیرات کے بانی ہونے کی نفی ہی کی کوئی بنیاد نکلتی ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے نام حاجی عابد حسین صاحبؒ کا ایک گرامی نامہ اور اس کا تجزیہ

اس سلسلہ میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو تاسیس دارالعلوم سے بے تعلق بلکہ بے خبر ثابت کرنے کیلئے سب سے بڑی دلیل حضرت حاجی محمد عابد صاحب کے گرامی نامہ کے اس ٹکڑے کو بتایا گیا ہے جس میں حاجی صاحب مدرسہ کے قیام کے لئے چندہ کرکے حضرت نانوتوی کو ان الفاظ میں

اطلاع دے رہے ہیں کہ:

''کل عصر اور مغرب کے درمیان تین سو روپے جمع ہوگئے اور اب آپ تشریف لے آئیے۔''

(مدینہ اخبار ۹/ربیع الاول ۱۳۸۵ھ)

اس سے نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ حضرت نانوتوی کو اس وقت تک قیامِ مدرسہ کی خبر تک بھی نہیں تھی، اس خط سے ہی انھیں پہلی بار اطلاع ہوئی کہ دیوبند میں کوئی مدرسہ قائم ہو رہا ہے اور جب وہ قائم ہوا تو حضرت نانوتویؒ قیامِ مدرسہ کے وقت دیوبند میں موجود بھی نہ تھے، اسلئے وہ بانی کیسے ہوئے؟

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حاجی صاحب کا یہ خط ہی اس کی مستقل دلیل ہے کہ حضرت نانوتویؒ تاسیس مدرسہ سے نہ لاعلم تھے نہ بے تعلق، بلکہ انھیں اس خط سے پہلے ہی سے اس کا علم بھی تھا اور اس سے گہرا تعلق بھی تھا، حتیٰ کہ اس چندہ کے بارے میں بھی وہ مطلقاً بے خبر نہ تھے، کیونکہ اول تو خط کی مذکورہ عبارت کے اسلوبِ بیان ہی نے یہ ساری بات واشگاف کردی ہے اور ''اب'' نے تو اس حقیقت کو بالکل ہی کھول کر رکھ دیا ہے کہ حضرتِ والا اس خط کے پہنچنے سے قبل ہی ان تمام امور سے باخبر بلکہ ان میں مؤثر انداز سے دخیل تھے، کیونکہ اس قسم کے مواقع پر لفظ ''اب'' کسی معلوم معاملہ کے لگے ہوئے انتظار کو رفع کرنے اور ابتدائی مراحل کے مختتم ہو جانے پر اصل مقصد کی تکمیل کرانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کہا کرتے ہیں کہ وہ (معہود فی الذہن) معاملہ جس کا آپ کو انتظار تھا یا آپ اسے کچھ اہم یا مشکل سمجھ رہے تھے مکمل ہو چکا ہے، اب آپ آجائیں، یعنی آنے میں کوئی تامل محسوس نہ کیا جائے، وجہ تامل رفع ہو چکی ہے اور اس میں کوئی حالت منتظرہ نہیں رہی، لہٰذا اب آنے میں تاخیر نہ ہونی چاہیئے۔

یہی اسلوبِ بیان اس خط میں اختیار کیا گیا ہے جس سے صاف واضح ہے کہ ان دونوں بزرگوں میں نہ صرف یہ کہ تاسیس مدرسہ کا منصوبہ علم ہی کی حد تک تھا بلکہ کوئی عملی صورت بھی باہم طے شدہ تھی اور جونہی اس کے ابتدائی مراحل طے ہوگئے، وونہی حضرت حاجی صاحب نے انتظاری کیفیت ختم کرنے کیلئے لفظ ''اب'' کے ساتھ اسی انداز میں حضرت والا کو اطلاع دیدی جیسے کسی قصہ طلب کام کی اطلاع بحالت انتظار کنائی الفاظ میں دیا کرتے ہیں، اس لئے اس خط کی رو سے دعویٰ کرنا کہ حضرت نانوتوی کو اس خط سے پہلے مدرسہ کے قیام واجراء اور ان مراحل کے منصوبوں کی کوئی

خبر تک نہ تھی، کم از کم اس خط کے اسلوب اور طرزِ بیان سے مفہوم نہیں ہوتا بلکہ یہ خط حضرت والا کی لاعلمی اور بے تعلقی کے بجائے میں تو سمجھتا ہوں کہ پہلے سے ذہن میں آئے ہوئے علم اور معاملہ کی طے شدگی بلکہ اس کے ساتھ منصوبہ کے بروئے کار لائے جانے کے انتظار کی دلیل ہے۔

حاجی صاحبؒ کے خط کی بنیاد پر ایک فرضی تخیل

پھر اس خط کی غرض وغایت کے سلسلہ میں یہ تخیل قائم کر لینا کہ حاجی صاحب نے حضرتِ والا کو مدرسی پر بلانے کے لئے یہ خط لکھا، اس خط پر ایک بے بنیاد اضافہ ہے، جس کا خط کی عبارت یا اس کے کسی ایک لفظ میں اشارۃً یا کنایۃً کوئی ذکر ہی نہیں۔ غور کیا جائے کہ خط کے اجمالی بلکہ کنائی اسلوبِ بیان سے بالخصوص حضرتِ والا کی مزعومہ بے خبری کے ساتھ انھیں ملازمت کے لئے اچانک بلا بھیجنا اور وہ بھی مبہم اور نا تمام الفاظ میں کہ چندہ ہو چکا ہے، اب آپ آجاویں، محض ایک عقدِ مجہول کی صورت ہے جو حضرت نانوتوی کی مزعومہ لاعلمی اور بے خبری کی حالت میں ایک بے معنی اور ان بزرگوں کی شان سے فروتر بات ہے، کیونکہ اس عنوانِ بیان کا حاصل یہ نکلے گا کہ سارے کام ہو گئے چندہ بھی ہو گیا مدرسہ بھی قائم ہو گیا صرف مدرس کا تقرر باقی ہے، اب آپ مدرسی کے لئے آجاویں، گویا حضرتِ والا کو ملازمت کی تلاش تھی اور حضرت حاجی صاحبؒ سے کہہ رکھا تھا کہ کوئی مدرسہ قائم ہو تو میرا بھی خیال رکھیں، اس لئے حاجی صاحب نے بروقت تحریر فرمایا کہ چندہ تین سو روپیہ ہو گیا ہے یعنی تنخواہ ملنے میں دشواری نہ ہوگی، اب آپ آجاویں۔ ظاہر ہے کہ اس خط کی غرض وغایت مدرسی اور اس کی غرض حضرت والا کا بلاوا قرار دینا قطع نظر خط کے اسلوب کے ان بزرگوں میں سے کسی کی بھی شان کے شایاں نہیں۔

حاجی صاحبؒ کے خط کی غرض وغایت

اگر مدرسی کے لئے حضرت کو بلایا جانا خط کی غرض وغایت ہوتی اور حضرت اس قصہ سے کلیتاً لاعلم اور بے خبر ہوتے، گویا قیامِ مدرسہ کی یہ بالکل ابتدائی اطلاع ہوتی جس کی حضرت کو پہلے سے

مطلق خبر نہ ہوتی تو خط کا اسلوبِ بیان یہ ہوتا کہ ’’میرا ارادہ مدرسہ قائم کرنے کا ہے چندہ بھی کر چکا ہوں، مدرس کی تلاش ہے، آپ مدرسی قبول فرمائیں اور تشریف لے آویں‘‘ نہ یہ کہ ’’چندہ ہو چکا ہے اب آپ آجاویں‘‘ ورنہ اس اندازِ بیان پر قدرتاً حضرت کے ذہن میں جبکہ وہ معاملہ ہی سے بے خبر تھے یہ سوالات پیدا ہونے چاہئیں تھے کہ کیسا چندہ؟ کس کام کے لئے کیا گیا ہے؟ مجھے آخر کیوں بلایا جا رہا ہے جبکہ میں برسر کار بھی ہوں، آخر مجھے ایک جمی جمائی اور مطابق ذوق جگہ سے بے وجہ کیوں اکھاڑا جا رہا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ مگر نہ تو حاجی صاحب کوئی واضح بات لکھتے ہیں اور نہ حضرت والا کو اس اجمال سے کوئی استعجاب ہوتا ہے، نہ وہ کوئی سوال کرتے ہیں بلکہ اپنی خوشی کا اظہار کر کے پندرہ روپے ماہوار کا ایک مدرس نامزد کر کے بھیج دیتے ہیں، اس صورت میں یہ مجمل اور کنائی خط اور اس کا بلا استفسار واستعجاب یہ تفصیلی جواب اس کی واضح دلیل ہے کہ ان بزرگوں کے درمیان پہلے سے کوئی منصوبہ طے شدہ تھا، ورنہ اطلاعِ محض تین سو روپے کے جملے سے حضرت نانوتویؒ نے خود بخود کیسے سمجھ لیا کہ یہ سارا قصہ قیامِ مدرسہ کے لئے کیا جا رہا ہے اور مجھے مدرسی کیلئے بلایا جا رہا ہے؟

اس لئے جب تک کہ یہ سارے منصوبے ان دونوں بزرگوں کے درمیان پہلے سے طے شدہ نہ مانے جائیں خط کا اجمال اور جوابِ خط کی تفصیل معقول نہیں ٹھہر سکتے، البتہ اگر معاملہ دونوں بزرگوں کے درمیان طے شدہ اور معہود فی الذہن مانا جائے تو یہ اجمال و تفصیل دونوں اپنی اپنی جگہ معقول اور قابل قبول ہو جاتی ہیں اور حاصل یہ نکلتا ہے کہ حاجی صاحب نے خط میں تو کسی تصریح کی ضرورت یوں نہ سمجھی کہ یہ سب معاملہ حضرت کے ذہن اور علم میں پہلے ہی سے ہے اور باہم طے شدہ ہے، فقط چندہ کی اطلاع کر کے بلایا جانا کافی ہے، وہ خود ہی سمجھ جائیں گے، اور ادھر حضرت والا نے جواب میں تفصیل کر کے مدرسہ کا ذکر بھی فرما دیا بلکہ اسے ’’مدرسہ مذکور‘‘ کے عنوان سے تعبیر فرمایا جبکہ حاجی صاحب کے خط کے اس ٹکڑے میں مدرسہ کہیں بھی مذکور نہیں اور چندہ کی خبر پر ملا محمود صاحب کو پندرہ روپے ماہوار پر نامزد کر کے بھیجنے کی بھی اطلاع دیدی اور آئندہ کے لئے اپنے ساعی رہنے کی اطمینان بخش خبر بھی دیدی، جو اس کی صاف دلیل ہے کہ یہ سب قصے حضرت کے ذہن اور علم میں تھے، کیونکہ ظاہر ہے کہ ایسی کنائی عبارت سے کسی پہلے سے طے شدہ منصوبہ ہی کو سمجھ کر قابل عملدر آمد سمجھا جاتا

ہے نہ کہ مجہولِ مطلق کو۔

اس لئے حاجی صاحب کے خط کی غرض وغایت چندہ کی اطلاع دے کر حضرت نانوتوی کو مدرسی کے لئے بلایا جانا نہ صرف یہ کہ خط میں روایت پر محض اپنا ایک قیاسی اضافہ ہے، بلکہ درایۃً غیر معقول بھی ہے، اس لئے اس خط اور اسکے اندازِ بیان سے نہ تو حضرت کی بے خبری ثابت ہوتی ہے اور نہ قیامِ مدرسہ سے ان کی بے تعلقی، بلکہ اس کا عکس ثابت ہوتا ہے اور اس صورتِ حال کے تحت اس خط سے حضرت کے بلاوے کی غرض نہ مدرسی کے لئے بلاوا نکلتی ہے نہ حضرت کے لئے اجراءِ تنخواہ کی سہولت کی خوشخبری، بلکہ خط کا صاف اور متبادر مفہوم صرف یہ ہوسکتا ہے کہ چندہ ہو چکا ہے اب آپ آ کر مدرسہ کا اجراء کر دیں اور اسے قائم کر دیں، جس میں اب کوئی حالت منتظرہ باقی نہیں ہے، ابتدائی مراحل چندہ وغیرہ سب طے ہو چکے ہیں۔

حضرتِ والا نے اس طے شدہ منصوبے اور کارِ خیر کی عملی تاخیر گوارہ نہ کرتے ہوئے لکھ بھیجا کہ مدرس بھیج رہا ہوں یعنی کارِ تدریس کا آغاز کر دیا جائے، اس میں کسی انتظار کی ضرورت نہیں، چونکہ زمانہ خیر و برکت کا تھا، قلوب اخلاص وللّٰہیت سے پرُ تھے، اس لئے اصل مقصد کو پیش نظر رکھا گیا جو تعلیم کا اجراء تھا، چنانچہ حاجی صاحب نے حضرت کے تحریر فرمانے پر تعلیم کا آغاز کرا دیا اور حضرت کی تحریر کے بعد ان رسمیات کو غیر ضروری سمجھا کہ اس خط کے بعد اجراءِ تعلیم حضرتِ والا کے افتتاح کرنے پر معلق پڑا رہے جو خود ان کی منشاء کے خلاف ہے۔

اندریں صورت حاجی صاحب کے خط سے حضرتِ والا کی قیامِ مدرسہ سے بے تعلقی اور بے خبری کا نتیجہ نکالنا ذاتی تخیل ہے، خط کا مفہوم نہیں۔ ساتھ ہی اس پر بھی غور کیا جائے کہ حاجی صاحب کے خط میں تو نہ مدرس کا ذکر ہے نہ مدرس طلبی کا اور نہ مدرس کے سلسلہ میں کسی معاملہ کے طے کرنے کا جیسے تنخواہ وغیرہ، اور ادھر مزعومہ طور پر حضرت نانوتوی اس قصہ سے مطلقاً لاعلم اور بے خبر بھی ہیں مگر پھر بھی از خود مدرس کا تقرر بھی فرما دیتے ہیں خود ہی پندرہ روپے ماہوار مدرس کی تنخواہ بھی مقرر فرما دیتے ہیں اور ان سارے معاملات کو مکمل طریق پر طے کر کے مدرس کو بھیج بھی دیتے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ کیا ایک بے تعلق اور لاعلم محض آدمی کو یہ جرأت ہوسکتی ہے کہ ایک سواسی روپیہ سالانہ کے مستقل بوجھ کا

کسی دوسرے آدمی کو خواہ مخواہ مکلّف ٹھیراوے اور بلا استمزاج کئے ہوئے اسے مجبور کر دے کہ وہ دواماً یہ مصارف اپنے سر رکھے؟ کم از کم عقل وفہم اس کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس لئے بھی خط اور جوابِ خط کی یہ ساری صورتیں اس وقت تک معقول نہیں ٹھہر سکتیں جب تک کہ ان دونوں بزرگوں میں قیامِ مدرسہ کا منصوبہ پہلے سے طے شدہ اور باہمی طور پر سمجھا سمجھایا نہ مانا جائے، ورنہ حضرت نانوتوی کو قیامِ مدرسہ سے بے تعلق اور لاعلم ماننے کی صورت میں حاجی صاحب کا یہ کنائی خط قصہ طلب عبارت میں بھیج دینا اور حضرت والا کا جواب میں ایک تفصیلی پروگرام بنا کر لکھ بھیجنا اور حاجی صاحب کے سر ایک مسلسل بار عائد کر دینا کوئی معقول بات نہیں رہتی، چہ جائیکہ اس غیر معقول صورتِ حال کو قیامِ مدرسہ سے حضرتِ والا کی بے تعلقی اور لاعلمی کی حجت کے طور پر پیش کیا جائے۔

حاجی صاحبؒ کے خط کی حقیقی وضاحت

حقیقت یہ کہ حضرت حاجی صاحبؒ کے خط کی یہ مجمل عبارت قدرتاً دوسرے جملوں کو چاہتی ہے، اگر یہ خط پورا نقل کر دیا جاتا تو بات صاف ہو جاتی لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ خط محفوظ ہے یا ضائع ہو چکا ہے، تاہم یہ غنیمت ہے کہ ابھی اس خط کے دیکھنے والے موجود اور بقیدِ حیات ہیں، انکے بیان سے وہ امور جو ہم نے اس مجمل عبارت سے بطور استنباط کے پیش کئے ہیں، نصِ صریح بن جاتے ہیں۔

حضرت الاستاذ علامہ محمد ابراہیم صاحبؒ سابق صدر مدرس دارالعلوم دیوبند نے فرمایا اور سوانح قاسمی کی تالیف کے وقت لکھ کر بھی دیدیا تھا جو شامل فائل ہے، کہ میں نے حضرت حاجی محمد عابد صاحب کا وہ خط حاجی نذیر احمد صاحب خلیفہ حضرت حاجی صاحب (مصنف تذکرۃ العابدین) کے پاس اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پڑھا ہے جو حضرت حاجی صاحب نے حضرت نانوتوی کو لکھا تھا، اس میں صراحتاً یہ مضمون مرقوم تھا کہ:

”وہ جو آپ میں اور ہم میں باہم مذاکرات ہوتے رہتے تھے کہ کوئی مدرسہ قائم کیا جائے، فقیر کو ایک دن خیال آگیا اور چندہ کے لئے اٹھ کھڑا ہوا، کل عصر مغرب کے درمیان تین سو روپے ہو گئے، اب آپ تشریف لے آئیں۔“

حضرت حاجی صاحبؒ اور حضرت نانوتوی کا

تاسیسِ دارالعلوم کے متعلق مشترک منصوبہ

اس جملے سے وہ پوری بات واضح ہوگئی جو ہم نے شائع شدہ جملہ کے اسلوبِ بیان سے بطور استنباط عرض کی تھی کہ تاسیس مدرسہ کا منصوبہ ان دونوں بزرگوں کے علم میں تھا، باہم طے شدہ تھا اور اجراءِ مدرسہ کے لئے اسی کے تحت چندہ کیا گیا اور حضرت والا کو بلایا گیا، اس لئے خط کی یہ تحریری اطلاع حضرت کے لئے کوئی ابتدائی یا نئی خبر نہ تھی اس لئے انھوں نے سارا واقعہ پیش نظر رکھ کر جواب میں سارا پروگرام تفصیل سے لکھ بھیجا اور حاجی صاحب نے اس کے مطابق اسے عملی جامہ پہنا دیا۔

نیز اسی سے یہ بھی کھل گیا کہ اس خط کے ذریعہ حضرت نانوتوی کو اسی مقصد کے لئے بلایا گیا تھا جس مقصد کے لئے ان بزرگوں میں باہم مذاکرے ہوتے تھے اور وہ یقیناً مدرس کے انتخاب وتقرر کے مذاکرے نہ تھے کہ اول تو کسی شخص کا مدرسی پر مقرر کیا جانا کوئی ایسا اہم اور پیچیدہ مسئلہ نہ تھا کہ اس پر آٹھ نو برس مسلسل مذاکرے ہوں، دوسرے یہ جزوی بات طبعاً مدرسہ کا منصوبہ طے ہو جانے کے بعد کی تھی، نہ یہ کہ مدرسہ تو قائم نہ ہو اور مدرس کا انتخاب وتقرر کا مسئلہ چھڑ جائے اور برسوں چھڑا رہے، تیسرے یہ کہ اس سے زیادہ بے معنی اور بے حیثیت بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ حضرت نانوتویؒ نے یہ مذاکرے اپنی مدرسی قائم کرنے کے لئے کئے ہوں جبکہ ان کے ہمعصروں کے ذہنوں میں ان کی مزاجی کیفیت کا پورا علم تھا کہ کسی مدرسہ میں بیٹھ کر اور مدرس بن کر پڑھانا ان کی آزاد فطرت کے خلاف ہے، جس پر انھوں نے اپنی پوری زندگی گذاری اور خود دارالعلوم میں بھی مدرس کی حیثیت سے کبھی نہیں پڑھایا، چھتہّ کی مسجد میں بطور خود منتخب افراد کی تعلیم وتربیت کا ذاتی سلسلہ قائم رکھا، یہ نہ مدرسہ دیوبند میں بیٹھ کر پڑھانا تھا نہ مسجد چھتہ میں مدرسِ مدرسہ کی حیثیت سے پڑھانا تھا جو بے محل طریق پر میری طرف منسوب کرکے مدینہ اخبار کے مقالہ میں اس پر حیرت کا اظہار کیا گیا ہے، یہ مدرسی شخصی تھی نہ کہ رسمی یا ملازماتی اور تعلیم وتعلّم آپ کا شغلِ دوامی تھا مگر آزادانہ۔

حضرت نانوتوی کا دارالعلوم سے رسمی نہیں حقیقی تعلق

چنانچہ سوانح مخطوطہ کے مصنف لکھتے ہیں:

''اخلاص کا (حضرت نانوتویؒ کے) یہ حال کہ جملہ قول وفعل آپ کے لوجہ اللہ تھے، ریا کا نام نہ تھا، طمع نفسی کی بو بھی نہ تھی، کبھی وعظ پر اجرت نہیں لی، نہ کبھی نفسانی خواہش سے وعظ کہا، نہ کبھی قرآن وحدیث کو مالِ دنیا کی عوض میں پڑھا پڑھایا، جو کام تھا وہ محض للہ، بے طمع ہونا آپ کا ظاہر و باہر، کیونکہ اگر آپ کو طمع دنیوی ہوتی تو بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ سونے کی دیواریں بنا لیتے، مدرسہ دیوبند کے مکان کو لاکھوں اینٹوں سے تعمیر کرایا مگر اپنے گھر میں ایک پھوٹا روڑا بھی نہ لگوایا۔'' (سوانح مخطوطہ ص ۱۶)

اسی سوانح میں دوسری جگہ لکھا ہے:

''یہ سب کو معلوم ہے کہ مدرسہ اسلامیہ دیوبند آپ ہی کا ساختہ پرداختہ ہے اور کیا کچھ اس کا کارخانہ؟ کہ چھوٹی سی سرکار مگر ہرگز کبھی اس کی کسی چیز سے نفع نہیں اٹھایا، اپنے پاس سے دینا جانتے تھے لینے کا نام نہ تھا۔'' (سوانح مخطوطہ ص ۱۶)

جس سے واضح ہے کہ آپ کی خدمتِ مدرسہ لوجہ اللہ تھی اور تعلیم اپنی شخصی تھی، آپ کے اس درس میں اساتذۂ دارالعلوم بھی شریک ہوتے تھے بلکہ فرمائش کر کر کے حدیث یا تفسیر کا درس شروع کراتے تھے، جیسے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس دارالعلوم کی فرمائش پر تفسیر کا درس شروع کرایا جو چھتہ کی مسجد میں شروع ہوا، جس میں عموماً اساتذۂ دارالعلوم شریک تھے، حضرتِ والا نے اپنے شخصی درس کے لئے کچھ ہونہار طلبہ منتخب کر لئے تھے اور سفر وحضر میں ان کے پڑھانے اور تربیت دینے کا سلسلہ قائم رہتا تھا، بصورتِ قیامِ دیوبند چھتہ کی مسجد میں اور بصورتِ سفر جہاں بھی قیام ہو وہیں یہ درس جاری رہتا، حسبِ روایت مولانا مبارک علی سابق نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت والا کا سفرِ گنگوہ ہوا، تلامذہ ساتھ تھے اور وہاں ابوداؤد شریف کا درس دیا جو اس زمانہ میں معمول تھا، ناغہ نہیں فرمایا اور سبق کچھ زیادہ مقدار میں ہوا تو بطور مزاح حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ یہاں اس تیز رَوی سے یہ طالب علم کیا خاک سمجھے ہونگے، حضرت مسکرا دیئے اور درس جاری رہا۔

بہرحال حضرت کی اس شخصی تدریس کا نہ بانی کے مسئلہ سے کوئی تعلق تھا نہ ملازماتی مدرسی سے، اس لئے چھتہ کی مسجد کی اس تدریس کا انتساب رسمی تدریس سے اور وہ بھی میرے حوالہ سے خلافِ

واقعہ ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ حاجی صاحب کا حضرت والا کو اطلاع دے کر بلانا تدریس کے لئے نہیں تھا بلکہ اجراءِ مدرسہ کے لئے تھا جس کے لئے ان بزرگوں میں برسوں مذاکرے ہوتے رہے۔

اجراءِ مدرسہ کیلئے حضرت نانوتویؒ ہی کو کیوں دعوت دی گئی؟

اسی کے ساتھ اس خط کا یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے کہ حاجی صاحبؒ نے اجراءِ مدرسہ کے لئے یہ دعوت آخر حضرت نانوتویؒ ہی کو کیوں دی؟ اور کسی کو کیوں نہیں دی؟ جبکہ خود دیوبند میں اہل علم وفضل دوسرے بھی تھے۔سو اس کی وجہ حضرت نانوتوی کی شخصیت اور ذاتی وجاہت سے قطع نظر اسکے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ بنیادی مذاکرات کا تعلق ہی ان سے تھا اور حضرت والا ہی نے قیامِ مدرسہ کا جذبہ ان میں پیدا کیا تھا،اس لئے حضرت حاجی صاحبؒ کا قیامِ مدرسہ کی اس ابتدائی جدوجہد چندہ وغیرہ کے لئے اٹھنا حضرت نانوتویؒ ہی تحریک کے زیر اثر عمل میں آیا جسے حاجی صاحب نے مذاکراتِ باہمی کے لفظ سے تعبیر فرمایا،اس لئے ان مذاکرات کی بناء پر وہ اجراءِ مدرسہ کے لئے حضرت والا ہی کو بلا سکتے تھے کہ یہ انھیں کی تاثیر وتصرف کے ظہور کی صورت پیدا ہو رہی تھی،ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت نانوتوی کی یہ اجتماعی رنگ کی تعلیمی تحریک جس کے تحت ملک میں چندہ کے مدارسِ دینیہ کا وجود ہوا،حضرت حاجی محمد عابد صاحب نے ان میں پیدا نہیں کی تھی جس سے غالباً منفی نگار حضرات بھی انکاری نہیں ہیں،چنانچہ مدینہ اخبار کے مقالہ میں محترم مقالہ نگار نے تحریر فرمایا ہے کہ:

یقیناً مدرسہ کا یہ خاکہ (اجتماعی رنگ کی تعلیمی تحریک) حضرت حاجی (محمد عابد) صاحب کے ذہن میں نہ تھا وہ محدود دائرہ میں مدرسہ کو چلانا چاہتے تھے۔...... الخ (مدینہ اخبار ۹/ربیع الاول ۱۳۸۵ھ)

مولانا محمد میاں صاحب سابق ناظم جمعیۃ علماءِ ہند نے فرمایا:

''اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ دارالعلوم کے پر شوکت تصور سے حضرت حاجی (محمد عابد) صاحب کا ذہن خالی تھا۔'' (علمائے ہند کا شاندار ماضی ص ۶۰)

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''حاجی صاحب مرحوم (حاجی محمد عابد صاحب) کے سامنے (دارالعلوم کا) وہ مستقبل نہ تھا جو حضرت مولانا نانوتوی کو نظر آرہا تھا۔'' (ارواحِ ثلاثہ ص ۱۸۹)

حاجی عابد حسین صاحب کا

درویشانہ مزاج اور اجتماعیت سے پرہیز

حقیقت یہ ہے کہ حضرت حاجی محمد عابد حسین صاحب پر رنگِ سلوک غالب تھا، بلکہ کسی حد تک تصوف کی مروّجہ رسوم کی پابندیاں بھی تھیں اور وہ ایک تارک الدنیا بزرگ تھے، جنھوں نے (بتصریح مصنف سوانح مخطوطہ) اپنی ساری جائیداد و املاک راہِ خدا میں دے کر فقیری اور گوشہ گیری اختیار فرمالی تھی، ان کا اصلی ذوق گوشہ نشینی تھا اسی لئے چھتہ کی مسجد کو انھوں نے اپنا قرار گاہ بنالیا تھا اور اس میں درویشانہ انداز سے رہتے تھے، اجتماعیت یا علمی انداز سے کسی ہمہ گیر تحریک کے لئے اٹھنا ان کا مذاق ہی نہ تھا اس لئے یہ مانا جانا مشکل ہے اور کسی نے مانا بھی نہیں کہ ''قاسمی تحریک'' حضرت حاجی محمد عابد حسین صاحب کی تاثیر وتصرف کا نتیجہ تھی، دوسرے یہ کہ اجتماعی رنگ کی تحریک جس پر تعلیم کا سرپوش پڑا ہوا تھا، ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے تاثرات کا نتیجہ تھی تاکہ تعلیمی رنگ سے تربیتی انداز میں اس ناکامی کی تلافی کی جائے اور ظاہر ہے کہ حضرت حاجی محمد عابد صاحب ۱۸۵۷ء کی تحریکِ جہاد میں شامل نہیں تھے کہ ان میں یہ تاثرات پیدا ہوتے اور کوئی ہمہ گیر فکر ان میں نمایاں ہوتا، اس لئے یہی ماننا پڑے گا کہ حاجی صاحبؒ کی یکسوئی کی زندگی میں تعلیمی سلسلہ کی یہ خاص حرکت خواہ وہ محدود ہی پیمانہ پر کیوں نہ ہو، حضرت نانوتوی ہی کی پیدا کردہ تھی، جو ان مذکورہ ''مذاکرات'' کی صورت سے چھتہ کی مسجد میں ۱۸۵۷ء کے بعد آٹھ نو برس تک وقتاً فوقتاً جاری رہی اور جب بھی حضرت کا دیوبند آنا ہوتا تو قیام چھتہ ہی کی مسجد میں ہوتا، ان ایام میں اس مبارک مسجد میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب دیوبندی کی آمد ورفت بھی ہوتی جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس کی بھی صراحت کی ہے، اور وہ بھی چھتہ ہی کی مسجد میں قیام فرماتے تھے، اس لئے حضرت نے بھی اپنے ہنگامی قیام کے لئے اور مستقل قیامِ دیوبند کے بعد رہائش کے لئے اسی مسجد کو اختیار فرمایا۔

حضرت نانوتویؒ اور حضرت حاجی صاحبؒ کا باہمی ربط وضبط

اس گہ وبیگہ کے مسلسل قیام سے ان بزرگوں میں غیر معمولی ربط وضبط اور قلبی تعلق کے باہمی علاقے قائم ہوئے، حضرت حاجی صاحب علم اور علماء کی عظمت تو پہلے ہی سے غیر معمولی طور پر اپنے اندر لئے ہوئے تھے، اب حضرتِ والا کی پیاپے آمد سے معیت اور تبادلۂ خیالات وافکار سے علم براری اور عالم پروری کے جذبات بھی ان میں بھر گئے اور سلسلۂ تعلیم کے اجراء وقیام کی قوتِ قریبہ بھی پیدا ہوگئی، جس سے وقت مقدر آ پہنچنے پر وہ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے اور مدرسہ قائم کرنے کے لئے چندہ مانگنے کے لئے انتہائی بے نفسی سے خود ہی اپنا رومال دوسروں کے سامنے پھیلایا جس کو حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے اپنی ایک طویل نظم میں جو مدرسہ دیوبند کے جلسہ سالانہ تقسیم انعام بابتہ ۱۲۹۸ھ کے موقعہ پر پڑھی گئی، ظاہر فرمایا ہے:

مردِ حق عابد صداقت کیش   اولاً گستراند رومالش
ہم باخلاصِ دل دراں بنہاد   چیزے از طیبات اموالش
گوئیا ایں ہمہ فتوح کثیر   در رسیدہ ہمہ بافضالش

لیکن حاجی صاحب کے ان جدید تاثرات کا جو قیامِ مدرسہ کے لئے ایک دم داعی ہوگئے سرچشمہ کہاں تھا؟ اور یہ پروبال کہاں سے آئے؟ تو مولانا فضل الرحمٰن صاحب ہی اسی نظم میں سرچشمہ کا بھی پتہ دے رہے ہیں کہ وہ سرچشمہ فیضانِ قاسمی تھا جس سے پروبال کی یہ پرواز حاجی صاحب میں اچانک رونما ہوئی۔ فرماتے ہیں:

لیکن ایں طائر (۱) ہمایوں فال   شد ز قاسم عطا پر و بالش

غور کرنے کی بات ہے کہ اس نظم میں حضرت حاجی صاحبؒ کے چندہ کرنے اور رومال پھیلانے کا ذکر ہے جو اجراءِ مدرسہ سے یقیناً پہلے کی چیز ہے اور محض مبادی میں سے، لیکن اسے بھی

(۱) مراد حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ

مولانا فضل الرحمٰن صاحب عطاءِ قاسم سے تعبیر کر رہے ہیں جس سے واضح ہے کہ حضرتِ والا نے مذاکرات کے ذیل میں صرف قیامِ مدرسہ ہی کا جذبہ ان میں پیدا نہیں کیا بلکہ بطور اصول کے یہ بھی ذہن نشین کیا کہ بناءِ مدرسہ چندہ کے اصول پر ہونی چاہئے، سرکاری گرانٹوں یا امیروں کی جاگیروں کے بھروسہ پر نہ ہو، تا کہ یہ ادارہ عوامی رہے، سرکاری یا جاگیر داری نہ ہو جائے۔ غالباً اسی لئے حضرت حاجی صاحبؒ نے اجراءِ مدرسہ کے لئے جب حضرت والا کو بلایا تو سب سے پہلے چندہ ہی کا ذکر کیا اور وہ بھی تعین مقدار کے ساتھ، ورنہ فی نفسہٖ اس کی کوئی اہمیت نہ تھی کہ اس موقعہ پر چندہ اور اس کی مقدار کا ذکر کیا جائے۔

شاید اسی اہمیت کے پیش نظر مولانا منصور علی خاں صاحب (تلمیذ حضرت نانوتویؒ) نے مدرسہ دیو بند کے قیام کو حضرت نانوتوی کی طرف منسوب کرتے ہوئے خصوصیت سے اس کی بنیاد چندہ ظاہر کی ہے کہ:

> ’’خصوصاً مدرسہ دیو بند اول مولانا مرحوم (حضرت نانوتوی) نے اس مدرسہ کو چندہ سے قائم کیا تھا۔‘‘
>
> (مذہب منصور جلد دوم ص ۱۷۷)

دار العلوم کے لئے چندہ کی تجویز

حضرت نانوتویؒ ہی کی اسکیم تھی

پس ایک طرف حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب اس تحصیل چندۂ مدرسہ کو عطائے قاسم سے تعبیر کر رہے ہیں اور ایک طرف مولانا منصور علی خاں اسے بناءِ مدرسہ کے سلسلہ میں بطور بنیاد کے ذکر کر رہے ہیں، اور ادھر حضرت نانوتویؒ اپنے اصولِ ہشتگانہ میں چندہ کی دفعہ کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں کہ اول و آخر دونوں دفعات چندہ ہی کے بارے میں لائی گئی ہیں، یہ تینوں وثیقے ہمیں اس نتیجہ تک پہنچاتے ہیں کہ حضرت نانوتوی اور حضرت حاجی صاحب میں قیامِ مدرسہ ہی کا منصوبہ طے شدہ نہ تھا بلکہ چندہ کی اسکیم بھی طے شدہ تھی اور اسی کے تحت حضرت حاجی صاحب نے چندہ کیا اور پھر

خصوصیت سے خط میں چندہ ہی کا ذکر تعین مقدار کے ساتھ کر کے حضرت کو بلایا جس کا مقصد یہ تھا کہ سب معاملہ اول سے لیکر آخر تک آپ ہی کے اصول ومقاصد کے مطابق ہوا ہے اس لئے اب آپ کو آنے میں تامل نہ ہونا چاہئے، بلکہ اشعارِ مذکورہ بالا سے یہ حقیقت بہت صاف ہوکر عیاں ہو جاتی ہے کہ جب یہ مبادی اور تحصیل چندہ کے پروبال اور یہ پرواز عطاءِ قاسم ہیں تو قدرتی طور پر حاجی صاحبؒ کے یہ تمام اقدامات درحقیقت قاسمی اقدامات ہوئے، اور کہا جاسکتا ہے کہ قاسمی تحریک کا سب سے پہلا اثر دیوبند ہی میں مدرسہ دیوبند کے قیام کی صورت میں نمایاں ہوا، یہی بنیاد تھی کہ اجراءِ مدرسہ اور آغازِ تعلیم کے لئے حضرت حاجی صاحب نے صرف حضرت والا ہی کو بلایا جبکہ یہ سب فیضان انھیں کا تھا، کیا اس کے بعد بھی یہ کہنے کی کوئی گنجائش ہے کہ دیوبند کے مدرسہ کے قیام وتاسیس کا حضرت نانوتوی سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ انھیں حاجی صاحب کے خط ملنے سے پہلے اس کی خبر تک بھی نہ تھی کہ دیوبند میں کوئی مدرسہ قائم ہونے والا ہے؟ میں تو عرض کروں گا کہ مدرسہ ہی کی نہیں چندہ تک کی اسکیم سے بھی حضرت بے خبر نہ تھے اور یہ ابتدائی مرحلہ بھی ان دونوں بزرگوں میں طے شدہ تھا، اسی لئے حاجی صاحب کے خط میں اہمیت کے ساتھ چندہ کی اطلاع دے کر حضرت والا کو بلایا گیا تا کہ مدرسہ کی تاسیس کا عوامیت پر قائم ہونا نمایاں ہو جائے۔

اجراءِ تعلیم کے وقت حضرت نانوتوی کی عدم موجودگی کی وجہ

رہا یہ کہ اجراءِ تعلیم کے وقت حضرت والا دیوبند میں موجود نہ تھے، کیا اس وقت جو وہاں موجود تھے وہ سب کے سب مدرسہ دیوبند کے بانی تھے؟ اس لئے کہ موجود تھے، اگر حضرت والا موجود نہ تھے تو اجراءِ مدرسہ کے حق میں ان کا تحریری اذن ومنشاء موجود تھا، ان کا تقرر کردہ اور بھیجا ہوا مدرس بتعیّن تنخواہ موجود تھا، ان کی مؤثر تحریک اور مذاکروں کا نمایاں ثمرہ موجود تھا جس کا حاجی صاحب اپنے خط میں اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب اپنی نظم میں اعتراف فرما رہے ہیں، اس لئے یہ عدم موجودگی ان کے بانی ہونے کی پوزیشن میں اگر وہ بانی تھے، کیا خلل انداز ہوسکتی ہے؟

البتہ ایک سوال یہاں ضرور پیدا ہوتا ہے کہ میرٹھ سے دیوبند حضرت والا کی آمدورفت بکثرت

تھی اور ۱۸۵۷ء کے بعد اور بھی زیادہ بڑھ گئی تھی جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے حوالہ سے عرض کیا جا چکا ہے، پھر اجراءِ مدرسہ کے لئے ایک دن یا چند گھنٹوں کے لئے دیوبند تشریف لے آنے میں آخر کیا رکاوٹ تھی؟ بالخصوص جبکہ اس ادارہ کے قیام کے سلسلہ میں برسوں مذاکرے بھی فرمائے، خواص وعوام کو آمادہ بھی کیا اور ان کا عین متمنا یہی تھا، لیکن جب وہ مبارک ساعت آئی کہ وہ قائم ہو تو حضرت بلانے پر بھی تشریف نہیں لائے؟

اس کا ایک ظاہری اور بڑا سبب تو حضرت والا کی زندگی اور آپ کا قلبی مقام ہے، اور وہ یہ کہ آپ کمالِ تواضع وانکسار کے سبب امتیاز وشہرت اور نام آوری کے مواقع سے طبعاً گھبراتے تھے، امامت سے ہمیشہ گھبراتے تھے، خطابت ووعظ سے بے حد بچتے تھے، بیعت کرنے سے گریزاں رہتے تھے، اور اگر کسی کو کر بھی لیا تو تربیت کے بعد اجازت وخلافت دینے سے گھبراتے تھے کہ شیخ کہلائیں، خود اجازت دینے کے بجائے کمال کسر نفسی سے حضرت گنگوہی کی طرف رجوع کرا دیتے تھے کہ اجازت وہاں سے لو، اگر حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری رحمہ اللہ حکماً حضرت سے وعظ نہ کہلائیں اور حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ' بیعت کرنے پر مجبور نہ کریں تو شاید عمر بھی وہ یہ راستہ نہ چلتے۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ زندگی اجراءِ مدرسہ کے اس کھلے امتیازی مقام کو کیسے برداشت کرتی؟ اس لئے خود تشریف نہیں لائے، مگر جو کام خود آ کر انجام دیتے وہ باحسن اسلوب وہیں سے انجام دے دیا جیسا کہ ملا محمود صاحب کے بھیجنے کی تفاصیل سے اندازہ ہو سکتا ہے۔

حضرت نانوتوی کا شمار برطانوی گورنمنٹ کے باغیوں میں

دوسری بنیادی وجہ یہ ہے کہ حضرت نانوتوی جہادِ شاملی کے سربراہوں میں سے تھے، آپ کو گورنمنٹ اپنے کھلے باغیوں میں شمار کرتی تھی، چنانچہ اس جنگ میں شکست کے بعد آپ کا وارنٹِ گرفتاری نکلا ہوا تھا، بلیک لسٹ میں نام آیا ہوا تھا اور پولیس ہر وقت تلاش وجستجو میں سرگرداں رہتی اور شبہ پر بھی ان مقامات کا محاصرہ کیا جاتا رہتا تھا جہاں حضرت کی موجودگی کی خبر دی جاتی تھی، اس لئے آپ ہر وقت گورنمنٹ کی نگاہوں میں معتوب اور مشتبہ تھے اور گورنمنٹ کا یہ تصور آپ کے حق میں

بے محل نہ تھا کہ آپ کو ذرا بھی کوئی موقعہ ملے گا تو آپ اس گورنمنٹ کی تخریب وبغاوت سے نہ چوکیں گے، ظاہر ہے کہ ان حالات میں اگر حاجی صاحب کی اطلاع پر حضرت والا خود دیوبند پہنچ کر مدرسۂ دیوبند کا افتتاح واجراء کرتے تو حکومت کو یہ باور کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوتا کہ اس مدرسہ کی بنیاد باغیانہ جذبات پر رکھی گئی ہے اور یہاں جہاد کے سوا اور کوئی تعلیم نہیں دی جائیگی، اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ شروع ہی سے گورنمنٹ اس کی تخریب کے درپے ہو جاتی یا اسے قائم ہی نہ ہونے دیتی یا چلنے نہ دیتی اور وہ فکرِ خاص جس پر یہ مدرسہ قائم کرنا مقصود تھا (جس کا تذکرہ آگے آرہا ہے) کبھی بھی آگے نہ بڑھ سکتا، بالفاظِ دیگر وہ ساری اسکیم ہی فیل ہو جاتی جو حضرت والا کے ذہن کی امانت بنی ہوئی تھی۔

ادھر حضرت حاجی محمد عابد صاحب جن سے نو برس تک اس اجراء وقیامِ مدرسہ کے مذاکرے ہوتے رہے، نہ سیاسی لائن کے آدمی تھے اور نہ اس تحریکِ جہاد میں شریک تھے، ایک صوفی صافی، تارک الدنیا اور گوشہ نشین مگر بااثر بلکہ وسیع الاثر بزرگ تھے، جن کے خلاف انگریزوں کے ذہن میں کوئی تصور اور کوئی جذبہ نہ تھا، اس لئے حضرت والا نے اپنی انتہائی دانش مندی سے باوجود اطلاع ودعوت کے اجراءِ مدرسہ کے وقت خود دیوبند سے غیر حاضر رہ کر یہی ضروری سمجھا کہ مدرسہ کا افتتاح ان کی عدم موجودگی میں حضرت حاجی صاحبؒ کے ذریعہ عمل میں آئے، تاکہ ابتداء ہی سے گورنمنٹ مدرسہ کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھنا نہ شروع کر دے اور وہ فکر جو اس مدرسہ کے ذریعہ چلانا مقصود ہے اول مرحلہ ہی میں محو نہ کر دیا جائے، مدرسہ جم جانے اور اس کے اثرات ملک میں پھیل جانے کے بعد قدرتی طور پر ایسے خطرات کا پیش آنا یقینی نہیں رہ سکتا تھا اس لئے ابتداء ہی میں حضرتِ والا نے اس کی رعایت ضروری سمجھی اور وقت پر اپنی غیر حاضری سے ان خطرات کا سدِباب فرمادیا۔

گلاؤٹھی کے مدرسہ کے خلاف حکومتِ وقت کا رجحان

اس قسم کے خطرات اس دور میں محض احتمالی نہ تھے بلکہ واقعاتی شکل لئے ہوئے تھے، چنانچہ حضرت والا ہی کے بعض قائم فرمودہ مدارس میں اول مرحلہ میں یہ خطرہ عملی صورت میں پیش آیا اور مدرسہ کو اس وقت تک بند کر دینا پڑا جب تک کہ حالات اطمینان بخش نہ ہو گئے۔ حضرت والا نے

گلاؤٹھی پہنچ کر اپنے ایک متوسل منشی مہربان علی صاحب رئیس اعظم گلاؤٹھی کو مدرسہ قائم کرنے پر آمادہ فرمایا، مقررہ وقت پر انھوں نے سنگ بنیاد رکھنے کے لئے حضرتِ والا کو دعوت دی، آپ نے گلاؤٹھی پہنچ کر ۱۲۹۲ھ میں جو مدرسہ دیوبند کی عمارت بننے کا سال ہے، مدرسہ کا اجراء فرمایا اور خود ہی اس کا نام مدرسہ منبع العلوم تجویز فرمایا، مدرسہ کی مدرسی کے لئے حضرتِ والا نے اپنے بڑے داماد مولانا عبداللہ صاحب انبیٹھوی کو تجویز فرما کر بھیجا جن کے ساتھ ان کے صاحبزادے مولانا محمد میاں صاحب مہاجر کابل اور خود حضرتِ والا کے صاحبزادے (میرے والد بزرگوار) حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب بحیثیت طالب علم کے تھے، مدرسہ کی تاسیس پر چھ مہینے ہی گذرنے پائے تھے کہ کلکٹر نے منشی مہربان علی صاحب کو بلا کر تہدید آمیز لہجہ میں کہا کہ کیا اس مدرسہ کی بنیاد مولوی محمد قاسم نے رکھی ہے اور کیا اس میں جہاد اور بغاوت کی تعلیم دی جا رہی ہے؟ منشی صاحب گھبرا گئے اور انھوں نے بہت ہی دب کر یہ جواب دیا کہ جی نہیں، وہ تو ایک مکتب ہے جس میں نماز اور روزہ کے کچھ مسائل بتا دیئے جاتے ہیں اور کچھ قرآن شریف کی تعلیم دیدی جاتی ہے، مگر کلکٹر کا انداز دیکھ کر منشی صاحب موصوف اس قدر مرعوب اور خوفزدہ ہوئے کہ انھیں آکر مدرسہ بند کرنا پڑا اور مولانا عبداللہ صاحب کو مجبوراً جواب دینا پڑا، کچھ عرصہ بعد جب یہ قصہ ماضی ہوگیا تب پھر از سرنو مدرسہ میں تعلیم شروع ہوئی اور مدرسہ کا ثانوی وجود ہوسکا۔

یہ واقعہ حضرت مولانا محی الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس مدرسہ گلاؤٹھی نے مولانا بشیر احمد خاں صاحب مرحوم مدرس دار العلوم دیوبند سے بیان فرمایا اور مولانا موصوف نے دار العلوم کے بزرگوں کے ایک اجتماع میں جس میں یہ احقر بھی حاضر تھا یہ واقعہ نقل فرمایا، اس سلسلہ میں مولانا ممدوح نے اس مدرسہ کی تاسیس کے محرکات کے بارہ میں ایک لطیفہ بھی نقل فرمایا کہ منشی مہربان علی صاحب کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، انھوں نے اپنے شیخ حضرت نانوتویؒ سے اس بارے میں دعاء کی درخواست کی، حضرت نے فرمایا کہ تم گلاؤٹھی میں دینی مدرسہ قائم کردو تو اللہ تعالیٰ تمہیں پسری اولاد دے گا۔ اس پر منشی صاحب نے قیامِ مدرسہ کا ارادہ کیا اور حضرتِ والا کو گلاؤٹھی بلا کر اس کا سنگِ بنیاد رکھایا، لیکن چھ ماہ کے اندر جب وہ کلکٹر کی غضبناکی کا واقعہ رونما ہوا اور منشی صاحب نے مدرسہ بند کردیا تو دیوبند آکر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے مدرسہ بند کرنے کا واقعہ ذکر کیا، مولانا نے جوش

اور جذبہ سے فرمایا کہ ''یہ نہیں تو وہ بھی نہیں'' اگر مدرسہ نہیں تو نرینہ اولاد بھی نہیں، چنانچہ منشی صاحب نے محض نرینہ اولاد کے لئے دوسری شادی کی مگر نرینہ اولاد عمر بھر کبھی نہ ہوئی۔

بہرحال عرض کرنا یہ ہے کہ اس دور میں مدرسہ یا دوسرا ادارہ خصوصیت سے حضرت نانوتوی کے انتساب سے برطانوی گورنمنٹ کی نگاہوں میں کھٹک جاتا تھا اور وہ اس کے درپئے تخریب ہو جاتی تھی، اگر حضرتِ والا مدرسہ دیوبند کے اجراء کے لئے میرٹھ سے دیوبند پہنچ کر خود مدرسہ کا اجراء فرماتے تو ممکن تھا کہ یہی حشر اس کا بھی ہوتا جو مدرسہ گلاؤٹھی کا ہوا، بلکہ اس سے زیادہ کیونکہ گلاؤٹھی کا مدرسہ دیوبند کے مدرسہ سے نو برس بعد جاری ہوا جبکہ ملک میں برطانوی حکومت کی طرف سے امن وامان کا اعلان ہو چکا تھا اور ملک کے کام اپنی اپنی جگہ جم گئے تھے، لیکن حضرت نانوتوی اور ان کے انتساب سے جاری شدہ کاموں کے بارے میں حکومت کی کھٹک بدستور باقی تھی تو نو برس پہلے جبکہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے آثار پوری طرح مضمحل بھی نہ ہونے پائے تھے، حضرت کی نسبت سے جاری شدہ کام اور وہ بھی تعلیمی ادارہ حکومت کو کس قدر کھٹکتا اور وہ اس کے استیصال میں کیا کچھ نہ کرتی، اس لئے حضرت نے کمالِ احتیاط سے مصلحتاً مدرسہ کے ابتدائی ایام میں بسلسلہ اجراء وقیامِ مدرسہ آگے آنا پسند نہیں فرمایا گو اندرونی طور پر اس کے ابتدائی مراحل اور سلسلۂ تعلیم کے آغاز کے وسائل جیسے مدرس کا تقرر وتعین واجراءِ تنخواہ اور مستقبل میں مساعی کی بشارت وغیرہ کے مبادی سب آپ ہی نے طے فرمائے۔

پس اجرائے مدرسہ کے وقت حضرت کی اس عدم موجودگی کو بانیٔ مدرسہ ہونے کی نفی کے لئے حجت بنانا صرف لفظ ''عدم موجودگی'' کو سامنے رکھ کر، اس کے نیچے کی ساری تاریخ اور واقعات سے لاعلمی پر مبنی ہے۔ **حفظت اشیاءً وغابت عنك اشیاءً۔**

بہرحال یہ عدم موجودگی بوقت اجراء حضرتِ والا کے بانی ہونے کی نفی کے لئے کارگر نہیں ہو سکتی جبکہ واقعات کا ذکر کردہ تسلسل سامنے موجود ہو، نیز مدرسہ دیوبند کے اجراء وقیام سے حضرت نانوتوی کی بے تعلقی جو اس خط کی ایک نا تمام عبارت سے ثابت کی جاری ہے یوں بھی مستبعد اور بعید از قیاس ہے کہ ایک ایسی شخصیت جو عمومی طور پر اس دور میں ایک ہمہ گیر تعلیمی تحریک اور اجراءِ مدارس کی محرکِ

اعظم تسلیم کی گئی ہو اور اس نے جگہ جگہ خود پہنچ کر مدارس قائم بھی کیے ہوں، اس کا خود اپنے گھر میں قیامِ مدرسہ سے نہ صرف بے تعلق بلکہ لاعلم محض ہونا غیر قدرتی ہے، حضرت کی ہمہ گیر شخصیت کے لئے زیادہ موزوں اور شایانِ شان یہی ہو سکتا تھا کہ وہ باہر سے پہلے اپنے گھر کی زیادہ فکر کریں اور اپنی اسلامی تعلیمی تحریک کو زیادہ سے زیادہ دیوبند میں ابھاریں تا کہ باہر والوں کے لئے مثال قائم ہو اور تحریک آگے بڑھے، سو اندازہ ہوتا ہے کہ حضرتِ والا کے فیضان نے پہلے دیوبند ہی کو تاکا ہے اور اس کے بعد ہی طبعی ترتیب سے آپ درجہ بدرجہ آگے بڑھے ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کی اصلاحی تحریک

سوانح مخطوطہ کے مصنف نے حضرتِ والا کو آفتاب سے تشبیہ دیتے ہوئے دیوبند کو قمر کہا ہے اور بتایا ہے کہ اس سے ہندوستان کے شہر اور قصبے روشن ہوئے اور یہ قمر آفتابِ قاسمی سے چمکا تو صورتِ دلیل یہ ہو جاتی ہے کہ آفتاب نے قمر کو روشن کیا اور قمر نے پورے ملک پر اپنا نورانی سایہ پھیلا دیا، جس سے یہ طبعی ترتیب نکل آئی کہ آپ نے پہلے اپنے گھر کو ہی چمکایا بعد میں ماحول کی طرف توجہ فرمائی جس کو سوانح مخطوطہ کے مصنف نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے:

''وہ آفتاب عالم تاب (حضرت نانوتویؒ) مشرقی نانوتہ میں طلوع ہوا اور زمین دیوبند کو منور فرمایا اور منور بھی کیسا؟ قمر بنا دیا اور اس قمر سے تمام ہندوستان کے قصبوں اور شہروں کو روشن کر دیا، دیوبند کے حدود دہلی سے بڑھ گئے، دیوبند یا ایک کوردہ تھا یا ایسا نام روشن ہوا کہ مرکزِ خواص وعوام ہو گیا اور دارالعلم بن گیا۔''

(سوانح مخطوطہ ص ۱۹)

رہا یہ کہ دیوبند کی اس ماہتابی ضیاء کی نوعیت کیا تھی؟ تو سچ پوچھئے تو نورانیتیں دو ہی ہیں نورِ اخلاق اور نورِ علم، سو حضرتِ والا نے تحریکِ خاص سے خواص کو مذاکرات کے ذریعہ آمادہ کرنے کے ساتھ ساتھ اصلاحی انداز میں عام اہل دیوبند کی طرف دونوں ہی طریقوں سے توجہ فرمائی، ان کی پہلی توجہ اصلاحِ اخلاق ومعاشرت کی طرف منعطف ہوئی اور جو جاہلانہ رسوم ورواج یہاں جڑ پکڑ چلے تھے ان کا انسداد فرمایا۔

''جب مولانا کا چند روز دیوبند میں قیام ہوا تو آپ کو اہل دیوبند کے حال پر رحم آیا اور ان کی درستی اور

اصلاحِ معاش ومعاد کی طرف متوجہ ہوئے۔'' (سوانح مخطوطہ ص ۳۹)

قصبہ دیوبند کی پانچ قدیم خرابیوں کی اصلاح

جس کی تفصیل دوسری جگہ یہ کی ہے۔

اس قصبہ میں پانچ بنیادی خرابیاں گھر کر چکی تھیں اور ان سے پھر دوسری بیماریاں نشو ونما پا رہی تھیں، ایکؔ حج کی طرف کوئی عام توجہ باقی نہیں رہی تھی اور ایک عظیم رکنِ اسلام متروک ہو چکا تھا جس سے اجتماعی عبادت وعمل کی زندگی برباد ہو چکی تھی، دوسرؔے نکاحِ بیوگان کہ اسے ایک قبیح ترین عیب سمجھا جانے لگا تھا اور اس کا نام لینے سے بھی تلواریں کھنچ جاتی تھیں جس سے معاشرہ اور رہن سہن فاسد ہو کر رہ گیا تھا، تیسرؔے نفاقِ باہمی جس سے مقدمہ بازی کی کثرت ہو گئی تھی اور برادریوں میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی، اتفاق واتحاد کا نشان مٹ چکا تھا، جس سے قوت اور قومی طاقت کا فقدان ہو چکا تھا، چوؔتھے بیاہ شادی کی مسرفانہ رسمیں، فضول خرچی اور اس پر مفاخرت سے معیشت تباہ ہو رہی تھی، پانچویںؔ غمی کی جاہلانہ رسمیں جن سے عقائد اور افکار وخیالات کی دنیا اجڑ چکی تھی، بالخصوص تشیّع کا زیادہ غلبہ تھا، ہر سنی آدھا شیعہ تھا، تقریباً ہر مسجد سے تعزیہ اٹھتا تھا، ماتمی مجلسیں ہوتی تھیں اور عزاداری اپنے پورے عروج پر تھی، اس پر ستم ظریفی یہ کہ یہ سب کچھ سنّیت کے نام پر ہو رہا تھا۔

غرض یہ پانچ بنیادی خرابیاں تھیں جس سے عبادتی زندگی، معاشرتی زندگی اور معاملاتی زندگی برباد ہو رہی تھی، حضرتِ والا نے مواعظ اور تدابیر سے ان رسوم کا انسداد فرمایا، نہ صرف وعظ وپند سے بلکہ تنظیم اور عملی قوت سے بھی رؤسائے دیوبند اور برادریوں کو جمع کر کے سب کے اتفاق سے حضرتِ والا نے ایک کتبہ اور وثیقہ لکھایا جس میں عہد کیا گیا تھا کہ شادی غمی کی رسمیں یک قلم موقوف، مستورات کا ہندوانہ لباس یک قلم ختم اور نزاعاتِ باہمی کا تصفیہ حسبِ اصولِ شرعیہ ہوا کرے اور اس کے لئے اس عہد نامہ میں سب سے پہلی دفعہ یہ تھی کہ کوئی مقدمہ یا معاملہ جس میں فریقین مسلمین ہوں سرکاری کچہری میں نہ جاوے اور ایک عدالتِ شرعی (محکمہ قضا مقرر ہو، جسکے حاکم حضرتِ والا ہوں، چنانچہ یہ شرعی عدالت قائم ہوئی اور برسہا برس کے الجھے ہوئے مقدمات جنھوں قصبہ میں نا اتفاقی اور

ناچاقی پھیلا رکھی تھی، منٹوں میں طے ہونے لگے اور لوگوں میں باہمی میل ملاپ اور محبت وو داد کی روح دوڑ گئی جیسا کہ سوانح مخطوطہ میں ص ۴۵ سے ص ۴۷ تک یہ تمام تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

دوسری توجہ تعلیم کی طرف فرمائی جس سے اصل دین قلوب میں متعارف ہو اور تمام دینی مقاصد کے ذہنوں میں جاگزیں ہونے کی صورت پیدا ہو جائے جبکہ جہالت نے ان کے قلوب کو چر لیا تھا جس کا واحد ذریعہ تعلیمی مدرسہ کا قیام ہی ہو سکتا تھا، جو حضرتِ والا کی بنیادی تحریک تھی، لیکن اس کیلئے عام قلوب میں استعداد پیدا کی جانی ضروری تھی، جب تک عوام میں اپنی جہالت اور علم کی ضرورت کا احساس نہ ہوتا قیامِ مدرسہ ممکن نہ تھا، جو حقیقتاً ان ہی کی اعانت کا محتاج تھا، سو اس سلسلہ میں حضرتِ والا نے بھر پور توجہ فرمائی، خواص وعوام دونوں پر اثر ڈالا اور اپنی اپنی نوعیت سے دونوں حلقوں کے ذہن کو بنایا جس کی قدرتی صورت یہ بنی کہ قیامِ مدرسہ سے بہت پہلے ہی سے حضرتِ والا کی آمد ورفت دیوبند میں شروع ہو چکی تھی، آپ کے قرابتی تعلقات اہل دیوبند سے کافی تھے، آپ کی بڑی بہن دیوبند ہی میں بیاہی تھیں، آپ کے والد ماجد کی بہن یعنی آپ کی پھوپھی بھی دیوبند ہی میں بیاہی گئیں، پھر خود آپ کی شادی بھی دیوبند میں ہوئی، اس بناء پر دیوبند میں آمد ورفت بکثرت رہتی تھی اور دیوبند مثل آپ کے وطن ثانی کے تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ آمد ورفت اور بھی بڑھ گئی اور قیام کچھ زیادہ ہونے لگا، جیسا کہ سوانح مخطوطہ میں مرقوم ہے۔ چوں کہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب دیوبندی اور حاجی محمد عابد صاحب چھتہ کی مسجد میں قیام پذیر تھے، حضرتِ والا نے ان بزرگوں کی وجہ سے اسی مسجد میں قیام کیا اور ان دونوں بزرگوں سے کمال درجہ کا انس اور ربط ضبط ہو گیا، یہی زمانہ ان مذکرات کا ہے جو قیامِ مدرسہ کے سلسلہ میں حضرتِ والا نے ان حضرات سے کئے اور ان کے ذہن میں اس دور کے مصیبت زدہ اور شکست خوردہ مسلمانوں کو سنبھالنے اور ابھارنے کے لئے تعلیمی تحریک پیوست کی اور ۱۲۸۳ھ میں بصورتِ مرقومہ بالا اس کا ظہور ہوا۔ صاحبِ سوانح مخطوطہ لکھتے ہیں کہ:

''مولانا مرحوم (حضرت نانوتویؒ) کی دیوبند میں بہت سی قرابتیں قدیمہ وجدیدہ ہیں، اس لئے مولانا کی آمد ورفت یہاں اکثر رہتی تھی مگر آزادی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ نہ کسی سے رلنا نہ ملنا، سب سے

الگ رہنا، مگر ۱۲۷۴ھ میں جس کو چوبیس سال کا عرصہ ہوا آپ کی دیوبند میں آمدورفت اور زیادہ بڑھ گئی اور قیام بھی زیادہ سے زیادہ ہوا، یہ وہ سال مبارک ہے جس میں دیوبند کا بختِ خفتہ بیدار ہوا اور ظلم وجہل کی رات تمام ہوئی اور علم وعمل کی صبح صادق نمودار ہوئی، اسی زمانہ میں جناب مولوی رفیع الدین صاحب وجناب حاجی محمد عابد صاحب دیوبندی سلمہا اللہ تعالیٰ جن کی مختصر کیفیت آگے عرض کروں گا، چھتہ کی مسجد میں قیام پذیر تھے، مولانا نے ان بزرگوں کی وجہ سے اسی مسجد میں قیام کیا اور ان دونوں بزرگوں سے کمال درجہ کا اتحاد پیدا ہوگیا۔" (سوانح مخطوطہ ص ۲۹)

ظاہر ہے کہ ۱۲۷۴ھ کے بارے میں صاحبِ سوانح مخطوطہ کا یہ کہنا کہ ظلم وجہل کی رات ختم ہوئی اور علم کی صبح صادق نمودار ہوئی، قیامِ مدرسہ کی طرف تو اشارہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ مدرسہ کا قیام تو اس سے نو سال بعد ۱۲۸۳ھ میں ہوا ہے، اس لئے یہ علم کی صبح صادق درحقیقت علم کی وہی داغ بیل یعنی قیامِ مدرسہ کے سلسلہ کے باہمی مذاکرے ہیں جن کے نتیجہ میں نو سال بعد مدرسہ کا قیام عمل میں آیا۔

اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ صاحبِ سوانح مخطوطہ جیسے حضرات اس ابتداء ہی سے انتہاء کو سمجھ گئے تھے کہ یہ مذاکرے کچھ رنگ لانے والے ہیں اور علم کی پو پھٹنے کی خبر دے رہے ہیں، نیز صبح صادق کی نمود کو پورے دیوبند کی طرف منسوب کرکے یہ کہنا کہ اس قصبہ کے بختِ خفتہ بیدار ہوگئے، اس کی علامت ہے کہ صاحبِ سوانح کے نزدیک پورے قصبہ پر ان مذاکرات کے اثرات پڑ چکے تھے، چنانچہ ۱۲۷۴ھ سے قبل کی آمد کے بارہ میں صاحبِ سوانح کا یہ کہنا کہ حضرت میں یکسوئی کا غلبہ تھا تو ۱۲۷۴ھ کے بعد کی آمد کا صاف مطلب یہ نکلا کہ اب حضرتِ والا حریمِ اختفا سے نکل کر باذن اللہ رلنے ملنے اور سب میں گھل مل جانے کے مقام پر آچکے تھے تاکہ انھیں بھی اپنی حقیقی روح سے آشنا بنائیں اور یہ حقیقی روح وہی قاسمیت اور علمی تحریک تھی جسے گھل مل کر آپ نے عوام آشنا بنایا اور جسے صاحبِ سوانح نے علم کی صبح صادق ہونے سے تعبیر کیا ہے، جو ۱۸۶۶ء میں علم کا سورج طلوع ہونے کی خبر دے رہی تھی۔

بہرحال اس طرح آپ نے دیوبند کو علم اور اخلاق دونوں سے آراستہ کرنے کی جدوجہد فرمائی تاکہ دیوبند کی مثال سے پورا ملک اور پورے ملک سے پھر پورا عالمِ اسلام منور ہوسکے، چنانچہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس حقیقت کو تاریخی طور پر واشگاف بھی کردیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''جب وہ طبیبِ روحانی (حضرت نانوتویؒ) اپنی قوم (اہل دیوبند) کی اصلاح (رسومِ مروجہ وقبائح اخلاق ومعاشرہ) سے فارغ ہوا، تمام ہندوستان کے مسلمانوں پر نظر ڈالی اور بنظرِ غور دیکھا تو دریافت کیا کہ مادۂ جاہلیت بعض کے اندر پیدا ہو چکا ہے اور خوف ہے کہ اس مادہ سے امراضِ متعدی پیدا ہو جائیں اور رفتہ رفتہ وہی امراض وبائی ہو کر ایک عالم کو ہلاک کر دیں اور اس مرض کا چلتا ہوا نسخہ علم دین ہے جہاں تک ممکن ہو اس کی اشاعت میں سعی کی جائے، چنانچہ مدرسہ اسلامی عربی دیوبند جاری کیا۔'' (سوانح مخطوطہ ص ۴۷و۴۹)

اس سے واضح ہے کہ حضرتِ والا کا ملک سے پہلے اپنے گھر کی طرف توجہ فرمانا محض قیاسِ جلی ہی کے مطابق نہیں بلکہ واقعہ بھی یہی ہے کہ آپ نے سب سے پہلے اہل دیوبند کی طرف توجہ فرما کر پہلے خواص کا ذہن بنایا جس کی طرف حضرت حاجی صاحبؒ نے مذاکرات کے عنوان سے اشارہ فرمایا اور پھر عوام کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے۔

معاشرہ کی اصلاح کے بعد تعلیمی تحریک کا اجراء

ابتداءً اصلاحِ رسوم اور اصلاحِ معاشرہ کا وظیفہ انجام دیا، پھر اصل دین دلوں میں جمانے کے لئے تعلیمی تحریک کے سلسلے سے مدرسہ کا قیام عمل میں آیا تا کہ اصلاحی سلسلہ تعلیمی راستے سے آگے بڑھے اور پختہ ہو کر ملک گیر ہو جائے، اس کے مبادی اور ابتدائی مراحل طے کرنے میں حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پیش قدمی فرمائی، اب آگے یہ ان اکابر اہل اللہ کی للّٰہیت اور بے لوث جذبۂ خدمت کی بات ہے کہ حضرت حاجی صاحبؒ نے تو از راہِ حق پسندی اجراءِ مدرسہ کے لئے حضرت نانوتوی کو بلانا ضروری سمجھا جبکہ ان میں یہ جذبہ اور ابتدائی عمل کا ابھار حضرتِ والا ہی کے مذاکرات سے پیدا ہوا تھا جو ان کے خط سے ظاہر ہے، اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ازراہِ عجز و نیاز اور بمصالح مذکورہ اپنی آمد کے انتظار میں اس کارِ خیر کو مؤخر کرنا اور معلق چھوڑے رکھنا نامناسب خیال فرمایا اور ایک مدرس کا انتخاب اور اس کی تنخواہ کا تعین کر کے دیوبند بھیج دیا، تا کہ تعلیم کا اجراء بلا کسی تاخیر وانتظار کے جلد عمل میں آ جائے۔ بہر حال وقت کے قدرتی تقاضے اور تاریخی تصریحات کے بموجب تحریکِ قاسمی کا اولین نقش قدرتی طور پر پہلے دیوبند ہی پر پڑنا چاہئے تھا اور پڑا، کہ یہی نقش اول آخر کار نقش ثانی کا پیش خیمہ بن سکتا تھا جو پورے ملک کے لئے بنا۔

بہرحال حاجی صاحب کے خط کے مختصر عبارت کے ساتھ اس کے قدرتی ٹکڑوں کو ملا لئے جانے سے مدرسہ دیوبند کا یہ ابتدائی اجراء جو حضرت حاجی صاحب نے فرمایا، حضرت نانوتوی سے اس طرح وابستہ ہو جاتا ہے کہ حاجی صاحب کا اقدام دراصل حضرتِ والا ہی کا اقدام تھا اور اجراءِ تعلیم کے وقت ان کی عدم موجودگی سے بانی ہونے کی پوزیشن میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا کہ اسے وجہِ انکار بنایا جائے، بلکہ خط کی ان تصریحات کے بعد یہ انکار **توجیه القول بمالایرضی به القائل** کا مصداق ہو کر رہ جاتا ہے، اس لئے یہ نفی حیرت ناک ہے کہ دیوبند کے مدرسہ کی تاسیس سے حضرت نانوتوی حضرت حاجی صاحب کے خط پہنچنے تک بے تعلق بلکہ لاعلم محض تھے، جبکہ خواص وعوام دونوں کا تاثر اس بارے میں حضرت ہی کے مذاکروں اور تحریک سے ہوتا رہا، جس کا اندازہ حضرت حاجی صاحبؒ کے خط اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی نظم سے ہوتا ہے اور پورے قصبہ کے جذبہ اور تاثر کا اندازہ خود حضرتِ والا کی تقریر کے ایک جملہ سے اور صاحبِ سوانح مخطوطہ کی عبارت سے ہو رہا ہے، دونوں صورتوں میں حضرت والا کی مدرسہ دیوبند کے قیام واجراء سے بے تعلقی اور لاعلمی بے بنیاد ہو کر رہ جاتی ہے جس پر منفی نگار حضرات نے اپنے مقالات میں زور دیا اور اسے منفی دعوے کی حجت کے طور پر استعمال کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ منفی پہلو پر زور دیتے ہوئے حضرت نانوتوی کے بانیٔ مدرسہ دیوبند نہ ہونے کی دلیل میں حضرت حاجی صاحب کا جو خط نا تمام انداز سے پیش کیا گیا ہے اس سے نہ صرف یہ کہ نفی نہیں نکلتی بلکہ اسکے برعکس اثبات نکل رہا ہے اور خط کے باقی ماندہ جملے ملا لینے سے تو مستقلاً اس نفی کا رد نکل آتا ہے۔

ایک نا معلوم وغیر محقق رسالے کا حوالہ

رہا وہ کہن سال رسالہ جسے مدینہ اخبار میں محترم مقالہ نگار نے تخمینی طور پر نصف صدی سے زائد کی عمر کا بتلایا ہے اور حضرتِ والا کے بانی ہونے کی نفی میں اسے بطور سندِ نفی پیش کیا گیا ہے، اس لئے قابل بحث نہیں کہ نہ اس کا نام معلوم نہ مصنف کا پتہ، نہ سن تصنیف، اگر اس رسالے کی تخمینی عمر کے

ساتھ مصنف کا بھی کوئی تخمینی پتہ نشان دیدیا جاتا اور تخمینی ہی طور پر اس تحریر کا کوئی اسم ورسم بھی سامنے رکھدیا جاتا تو اس پر کچھ عرض کیا جاتا، لیکن تحریر کی اس گمنامی کی صورت میں عرض بھی کیا جائے تو کیا عرض کیا جائے۔ پھر جو کچھ اس گمنام تحریر میں کہا گیا ہے (مثلاً حضرت نانوتویؒ کے بانی ہونے کا قصہ ۱۹۰۵ء سے شروع کیا گیا ہے، اس سے پہلے کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ وہ بانی مدرسہ ہیں)، سو اس کی حقیقت کچھ تو خود حضرت حاجی صاحبؒ کے خط کی عبارت سے، کچھ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی نظم سے اور کچھ سرسید اور مولانا منصور علی خاں وغیرہ کے نوشتوں سے اور کچھ سوانح مخطوطہ کی تصریحات سے سامنے آچکی ہے، جو یقیناً ۱۹۰۵ء سے پہلے کی بات لکھ رہے ہیں نہ کہ گورنر صاحب والے جلسہ اور اس کے بعد کی، نیز اس کے بارہ میں اور کچھ شہادتیں آگے بھی آنے والی ہیں۔

اصل بانی کا تعیّن

بہرحال جب حضرتِ والا کے بانی ہونے کی نفی کالعدم ہوگئی جس کا واقعات نے ساتھ نہیں دیا تو اصل سوال پھر لوٹ آیا کہ بانی کون ہے؟ اور یہ کہ اوپر کی عرض کردہ متضاد روایات کو سامنے رکھ کر آج کس کو بانی کہا جائے اور کس کو نہ کہا جائے؟ ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہوسکتا جب تک کہ روایات کا تضاد ختم نہ ہو، یا متضاد روایتیں ختم نہ ہوں، یعنی صورتیں دو ہی ہیں، ایک متضاد روایتوں میں ترجیح وانتخاب کہ کسی ایک روایت کو قرائن کی مدد سے ترجیح دے کر بقیہ کو رد کر دیا جائے، دوسرے تطبیق اور جمع بین الروایات کہ کسی ایک روایت کا بھی نہ انکار کیا جائے، نہ اسے چھوڑا جائے لیکن سب روایتوں کو جمع کر کے ان کا صحیح محمل متعین کر دیا جائے، ظاہر ہے کہ اس کے بغیر بانی کا تعین نہیں ہوسکتا۔

رفعِ تضاد کی پہلی صورت یعنی رد وانکار اور ترجیح وانتخاب رواۃ کی ضبط وعدالت اور جلالتِ شان کے لحاظ سے دشوار تر اور مشکل ہے، بالخصوص جبکہ وجوہِ انکار بھی منقح نہیں ہیں، اس لئے احقر کے خیالِ ناقص میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ان روایات میں سے کسی ایک کو بھی رد کیا جائے، یا کوئی ایسی تاویل کی جائے جو محض لفظی ہیر پھیر سے تعلق رکھتی ہو اور دل اسے قبول نہ کرتا ہو، اس لئے کہ

اتنے اکابر کی شہادتوں کو بیک جنبش قلم غلط ٹھہرا کر کسی ایک شخصیت کے بانی ہونے اور دوسری کے بانی نہ ہونے پر اصرار کیا جانا خواہ وہ حاجی محمد عابد صاحب ہوں یا حضرت نانوتوی، کم از کم ان روایتوں اور راویوں کے منصب ومقام سے میل نہیں کھاتا، اور اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہ مخالف دستاویزی تحریرات باہم ٹکرانے کے لئے نہیں ہیں کہ ایک سے دوسری کو ساقط الاعتبار بنایا جائے، ورنہ ان سب کی دستاویزیت ساری کی ساری ختم ہو جائے گی اور کوئی ایک بھی بانی ثابت نہ ہوگا بلکہ راویوں کی ثقہ وعدالت اور تقدیس وحرمت اس کی مقتضی ہے کہ ان سب روایتوں کو قبول کر کے ان میں بلحاظ نوعیتِ واقعات تطبیق دی جائے اور سب کو اپنے موقعہ پر قرائن وشواہد اور واقعات کی مدد سے چسپاں کیا جائے، جس کی نوعیت اس کے سوا دوسری نہیں ہے کہ یہ سب حضرات بحیثیت مجموعی بانی ہیں، جہاں تک اس مسئلہ کی تفصیل کا تعلق ہے اس کی نوعیت یہ محسوس ہوتی ہے کہ مدرسۂ دیوبند کی یہ ساری بنائیں جن کی رو سے مختلف حضرات کو بانی کہا جا رہا ہے درحقیقت ایک بناء کے مختلف پہلو ہیں جو حسبِ مناسبت مختلف حضرات کے ذریعہ رونما ہوئے ہیں۔

قدرتی بات ہے کہ جب بھی کسی جماعتی نصب العین یا عمومی ادارہ کے قیام کا مسئلہ سامنے آیا تو طبعی طور پر اس کے قیام وانصرام میں مختلف شخصیتیں جمع ہو کر اپنی اپنی نوعیت سے آگے بڑھتی ہیں اور اپنی اپنی صلاحیتیں عمل میں لا کر ہر ہر فرد اپنے اپنے رنگ سے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے، اس لئے ان کے قیام میں درجہ بدرجہ سب کا حصہ شامل ہوتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ کسی ادارہ کے آغاز وافتتاح یا اجراء کے وقت اس کا ہر پہلو اولیت ہی لئے ہوتا ہے، اس صورت میں جو فرد بھی اس کے کسی پہلو کو بروئے کار لائیگا وہ اس کے حق میں اولیت ہی لئے ہوئے ہوگا جس کو تاسیس کہتے ہیں، اس لئے اس کے آغاز کنندہ پر بانی اور مؤسس کا اطلاق درست ہو سکتا ہے، خواہ وہ کسی جزوی پہلو کا افتتاح کرے یا کل کا، جبکہ نفس ادارہ ہی اولیت اور آغاز کے مقام پر ہے تو اس کا ہر ہر فرد بھی اولیت اور آغاز کی شان لئے ہوئے ہوگا۔

مثلاً اگر تعلیمی نصب العین سامنے ہو جسے کسی جماعتی یا اداراتی صورت سے وجود دیا جا رہا ہو، تو قدرتی بات ہے کہ کوئی اس کی تجویز پیش کرتا ہے، کوئی تعلیم کا اجراء کرتا ہے، کوئی وسائلِ تعمیر فراہم کرتا

ہے، کوئی اس کا مسلک ومشرب یعنی پالیسی طے کرتا ہے، کوئی اس کے بنیادی اصول وضع کر کے دستور بناتا ہے، کوئی اس کے انتظامی اور تعلیمی قواعد وضوابط بناتا ہے، کوئی اس کی تعمیر اٹھانے کے لئے آگے بڑھتا ہے اور کوئی اسے بروئے کار لانے کے لئے ذہن بناتا ہے اور خواص وعوام میں روح پھونک کر ان کے جذبات کو قیامِ ادارہ کے لئے برانگیختہ کرتا ہے وغیرہ وغیرہ، ان مختلف پہلوؤں کے لحاظ سے یہ علمی آغاز کرنے والے سب کے سب بانی ہی کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں جبکہ ان سب کا بناء سے تعلق ہوتا ہے۔ اندریں صورت ظاہر ہے کہ جسکے سامنے ان میں بناء وتاسیس کا کوئی بھی پہلو نمایاں ہوگا خواہ وہ جزوی ہو یا کلی جس کو کسی شخصیت نے آگے بڑھایا ہوگا تو واقعاتی سطح پر وہ اس کو بانی کے لفظ سے یاد کرے گا اور اس میں حق بجانب ہوگا جبکہ ہر پہلو کی آغازِ ادارہ میں بناء ہی رکھی جاتی ہے۔

بانی ہونے کی مختلف حیثیتیں

اس اصول کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ خاص خاص بناؤں کے دائرہ میں مثلاً حضرت حاجی محمد عابد صاحب اجرائے تعلیم وافتتاحِ مدرسہ اور فراہمیٔ وسائل کی حیثیت سے بلاشبہ بانی ہیں جس میں پہل اور اولیت انہی کا حصہ ہے۔

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب اس عمل کے مذکرِ اول اور معینِ تاسیس کی حیثیت سے بانیٔ مدرسہ ہیں کہ یہ عمل ان ہی کا حصہ ہے، اور اس میں پہل انھوں نے ہی کی۔ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب مؤیدِ اوّل اور معین تاسیس کی حیثیت سے بانیٔ مدرسہ ہیں کہ ان کے ہر ہر لفظ سے تائید ونصرت اور تعاون کا عمل نمایاں ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب محدثِ اول کی حیثیت سے بانیٔ مدرسہ ہیں کہ اس مدرسہ میں تعلیم حدیث کے بانی مبانی رہے ہیں اور اس عمل میں بلاشبہ اولیت کا فخر انہی کو حاصل ہے۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ اس مدرسہ کے فقہی مسلک اور اس میں تصلّب پیدا کرنے کی حیثیت سے بانیٔ مدرسہ ہیں کہ انہی سے اس عمل کی بنیاد قائم ہوئی۔

بانی کی عمومی نسبت

البتہ جو لوگ بنیاد کے ان تمام پہلوؤں میں کسی شخصیت کی روح کو دوڑتا ہوا دیکھتے ہیں جس کے آثار جڑ بنیاد سے لے کر شاخوں اور پھل پھول پتیوں تک میں پھیلتے ہوئے محسوس ہو رہے ہوں، ادارہ کی درودیوار، افعال و آثار، پالیسی اور حکمت عملی، اساسی اصول، بنیادی طریق کار، رنگِ تعلیم وتربیت اور اس کے پروردہ فضلاء کے اخلاق وملکات کی نوعیت میں اسی کے آثار رچے ہوئے دکھائی دیں جس سے یہ ساری تاسیسیں جزوی ہوں یا خصوصی اسی کے فیضان سے متحرک نظر آئیں بلکہ اس میں مدغم ہوں تو لوگ علی الاطلاق اسی کو بانی کہتے میں قلوب کی تسکین محسوس کریں گے۔ اس صورت سے بناء کی مختلف اور خاص خاص نسبتوں میں اسی روح الکل کے بانی ہونے کی عمومی نسبت آجاتی ہے اور منجانب اللہ عام زبانوں پر اس کا چرچا اور قبولِ عام پھیل جاتا ہے۔

پس جیسے ان سب اکابر کو اپنی اپنی نوعیت سے بانی کہنے میں لوگ حق بجانب ہیں ایسے ہی اس جامع شخصیت کو علی الاطلاق بانی کہنے اور اس کے بانی ہونے کو من اللہ سمجھنے میں بھی حق بجانب ہیں جس کی تکذیب ممکن نہیں، بالخصوص جبکہ اس معنوی نسبت وغلبہ کے ساتھ ساتھ رسمی انداز سے بھی بناء وتاسیس میں اس کا ہاتھ ہو اور کھلا دخل نمایاں ہو، تو پھر تشخص وانفرادیت کے ساتھ اسے بانی پکارنے میں کسی تامل وجھجک محسوس کرنے کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔

پس تاریخی طور پر بلاشبہ مدرسۂ دیوبند کی تاسیس کے سلسلہ میں ان سب اکابر کا ہاتھ ہے، لیکن عموماً بانی کا لفظ بولتے وقت جمع الکل اور روح الکل ہونے کی شان چونکہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ میں نمایاں ہے اس لئے بحیثیت بانی انہی کا نام زبانوں پر جاری ہوا اور خواص وعوام میں ابتداءً ہی سے اس کا چرچا پھیل گیا جس میں دوسرے حضرات کے بانی ہونے کی نفی شامل نہیں، اس طرح یہ تمام متضاد روایتیں ایک نقطہ پر جمع ہو سکتی ہیں اور ان کا تضاد ختم ہو جاتا ہے۔

جمعِ روایات کا احسن طریقہ

ہمارے خیال میں ہمارے سلف نے بھی جمع روایات کا یہی طریقہ کار اختیار کیا ہوا تھا کیونکہ اس سے صرفِ نظر کیا جانا مشکل ہے کہ ان بزرگوں کے سامنے جنھوں نے کسی نہ کسی کے بانی ہونے کا دعویٰ کیا ہے یہ ساری ہی روایتیں ہوں گی جن میں کسی دوسرے کو بانی کہا گیا ہے۔ اگر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت نانوتوی کو بانی کہہ رہے ہیں تو وہ اس سے کیسے بے خبر ہوں گے کہ ایک اشتہار میں انھوں نے حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمہ اللہ کے بانیٔ مدرسہ ہونے پر بھی اپنے تصدیقی دستخط ثبت کئے اور ساتھ ہی اس سے کیسے بے خبر ہوں گے کہ کہنے والوں نے خود انھیں بھی بانی کہا ہے۔ اور اگر مولانا ذوالفقار علی صاحب حضرت حاجی محمد عابد صاحب کو بانی کہہ رہے ہیں تو کیا انھیں اس کا علم نہ ہوا ہوگا کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جیسے ثقہ بزرگ نے خود انھیں بھی بانی کہا ہے اور اگر مولانا محمد یعقوب صاحب تین افراد کو بانی کہہ رہے ہیں تو کیا انھیں یہ علم نہ ہوا ہوگا کہ ان کے پیر ومرشد حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ خود انہیں بھی بانیوں میں شمار کر رہے ہیں، اور اگر حضرت شیخ الہند حضرت نانوتوی کو بانی اور قائم کنندۂ مدرسہ کہہ رہے ہیں تو کیا انھوں نے اپنے والد بزرگوار کی کتاب الہدیۃ السنیۃ کبھی نہیں پڑھی ہوگی جس میں حضرت حاجی محمد عابد صاحب کو بانی کہا گیا ہے، اور اگر حضرت تھانوی حضرت نانوتوی کو بانیٔ مدرسہ فرما رہے ہیں تو کیا انھیں یہ علم نہ ہوگا کہ ان کے شیخ طریقت حضرت حاجی امداد اللہ خود حاجی محمد عابد صاحب کو بھی بانیوں میں شمار کر رہے ہیں، اور اگر حضرت گنگوہی حضرت حاجی محمد عابد صاحب کو بانی کہہ رہے ہیں تو کیا انھیں اس ''تذکرہ'' کا علم نہ ہوا ہوگا جس میں خود انھیں بھی بانی کہا گیا ہے درحالیکہ یہ رسالہ تذکرہ ۱۳۱۷ھ میں لکھا گیا ہے اور حضرت گنگوہی کی وفات ۱۳۲۳ھ میں پورے چھ برس بعد میں ہے۔

بہرحال جب ایک ہی دور کی یہ ساری باتیں ہیں اور کہنے والے خود سننے والے بھی ہیں تو ہر ایک بانی والی روایت ہر ایک کے سامنے ضرور آئی ہوگی، بالفاظِ دیگر بانی والی روایتوں کا یہ تضاد روایتوں کے اصل سرچشمے کے سامنے بھی ہوگا، لیکن پھر بھی وہ ایک دوسرے کو بانی کہتے رہے اور کسی نے کسی

کے حتیٰ کہ خود اپنے بھی بانی ہونے کی نفی نہیں کی، اور اس طرح ان میں سے ہر ہر فرد ان متضاد روایتوں کے ماتحت گویا کئی کئی آدمیوں کو بانی تسلیم کرتا رہا اور کبھی بھی اسے اپنی یا دوسروں کی تضاد بیانی کا دھیان نہ گذرا، ان اکابر واعیان کی ثقاہت وعدالت کے پیش نظر اس کا صاف اور کھلا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ ان حضرات کے ذہنوں میں یہ بانی والی روایتیں متضاد بھی نہ تھیں ورنہ دوضدوں کے درمیان رہ کر یہ ساری متضاد روایتیں کیسے قبول کر لیتے ؟ بلکہ وہ ان روایات سے بناءِ مدرسہ کو ایک ہی بناء سمجھ کر بناء کی مختلف نوعیتیں اور مختلف پہلو اپنے ذہنوں میں لئے ہوئے تھے اور ہر روایت کو کسی نہ کسی ایک پہلو کا ترجمان سمجھے ہوئے تھے، اسلئے اس سے بتلائے ہوئے بانی کو اس پہلو کے لحاظ سے وہ بانی تصور کرتے تھے جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ان روایتوں میں تضاد ہی نہ تھا اور نہ وہ غیر صحیح تھیں، بلکہ ان کے ذہن میں ہر روایت کا ایک خاص محمل تھا جس پر محمول ہوکر یہ روایت کسی بھی دوسری روایت سے متصادم نہ تھی، اس لئے وہ رفعِ تضاد کے ساتھ ان متعارض روایتوں کو قبول کئے ہوئے تھے اور وہ رفعِ تضاد ہی تھا اور یہی ہو بھی سکتا تھا کہ ان حضرات کے نزدیک بناء کے کسی نہ کسی مخصوص پہلو کے لحاظ سے ان روایتوں کی ہر نامبردہ شخصیت بانی تھی اس لئے جن کے سامنے جو پہلو آیا جس سے کوئی شخصیت وابستہ دیکھی اس نے اسی کے لحاظ سے اسے بانی کہہ پکارا، اس طرح ایک ایک راوی نے کئی کئی بانیوں کے بانی ہونے کا دعویٰ کیا جس میں کوئی تضاد نہیں۔

بانیٔ مطلق

البتہ جس شخصیت میں بناء کے مخصوص اصول اور بناء کا وہ خاص فکر دیکھا جس پر ادارہ کھڑا ہوا ہے اُسے علی الاطلاق بانی کہا، پس ادارہ کے اضافی بانی تو کئی ثابت ہوئے اور حقیقی اور مطلق بانی ایک ہی رہا، اس لئے اگر رفعِ تضاد کی آج بھی یہ صورت اختیار کر لی جائے جو ان اسلافِ کرام کے ذہنوں میں تھی تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اور کیا ضرورت ہے کہ ان روایتوں کو ٹکرا کر نفی واثبات کا معرکہ قائم کیا جائے، کیونکہ ہر ایک کو الگ الگ بانی کہہ کر ہر دوسرے کے بانی ہونے کی نفی کی جائے گی تو قدرتاً کوئی ایک بھی بانی ثابت نہ ہوگا اور اتنی بڑی عظیم القدر بناء بلا بانی کے رہ جائے گی، اس لئے روایات

میں تطبیق اور رفعِ تضاد کی آسان اور واقعاتی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ بانی سب ہوں مگر اضافی اور ہرایک کے بانی ہونے کی نوعیت جداجدا ہواوران میں بانیٔ مطلق ایک ہو، جس کے فکری اصول مضبوط رہنمائی اوردیے ہوئے نقشہ پرادارہ کھڑا ہوا اور چل رہا ہو۔

دارالعلوم کے محرکِ حقیقی اور مفکرِ اول

پس حضرت نانوتویؒ اس سارے سلسلہ کے محرکِ اول اور مفکر ہونے کی حیثیت سے اس مدرسہ کے بانیٔ اعظم ہیں، جنھوں نے ان سب بانیوں میں حرکت پیدا کی اوران میں منصوبہ بندی کی زندگی پیدا کرکے ان بانیوں کے سربراہ کی حیثیت سے آگے آئے۔ مولانا مناظراحسن گیلانی مرحوم نے اسی حقیقت کی طرف سوانح قاسمی میں ''تاذین خاص'' اور ''تاذین عام'' کے لفظ سے اشارہ فرمایا ہے کہ آپ نے اپنی تاذین (اذن) سے بتوسط حضرت حاجی محمد عابد صاحب اس کام کی تکمیل فرمائی، اس لئے عام زبانوں میں علی الاطلاق بانی وہ کہلائے حتیٰ کہ بانیوں کا حلقہ بھی انھیں بانی کہنے سے خاموش نہیں رہا۔ اس لئے بحیثیت بانی ان ہی کا نام مخلوق کی زبان پر چڑھ گیا اور اضافی بانیوں کی بناء کی جزوی نسبتیں اس بانیٔ اعظم کی کلی اور اجتماعی نسبت میں گم ہوکررہ گئیں، جس سے صورت یہ بن گئی کہ اوروں کو بانی کہلانے کے لئے مضامین لکھنے کی ضرورت پڑتی ہے اور حضرتِ والا کو بانی کہلانے کے لئے کسی قلمی یا زبانی جدوجہد کی حاجت نہیں پڑتی بلکہ من اللہ اس تاسیس کی عام تلقی بالقبول کے ساتھ زبانیں ان کے بانی ہونے کے بارے میں خودبخود گویا اور دل خودبخود معترف ہیں، نہ صرف آج ہی بلکہ ابتداءِ مدرسہ سے آج تک یہی صورتِ حال قائم اور زبان زد چلی آرہی ہے، جبکہ حضرتِ والا ہی میں بناءِ مدرسہ کی یہ ساری شانیں مجتمع دیکھی گئیں۔

چنانچہ ان تمام خصوصیاتِ بنا کا حضرتِ والا میں جمع ہوجانے کا اجمالی نقشہ جو اسلافِ کرام ہی کی شہادتوں سے ہم تک پہنچا ہے، ذیل میں ملاحظہ فرمایا جاوے جس کی بناء پر حضرتِ والا کو خواص وعوام بانی سمجھتے ہیں اور سمجھنے پر مجبور ہیں۔

(۱) اس سے کسی نے بھی انکار نہیں کیا کہ حضرت نانوتوی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد شکست

خوردہ مسلمانوں کے لئے بطور تلافیٔ مافات ایک اجتماعی رنگ کی تعلیمی تحریک لے کر اٹھے جو آگے بڑھی اوراس کے اثرات بتدریج ملک میں پھیل گئے، جس سے میکالے کی تعلیمی اسکیم آزاد نہ رہی کہ پوری قوم کو بہالے جائے، بلکہ اس کے مقابل ایک دوسری ہمہ گیر تحریک بھی آگئی اوراس نے بھی قوم کا ایک بڑا حلقہ گھیر لیا جیسا کہ ''مدینہ'' کے محترم مقالہ نگار نے اسی کو''تحریکِ قاسمی'' کے نام سے یاد کیا ہے، مدرسہ دُیو بند اسی تحریک کا مظہر اُتم ہے جیسا کہ اس کے کاموں سے نمایاں ہے۔

(۲) اس تحریک کی ابتداء دیو بند سے ہوئی اور حضرتِ والا نے خصوصی طور پر قیامِ مدرسہ کے لئے لوگوں کے ذہنوں کو ہموار کرنے کی جدوجہد یہیں سے شروع فرمائی، مذاکرات کے ذریعہ خواص کو ابھارا جیسا کہ حضرت حاجی محمد عابد صاحب کے خط سے ظاہر ہے اور ترغیب وتحریض کے ذریعہ عوام کے جذبات ہموار کئے جیسا کہ صاحبِ سوانح مخطوطہ کی روایت سے واضح ہے اور یہی جذبات مدرسہ دُیو بند کے قیام کا سبب بنے جو حضرتِ والا کے پیدا کردہ تھے۔

(۳) یہ تحریک اپنے عملی رخ کے لحاظ سے درحقیقت بناءِ مدارس کی تحریک تھی، چنانچہ حضرتِ والا کی اس تحریک کا اثر ملک میں جا بجا مدرسے قائم ہونے ہی کی صورت میں نمایاں ہوا، حضرت نے خود بھی خصوصی مشوروں اور تذکیرات ومساعی سے مدارس قائم کرائے اور جگہ جگہ خود بھی پہنچ کر مدرسوں کی بنیادیں رکھیں جن کے بانی کی حیثیت سے وہ یاد کئے گئے۔ مدرسہ دُیو بند بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں بلکہ اسی کلیہ کا جزو ہے جیسا کہ سرسید، مولانا منصور علی خاں اور مؤلف سوانح مخطوطہ کی تصریحات سے واضح ہے۔

(۴) حضرتِ والا کی اس تحریک کا سب سے پہلا اثر بھی دیو بند ہی میں نمایاں ہوا اوراس نوعیت کا سب سے پہلا چندہ کا مدرسہ ہندوستان میں دیو بند ہی میں قائم ہوا اور دیو بند جبکہ بوجوہِ متعددہ حضرتِ والا کے وطن کی حیثیت رکھتا تھا تو آپ نے وطن کے حق کو مقدم رکھتے ہوئے قیامِ مدرسہ کے لئے یہاں محض ایک عمومی تحریک یا خصوصی تحریض پر قناعت نہیں فرمائی بلکہ آگے بڑھ کر خصوصی طور پر عملی اقدامات بھی کئے جن سے مدرسہ دُیو بند کا قیام عمل میں آیا، جیسا کہ سوانح مخطوطہ کی تصریحات سے واضح ہے اور حضرت حاجی صاحب کے خط اور حضرتِ والا کے جوابِ خط سے بھی

اس پر روشنی پڑ رہی ہے۔

(۵) چھتہ کی مسجد کے مذاکرات درحقیقت خواص کی ذہن سازی اور ان کے دلوں میں قیامِ مدرسہ کے جذبات کی تخم ریزی تھی، جس سے حضرت حاجی صاحب کی یکسو اور خلوت پسند طبیعت اس جلوتی لائن پر آئی اور تاسیس مدرسہ کے ابتدائی مراحل انھوں نے انہی مذاکرات کے زیر اثر انجام دیئے، اس لئے ان کے اقدامات درحقیقت فیضانِ قاسمی سے تھے اور یہ ابتدائی تاسیس بھی بلحاظ حقیقت تاسیس قاسمی تھی جیسا کہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی نظم سے واضح ہے۔

(۶) ان مذاکرات کو یاد دلا کر جبکہ ان ہی کی بنیاد پر حضرت حاجی صاحب نے خصوصیت سے حضرتِ والا ہی کو اجراءِ مدرسہ کے لئے بلایا جیسا کہ خود حاجی صاحب کے خط سے واضح ہے تو اس سے صاف نمایاں ہے کہ خود حاجی صاحب کے ذہن میں بھی حضرتِ والا کا محرک ومجوزِ مدرسہ ہونا جاگزیں تھا جو بناءِ مدرسہ کی اصل اور اساس ہے، ورنہ اگر یہ دعوت محض اخلاقی ہوتی تو مذاکرات کا حوالہ دے کر ہرگز نہ دی جاتی، اس لئے گو اجراءِ تعلیم کا ظہور حاجی صاحب کے عمل اور حرکت سے ہوا لیکن حقیقتاً یہ ان ہی مذاکرات کی عملی تعمیل تھی جو مدرسہ کے اجراء کی اساس ثابت ہو چکے تھے اور یہ اساس حضرت نانوتوی کی قائم فرمودہ تھی جیسا کہ مذکورہ خط سے نمایاں ہے۔

(۷) اس مدرسہ کو جاری کرنے کے لئے حضرت نانوتویؒ ہی نے ملا محمود صاحب کو مدرس بنا کر اور ان کی تنخواہ پندرہ روپیہ ماہوار تجویز کر کے میرٹھ سے دیوبند بھیجا جس کا حاصل یہ ہے کہ اجراءِ مدرسہ ان کے اذن اور ان کے ارسال کردہ مدرس سے ہوا، گو حضرت والا بقاءِ مدرسہ ہی کی مصالح کے پیش نظر اس اجراء کے وقت دیوبند تشریف نہیں لائے جیسا کہ تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ آئندہ کے لئے مدرسہ کے حق میں ساعی رہنے کے وعدہ سے حضرت حاجی صاحب کی تسلی فرما دی جیسا کہ خود حضرتِ والا کے جوابی خط سے واضح ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے فکر پر دار العلوم کا قیام

(۸) ساعی ہونے کے وعدہ کے ایفاء کے سلسلہ میں بالآخر حضرتِ والا قیامِ مدرسہ کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں دیو بند تشریف لے آئے، قیام فرمایا اور غیر رسمی طور پر ہر طرح سے مدرسہ کو ہاتھ میں لیا، اس کی سرپرستی فرمائی، اس کی مستقل عمارت کی فکر فرمائی اور ایک بڑا جلسہ بلا کر عمارت کا سنگِ بنیاد رکھایا، حاجی صاحب کو باوجود ان کے مستقل تعمیر مدرسہ کے خلاف ہونے کے اس پر راضی کیا اور شریکِ تاسیس فرمایا جیسا کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصریحات سے ظاہر ہے جو رسالہ دار العلوم میں شائع شدہ ہیں۔

(۹) نظامِ تعلیم کا ڈھانچہ مرتب فرمایا، اس کے مناسبِ حال تعلیمی اور انتظامی شخصیتیں جمع کیں، انتظامِ مدرسہ کے اساسی اصول وضع فرمائے جو آج تک اس کے نظم کی اساس بنے ہوئے ہیں، ان میں اپنی ہمہ گیر اجتماعیت کے رنگ کو منضبط فرمایا جس سے اس ادارہ میں تعلیم وتربیت کا سلسلہ قائم ہے اور فضلائے دیو بند کا یہی وہ امتیازی رنگ ہے جس کی بنا پر انھیں ''قاسمی'' کہا جاتا ہے اور وہ دوسری جگہ کے فضلاء سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔

غرض ادارہ کے اصول سے لے کر فروع تک ہر دائرہ پر دیو بند آتے ہی حضرتِ والا کا چھا جانا جبکہ وہ رسمی انداز کے نہ منتظم ہوئے نہ مدرس، نہ کبھی دار العلوم میں بیٹھ کر پڑھایا نہ دفتر کی کسی اسامی پر بیٹھ کر کارِ نظم سے تعلق رکھا، مگر پھر بھی سب کے سب ان کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے سرگرم رہے، ذرا بھی چون وچرا نہ کی، اور کسی کے بھی دل میں یہ سوال پیدا نہ ہوا کہ آخر ایک بیرونی بے تعلق اور لاعلم محض آدمی کیوں اور کس استحقاق سے ادارہ میں آتے ہی اس طرح گھس گیا کہ گویا ادارہ تنہا اسی کا ہے، ظاہر ہے کہ یہ اسکے بغیر ممکن نہیں کہ دلوں میں اسے ابتدا ہی سے اس ادارہ کا ہمہ اوست اور اسکی اساس وبنیاد اور ادارہ کی تاسیس سے لے کر تدریس ونظم تک اسی کو قیامِ ادارہ کا ذمہ دار سمجھا جا رہا ہو، ورنہ عادتاً ایک بے تعلق اور بے خبر انسان کا اچانک پہنچ کر اس طرح دخیل ہو جانا برداشت نہیں کیا جاتا۔

(۱۰) پھر بنیادی چیز وہ فکر اور نصب العین ہے جس پر ادارہ قائم کیا جائے، سو ابتداءِ تاسیس

سے ہی مدرسۂ دیو بند کا قیام حضرت والا ہی کے خصوصی فکر پر عمل میں آیا جیسا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مقولہ سے نمایاں ہے جسے مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی روایت فرمارہے ہیں، مولانا موصوف اپنے ایک طویل مضمون ''احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن'' (۱) میں لکھتے ہیں کہ میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے فرستادہ کی حیثیت سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ان کا سیاسی مسلک معلوم کرنے کیلئے حاضر ہوا اور میں نے سوال کیا۔ فرماتے ہیں کہ میں:

''اپنی بات (حضرت شیخ الہند کے سیاسی مسلک کے بارے میں استفسار ختم کر چکا تو دیکھا کہ حضرت (شیخ الہند) پر ایک خاص حال طاری ہے اور اپنے استاد حضرت مولانا محمد قاسمؒ بانیٔ دارالعلوم دیو بند کو جن کو وہ حضرت الاستاذ کے لفظ سے یاد کیا کرتے تھے، ان ہی کا نام لے کر فرمایا ''حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا درس وتدریس تعلیم وتعلّم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تا کہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔''

(رسالہ دارالعلوم شمارہ ۶ جلد ۴ بابت ماہ جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ)

اس سے صاف نمایاں ہے کہ یہ مدرسہ محض تعلیم وتعلّم ہی کا مدرسہ نہ تھا بلکہ ایک خاص مکتبِ فکر اور مکتبِ خیال بھی تھا جس پر اس کی بنیاد رکھی گئی اور وہ مکتبِ فکر یقیناً حضرت حاجی محمد عابد صاحب کا نہ تھا بلکہ حسبِ تشریح شیخ الہند حضرت نانوتوی کا تھا، اس لئے اس فکر کے بانی حضرت ہوئے، اس فکر ہی کو محترم مقالہ نگار ''مدینہ'' نے ''قاسمی تحریک'' کے عنوان سے تعبیر کیا ہے اور صحیح کیا ہے، لیکن ان کے سامنے چونکہ مولانا مناظر احسن کی یہ روایت نہ تھی اس لئے وہ اس تحریک کو ایک عمومی رنگ سے لکھ کر مدرسۂ دیو بند کی بناء سے اس کا خصوصی تعلق قائم نہ فرما سکے۔

(۱) حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کا یہ مضمون اب کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے، جس کو دیو بند کے ''مکتبہ طیبہ دیو بند'' نے شائع کیا ہے، جو اب بسہولت دیو بند کے کسی بھی تجارتی مکتبہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ محمد عمران قاسمی بگیانوی

قاسمی فکر کے اصولِ ہشتگانہ پر دارالعلوم کا ارتقاء

(۱۱) حضرتِ والا کا یہ فکر عملی طور پر تو ان کی تعلیمات میں لپٹا ہوا تھا جس کے نمونے وہ مخصوص فضلاء تھے جو قاسمی مکتبِ فکر سے پیدا ہوئے اور دیوبند سے لے کر بیرونِ دیوبند، ہند اور بیرونِ ہند تک پھیل گئے اور مدارس کو سنبھالا اور اجتماعی طور پر یہ فکر ان کے آٹھ بنیادی اصول میں لپٹا ہوا ہے جو آپ نے مدرسۂ دیوبند کے لئے وضع کئے اور آپ ہی کے قلم سے لکھے ہوئے خزانۂ دارالعلوم دیوبند میں محفوظ ہیں۔ سوانح قاسمی وغیرہ میں اس کا فوٹو بھی شائع ہو چکا ہے، ان اصول پر خود حضرتِ والا نے بطور عنوان جو عبارت لکھی وہ حسبِ ذیل ہے۔

''وہ اصول جس پر یہ مدرسہ نیز اور مدارسِ چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں۔''

اس عبارت سے واضح ہے کہ حضرتِ والا کے نزدیک درحقیقت مدرسہ کی بناء ان اصول پر کی گئی ہے، اس لئے خود ہی ان اصول کو بنائے مدرسہ قرار دیا۔ پس اگر اینٹ گارے سے اس کی صورت کی بنیاد رکھی گئی تو ان آٹھ معنوی اینٹوں پر اس کی حقیقت کی بنیاد رکھی گئی ہے، ان اصول پر حضرتِ والا نے اپنے مخصوص اجتماعیت کے رنگ کو منضبط کر دیا ہے۔

پہلا اصول

آپ کا اولین منشاء یہ تھا کہ یہ مدرسہ عوامی ہو یعنی عوام کا ہو غرباء کا ہو، سرکاری یا جاگیرداری یا نوابی نہ ہو، اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ اس کی تعمیر صرف عوام کے پیسے سے ہو اور اس میں دخل عوام کا ہو، اس لئے سب سے پہلا اصول عوامی چندہ کا رکھا گیا اور اس کی بھی تکثیر پر زور دیا گیا کہ جہاں تک بھی ہو اُسے پھیلایا جائے اور اس کا دائرہ وسیع کیا جاتا رہے کسی ایک شہر یا صوبہ میں محدود بنا کر نہ چھوڑ دیا جائے۔ اصولِ ہشتگانہ میں اس اصول کو اولیت دے کر درحقیقت اس کی اہمیت واضح فرمائی ہے۔ پس مدرسۂ دیوبند کا پہلا بنیادی اصول رابطۂ عوام ثابت ہوا جس پر آج حکومتوں اور ساری ہی اجتماعیّتوں کی بنیاد ہے۔

دوسرا اصول

دوسری بنیاد یہ تھی کہ اس مدرسہ کے نظام میں جو بھی مستفید کی حیثیت سے داخل ہو اس کی امداد واعانت، اس کے طعام وقیام کی انتہائی سعی عمل میں لائی جائے کیونکہ اس تربیتی ادارہ میں داخل ہونے والے ہی اس کے تیار کردہ نظام کے کل پرزے بنیں گے، اگر وہ صحیح طور پر ادارہ میں فٹ اور اس سے مربوط ہوں گے تو وہی دوسرے دن اس نظام کے دست وبازو ثابت ہوں گے، اس لئے اجرائے طعام بلکہ اس کی بھی افزائش وتکثیر پر زور دیا گیا جو تربیت اور وابستگی کی روح اور اجتماعیت کا پہلا زینہ ہے، اسے رابطۂ خواص کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، نیز اسی دفعہ سے علی الاعلان واضح کر دیا گیا کہ حضرت کے نزدیک فری تعلیم اور مفت تربیت ہی قومی بچوں کو آگے بڑھا سکتی تھی، خریدکردہ تعلیم اور بہ قیمت ملنے والی تربیت نہ تعلیم ہے نہ تربیت، بلکہ بزنس ہے، جس سے صاحبِ ضمیر پیدا نہیں ہو سکتے بلکہ بکے ہوئے افراد ہی تیار ہو سکتے ہیں۔

تیسرا اصول

تیسری بنیاد یہ تھی کہ اس مدرسہ کا نظام شورائی ہو، اس کی ایگزیکٹیو کونسل اہل شوریٰ پر مشتمل ہو۔ یہی باڈی اہل چندہ کی وکیل ہو، پھر ان سب کے نمائندہ کے طور پر مہتمم کا عہدہ رکھا جو درحقیقت اہل شوریٰ کا وکیل اور کار پرداز ہے، اس لئے اس اصول کا حاصل جمہوریت یا مرکزیت ہے، یعنی دارالعلوم کا نظام خواہ وہ کلی ہو یعنی پورے ادارہ کا ہو یا جزوی یعنی اندرونی شعبہ جات کا ہو، نہ تو استبداد اور شخصیتِ محضہ پر مبنی ہو اور نہ ہی لامرکزیت پر جس کا نام اس زمانہ میں جمہوریت رکھا گیا ہے، بلکہ قیادتِ شورائیہ پر ہو، ایک صاحبِ عزم ہو اور اس کی پشت پر شورائی قوت ہو، تاکہ اس نظام کا ہر مسئلہ نکھرا ہوا ثابت ہو اور اس میں پوری قوم کا دماغ شامل ہو جو باہمی تعاون وتناصر اور مابینی اتحاد کا بنیادی وسیلہ ہے کہ اس کے بغیر کوئی اجتماعیت آگے نہیں بڑھ سکتی۔

چوتھا اصول

چوتھی بنیاد مربیوں کا وحدتِ ذوق ہے جو باہمی اتحاد کی روح ہے۔ مختلف المذاق اور

متفاوت المشرب مربیوں کے جمع ہو جانے پر نہ صرف یہ کہ مستفیدوں کی تربیت نہیں ہوسکتی بلکہ ذہنی کشاکش اور خارجی نزاع وجدال بھی نقد وقت ہوتا ہے جس سے مقصد پیچھے رہ جاتے ہیں اور جھگڑے آگے آجاتے ہیں، اسلئے اتحادِ مشرب کو مدرسہ کے نظامِ اجتماعی کیلئے اساسی قرار دیا گیا جس کا قدرتی ثمرہ ایک نصب العین پر لگ کر جزوی اغراض سے بالاتری اور بے غرضانہ خدمت ہے جس میں خود بینی اور آزار رسانی کا وجود نہیں ہوتا اور یہی اجتماعیت کی روح ہے جو نظام کو آگے بڑھاتی ہے۔

پانچواں اصول

پانچویں بنیاد بلکہ بنیادوں کی بنیاد علم اور تعلیم ہے جس کی لائنوں سے یہ سارا نظام اُٹھایا گیا کہ وہ اپنی حدود میں مکمل ہو، اپنے نصاب اپنے نظام اور اپنی تنظیم کے لحاظ سے مضبوط اور مستحکم ہو، اگر اس میں نقص آجائے، خواندگی نہ ہو یا ناقص ہو تو سارا نظام بیگانہ اور یہ پورا کارخانہ معطل اور لایعنی ہوگا، نہ آباد ہوگا نہ فائدہ رساں رہے گا۔

چھٹا اصول

چھٹی بنیاد اختیارِ اسباب کے بعد اسباب سے بے نیازی اور خدا پر بھروسہ ہے جو مسبّب الاسباب اور کارسازِ حقیقی ہے، یقین رکھا جائے تو اس کی مدد پر، نہ کہ بے سہارا اسباب پر، اور حقیقی توجہ ہو تو صرف مالک الملک پر نہ کہ فانی مملوکات پر، اس لئے نظامِ ادارہ کسی کارخانہ تجارت اور اس کی یقینی آمدنی یا کسی امیر محکم القول یا کسی حاکم کی قوت وحول اور ان کی موعودہ گرانٹوں پر نہ چلا جائے کہ ان امور پر بھروسہ کر لینے سے توجہ الی اللہ اور سرمایہ رجوع الی اللہ ہاتھ سے جاتا رہتا ہے، امدادِ غیبی منقطع ہو جاتی ہے اور کثرتِ وسائل کے سبب لوگ کھانے بانٹنے میں لگ کر باہمی نزاع وجدال کا شکار ہو جاتے ہیں، جس سے نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور بندگی کا مادۂ خوف ورجاء پادرِ ہوا ہو جاتا ہے جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے جس سے اوپر کی مدد آتی ہے، اس لئے بدرجہ اسباب اس قسم کی بے سروسامانی ملحوظ رکھنے پر زور دیا گیا۔

ساتواں اصول

اس سلسلہ میں خصوصیت سے سرکار اور امراء وحکام کی شرکت زیادہ مخل اور مضر تھی تو اسے خصوصیت سے روک دیا گیا، جو درحقیقت استغنا اور غنا کی روح ہے اور کوئی بھی نظام پابستگی، محتاجگی اور درماندگی کے ساتھ نہیں چل سکتا جب تک کہ اربابِ نظام میں خودارادیت کی روح دوڑی ہوئی نہ ہو۔

آٹھواں اصول

آٹھویں بنیاد یہ ہے کہ مخلص اور بے غرض افراد کا چندہ یا تعاون زیادہ حاصل کیا جائے جن کا رخ چندہ دینے سے نام آوری اور جاہ وشہرت نہ ہو، نظر براحوال ان کا حسنِ نیت کھلا ہوا ہو کہ اسی سے ادارہ کے نظام میں خیر وبرکت آسکتی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ لقمۂ حلال ہی عطا کنندہ اور عطایافتہ دونوں میں توفیق کے دروازے کھول سکتا ہے۔ مسلوب التوفیق لوگوں سے حقیقی معنی میں وہ اجتماعی خدمت نہیں بن پاتی جو دلوں کا مطلوب اور عقل کا مرغوب ہے، ممکن ہے کہ اموال کے رطب ویابس سے کوئی نظام وسیع ہو جائے مگر وہ صورتاً نظم ہوگا جو حقیقت سے خالی ہوگا، اس سے نہ دلوں کو چین مل سکتا ہے نہ روحوں کو سکون، جو سارے نظاموں کا مقصودِ اصلی ہے۔ اس لئے اس تعاونِ باہمی یا اعانتِ مابینی کے سلسلہ سے رابطۂ عوام پیدا کرنے میں انتخاب اور نگاہِ انتخاب کو ضروری قرار دیا گیا تا کہ نظامِ اجتماعیت محض مادی ہو کر نہ رہ جائے بلکہ روحانیت اور اخلاقیت سے بھرپور ہو۔

اصولِ ہشتگانہ کا عملی انطباق

عجیب بات یہ ہے کہ ان اصولِ ہشتگانہ کی ابتدا بھی چندہ سے کی گئی اور انتہا بھی چندہ ہی پر کی گئی، جس سے واضح ہے کہ رابطۂ عوام حضرت کی نگاہوں میں اہم ترین چیز تھی، جس پر آنے والے زمانہ کی تعمیر ہونے والی تھی۔ پس پہلی دفعہ میں اگر تکثیر چندہ پر زور دیا گیا ہے تا کہ عوام کی قوت زیادہ سے زیادہ حاصل ہو تو آخر کی دفعہ میں اس کی تحدید پر زور دیا گیا ہے، کہ یہ تکثیر محض مخلصین کے دائرہ میں محدود رہے۔ بالفاظِ دیگر باور کرایا گیا ہے کہ غیر مخلصوں یا دائرۂ اخلاص سے بے خبر اور بیگانہ طبقوں

کا تعاون اس مخلصانہ ادارہ کے لئے کبھی مفید نہ ہوگا اور نہ پھر کسی مقررہ نہج پر اس کا نظام چل سکے گا۔

حضرتِ والا کے ان اصولِ ہشتگانہ کی اس تشریح سے ظاہر ہے کہ رابطۂ عوام، قومی تربیت اور ٹریننگ، نظامِ شورائی، مرکزیت وقیادت، اتحادِ خیال، وحدتِ ذوق، استحکامِ تعلیم، انضباطِ تربیت، صاحبِ ضمیر افراد کی پیداوار، قومی استغنا وخودداری، عزمِ خود ارادیت، انتخابِ حلقہ جات حضرتِ والا کی اجتماعیت کے عناصرِ خاص تھے، جنہیں آپ نے ان آٹھ اصولوں میں منضبط فرما کر اپنا نقطۂ نظر واضح فرمایا ہے۔

قاسمیت یا قاسمی تحریک

یہی وہ اجتماعی رنگ کا تعلیمی نظام ہے جسے یاد کرنے والوں نے ''قاسمیت'' یا ''تحریکِ قاسمیت'' سے یاد کیا ہے، جو آج کی رسمی تحریکوں سے بالاتر اور بالکل جداگانہ ہے، لیکن اس کا ڈھانچہ آج کے ترقی یافتہ اور مروّجہ نظاموں سے الگ بھی نہیں ہے بلکہ ملتا جلتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی اسی فکرِ خاص سے ہو سکتی تھی اس لئے اگر اسی کی تلافی کے لئے مدرسۂ دیو بند قائم کیا گیا اور بلاشبہ قائم کیا گیا جیسا کہ حضرت شیخ الہندؒ کا مقولہ گذر چکا ہے تو مدرسۂ دیو بند کی بنیاد اسی فکر اور انہی اصول پر ہونی چاہئے تھی اور اگر یہ بنیاد حضرت نانوتویؒ نے ڈالی ہے اور بلاشبہ ڈالی ہے تو وہی اس کے حقیقی بانی ٹھہرتے ہیں جبکہ وہی ۱۸۵۷ء کی تلافی کا تصور بھی ذہن میں باندھ سکتے تھے اور وہی اسے لے کر بھی اُٹھے۔

پس جیسے مدرسہ کی ظاہری تعمیر کے وقت آپ نے ہی صورتِ مدرسہ کا سنگِ بنیاد رکھا ایسے ہی مدرسہ کی معنوی تعمیر کے لئے آپ ہی نے ان اصول سے حقیقتِ مدرسہ کی بھی تاسیس کی اور ان اصول پر خود ہی یہ عنوان بھی قائم فرمایا کہ یہ اصول مدرسہ کی بنیاد واساس ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود ان کے ذہن میں بھی شعوری طور پر یہ حقیقتِ واقعہ موجود تھی کہ وہ اس مدرسہ کی بنیاد رکھ رہے ہیں، ورنہ اصولِ ہشتگانہ پر خود ہی یہ عنوان قائم نہ فرماتے، لیکن ادعاء کبھی نہیں فرمایا جیسا کہ بحمد اللہ ان بانیوں میں سے کسی ایک نے بھی نہیں کیا، لیکن ادعاء نہ کرنے سے یہ ضروری نہیں ہے کہ حقیقتِ واقعہ

کا ادراک وشعور بھی نہ ہو۔ چنانچہ اس شعوری حقیقت کے تحت حضرتِ والا نے بے جھجک خود ہی مدرسہ کے لئے مدرس کا انتخاب کر کے بھی بھیجا اوراس کی تنخواہ بھی خود ہی جاری کر دی اور پھر خود ہی اپنے برادرِ عم زاد جوآپ کے فیض یافتہ اور تلمیذ بھی تھے، یعنی صاحب العلم والعرفان حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سرکاری ملازمت چھڑا کر مدرسۂ دیوبند کی صدر مدرسی کی مسند پر لا بٹھایا جو اس فکرِ خاص کے حامی اوراس سے سرشار تھے۔

حضرت حاجی امداداللہ صاحبؒ کے تائیدی ارشادات

(۱۲) شاید حضرتِ والا کی اسی تاسیسی خصوصیت کی طرف حضرت کے شیخ طریقت حضرت اقدس حاجی امداداللہ قدس سرہٗ کا ذیل کا جملہ بھی مشیر ہے جوانہوں نے دیوان محمد یٰسین صاحب عرف دیوان اللہ دیا مرحوم خادمِ خاص حضرت نانوتویؒ واولین ناظم کتب خانہ مدرسہ دیو بند سے اس وقت فرمایا جب انہوں نے حج کے موقعہ پر مکہ مکرمہ سے رخصت ہوتے وقت اپنے شیخ الشیخ حضرت اقدس حاجی امداداللہؒ سے عرض کیا کہ:

''حضرت ہمارے مدرسہ کے لئے دعا فرماتے رہیں۔''

تو فرمایا:

''چہ خوش؟ راتوں سجدہ میں پیشانیاں ہم نے رگڑیں کہ خدایا مسلمانانِ ہند کی بقا وحفاظت کے لئے ایک مدرسہ کو وجود عطا فرما اور مدرسہ آپ کا ہو گیا۔''

اس کے بعد فرمایا:

''خیال یہ تھا کہ مدرسہ نانوتہ میں قائم ہوگا یا تھانہ بھون میں، کیا خبر تھی کہ اس دولت کو دیو بند والے لے اُڑیں گے۔''

یہ روایت اجمال کے ساتھ سوانح قاسمی میں اور قدرے تفصیل کے ساتھ ارواحِ ثلاثہ میں بالفاظِ مختلفہ بیان کی گئی ہے جیسا کہ سوانح قاسمی کے ص ۲۲۳ جلد ۲ میں حوالہ موجود ہے، میں نے خود بھی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہے۔ اس روایت کے تحت حضرتِ اقدس کا قیامِ مدرسہ کے سلسلہ میں نانوتہ کا نام لینا اور ذہن میں اس کا تصور آنا اسی وقت ممکن تھا کہ وہ حضرت

نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ میں اس خاص قسم کے مدرسہ کی تاسیس کا جذبہ اور تعلیمی تحریک کا فکرِ خاص محسوس فرمارہے ہوں، جو بعد میں ''تحریکِ قاسمی'' اور قیامِ مدرسہ کی صورت میں نمایاں ہوا، اور شاید اسی بناء پر (جیسا کہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا اور بارہا سنا) کہ حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی نے ۱۸۵۷ء کے بعد خود اپنے لئے بھی حضرت کی معیت میں ہجرت کی اجازت چاہی تو فرمایا کہ تم ہندوستان ہی میں ٹھہرو، تم سے خدا کو یہاں کام لینا ہے، وہ کام یہی تعلیمی نظام اور اس کے ذریعہ مسلمانانِ ہند کو سنبھالنا تھا، جو دیو بند سے چل کر ملک گیر بلکہ عالمگیر ہونے والا تھا۔

رہا یہ کہ تھانہ بھون کا نام بھی اس بارہ میں حضرتِ اقدس کی زبان پر آیا تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد قیامِ مدرسہ کا یہ داعیہ خود حضرتِ اقدس حاجی امداد اللہ کا بھی ہو، جبکہ وہ ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں امام الکل تھے اور ۱۸۵۷ء ہی کے معرکہ کی ناکامی کی تلافی کے لئے اس مدرسہ کے قیام کی ضرورت سمجھی ہو (جیسا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے مقولہ سے ظاہر ہوا) اور اسی جذبہ کے تحت کسی دینی مرکز کے قیام کی راتوں دعائیں فرماتے رہے۔

پس اس حقیقت کے پیش نظر کہ مرشد تھانویؒ کا جذبہ مسترشد نانوتویؒ کے ہاتھوں پورا ہونے والا ہے، حضرتِ اقدس نے قیامِ مدرسہ کی نسبت ذوات کا نام لئے بغیر ان کے وطنوں کی طرف فرمادی کہ مدرسہ تھانہ بھون میں قائم ہوگا جو مرشد کی جگہ ہے یا نانوتہ میں قائم ہوگا جو مسترشد کی جگہ ہے، لیکن یہ قسمت کی یاوری ہے کہ دیو بند کی چھوٹی سی گمنام بستی اس دولت کے لئے ہاتھ پھیلائے بیٹھی تھی اور وہ اس دولت کو لے اُڑی، گویا اس تعبیر سے حضرت نانوتویؒ کے بانیٔ مدرسۂ دیو بند ہونے کی طرف ایک لطیف اشارہ فرمایا گیا۔ رہا یہ کہ مدرسہ کا تھانہ بھون یا نانوتہ میں قیام نہ ہوا، سو اس کی وجہ جو بزرگوں سے سننے میں آئی ہے یہ ہے کہ یہ دونوں بستیاں جہاد کا مرکز اور انگریزوں سے بغاوت کا سرچشمہ بن چکی تھیں، اس لئے انگریز نے ان دونوں بستیوں کو تہس نہس کر دینے کی سعی کی، بطونِ اوراق میں محفوظ ہے کہ اگر مدرسہ نانوتہ یا تھانہ بھون میں قائم ہوجاتا تو مدرسہ کا بھی وہی حشر ہوتا جو ان بستیوں کا ہوا، البتہ دیو بند کی بستی ان تحریکات سے خالی اور الگ تھلگ تھی اور یہاں جہاد وغیرہ کا چرچا نہ تھا، اس لئے اجرائے مدرسہ کے لئے اسی بستی کو منتخب کیا گیا اور یہ بستی یہ دولت لے اُڑی۔

ان ایک درجن وجوہ ودلائل کو سامنے رکھ کر اندازہ کیا جائے کہ ایک شخصیت خاص حالات کے تحت ایک ہمہ گیر تعلیمی تحریک لے کر اُٹھے جس کی بنیاد وقیام مدارس پر ہو، اس کے تحت مدارس قائم ہوں، خود بھی مدارس قائم کرے اور دوسروں سے قائم کرائے، خاص دیوبند میں اس تحریک کو عملی جامہ پہنانے کے لئے خواص وعوام کو آمادہ کرے اور اُبھارے، اسی کے تحت مدرسہ کا وجود عمل میں آیا، اجرائے مدرسہ کے لئے اس ترغیب وتحریض کو یاد دلا کر خصوصیت سے اسی کو دیوبند بلایا جائے، خود کے نہ آسکنے پر تنخواہ دار مدرس بھیج کر مدرسہ جاری کردینے کا منشاء ظاہر کرے، جو اس کا تحریری اذن ہو، حاجی محمد عابد صاحبؒ اس کی تحریر پر مدرسہ کا اجراء عمل میں لائیں اور اس دور کے ذمہ دار اس اجراء کو بلکہ اس کے مبادی تک کو عطائے قاسم یا فیضانِ قاسمی سے تعبیر کریں، اسی کے فکر اور منصوبے پر مدرسہ کی بنیاد رکھی جائے، وہی شخصیت مستقبل کے لئے مساعی کا وعدہ دے اور بالآخر دیوبند پہنچ کر ہر طرح مدرسہ کو ہاتھ میں لے اور بلا جھجک مدرسہ اس کے حوالہ ہو جائے، مدرسہ کی عمارت کا سنگِ بنیاد خود ہی رکھائے، اس کے نظامِ تعلیم وانتظام کا ڈھانچہ بھی خود ہی بنائے اور اس کے ہمہ جہتی دخل وتصرف کو لوگ بلا چون وچرا اس طرح قبول کریں جیسے اس کے اکابر اس کے منتظر بیٹھے تھے، نہ کسی کو اس عمل دخل پر استعجاب ہو نہ تحیر، پھر اس کے اکابر اس مدرسہ کی بنا کو اس کے وطن کی طرف منسوب کر کے اس کی تاسیس باور کرائیں اور جن احوال واسباب پر مدرسہ کا قیام عمل میں آئے وہ اس کے اوپر گذرے ہوئے احوال ہوں، تو یہی وہ بنیادی امور ہیں جو کسی ادارہ کی تاسیس کا صحیح مفہوم کہے جاسکتے ہیں۔ اس لئے سوچا جائے کہ علی الاطلاق بانی کسے کہا جائے؟

خواص وعوام کی زبان پر بناء کی نسبت

بہرحال یہ ہے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے بانیٔ مدرسہ ہونے کی نوعیت، جس کی رو سے انہیں خواص وعوام کی زبانوں پر بانی بولا جاتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہندوستان کے حسبِ حال حضرت نانوتوی رحمہ اللہ تعلیمی رنگ میں ایک ہمہ گیر اجتماعی رنگ کے مؤسس تھے، اس فکر کا مظہر اتم دارالعلوم دیوبند ہے جس کا خاکہ پیش کیا جاچکا ہے، اسی لئے اس ادارہ کا بنیادی مزاج،

رنگِ تعلیم، ذوقِ ہمہ گیری اور اندازِ جامعیت وہی ہے جو حضرت والا کا تھا، اور طبعی طور پر اساس کا رنگ ہوتا بھی وہی ہے جو مؤسس کا ہو، پھر اس کا بنیادی مسلک اور ذوق جس پر سو برس سے اس کے فضلاء کی تعلیم وتربیت ہو رہی ہے، سب جانتے ہیں کہ وہ حضرتِ والا ہی کا ہے جسے اس احاطہ میں ''قاسمیت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

غرض ذوق وفکر، مسلک ومشرب اور اجرائے تعلیم سے لے کر عملی تربیت، اجرائے تعلیم کا عملی اذن اور آخر عمارتِ مدرسہ کا سنگ بنیاد جس سے مدرسہ نے استقلالی صورت حاصل کی وغیرہ، سارے ہی وہ امور ہیں جن سے تاسیس مدرسہ کے بارہ میں حضرت نانوتویؒ کا مدرسہ سے نہ صرف گہرا اور خصوصی تعلق ہی ثابت ہوتا ہے بلکہ آپ ہی اس کے مدارِ کل نمایاں ہوتے ہیں۔ اس لئے اور حضرات اگر بانی ہیں تو وہ بانیٔ اعظم اور بانیوں کے سربراہ ہیں، یہی حقیقت حضرت شیخ الہندؒ کے ایک قصیدہ میں جو انھوں نے حضرتِ والا کی آمدِ دیوبند اور سلسلۂ علم یعنی مدرسہ دیوبند کے اجراء کے بارے میں لکھا ہے، حسبِ ذیل شعر سے حضرتِ والا کا سربراہِ بانیان ہونا نمایاں ہے:

جملہ اعیان واکابر تھے جلو میں اس کے
اس کی شوکت کو پہنچتی تھی کہاں شوکتِ جم

حضرت نانوتویؒ کے بانی ہونے کی نسبت شروع سے چلی آرہی ہے

یہی بنیاد ہے جس کی بنا پر روایات کا ایک عظیم ذخیرہ ملتا ہے جو حضرتِ والا کو بانیٔ مدرسہ قرار دے رہا ہے، اس میں بھی بڑے اکابر اہل اللہ اور عظام رجال شامل ہیں، جو آپ کو بانی کے نام سے یاد کر رہے ہیں۔ ان شہادتوں میں ایک طبقہ حضرت نانوتویؒ کے اکابر کا ہے، ایک معاصرین کا، ایک تلامذہ ومستفیدین کا اور ایک مشاہیرِ ملک کا ہے، جو آپ کو مختلف عنوانوں سے دار العلوم کا مؤسس اور دار العلوم کو ان کے آثار اور باقیاتِ صالحات بتلا رہا ہے۔ کسی نے انہیں بانی کہا، کسی نے انہیں مدرسہ

کا مصدر کہا، جس سے مدرسہ صادر ہوا ہے، کسی نے مدرسہ کو ان کی عمدہ ترین یادگار بتلایا، کسی نے انہیں مدرسہ کا قائم کنندہ کہا، کسی نے مؤسس کے لفظ سے یاد کیا، کسی نے مدرسہ کو ان کی باقیاتِ صالحات میں سے کہا اور کسی نے انہیں اس باغ کا باغبان کہا وغیرہ وغیرہ۔ غرض تعبیریں مختلف ہیں اور منشاء ایک ہے ؎

عباراتنا شتّٰی وحُسْنك واحدٌ

وكل الٰی ذالك الجمال يشيرٌ

اور پھر ان شہادتوں کا ایک بڑا عدد وہی ہے جو ۱۹۰۵ء سے قبل کا ہے جبکہ ایک کہنہ اور گمنام تحریر کے گمنام مصنف نے اس قسم کی شہادتوں کو جو سب کی سب ان کے سامنے ہیں بھی نہیں، خلافِ واقعہ کہہ کر انہیں ۱۹۰۵ء سے ایک جاری شدہ پروپیگنڈہ بتلایا ہے، لیکن ان شہادتوں سے واضح ہے کہ ابتدائے مدرسہ ہی سے حضرتِ والا کا بانیٔ مدرسہ ہونا اپنوں اور پرایوں میں ایک بدیہی اور متواتر حقیقت کی حیثیت سے مسلّم تھا، ذہنوں میں متعارف تھا اور زبان وقلم پر اس کا چرچا پھیل چکا تھا۔

بناءِ دارالعلوم کے متعلق ناقابلِ تردید شہادتیں

(۱) حضرتِ والا کے اکابر میں سب سے بڑی شخصیت ان کے پیرومرشد حضرت اقدس حاجی محمد امداداللہ قدس سرہ کی ہے، وہ حضرت نانوتویؒ کی وفات پر اپنے ایک تعزیتی مکتوب میں جو مکہ مکرمہ سے حضرت مولانا رفیع الدین صاحب دیوبندی قدس سرہ مہتمم ثانی مدرسۂ دیوبند کے نام بھیجا گیا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

”عزیز مرحوم (حضرت نانوتویؒ) کے جو شاگرد و مرید اور دوست ہیں، سب مدرسہ کی طرف توجہ رکھیں کہ عزیزم رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی عمدہ یادگار یہ مدرسہ ہی ہے اس سے غفلت نہ کریں۔“

(مکتوب محفوظ محافظ خانہ دارالعلوم)

(۲) حضرتِ والا کے معاصرین میں اس وقت کے ذمہ دار اکابر میں سے حضرت مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم ثانی دارالعلوم دیوبند کی مقدس شخصیت اس ماحول میں معروف ترین شخصیت

ہے، حضرت ممدوح حضرت نانوتویؒ کی وفات پر بحیثیت مہتمم اپنے تعزیتی مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

''اس چشمۂ فیض (مدرسہ دیوبند) کے منبع اور اس آبِ حیات کے مصدر اور اس آفتاب عالم تاب کے مظہر آپ (حضرت نانوتویؒ) ہی ہیں۔'' (روداد مطبوعہ دارالعلوم دیوبند بابت ۱۲۹۷ھ)

(۳) مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی مہتمم رابع مدرسہ دیوبند (جو جہادِ شاملی میں حضرت نانوتویؒ کے مخصوص رفیق اور ہر وقت کے ساتھی تھے) حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم خامس دارالعلوم کے عہدۂ مہتممی پر تقرر کا ذکر کرتے ہوئے مدرسۂ دیوبند کی بنیاد و تاسیس کو حضرت نانوتویؒ کے دستِ مبارک اور سعی قدم کی طرف منسوب فرما رہے ہیں، لکھتے ہیں:

''اُمید ہے کہ ان کا (حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب کا) مہتمم مدرسہ ہونا مدرسہ کے ثبات اور ترقی کیلئے ایسا ہی مبارک و مفید ہوگا جیسا کہ اُن کے والد ماجد علیہ الرحمۃ والغفران (حضرت نانوتویؒ) کا قدم اور دست مبارک اس مدرسہ کی بنیاد اور سرپرستی کے واسطے مبارک ہوا۔'' (روداد مدرسہ دیوبند بابت ۱۳۱۳ھ)

(۴) حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ جن کا شمار بانیانِ دارالعلوم میں اس دور کے بزرگوں نے کیا ہے، اپنے ایک مضمون میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت تحریر فرماتے ہیں کہ:

''پیشوائے منازل دین، رہنمائے مراحل یقین، آیۂ قدرتِ الٰہی، مایۂ رحمتِ نامتناہی، غفراں مآب مغفرت پناہ جناب حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کہ کدیور ایں حلقہ پر بہار و بانیٔ ایں بناء فیض آثار بودہ، جزاہ اللہ عنا وعن جمیع المسلمین خیر الجزاء۔''

(روداد جلسہ دستار بندی دارالعلوم دیوبند بابت ۱۲۹۸ھ ص ۲۳، ۲۴)

پھر اپنی نظم موسوم بہ ''ارمغانِ مدرسہ'' میں حضرت نانوتویؒ کے اصولِ اساسی ہشتگانہ دارالعلوم دیوبند میں سے ایک اصول (کہ اس مدرسہ کے لئے کبھی کسی مستقل آمدنی کی سبیل نہ پیدا کی جائے ورنہ امدادِ غیبی منقطع ہوجائے گی) کی ترجمانی کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

اسکے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کیلئے — کوئی سرمایہ بھروسہ کا ذرا ہو جائے گا
پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ — یہ سمجھ لینا کہ بے نور وضیاء ہو جائے گا

(القاسم دارالعلوم نمبر محرم ۱۳۴۷ھ ص ۳۳)

(۵) حضرت والا کے تلامذہ اور طبقہ تلامذہ کے مقدس افراد میں سے حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کا مقولہ بروایت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی گذر چکا ہے کہ:

''حضرت الاستاذ (حضرت نانوتویؒ) نے اس مدرسہ کو کیا درس وتدریس، تعلیم وتعلّم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے کہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔'' (رسالہ دار العلوم بابت جمادی الثانی ۱۳۷۳ھ ص ۴۲)

اس میں حضرت نانوتویؒ کو مدرسہ دیوبند کا قائم کنندہ فرمایا گیا ہے اور اسی متن کی شرح حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے قصیدہ میں فرمائی ہے جو حضرت نانوتویؒ کے مرثیہ کے طور پر لکھا ہے، اس کے چند متفرق اشعار بلاترتیب درجِ ذیل ہیں۔

شیخ الہندؒ کے قلم سے حضرت نانوتویؒ کا مرثیہ

آپ نے اپنے جلیل القدر استاذ کا ذکر بسلسلہ قیامِ مدرسہ دیوبند فرمایا ہے، اس وقت کے جہل وظلم کی تفصیل بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

اتنے میں دیکھتے بس کیا ہیں ایک مردِ خدا — آرہا تیز رَوی سے ہے لئے ساتھ علم

بے نیازی وتوکل رخِ روشن سے نمود — قطع منزل کیلئے دونوں قدم تیغ دودم

گاڑ کر اس نے عَلم ایک ندا کی ایسی — یک بیک چونک پڑے اہل غدر اہل خیم

اس کی آواز تھی یا بانگِ خلیلِ الٰہی — کہہ کر لبیک چلے اہلِ عرب اہلِ عجم

باندھ کر چست کمر کہتے ہوئے نحن معك — چل پڑے جو بھی ملا اُس یم رحمت کا قدم

اس مربیٔ دل وجاں کی مسیحائی سے — علم دین زندہ ہوا جہل نے لی راہِ عدم

علم کو لاکے ثریا سے ثریٰ پر رکھا — آنکھوں سے دیکھ لیا عَلَّمَ مَالَمْ یَعْلَمْ

دولتِ علم سے سیراب کیا عالم کو — قاسمِ علم بھلا کیوں نہ ہو پھر اس کا عَلم

طائرِ علم شریعت کے لئے یہ دبین — برکتِ حضرتِ قاسم سے ہے مامونِ حرم

سلسلے علم کے امصار وقریٰ تک جاری　　اسکی ہمت سے ہوئے بل یہ ترا فیضِ اعم
جملہ اعیان واکابر تھے جلو میں اُس کے　　اسکی شوکت کو پہنچتی تھی کہاں شوکتِ جم

علم کا جھنڈا گاڑنا بناءِ مدرسہ کی طرف اشارہ ہے، بانگِ خلیل اللّٰہی سے آواز کی ہمہ گیری اور عرب وعجم میں فیضان کی عمومیت کی طرف اشارہ ہے، نَحْنُ مَعَكَ اور یم رحمت کا قدم سے حضرتِ والا کے ساتھ وقت کے اکابر واعیان کی معیت وپیروی کی طرف اشارہ ہے، امصار وقریٰ میں علمی سلسلوں کے پھیل جانے سے قیامِ مدرسہ کی کثرت کی طرف اشارہ ہے جو حضرتِ والا کی بنیادی تحریک تھی، جملہ اعیان واکابر کے جلو میں ہونے سے اجتماعی رنگ کے تعلیمی سلسلہ میں حضرتِ والا کے قائد اور سربراہ ہونے کی طرف اشارہ ہے جس سے آپ کا مدرسہ دیوبند کے قیام کے حق میں سربراہِ بناء ہونا اور بانیوں کی جماعت کو متحرک کر کے بانی بنانا واضح ہوتا ہے، جو آپ کے بانیٔ اعظم ہونے کی دلیل ہے۔

مولانا محمد میاں مہاجر کابل کی سند میں بانی کا ذکر

(۶) مولانا محمد میاں انبہٹوی مہاجر کابل (جو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے نواسے اور مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے یعنی مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی بہن کے پوتے ہیں) کی قلمی سند میں لکھا گیا ہے جو دار العلوم سے انہیں عطا کی گئی تھی:

فانه حفيد مولانا انصار علی وحفيد بنت استاذ الاساتذة الاعلام مولانا مملوك العلی النانوتوی وابن بنت الامام حجة الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی مؤسس هذه المدرسة. (سند محفوظ بدار العلوم)

اس سند پر (جو پرانے کاغذات میں محفوظ ہے) حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رکن مجلس شوریٰ مدرسہ، حضرت مولانا حکیم محمد حسن صاحب برادر خورد حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب، جناب حاجی ظہور الدین صاحب دیوبندی ممبر مدرسہ رحمہم اللہ اور دوسرے اکابر اساتذہ کے دستخط ہیں جس میں بانی اور مؤسس

کا لفظ حضرت نانوتویؒ کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

حضرت تھانویؒ کی شہادت

(۷) حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ جو حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھی معتقدین میں سے تھے، حتیٰ کہ اس دور کے نزاع کے وقت بھی انہوں نے حضرت حاجی صاحب کے یہاں کی حاضری ترک نہیں فرمائی، ۱۹۰۵ء سے بہت پہلے اپنی مثنوی زیر و بم لکھی ہے، اس میں حضرت نانوتویؒ کی نسبت تحریر فرماتے ہیں:

اے کجا رفت آں مدارِ اہتدا　　آں محمد قاسم مولائے ما
مرشدِ موصل برائے طالباں　　ہادیٔ کامل برائے گمرہاں
داشت حرفِ علمِ دیں ہمت بلند　　مدرسہ کردہ بناء در دیوبند

(مثنوی زیر و بم بحوالہ القاسم دارالعلوم ص ۱۹)

(۸) مولانا نواب محی الدین خاں صاحب رئیس مرادآباد و تلمیذ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ قاضی ریاست بھوپال نے ۱۳۱۳ھ میں آج سے بہتّر سال قبل مخالفین دارالعلوم کے پھیلائے شکوک وشبہات کا جواب ایک تحریر موسوم بہ ''تذکرہ'' میں دیتے ہوئے اس کے مقدمہ میں فرمایا:

''کیونکہ جیسا کہ اس کا (مدرسہ دیوبند کا) قیام تمام مدارس کے قیام کا سبب تھا، ایسے ہی بظاہر حال اس کی خرابی بھی باقی مدارس کی خرابی کی دلیل ہوسکتی ہے۔ اور بالخصوص اس سبب سے اور زیادہ رنج والم تھا کہ یہ بنیاد حضرت اقدس مولانا واستاذ ناحجۃ الاسلام مولانا محمد قاسمؒ کی قائم کی ہوئی ہے اور اس میں تزلزل آنا گویا تمام متوسلانِ حضرتِ مرحوم کے لئے قیامت کا نمونہ ہے۔'' (تذکرہ ص ۲)

(۹) سوانح مخطوطہ کے مصنف حاجی فضل حق صاحب مہتمم ثالث مدرسہ دیوبند اس سوانح میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''خلاصۂ کلام یہ ہے کہ علاوہ بے شمار حسنات اور باقیاتِ صالحات کے تین کام مہتم بالشان مولانا علیہ الرحمۃ (حضرت نانوتویؒ) سے ظہور میں آئے، اول مدرسۂ دیوبند، دوم مباحثہ شاہ جہانپور، سوم ترویج نکاحِ بیوگان۔'' (سوانح مخطوطہ ص ۵۵)

(۱۰) مولانا منصور علی خاں صاحب تلمیذ حضرت نانوتویؒ وناظر الاطباء ریاست حیدرآباد دکن کی تحریر ان کی ایک مطبوعہ تصنیف ''مذہبِ منصور'' میں طبع شدہ موجود ہے جو پہلے پیش کی جا چکی ہے، اس کا یہ جملہ مکرر پیش ہے جس میں حضرت والا کو قائم کنندہ مدرسہ دیوبند کہا گیا ہے، فرماتے ہیں:

''خصوصاً مدرسہ دیوبند، اول مولانا مرحوم (حضرت نانوتویؒ) نے اس مدرسہ کو چندہ سے قائم کیا تھا۔'' (مذہب منصور جلد دوم ص ۷۷)

(۱۱) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنے ایک ذمہ دارانہ پمفلٹ میں جو بعنوان ''دارالعلوم دیوبند کے اطمینان بخش حالات'' شائع ہوا تھا، تحریر فرمایا:

''حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم صاحب بانیٔ دارالعلوم دیوبند قدس سرہ العزیز کی ذاتِ گرامی کی طرف مسلمانانِ عالم کا رجحان ومیلان ......الخ۔ (پمفلٹ مطبوعہ ص ۷)

دارالعلوم کی مسجد کا کتبہ

(۱۲) پھر اسی نسبتِ بانی کے ساتھ حضرت ممدوح نے دارالعلوم دیوبند کی خوشنما مسجد کی لوح پر ۱۳۲۸ھ میں سنگِ مرمر کا ایک کتبہ بموجودگی حضرت شیخ الہند وبعلم حضرت ممدوح نصب کرایا جو آج تک نصب شدہ موجود ہے اور اس کتبہ میں حضرت ممدوح کا قطعہ تاریخ بھی کندہ ہے، کتبہ کی عبارت حسبِ ذیل ہے جس میں حضرتِ والا کو بانیٔ دارالعلوم لکھا گیا ہے:

''الحمد للہ کہ اس مسجدِ مقدس متعلق مدرسہ اسلامیہ دیوبند بصرفِ زر وبذلِ ہمت جناب حاجی سیٹھ غلام محمد اعظم ساکن راندیر ضلع سورت بزمانہ اہتمام مولانا حافظ محمد احمد خلف الرشید حضرت مولانا محمد قاسم قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ بانی مدرسہ یکہزار وسہ صد وبست وہشت (۱۳۲۸ھ) انجام پذیر رفت۔ (کتبہ مسجد مدرسہ)

(۱۳) مولانا سعید الدین صاحب رحمہ اللہ ممبر مجلس شوریٰ دارالعلوم وتلمیذ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مکتوب میں جو صفر ۱۳۴۶ھ میں مطبع علوی بھوپال میں چھپ کر شائع ہوا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''یہی وجہ ہے کہ جب حضرت بانیٔ مدرسہ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں جس طرف ان کی توجہ ہوگئی اسی

طرف مدرسہ کے لئے امداد وفتوحات ہونے لگتی تھیں اور اہل اسلام متوجہ ہوتے تھے، اسی توجہ کا ظہور حضرت صدر مہتمم صاحب (حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ) کے ذریعہ ہو رہا ہے۔'' (مکتوب ص ۸۵)

مولانا عبید اللہ سندھی کی تحریر

(۱۴) حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ کے سلسلہ میں مولانا عبید اللہ صاحب سندھیؒ ناظم جمعیۃ الانصار دیوبند اپنے پمفلٹ ''قواعد ومقاصد جمعیۃ الانصار'' (مطبوعہ قاسمی پریس دیوبند) میں تحریر فرماتے ہیں:

''الحمدللہ کہ اس مبارک تمہید ابتداء جمعیۃ الانصار اور عظیم الشان جلسہ دستار بندی مدرسہ عالیہ (دیوبند) کی صورت میں شمس الائمہ حضرت مولانا محمود حسن صدر المدرسین اور فخر الاسلام حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم مدرسہ جو مقدس بانی قدس سرہ' کے ظاہری وباطنی جانشین ہیں، کی متفقہ کوششوں سے نمودار ہوئی۔ (قواعد ومقاصد جمعیۃ الانصار ص ۳)

حضرت علامہ کشمیریؒ کی تقریر

(۱۵) حضرت الاستاذ الاکبر العلامہ محمد انور شاہ کشمیری صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند نے علامہ رشید رضا مصری کی آمد پر جو تقریر عمارتِ دارالعلوم میں فرمائی اس میں ایک جگہ حضرت نانوتویؒ کے مناقب وفضائل کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

تلمذ علی الشیخ عبدالغنی شمس الاسلام والمسلمین العارف الحافظ المحقق الشیخ محمد قاسم ابواحمد واشاربیدہ الٰی مولانا الحافظ محمد احمد رحمہ اللّٰہ المھتمم فی ھذہ المدرسۃ الدیوبندیۃ الجالس فی ھذہ الحفلۃ''طیب''مؤسس ھذہ المدرسۃ العالیۃ وبانیھا۔

دوسری جگہ فرمایا:

ثم لما استولت الاجانب علی ھذہ البلادوقامت الحرب بین

الحق والباطل اسس الشیخ محمد قاسم هذه المدرسة العالية فنفع الله بها كثيرا جزاه الله خير الجزاء۔

(روداد دارالعلوم دیوبند بابت ۱۳۳۰ھ ضمیمہ ص ۴۰)

حضرت میاں اصغر حسینؒ صاحب کا حوالہ

(۱۶) حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب محدث دارالعلوم دیوبند (المعروف بہ میاں صاحبؒ) تحریر فرماتے ہیں:

''اگر وہ (حضرت شیخ الہندؒ) متاعِ دنیا کی طلب فرماتے تو بہت مواقع ایسے تھے کہ لوگ حضرت کو سر آنکھوں پر بٹھلاتے اور صدہا روپیہ مشاہروں اور نذرانوں کی صورت میں پیش کرتے، لیکن آپ نے باوجود ذاتی ضرورتوں کے ہمیشہ اپنے استاذ (حضرت نانوتوی قدس سرہ) کے لگائے باغ دارالعلوم دیوبند کی سرسبزی وشادابی کو مطمح نظر رکھا اور اسی دینی خدمت میں عمر تمام کردی۔

(حیات شیخ الہندؒ ص ۲۰ مطبوعہ قاسمی پریس دیوبند)

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی شہادت

(۱۷) حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تحریر موسوم بہ ''دارالعلوم کی دوازدہ سالہ زندگی'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''چونکہ حسبِ وصیتِ بانئ دارالعلوم ہر مدرس اور ملازم دارالعلوم کا فریضہ ہے کہ وہ توسیع چندہ اور ترقئ دارالعلوم کی کوشش بلیغ عمل میں لائے۔ الخ

(دارالعلوم کی دوازدہ سالہ زندگی ص ۱۴ جو مدرسہ میں مولانا کی دوازدہ سالہ زندگی کے سنین ہیں)

سرسید کا تعزیتی مضمون

(۱۸) پھر یہ تصور صرف اعیانِ مدرسہ ہی کا نہیں تھا بلکہ اس دور کے مشاہیر اور سر برآوردگانِ ملک کا بھی تھا جو دارالعلوم کے لحاظ سے بیرونی لوگ تھے۔ جبکہ اس دور میں دارالعلوم کا نہ کوئی

پروپیگنڈہ تھا نہ اس کا کوئی رواج تھا، اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی، اور ساتھ ہی یہ زمانہ ۱۹۰۵ء کا بھی نہ تھا کہ اسے بیسویں صدی عیسوی کی تبدیلی کے نیچے لاکر غلط بیانی قرار دیا جائے، ان میں سے سرسید بانی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ خاص طور پر قابل ذکر ہیں (جن سے حضرت نانوتویؒ کی کتنے ہی مسائل میں مخالفت بھی چلتی رہی ہے) وہ اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۴/اپریل ۱۸۸۰ء میں حضرت کی تعزیت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اُن ہی (حضرت نانوتویؒ) کی کوشش سے علومِ دینیہ کی تعلیم کے لئے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی وکوشش سے اسلامی مدرسے قائم ہوئے، ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت اور افسوس کے کہہ کر خاموش ہو جائیں یا چند آنسوں بہا کر اور رومال سے پونچھ کر صاف کر لیں بلکہ اُن کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگار کو قائم رکھیں۔ دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگار ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ یہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے۔"

(۱۹) ۳/صفر ۱۳۱۵ھ جسے آج اسّی (۸۰) برس ہو چکے ہیں، عالیجناب مولوی شوکت حسین صاحب ساکن ورنگل اپنی ایک مطبوعہ اپیل بنام "گزارش" میں جو پندرہ صفحہ کا ایک پمفلٹ ہے تحریر فرماتے ہیں کہ:

حضرت ممدوح الشان (حضرت نانوتویؒ) علماءِ متاخرین میں بہت ہی بڑے نامور فاضل اور بانسبت بزرگ تھے، مدرسہ دیوبند کی بناء بھی ان کے مبارک ہاتھوں کی ڈالی ہوئی ہے کیا شک ہے کہ اُن کا شمار علماء میں سے تھا۔ (گزارش ص ۴)

مولانا حکیم عبدالحیؒ ناظم ندوۃ العلماء کی تاریخ میں بانی کا تذکرہ

(۲۰) ۱۳۱۲ھ میں آج سے بہتّر سال قبل یعنی ۱۹۰۵ء سے بہت کافی پہلے حضرت مولانا عبدالحیؒ صاحب (از احفاد حضرت سید احمد شہیدؒ) اپنے سفر نامہ میں جو ۱۳۱۲ھ میں بوقت سیر دار العلوم

یہاں کے حالات کے بارے میں لکھا گیا ہے، دار العلوم سے متعلق ایک نزاع کا ذکر کرتے ہوئے (جس کی تفصیلات کو وہ حضرت شیخ الہندؒ سے سنا ہوا ظاہر فرما رہے ہیں) لکھتے ہیں:

''مختصر یہ ہے کہ اس نزاع کی بنیاد اسی وقت پڑ گئی تھی جس وقت مدرسہ دیو بند کی بنیاد ڈالی گئی تھی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بانیٔ مدرسہ جناب مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم نے مدرسہ کے جو اصول اس وقت قائم کئے تھے اور جن پر اب تک عملدر آمد ہے ان میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ الخ (رسالہ دار العلوم شوال ۱۳۷۱ھ)

ان اکابر و اعیان کے اتنے بڑے جم غفیر کی شہادتوں کو جو حضرتِ والا کو بانیٔ مدرسہ پکار رہا ہے، نہ جھٹلایا جا سکتا ہے نہ رد کیا جا سکتا ہے، اور نہ ہی اتنے ثقات و کبرا عادتاً جھوٹ پر جمع ہو سکتے ہیں، نیز یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی غلط پروپیگنڈہ کا شکار تھے، کیونکہ ان میں بہت سے وہ ہیں جو ان کے تلامذہ اور بلا واسطہ مستفیدین کے طبقہ میں سے ہیں، جنہیں ان اکابر سے براہِ راست سماع ولقاء حاصل ہے۔ پھر ساتھ ہی ساتھ یہ سارے بیانات مثبت ہیں کہ ''فلاں صاحب بانی ہیں'' جو پشت پر دلائل لئے ہونے کی علامت ہے منفی نہیں ہیں کہ ''فلاں بانی نہیں ہیں'' جس کے لئے نہ دلیل کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ان کا حقیقت ہونا ہی ضروری ہوتا ہے، اس لئے انکار کی کوئی وجہ نہیں رہتی بلکہ چار و نا چار تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حضرتِ والا بانیٔ مدرسہ تھے اور اگر دوسرے حضرات کو ایک ایک دو دو شہادتوں کی بنا پر بانی کہا جانا ضروری ہے تو حضرتِ والا کو شہادتوں کے اتنے کثیر عدد کی وجہ سے جو حدِ تواتر سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے بطریق اولیٰ بانی کہا جانا ضروری ہے۔

پھر اور حضرات کے بانی ہونے کا ثبوت اگر سو برس بعد کی کچھ شہادتیں ہیں تو حضرتِ والا کے بانی ہونے کا ثبوت پورے سو برس کی مسلسل شہادتوں کے ساتھ تلقی بقبولِ عام ہے جو صدی کے کسی حصہ میں بھی منقطع نہیں ہوا، بلکہ صدی کے ہر حصہ میں چھوٹے اور بڑے یہی کہتے آرہے ہیں اور تاریخ کے اوراق بھرے آرہے ہیں کہ حضرتِ والا بانیٔ مدرسۂ دیو بند ہیں۔ اس لئے ایسے ثابت شدہ دعویٰ کے رد کئے جانے کی کوئی وجہ وجیہ سامنے نہیں آتی کہ اُسے قبول نہ کیا جائے۔

رشتۂ اعتدال

خلاصہ یہ ہے کہ اس بارہ میں جماعتِ دار العلوم دو کناروں کے بیچ میں ہے اور افراط وتفریط سے ہٹ کر کمالِ اعتدال کا رشتہ سنبھالے ہوئے ہے، نہ تو وہ اس افراط میں مبتلا ہے کہ بانیٔ مدرسۂ دیو بند کے سلسلہ میں حضرت نانوتویؒ کے نام سے گریزاں ہو کر بانی ہونے کی نفی پر تل جائے اور اس نفی ہی کو اپنا موضوع ٹھہرا لے، اور نہ اس تفریط میں غرق ہے کہ خواہ مخواہ کھینچ تان کر تن تنہا صرف انہیں کو بانی پکار کر دوسروں کے بانی ہونے کے انکار پر آ جائے جو حقیقتاً بناءِ مدرسہ میں تاریخی طور پر دخل رکھتے ہیں، بلکہ ہمارا فکر ونظریہ ہے کہ مثبت انداز میں ہر بانی کا جو مقامِ تاسیس ہے وہ اسے دیا جائے اور دل میں اس کی نوعیتِ تاسیس کی عظمت رکھی جائے اور بانیٔ مطلق ایک کو سمجھا جائے جبکہ بناء کی ساری خصوصیات اس میں جمع ہیں اور وہ حضرت نانوتویؒ ہیں۔ جس سے بانی کے سلسلہ کی تمام روایات قابلِ قبول بھی ہو جاتی ہیں اور تضاد بھی ختم ہو جاتا ہے اور رفعِ تضاد کی اس صورت میں اسلافِ دار العلوم کا نقشِ قدم بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ **فللہ الحمد**

بہر حال جبکہ ثقات واعیان کی یہ بیسیوں شہادتیں واضح کرتی ہیں کہ حضرتِ والا کا بانیٔ دار العلوم ہونا خواص وعوام کے قلوب میں متعارف اور مسلم تھا تو اتنے مثبت دلائل وشواہد اور واضح قرائن کے ہوتے ہوئے منفی پہلو کی چند کمزور شہادتیں تاریخ کو نہیں بدل سکتیں، البتہ ان مثبت دلائل کو ان کی اُسی نوعیت کے ساتھ قبول کیا جائے گا جو حقیقتاً ان کی واقعاتی نوعیت ہے، اور واقعات ہی نے متعین کی ہے اور اسی سے ان کا صحیح محمل متعین کیا جائے گا جو عرض کیا گیا، جس سے حضرتِ والا کے بانیٔ مدرسۂ دیو بند ہونے کی نوعیت واشگاف ہو جاتی ہے۔

بناءِ مدرسہ کے بعد اس سے حضرتِ والا کے تعلق کی نوعیت

بناء میں بانی کے اثرات

قدرتی بات ہے کہ بناء میں بانی کا عمل دخل کلی طور پر خود اعتمادی لئے ہوئے ہوتا ہے اور قوم بھی اسے اپنا محسن سمجھتے ہوئے اس کا اثر مانتی ہے، اس لئے طبعی طور پر مدرسہ کے تمام نظری اور عملی کاموں میں بانیوں کی اس مقدس جماعت کا جن کے اسمائے گرامی مذکورہ روایات میں بانی کے آئے ہیں، درجہ بدرجہ عمل دخل یہی نوعیت لئے ہوئے ہے مگر یہاں بھی حضرت نانوتویؒ بانیوں کے سربراہ ہی کی حیثیت سے دکھائی دیتے ہیں اور ان کے کاموں میں غیر اختیاری طور پر اختیاری اور خود اعتمادی کی خصوصی شان محسوس ہوتی ہے جو ان کے بانئ مطلق ہونے کی کھلی شہادت ہے۔

اس سلسلہ میں حضرتِ والا کے تعلق کے دو رخ ہیں، پہلا یہ کہ جہاں تک مدرسہ سے مالی یا اخلاقی یا کسی بھی مادی مفاد حاصل کرنے کا تعلق ہے، حضرتِ والا نہ صرف اس سے بے نیاز ہی رہے بلکہ پورے قصد اور ہمت کے ساتھ اس سے بچنے کی سعی فرماتے رہے، نہ کبھی کوئی رسمی عہدہ قبول فرمایا نہ معاوضہ طلبی کا کوئی ادنیٰ تصور ان کے ذہن میں آیا، نہ تن بدن کی کسی ادنیٰ راحت طلبی کے مدرسہ سے روادار ہوئے جس کی وجہ آپ کی روحانیت کا علوّ ومقام اور ساتھ ہی آپ کی طبیعت کی افتاد، مزاج کی وارستگی، طبعی آزادی اور فطری غناء وسیر چشمی تھی جو ایسے مفادات کا تحمل ہی نہیں کر سکتی تھی۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف لکھتے ہیں:

"اور آپ کا (حضرت نانوتویؒ کا) قول تھا کہ مجھ کو پوری راحت اسی میں ملتی ہے کہ میں اپنے طور پر رہوں، غیر کا تابع ہو کر رہنا پسند نہیں آتا۔" (سوانح مخطوطہ ص ۳۸)

ظاہر ہے کہ اس طبعی افتاد کے ساتھ منافع کوشی کے تصورات کیسے جمع ہو سکتے تھے؟ پھر اس غناء کے ساتھ ایثار کا عالم یہ تھا کہ بقول سوانح مخطوطہ:

"اور (حضرت نانوتویؒ نے) تقسیم مال ومتاع خود ہر ہر خاص وعام میں خوب مشق حاصل کی۔"
(سوانح مخطوطہ ضمیمہ)

ظاہر ہے کہ اس صورت میں مدرسہ سے ذاتی مفاد حاصل کرنے کا کوئی ادنیٰ تصور بھی قائم نہیں کیا جاسکتا بلکہ اگر کیا جاسکتا ہے تو یہ کہ مدرسہ پر حضرت والا خود اپنی ذات سے خرچ کرتے ہوں نہ کہ مدرسہ کو اپنے او پر خرچ کرتے ہوں۔ چنانچہ آپ کی طبعی اور فطری افتاد بتلاتے ہوئے سوانح مخطوطہ کے مصنف لکھتے ہیں:

''مولانا نے (حضرت نانوتویؒ نے) اپنے عمل کو کسرِ نفسی سے صحیح کیا۔ اپنے علم کو جبر نقصان مسلمانوں اور مقابلہ کفار و مشرکین میں صرف کیا اور اپنی قوتِ عملیہ کو ہر چہار طرف سے سکوڑ کر بشکل جذر ظاہر کیا اور لا کلمہ سے اپنے آپ کو ایسا نفی کیا کہ ذات صفر کی برابر ہوگئی اور الا کلمہ سے ضربِ اثبات ایسی لگائی کہ حاصل ضرب ایک رہا اور عمل جمیع برادران اسلام اور تفریق بین الکفر والاسلام اور تقسیم مال خود ہر ہر خاص و عام میں خوب مشق حاصل کی۔'' (سوانح مخطوطہ ضمیمہ)

کسرِ نفسی کی بنا پر حضرت نانوتویؒ کا استغناء

ظاہر ہے کہ جب کسرِ نفسی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی تو مدرسہ سے کسی عہدے یا منصب کی طلب کا سوال ختم ہو جاتا ہے جو حبِ جاہ کا شعبہ ہے اور جب مالی ایثار حد کو پہنچا ہوا تھا تو معاوضہ طلبی کے تصورات ناممکن ہو جاتے ہیں جو حبِ مال کے شعبے ہیں۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف لکھتے ہیں:

''مدرسہ اسلامی دیوبند آپ ہی کا (حضرت نانوتویؒ کا) ساختہ پرداختہ ہے اور کیا کچھ اس کا کارخانہ ہے کہ چھوٹی سی سرکار مگر آپ نے ہرگز کبھی اس کی کسی چیز سے نفع نہیں اُٹھایا، اپنے پاس سے دینا جانتے تھے لینے کا کام نہ تھا۔'' (سوانح مخطوطہ ص ۱۵)

چنانچہ روداد مدرسۂ دیوبند بابت ۱۲۹۶ھ میں ص ۹ پر حضرت کا چندہ بھی درج ہے جس سے واضح ہے کہ مدرسہ پر خرچ فرماتے رہتے تھے۔

آگے حضرت والا کی بے نفسی، بے طمعی اور زہد وقناعت کے بارہ میں مزید تفصیل سے لکھتے ہیں کہ:

''اگر آپ (حضرت نانوتویؒ) کو طمع دنیوی ہوتی تو بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ سونے کی دیواریں بنا لیتے، مدرسۂ دیوبند کے مکان کو لاکھوں اینٹوں سے تعمیر کرایا مگر اپنے گھر میں ایک پھوٹا روڑا بھی نہ لگوایا۔''
(سوانح مخطوطہ ص ۱۶)

ایک جگہ آپ کے تقویٰ کے بارہ میں لکھتے ہیں:

''اور یہاں تک مدرسہ کے مال سے احتیاط تھی کہ اگر کبھی بہ ضرورت مدرسہ کے دوات وقلم سے کوئی اپنا خط لکھ لیتے تو فوراً ایک آنہ مدرسہ کے خزانہ میں داخل کر دیتے اور فرماتے کہ یہ بیت المال کی دوات ہے ہم کو اس پر تصرف جائز نہیں ہے۔'' (سوانح مخطوطہ ص ۱۶)

غرض طمع نفس اور لالچ کا تصور حضرت والا کے آس پاس بھی نہ تھا کہ عہدوں یا نمائشی اقتدار کے جذبات دل میں اُبھرتے۔ سوانح مخطوطہ کے جملے یہ ہیں کہ:

''اخلاص کا یہ حال کہ جملہ قول وفعل آپ کے خالصاً للہ تھے، ریا کا نام نہ تھا، طمع نفسی کی بو بھی نہ تھی، کبھی وعظ پر اجرت نہ لی، نہ کبھی نفسانی خواہش کی وجہ سے وعظ کیا، نہ کبھی مالِ دنیا کے عوض میں پڑھایا۔''
(سوانح مخطوطہ ص ۱۶)

حضرت مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''مسئلہ کبھی نہ بتلاتے حوالہ کسی پہ فرما دیتے۔ فتویٰ لکھنا اور مہر کرنا تو درکنار اول امامت سے بھی گھبراتے، آخر کو اتنا ہوا کہ وطن میں نماز پڑھا دیتے، وعظ کبھی نہ کہتے تھے۔'' (مختصر سوانح قاسمی ص ۱۱)

گو بعد میں حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ کے جبر واصرار سے وعظ فرمانا شروع کیا جیسا کہ مختصر سوانح قاسمی میں مرقوم ہے۔

ظاہر ہے کہ اس جذبہ کے بعد اخلاقی مفادات یا جاہی عہدے حاصل کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لئے آپ نے کبھی رسمی عہدہ قبول نہیں فرمایا نہ رسمی طرز کے مدرس بنے، نہ منتظم نہ ناظم نہ مہتمم اور نہ کبھی کسی مالی معاوضہ کا سوال درمیان میں آیا جس میں علاوہ حضرت والا کی مزاجی افتاد کے بنیادی وجہ یہ تھی کہ مدرسہ کو وجود آپ سے ملا تھا نہ کہ آپ کو مدرسہ سے، مدرسہ کے عہدے آپ سے بنے تھے نہ کہ آپ عہدوں سے، مدرسہ کا مالیہ آپ سے وجود پذیر ہوتا تھا نہ کہ آپ مالیہ سے، ظاہر ہے کہ جو شخص ہمہ وقت مدرسہ کو اپنا پروردہ سمجھ کر اس پر جھکا ہوا ہو اس میں یہ طلبیں کیسے جاگزیں ہو سکتی تھیں؟

مالی منافع کو چھوڑ کر راحتِ نفس کے لئے بھی آپ نے مدرسہ کو کبھی ذریعہ نہیں بنایا، سوانح مخطوطہ میں ہے کہ:

''آپ کے مزاج میں حرارت بہت تھی اور موسم گرما میں سرد مکان بہت مرغوب تھا۔ مدرسہ میں ایک

سرد خانہ (تہ خانہ) تیار ہوا اور گرمی کی بہت شدت تھی۔ مولوی رفیع الدین صاحب نے عرض کیا کہ سرد خانہ تیار ہے وہاں دوپہر کو آرام کیا کیجئے۔ مولانا نے (حضرت نانوتویؒ نے) فرمایا کہ ''ہم کون جو اس میں آرام کریں، وہ حق ہے طالب علموں کا'' اور کبھی آپ نے سرد خانہ میں جا کر استراحت نہ کی اور گرمی کی تکلیفیں سہا کیں۔'' (سوانح مخطوطہ ص ۱۶)

بہرحال اس غناء وایثار، زہد وقناعت اور صبر وتحمل کے لئے علوِ مقام کے ساتھ ظاہر ہے کہ منافع طلبی اور مفاد پرستی کا جوڑ لگنا ناممکن تھا اس لئے حضرت والا نے مدرسۂ دیوبند سے استحصال کا کبھی کوئی واسطہ اور تعلق نہیں رکھا، نہ کبھی عہدیدار بنے جیسے مدرس یا منتظم، نہ کبھی رسمی انداز سے اس کے کارکن ہوئے، ظاہر ہے کہ اس مزاج اور اس حال ومقام پر ہوتے ہوئے جیسے یہ ناممکن تھا کہ حضرت کا کوئی معاصر جو ان کے مزاج کو پہچانتا ہو، انہیں مدرسہ دیوبند کی مدرسی یا ملازمت کے لئے بلائے، ایسے ہی یہ بھی ناممکن تھا کہ خود حضرت والا بھی اس قسم کی موظفانہ خدمات اور ان سے استحصالِ مفادات کا کوئی تصور بھی ذہن میں لائیں۔

دارالعلوم سے حضرت نانوتویؒ کے تعلق کی نوعیت

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر مدرسہ سے آپ کے تعلق کی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ سمجھا جائے کہ آپ اجرائے مدرسہ کرا کر اس سے قطعاً بے تعلق ہو گئے تھے؟ اور اس کے کسی فکر وعمل میں آپ کی شرکت نہ تھی؟ مگر ظاہر ہے کہ بے تعلقی کے تصور کی یہاں کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ کیونکہ ایک شخص کسی بناء کو اس سے بے تعلق ہونے اور اس سے منقطع ہو جانے کے لئے قائم نہیں کرتا، ورنہ قائم کرنے ہی کی اسے کیا ضرورت در پیش تھی؟ دوسرے یہ کہ حضرتِ والا نے اپنے اس جوابی خط میں (جو قیامِ مدرسہ کے سلسلہ میں آپ نے حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کو لکھا تھا) خود ہی یہ بشارت دی تھی کہ ''میں مدرسہ کے حق میں ساعی رہوں گا'' ظاہر ہے کہ اس وعدہ کا ایفاء انقطاعِ سعی وعمل اور بے تعلق رہنے سے نہیں ہو سکتا تھا بلکہ مدرسہ کے ساتھ انتہائی تعلق اور اس کے بارہ میں پوری جدوجہد اور عملی مساعی سے ہی ہو سکتا تھا۔ تیسرے یہ کہ بقول حضرت شیخ الہندؒ جب حضرت نانوتویؒ نے ایک فکرِ خاص پر مدرسہ دیوبند قائم فرمایا کہ وہ فکر پھیلے اور آگے بڑھے (جیسا کہ سابق میں گذر چکا ہے) تو مدرسہ

سے بے فکری، بے تعلقی اور کلی علیحدگی سے یہ غرض وغایت آخر کیسے پوری ہوسکتی تھی اور اس فکر کو صاحبِ فکر کی بے تعلقی کی صورت میں آخر کون چلاتا اور پورا کرتا؟ ان تمام واقعاتی وجوہ کا قدرتی تقاضا ہے کہ حضرتِ والا اجراءِ مدرسہ کے بعد بھی مدرسہ سے اتنے ہی متعلق ہوں جتنا کہ اس کی تاسیس سے متعلق رہے، کہ یہ بھی بانی ہونے کا ایک قدرتی اقتضا ہے۔ بلکہ غور کیا جائے تو مدرسہ کی ذمہ داری سب سے زیادہ بلحاظِ اصول وفکر حضرتِ والا ہی پر عائد ہوسکتی تھی جس کو آپ نے اجراءِ مدرسہ کر کے طبعاً خود اپنے سر عائد فرمالیا تھا۔ چنانچہ ان اصولی استدلالی تقاضوں کو اگر تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ حضرتِ والا اگر تا بحدِ مفاداتِ ذاتی مدرسہ سے بے نیاز اور بے تعلق تھے تو بحدِ سعی وعمل ہمہ وقت اس میں منہمک اور مشغول بھی تھے اور آپ کا ہمہ وقتی عمل مدرسہ ہی کی فلاح وبہبود اور اس کی ہی ہر جہتی ترقی تھا۔ سوانح مخطوطہ میں ہے کہ:

(۱) حالانکہ رات دن مدرسہ کی اسلوبی میں مصروف رہتے اور تعلیم میں مشغول۔ (سوانح مخطوطہ ص ۱۶)

ظاہر ہے کہ یہ رویہ کہ کمال استغنا بھی ہو اور کمال عمل بھی اور کمال مرجعیت بھی، اسی فرد کا ہوسکتا ہے جو اول سے لے کر آخر تک مدرسہ کے قیام واجراء کی اصل واساس اور ادارہ کا ہمہ اوست مانا گیا ہو، اور اس نے محض اپنے فکر کو (جو مُلھم من اللہ ہو) آگے بڑھانے کے لئے ادارہ کو قائم کیا ہو، جس میں ذاتی مفاد کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ چنانچہ مدرسہ کے کاموں میں آپ کی ذہنی مصروفیت اور صرفِ ہمت کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کا دار العلوم کے بنیادی امور میں تصرف

(۲) حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم ثانی مدرسہ دیوبند کا خود اپنا مقولہ ہے جو ارواحِ ثلثہ میں نقل کیا گیا ہے کہ:

”مدرسہ کا اہتمام میں نہیں کرتا بلکہ حضرت نانوتویؒ کرتے ہیں، جو کچھ مولانا کے قلب پر وارد ہوتا ہے وہ بعینہٖ میرے قلب میں منعکس ہوجاتا ہے اور وہ کام کر گذرتا ہوں۔ چنانچہ میرے کام کرنے کے بعد حضرت نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ مولانا اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے میرے دل میں بھی یہی آرہا تھا جو آپ نے کیا۔“

اس سے صاف نمایاں ہے کہ حضرت والا کا امورِ مدرسہ میں دخل وتصرف صرف علم ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ آپ جزوی جزوی امور پر توجہ بھی رکھتے تھے، ورنہ ایک ذمہ دار کارکن (مہتمم) کی جزئیاتی امور میں ہمت افزائی، رہنمائی اور باطنی تاذین کے کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے۔

(۳) اس ذہنی اور قلبی مصروفیت اور ہمتِ باطن کے علاوہ آپ کا ظاہری عمل بھی کسی ایک نوع میں منحصر نہ تھا بلکہ ہمہ جہتی تھا آپ روزمرہ کی جزئیات کے علاوہ اہم بنیادی امور تقرر، تنزل اور عزل ونصب وغیرہ جیسے امورِ کلیہ میں بھی ابتدا ہی سے دخیل تھے، چنانچہ مدرسہ کی عین ابتدائی تاسیس کے وقت میرٹھ سے ملا محمود صاحب کا تقرر بحیثیت مدرس آپ ہی نے باختیارِ خود کر کے دیو بند بھیجا اور آپ ہی نے پندرہ روپیہ ماہوار ان کی تنخواہ جاری فرمائی، جو ایک با اختیار ذمہ دار کا کام ہوتا ہے جیسا کہ خود حضرتِ والا کے مکتوب بنام حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ سے نمایاں ہے، جو گذر چکا ہے۔

(۴) پھر آپ ہی نے حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسی غنی و مستغنی شخصیت پر زور اور دباؤ ڈال کر انہیں عہدۂ مہتممی پر مقرر فرمایا۔ سوانح مخطوطہ میں ہے:

''حضرت مولانا مرحوم (حضرت نانوتویؒ) کے دباؤ سے آپ نے (مولانا رفیع الدین صاحب نے) عہدۂ اہتمام مدرسۂ دیو بند اپنے سر دھرا، ورنہ بہت گھبراتے تھے۔'' (سوانح مخطوطہ ص ۳۵)

(۵) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو صدر مدرس مدرسۂ دیو بند بنا کر آپ ہی نے دیو بند بلایا اور صدر مدرسی پر مامور فرمایا، حضرت میاں صاحب (مولانا اصغر حسین صاحب) رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی (ابن مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) جو اجمیر میں سو روپیہ مشاہرہ پر مدرس رہ چکے تھے اور پھر بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے تھے، حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے ارشاد سے اس خدمت (صدر مدرسی) مدرسۂ دیو بند کو ایک اسلامی خدمت سمجھ کر اواخر ۱۲۸۳ھ میں تشریف لائے اور نہایت قلیل مشاہرہ بیس روپیہ (کچھ عرصہ بعد تیس روپیہ) پر صدر قرار پائے۔
(حیات شیخ الہند ص ۱۰)

بہر حال ان تقررات سے ظاہر ہے کہ مہتمم مدرسہ، صدر مدرس مدرسہ، مدرس دوم مدرسہ (ملا محمود صاحبؒ) آپ ہی کے مقرر فرمودہ تھے جو ۱۲۸۳ھ اور اس سے متصل سنین میں عمل میں آئے، جس

سے واضح ہے کہ میرٹھ چھوڑنے سے قبل ہی حضرتِ والا کے تصرفات اہم امور میں ۱۲۸۳ھ ہی سے جاری ہوگئے تھے۔ پھر یہی نہیں بلکہ مدرسہ کی عام جزئیات تک میں بھی آپ ہی کا منشاء کارفرما تھا۔ چنانچہ روزمرہ کی جزئیات میں آپ کا دخل وتصرف سوانح مخطوطہ کی اس عبارت سے ظاہر ہے کہ:

(۶) ''آپ کی (حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کی) اور مولانا (نانوتویؒ) کی کبھی صراحۃً یا کنایۃً خفیہ یا علانیہ کسی طرح کی مخالفت (دربارہ امورِ مدرسہ) نہیں ہوئی بلکہ روز بروز ترقی......'' الخ۔
(سوانح مخطوطہ ص ۳۵)

جزئیاتِ عمل میں مخالفت کی یہ نفی اسی وقت برجائے خود صحیح ہوسکتی ہے کہ حضرتِ والا کا جزئیاتِ اہتمام اور مدرسہ کے جزوکل میں عمل دخل ہو، ورنہ موافقت ومخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔

(۷) حضرتِ والا ہی نے مدرسہ میں فن سپہ گری کا شعبہ جاری فرمایا اور خود اپنی نگرانی میں طلبہ کو لکڑی اور تلوار کے ہاتھ سکھواتے تھے کہ درحقیقت ۱۸۵۷ء کا یہ بھی ایک فکر تھا، جیسا کہ صاحبِ سوانح مخطوطہ نے اسے بالتفصیل بیان کیا ہے اور بعض معترضین کا یہ مقولہ بھی نقل کیا ہے کہ:

''اب یہ مدرسہ عربیہ تھوڑا ہی رہا ہے یہ مدرسہ حربیہ ہوگیا ہے۔''

دارالعلوم کی رودادوں میں حضرت نانوتویؒ کا نام سرفہرست

(۸) ۱۲۸۳ھ میں مدرسہ کے قیام کا اعلان جن بزرگوں کی طرف سے ہوا ہے ان میں سرفہرست حضرت ہی کا اسم گرامی ملتا ہے جیسا کہ روداد مدرسۂ دیوبند بابت ۱۲۸۳ھ کے ص ۳ سے ظاہر ہے۔

(۹) پھر ۱۲۸۳ھ سے ۱۲۹۷ھ تک درجاتِ عربیہ کا امتحان بھی آپ ہی بشمول بعض اراکین خود لیتے تھے، باضابطہ رپورٹ اور رائے اپنے دستخط سے جو سرفہرست ہوتے تھے، دفتر اہتمام میں داخل کرتے تھے، جو رودادوں میں برابر شائع ہوتی تھی۔ چنانچہ ۱۲۸۴ھ میں مدرسۂ دیوبند کے سب سے پہلے سالانہ امتحان کے نتائج کی رپورٹ میں سرفہرست حضرت کے دستخط ہیں اور پھر دوسرے بزرگوں مثل مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس مدرسہ دیوبند، مولانا ذوالفقار علی صاحب ڈپٹی

انسپکٹر سررشتہ تعلیم ضلع سہارنپور، مولوی مہتاب علی صاحب مدرس تحصیل اسکول دیوبند کے دستخط ہیں۔

(روداد مدرسہ دیوبند بابت ۱۲۸۴ھ)

(۱۰) پھر روداد مدرسہ بابت ۱۲۸۵ھ میں ہے کہ:

''امتحان سالانہ تحریری وتقریری نہایت احتیاط وکمالِ مصروفیت سے جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب بشمول دیگر علماء وفضلاء نے کئی روز تک لیا اور کیفیتِ ذیل تحریر فرمائی۔'' (روداد ۱۲۸۵ھ ص ۶)

(۱۱) سالانہ امتحان کے پرچہ ہائے سوال بھی حضرتِ والا ہی بشمول حضرت صدر مدرس تحریر فرماتے تھے، روداد کی عبارت حسبِ ذیل ہے:

''اور امتحان تحریری میں ہر روز جناب مولانا واولانا مولوی محمد قاسم صاحب وجناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے سوالات تحریر فرمائے۔ جب امتحان پورا ہولیا تب جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب ومولوی محمد یعقوب صاحب نے باہم مل کر اُن کے جوابات دیکھے۔'' (روداد مدرسہ دیوبند بابت ۱۲۸۷ھ ص ۱۰)

اسی طرح ۱۲۸۹ھ کی روداد میں نتائج امتحان کی رپورٹ میں حضرت والا کے دستخط سرفہرست ملتے ہیں۔ غرض سال بھر کی پڑھائی اور اس کے نچوڑ میں نتائج امتحان سالانہ میں حضرتِ والا کا گہرا عمل دخل اور ذمہ دارانہ رویہ ۱۲۸۳ھ سے جو مدرسہ کی تاسیس کا سال ہے، حضرت کے سن وصال ۱۲۹۷ھ تک مسلسل رودادوں میں مذکور چلا آرہا ہے۔

امورِ مدرسہ میں حضرت نانوتویؒ کا عمل دخل

(۱۲) ساتھ ہی مدرسہ کے سالانہ جلسہ ہائے تقسیم انعام وتقسیم اسناد کے سلسلہ میں حضرتِ والا ہی آگے آگے سربراہِ کار کی شان سے دکھائی دیتے ہیں۔ حضرت ہی جلسہ کے سامنے تقریریں فرماتے تھے اور صرف وعظ وپند ہی نہیں بلکہ ان تقریروں میں مدرسہ کی سالانہ کارگزاری کا بیان بھی ہوتا تھا، نیز اس میں چندہ دہندگان کا شکریہ، چندہ کی اپیل اور مدرسہ کے بارے میں لوگوں کو توجہ دہانی بھی ہوتی تھی، جو ایک عملی ذمہ دار کی شان ہوتی ہے۔ ۱۲۹۲ھ میں جو مدرسہ کی عمارت کے سنگِ بنیاد رکھنے کا سال ہے، حضرتِ والا کی تقریر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے ان کی موجودگی میں سنائی، بظاہر موقعہ کی اہمیت کی وجہ سے یہ تقریر تحریری طور پر مرتب فرمائی گئی ہے جس میں مدرسہ کی دس سالہ

کارگزاری نمایاں کی گئی ہے، جسے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے ذریعہ سنوایا گیا۔ چنانچہ یہ تقریر اور ہر سال کی ایسی ہی تقریریں رودادوں میں طبع شدہ موجود ہیں جن سے حضرتِ والا کی مدرسہ کے بارہ میں ذمہ دارانہ مصروفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۱۳) حتیٰ کہ حضرتِ والا کے نام سے مدرسہ کے لئے چندہ کی اپیل بھی شائع ہوتی تھی جو روداد میں شائع شدہ موجود ہے۔ (دیکھو روداد مدرسہ دیو بند بابت ۱۲۹۳ھ ص ۳۸)

(۱۴) ۱۲۹۴ھ میں حضرت نانوتوی، مولانا محمد یعقوب صاحب اور مولانا رفیع الدین رحمہم اللہ کی حج کی روانگی کی کیفیت لکھ کر آخر میں لکھا گیا ہے:

> ''الحمد للہ کہ ماہ ربیع الاول ۱۲۹۵ھ میں حضرات ممدوح الصدر (حضرت نانوتوی، مولانا محمد یعقوب صاحب، مولانا رفیع الدین صاحب) مع الخیر والعافیت رونق افروز مدرسہ ہوئے اور خدا کا فضل اور ان حضرات کی کرامت ہے کہ ان کے زمانۂ غیبت میں اس کارخانہ میں کچھ کسی قسم کا کوئی حرج واقع نہیں ہوا۔''
>
> (روداد ۱۲۹۵ھ ص ۱)

یہ مدرسہ کے کاموں میں ان کی غیبت میں حرج واقع نہ ہونے پر شکرِ الٰہی بجالانا اس کی واضح دلیل ہے کہ یہ سب حضرات اپنے اپنے دائرہ میں ہمہ وقت کارہائے مدرسہ میں اس طرح مصروف رہتے تھے کہ ان کی غیبت میں اندیشہ تھا کہ امورِ مدرسہ میں خلل پڑ جائے، مگر خلل واقع نہ ہونے پر شکرِ الٰہی بجالایا گیا۔

(۱۵) اور آخر میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت کی ہمہ وقتی مصروفیات کو بہت ہی صریح اور واضح الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔ حضرت ممدوح بحیثیت مہتمم مدرسہ، حضرت کی وفات کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''اور جیسے مولانا رحمۃ اللہ علیہ (حضرت نانوتویؒ) مسلسل مختلف خدمات و معاونتِ دارالعلوم میں مصروف رہتے تھے ایسے ہی......'' الخ۔ (روداد مدرسہ دیو بند بابت ۱۲۹۷ھ ص ۳)

دارالعلوم کی شاخوں کا قیام بایماء حضرت نانوتویؒ

(۱۶) مدرسۂ دیو بند کی شاخوں اور فروعی مدارس میں جو بیرونِ دیو بند خود حضرت والا ہی کے

قائم فرمودہ تھے، مدرسین کو بھیجنا حضرتِ والا ہی کے امر واذن سے ہوتا تھا اور حضرت ہی کے مخصوص تلامذہ کا ان میں تقرر ہوتا تھا، چنانچہ مظفر نگر میں مدرسہ قائم فرما کر اس میں اپنے ہی تلمیذ مولانا محمد مراد صاحب پٹنی کو بھیجا اور مراد آباد میں مولانا احمد حسن صاحب کو، انبیٹھہ میں مولانا صدیق احمد صاحب کو، نگینہ میں مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی کو اور دیو بند میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کو مامور فرمایا وغیر وغیرہ۔ سوانح مخطوطہ میں اس کی کچھ تفصیلات دی گئی ہیں اور مختلف روداد ہائے مدرسہ میں بھی اس سلسلہ کے کچھ تاریخی ٹکڑے ملتے ہیں۔

گو رسمی طور پر حضرتِ والا نے مدرسہ کا کوئی عہدہ قبول نہیں فرمایا لیکن مدرسہ کے رسمی کاموں میں کوئی ایسا کام نہیں ملتا جس میں آپ کا عمل دخل نہ ہو، خواہ عہدہ داروں کا تقرر ہو یا شعبہ جات کا اضافہ، انضباطِ اصول وقواعد ہوں یا روزمرہ کی جزئیات، جیسا کہ ان ایک درجن سے زائد انواعِ کار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱۷) حتیٰ کہ حضرت والا کی تعلیمی مصروفیات کو دیکھ کر جو بطور خود تھیں ارباب مشورہ نے انہیں رسمی خدمت سپرد کر دیئے جانے اور ان پر مدرسہ سے کچھ معاوضہ لینے پر اصرار کیا مگر ہرگز قبول نہیں فرمایا۔ سوانح مخطوطہ میں ہے:

> ''اوائل میں اہل شوریٰ نے درخواست کی کہ آپ بھی اس مدرسہ کی مدرسی قبول فرمایئے اور اس کے عوض میں کسی قدر تنخواہ.......... مگر قبول نہ فرمایا اور کبھی کسی طور یا ڈھنگ سے ایک حبہ تک کے مدرسہ سے روادار نہ ہوئے۔'' (سوانح مخطوطہ ص ۱۶)

جس سے واضح ہے کہ آپ کی ہمہ وقتی اور غیر معمولی خدمت ومصروفیت اس درجہ پر تھیں کہ آپ اُس کے ہوتے ہوئے کوئی گھریلو کام یا فراہمی معاش نہیں کر سکتے تھے جو بظاہر اسبابِ گذر بسر کا ذریعہ بنتے، تو اربابِ شوریٰ نے معاوضہ قبول کرنے کی درخواست کی۔ غالباً اسی وجہ سے ذمہ دارانِ مدرسہ نے آپ کے حق میں اعلیٰ رسمی عہدوں کے القاب بے دریغ استعمال کئے ہیں جس سے خود حضرتِ والا کارہ تھے، جیسے سرپرست یا مربی یا مدبرِ امور وغیرہ، جو آپ کی ہمہ وقتی خدمات وتصرفات کی واضح دلیل ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے لئے

سرپرست، مربی اور مدبرِ مدرسہ کے القاب

(۱۸) مثلاً قیامِ مدرسہ کے بعد آپ ہی اس مدرسہ کے اولین سرپرست کہلائے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مختصر سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں:

''(حضرت نانوتویؒ) شروع مدرسہ میں دیوبند آئے پھر ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہوئے۔''
(مختصر سوانح قاسمی ص ۳۹)

سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ:

''جس قدر مدرسہ کے کارکن ہیں ماشاء اللہ بجائے خود بے نظیر ہیں، سرپرست دیکھو تو مولانا مرحوم (حضرت نانوتویؒ) جیسا باکمال، مہتمم رفیع الدین صاحب جیسا باوقار، مدرسین نور علیٰ نور، منجملہ اُن کے جناب مولانا محمد یعقوب صاحب مدرسِ اول، ہر بات میں سب اول......'' الخ۔
(سوانح مخطوطہ ضمیمہ ص ۳۴)

اس عبارت میں مدرسہ کے کارکنوں کے عنوان کے نیچے عہدوں کے القاب کے ساتھ حضرت کا ذکر کیا جانا بجائے خود اس کی واضح دلیل ہے کہ آپ محض تبرک کے درجہ میں سرپرست نہ تھے، بلکہ عملی سرپرست تھے اور مشغولِ کار ذمہ داروں میں شمار کئے جاتے تھے، البتہ موظفین وملازمین میں سے نہ تھے، بلکہ آپ کا سارا عمل حسبۃً للہ ہوتا تھا۔

(۱۹) ۱۳۱۳ھ میں مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ کے عہدۂ اہتمام پر تقرر کی تجویز کے سلسلہ میں لکھا ہے:

''اور حسبِ مقتضاءِ مصلحتِ وقت باتفاقِ رائے جملہ اہل مشورہ وصاحب سرپرست (حضرت گنگوہیؒ) مولوی حافظ احمد صاحب خلف الرشید حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ العزیز سرپرست اول مدرسہ ہٰذا مہتمم مقرر ہوئے۔'' (روداد سالانہ دارالعلوم دیوبند بابت ۱۳۱۳ھ ص ۳)

اس عبارت میں حضرتِ والا کو مدرسہ دیوبند کا اولین سرپرست کہا گیا ہے۔

بہر حال مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور صاحب سوانح مخطوطہ نے سرپرست کل اور بعد کے ذمہ دارانِ مدرسہ نے حضرت والا کو سرپرستِ اول مدرسۂ دیوبند ظاہر کیا جو بلاشبہ ایک تصرف وعمل کا منصب ہے، جس کا تجاویز کی منظوری میں مؤثر دخل رہا ہے جیسا کہ خود اسی تجویز میں حضرت گنگوہیؒ کی بحیثیت سرپرست منظوری تجویز اہتمام میں دکھائی گئی ہے۔

(۲۰) ۱۲۹۴ھ میں جب حضرتِ والا مع دیگر علماء وفضلاء کے حج کو تشریف لے گئے اور ۱۲۹۵ھ میں واپسی ہوئی تو اس میں حضرتِ والا کا تذکرہ کرتے ہوئے جناب منشی فضل حق صاحب مہتمم وقت مدرسہ دیوبند کی عبارتِ ذیل رودادِ مدرسہ میں ملتی ہے جو قابل توجہ ہے:

''حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب ادام اللہ فیوضہم مدبر ومربی مدرسہ ہذا..........'' الخ۔

(روداد مدرسہ دیوبند بابت ۱۲۹۵ھ ص ۱)

ظاہر ہے کہ سرپرست یا مربی یا مدبرِ مدرسہ کا اطلاق کسی ایسی ہی ذات پر ہوسکتا ہے جو ہمہ وقت ظاہر وباطن مدرسہ کے کاموں میں منہمک ہو اور اسی کی منشاء پر سارے کام چل رہے ہوں، نیز مہتمم اور ذمہ دارانِ کار یہ منصبی القاب اسی وقت کسی شخص کے لئے استعمال کر سکتے ہیں جسے مدرسہ میں اوپر سے لے کر نیچے تک ذمہ دار کارکن اُسے مدرسہ کا ہی نہیں بلکہ خود اپنا بھی مرجع الامور سمجھے ہوئے ہوں، اور تاسیس سے لے کر تفریعی امور تک میں اسے سربراہ اور قائد تسلیم کئے ہوئے ہوں، بلاتشبیہ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے گاندھی جی کانگریس کے چار آنے کے ممبر تک نہ تھے مگر ساری کانگریس اور سارے کانگریسی انہی کو کانگریس کا مربی ورہنما اور کرتا دھرتا اور ہیرو سمجھتے تھے۔ انہی کی پالیسی، انہی کے اصول اور انہی کی تعلیمات کو آزادئ ملک کی اساس وبنیاد قرار دیئے ہوئے تھے۔

اسی طرح حضرت نانوتویؒ مدرسۂ دیوبند کے چار پیسے کے بھی ملازم نہ تھے، نہ کوئی عہدیدار نہ منصب دار، لیکن ادارہ کے سارے حلقۂ اثر میں کرتا دھرتا اور ہیرو انہی کو سمجھا جاتا تھا۔ نہ محض خوش اعتقادی کے طور پر بلکہ ابتدائے تاسیس اور تاسیس کے بعد ان کی ہمہ وقتی خدمات اور مصروفیات کی وجہ سے، اور قدم قدم پر انہیں کی رہنمائی کی وجہ سے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے استغناء اور مزاجی وارستگی کا حاصل یہ نہیں تھا کہ تاسیس مدرسہ کے بعد انہوں نے مدرسہ سے کوئی تعلق نہیں رکھا اور وہ صرف چھتہ کی مسجد میں شخصی طور

پر صرف تعلیم وارشادات اور اشغالِ باطنی یا شخصی درس وتدریس یا تصنیف وتالیف یا تبلیغی اسفار میں وقت گزارتے تھے، نہیں! بلکہ آپ کے عزیز اوقات کا زیادہ حصہ مدرسہ کے کاموں، اس کی بہبود وفلاح اور اس کی توسیع وترقی میں صرف ہوتا تھا، گریز اگر تھا تو صرف رسمی عہدیداری یا مالیاتی انتفاع سے تھا، جسے وہ خود ہی فرما چکے تھے کہ مجھے کسی کے تابع ہو کر رہنا پسند نہیں آتا، لیکن اس کے معنی عمل کی نفی کے نہیں بلکہ عملی خود اعتمادی اور استقلال کاری کے ہیں، ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ کیا حضرتِ والا نے مدرسہ کی بنیاد اس سے بے تعلق رہنے یا اس سے گریزاں ہونے کے لئے رکھی تھی؟ نہیں! بلکہ اپنے عملی، علمی اور فکری منصوبوں کو چلانے اور آگے بڑھانے کے لئے رکھی تھی تاکہ ۱۸۵۷ء کی شکست کی تلافی ہو اور ایک جماعت ان جذبات کی حامل پیدا ہو جائے جو ۱۸۵۷ء کے مجاہدین اپنے اندر لئے ہوئے تھے، نیز یہ کہ جماعت مقامی نہ ہو بلکہ ملک گیر بلکہ اس سے بھی آگے ہو کر عالمگیر ہو، ظاہر ہے کہ اس کا ذریعہ تعلیم وتربیت ہی ہو سکتا تھا جس سے دل ودماغ کی تعمیر ہوتی ہے اور اس کا ذریعہ مدرسہ ہی ہو سکتا تھا اس لئے مدرسۂ دیو بند کی بنیاد ڈالی گئی جس سے یہ فکر شروع ہوا اور براہِ مدارس پھیلتے پھیلتے عالمگیر بن گیا جس میں علم واخلاق کے ساتھ استقلال، خود اختیاری، غناء واستغناء اور غیرت وحمیت سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتے تھے۔

چنانچہ اس جماعت نے غریبانہ زندگی کو سرمایہ دارانہ زندگی پر اور مستغنیانہ اور خود کارانہ زندگی کو امراء اور حکومتوں کی محتاجگی کی زندگی پر اور بالادستی کی زندگی کو زیردستی کی زندگی پر ترجیح دی جو حضرتِ والا کا فکر تھا، سو ظاہر ہے کہ یہ فکر مدرسہ سے ہٹ کر یا اس سے کٹ کر رہنے سے پورا نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے جس نے اس مقصد کے لئے مدرسہ قائم کیا تھا اسے مدرسہ سے بے تعلق رہنے کے بجائے سب سے زیادہ امورِ مدرسہ میں مصروف اور مشغول رہنا چاہئے تھا، اس لئے حضرتِ والا اس بارہ میں جہاں سب سے زیادہ غنی تھے وہیں سب سے زیادہ مصروف بھی تھے، اور تا انقضاءِ حیات مسلسل اور برابر مصروف رہے۔ چنانچہ یہ مصروفیت ۱۲۸۳ھ سے ہی شروع ہو گئی تھی جو مدرسہ کے آغاز کا سال ہے، حالانکہ اس وقت تک حضرتِ والا کا میرٹھ سے تعلق قائم تھا جیسا کہ رودادوں سے ظاہر ہے، لیکن سالانہ امتحانات، تقریروں میں اپیلیں، تقررات اور توسیع وترقی کے منصوبے وغیرہ اسی وقت سے

حضرت کے فکر اور رائے کے مطابق شروع ہو گئے تھے، اور پھر حضرت کے قیامِ دیوبند کے بعد تو یہ مشاغل مسلسل اور ہمہ وقتی ہو گئے جس سے حضرتِ والا کے اس فکر و نصب العین کے جو اثرات اس مدرسہ سے ہند و بیرونِ ہند میں ظاہر ہوئے سب کے سامنے ہیں اور تاریخ شاہدِ عدل ہے۔

بہر حال حضرت والا کی یہ خود کارانہ اور استقلالی شانِ عمل بھی بجائے خود ان کے بانیٔ مدرسہ ہونے کی ایک مستقل دلیل ہے کیونکہ جو شخص نہ عہدیدار ہو نہ تنخواہ دار، نہ مدرس ہو نہ ملازم، نہ ناظم ہو نہ منتظم، اور دخیل کار اس درجہ ہو کہ تمام مدرس و ملازم، ناظم و منتظم اور مہتمم غرض سارے عہدیدار اس کے خم ابرو دیکھتے ہوں اور وہ بھی محض روحانی یا اخلاقی طور پر نہیں بلکہ رسمی طور پر بھی اور پورے زور اور خود اعتمادی کے ساتھ ان کی عملی سرپرستی کرتا ہو تو یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس ذات کو نفسِ ادارہ کے حق میں چشمہ اور مصدر، اس کے کاموں کے لئے منبع اور مخزن سمجھا گیا ہو، اس سے ہی ادارہ نے جنم لیا ہو اور اس سے ادارہ کے کاموں کا آغاز ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہی معنی کسی ادارہ کی تاسیس کے ہوتے ہیں جس سے بانی کی حیثیت متشخص ہوتی ہے اور بحیثیت بانی قلوب اس کی طرف خود بخود ملتفت ہو جاتے ہیں۔ پس آپ کا بانی بلکہ سربراہ ہونا جہاں سابق میں عرض کردہ وجوہ و دلائل سے ثابت شدہ ہے وہیں مدرسہ کے کاموں میں آپ کی اس مصروفیت، مرجعیتِ عامہ اور مؤثر دخل کاری سے بھی نمایاں ہے۔

حاصلِ بحث

خلاصہ یہ ہے کہ ان تفصیلات سے بانی والی روایتوں میں مذکور شدہ افراد کے بانی ہونے کی نفی نہ کرتے ہوئے، حضرت نانوتویؒ کے بانی ہونے کی نوعیت بھی واضح ہوگئی اور ساتھ ہی حضرتِ والا کے بانی ہونے کی جامع شان بھی ہویدا ہوگئی جو مدرسہ کے قیام سے لے کر اس کے عملی کاموں کے انصرام وغیرہ تک سے نمایاں ہوتی رہی۔ شاید اسی نوعیت کے پیش نظر حضرت مولانا محمد میاں صاحب سابق ناظم جمعیۃ العلماء ہند نے، جو حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خاندانی تعلق بھی رکھتے ہیں، حاجی صاحب ممدوح کو بانیانِ مدرسہ میں شمار کرتے ہوئے حضرت نانوتویؒ کو بانیٔ اعظم

کے لقب سے یاد کیا ہے جو اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ بناءِ مدرسہ کی جو نسبتیں اور حضرات میں خاص خاص خصوصیتیں لئے ہوئے تھیں وہ حضرتِ والا میں جامعیت کے ساتھ سب جمع تھیں اور ظاہر ہے کہ جامعیت کسی نسبت کے لئے کمالِ ثبوت اور کمالِ امتیاز کا ذریعہ ہوتی ہے نہ کہ نفی اور تساوی کا۔

حضرت نانوتویؒ کی نسبت سب نسبتوں کی جامع ہے

پھر جبکہ حضرتِ والا کی نسبت ان تمام نسبتوں کی جامع ثابت ہوتی ہے جو اس احاطہ میں پھیلی ہوئی ہیں، اس لئے حضرتِ والا کے بعد اس دار العلوم کی رنگ کاری کرنے میں ایک دو شخصیتیں نہیں بلکہ ابًا عن جدٍ مختلف رنگ کی کتنی ہی شخصیتوں کا ہاتھ رہا ہے جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی استعداد و صلاحیت سے اپنے مناسبِ حال دار العلوم کے کسی نہ کسی پہلو اور نسبت کو اُبھار کر ان قاسمی نسبتوں اجاگر کیا۔ کسی نے اسے ساری مجموعی شان سے اُبھارا جیسے حضرت شیخ الہندؒ، کسی نے اس کی اجتماعی شان کو تقویت دی جیسے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی اور حضرت مولانا محمد میاں صاحب انبیٹھوی مہاجر کابل رحمہم اللہ نے، کسی نے اس کا علمی وقار بلند کیا جیسے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سرپرست رابع دار العلوم دیو بند، حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہما اللہ۔

کسی نے اس کی انتظامی اور تنظیمی شان بلند کی جیسے حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم خامس دار العلوم و حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم سادس دار العلوم رحمہما اللہ، کسی نے اس کے تقدس اور مشیخت کی شان کا بول بالا کیا جیسے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب اور حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمہما اللہ، کسی نے اس کی فنی اور استدلالی شان کو اونچا کیا جیسے حضرت مولانا غلام رسول خاں صاحب، حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب صدر المدرسین دار العلوم دیو بند، حضرت مولانا رسول خاں صاحب اور حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب شیر کوٹی رحمہم اللہ، کسی نے اس کی ادبی شان کو بڑھایا جیسے حضرت مولانا عبد الصمد صاحب نگینوی اور حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امروہوی رحمہما اللہ، کسی نے اس کے مسلک کے تحفظ اور دفاع پر تقریر و تحریر سے پورا زور صرف

کیا جیسے حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری اوران کے امثال رحمہم اللہ تعالیٰ، ان کے علاوہ اور بہت سے اساتذۂ علوم وفنون نے جن کی فہرست طولانی ہے اس کی آبیاری میں حصہ لیا جو اسی سے بنے اور اسی میں فنا ہو گئے۔

بہر حال جبکہ دار العلوم اپنی جامع نسبت کے سبب کسی ایک پہلو یا ایک نسبت کا نام نہ تھا بلکہ ان ساری نسبتوں کے مجموعے کا نام تھا، اس لئے ہر نوع کی شخصیت بھی اس نے بنائی اور پھر ہر شخصیت سے اپنے کسی نہ کسی پہلو کو روشن کرنے کا کام لیا اور اسے بڑھا کر اونچا کیا، اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ دار العلوم کی گلکاری ایک دو محدود شخصیتوں پر منتہی ہو کر ختم ہو گئی، بلکہ وہ ہمہ گیر رہی اور تا حال جاری ہے اور فرقِ مراتب کے ساتھ برابر جاری رہے گی جب تک علمِ الٰہی میں مقدر ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

خلاصہ یہ ہے کہ اس دار العلوم کے جامع مکتب فکر کے تحت اکابر واساطین دار العلوم اس کے مختلف پہلوؤں کو حسبِ تقاضائے وقت لے کر اُٹھے اور اپنے اپنے وقت میں مثالی ثابت ہوئے، اس لئے دار العلوم کی ترقیات کسی ایک دو کی نہیں بلکہ درجہ بدرجہ ان سارے بزرگوں کی رہینِ منت ہیں جن کی چند مثالیں ہزاروں میں سے بطور نمونہ عرض کی گئیں، ان میں سے جس پر جس شان کا غلبہ ہوا وہ اسی شان سے معروف اور متعارف ہوا، مگر یہاں شان چونکہ ایک آدھ نہیں بلکہ بہت سی ہیں اس لئے ان کے مجموعہ ہی کا نام "دار العلوم دیو بند" ہے، کسی ایک شان کو دار العلوم نہیں کہا جائے گا اور سب ہی شانوں کو اونچا کرنے سے اس کا اصلی مقام ظاہر ہو سکتا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے بانی ہونے کی جامع نوعیت

میرے خیال میں یہ چند سطریں حضرت نانوتوی قدس سرہ العزیز کے بانیٔ دار العلوم دیو بند ہونے کی جامع نوعیت کیلئے کافی ہیں جس کے تحت وہ بانیٔ دار العلوم دیو بند کے لقب سے مشہور ہوئے اور جب بھی دار العلوم کا ذکر آتا ہے تو تنہا انہی کو بانی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، جس میں نہ دوسرے حضرات کے بانی ہونے کی نفی شامل ہے، نہ بانیوں سے متعلقہ روایات سے کسی کا انکار۔

بہر حال ان تمام متضاد روایتوں کی تطبیق وجمع کا نچوڑ جس سے تمام متضاد روایتیں جمع ہو کر اپنے

اپنے محل پر چسپاں ہو جاتی ہیں، ہر روایت کا واقعی مقام اُسے مل جاتا ہے اور ہر ایک کا محمل متعین ہو کر مجموعہ سے جامع حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ امید ہے کہ ان سطور سے اُن حضرات کے خلجانات رفع ہو جائیں گے جو ایک کو بانی کہہ کر دوسرے کے بانی ہونے کی نفی کو تاریخ سمجھے ہوئے ہیں۔
والحمد للّٰہ الذی بنعمته تتم الصالحات۔

محمد طیب
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۱۵/ربیع الثانی ۱۳۸۵ھ

سلسلہ تالیفات وافاداتِ حکیم الاسلامؒ
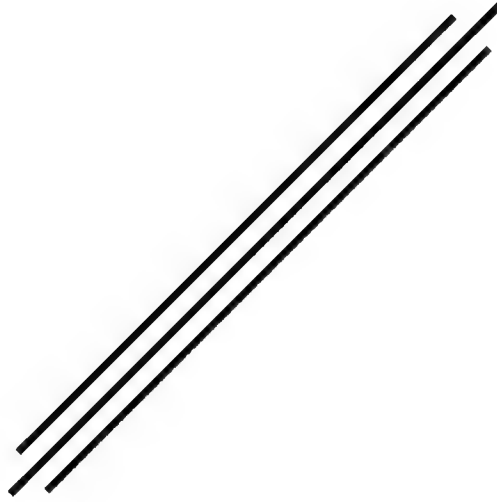
دار العلوم دیوبند

ایک نظر میں

• •

دارالعلوم دیوبند ایک نظر میں

کائناتِ انسانی کے لئے اسلام میں ایک مکمل ضابطۂ حیات اور دستورِ زندگی ہے، زندگی کا کوئی گوشہ اور حصہ ایسا نہیں ہے جس کے لئے اس میں منضبط اور مرتب ہدایات نہ ہوں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں دنیا کی صلاح وفلاح کے لئے بہت سارے لازوال چشمے بہائے وہیں آپ نے مسلمانوں کی تعلیم وتربیت اور سیرت سازی پر بھی خصوصی توجہ دی تاکہ دنیا امن وسلامتی اور صلح وآشتی کا گہوارہ باقی رہے، اور انسان جامۂ انسانیت کو تار تار کرنے کا گناہ مول نہ لے۔

اسلام میں تعلیم کی اہمیت

جن لوگوں کی اسلامی نظامِ زندگی پر گہری اور وسیع نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کی بسم اللہ ہی تعلیم وتعلّم، درس وتدریس اور کتاب وقلم سے ہوئی ہے۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی یہ نازل ہوئی:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ○ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ. (علق)

اپنے رب کے نام سے پڑھو، جو سب کا بنانے والا ہے، اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے بنایا، پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم سے علم سکھایا، سکھلایا آدمی کو جو وہ نہیں جانتا تھا۔

ابتدا میں جب خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا، تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو اپنے سینہ سے بار بار لگایا، جس سے آپ کا سینہ مبارک کھل گیا اور زبان مبارک پر یہ آیتیں جاری ہوگئیں۔

یہ پہلی وحی الٰہی اشارہ تھی کہ دنیا ظلمت وضلالت کی وادی سے نکل کر اس وقت تک شاہراہِ ہدایت ونور پر نہیں آسکتی جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ لکھنا پڑھنا نہ شروع کردے، اور

تعلیم وتربیت، درس وتدریس اور کتاب وقلم کے ساتھ وابستہ نہ ہوجائے، کیونکہ اس کی کامیابی کا راز کتاب وقلم اور تعلیم وتعلّم میں ہی مضمر ہے۔

جس دین میں تعلیم وتربیت کی یہ شان ہو، اور تحصیل علم کے لئے جبر واکراہ تک کی اجازت دی گئی ہو، اس دین قیم میں علم وفن کی اشاعت، کتاب وسنت کی تعلیم وترویج اور اخلاق واعمال کی پاکیزگی پر کس قدر ابھارا گیا ہوگا، اور اس دین پر ایمان لانے والوں میں عمل کا کیسا جذبہ وولولہ ہوگا، اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

قرآن پاک اور حدیث نبویؐ میں تعلیم وتربیت کی بڑی اہمیت وفضیلت آئی ہے اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہر دور میں علم وفن اور کتاب وسنت کی تعلیم واشاعت پر اپنے ذہن وفکر اور مالی سرمایہ کا ایک بڑا حصہ خرچ کیا اور تعلیم وتربیت کے بے شمار ادارے قائم کئے، جہاں رہ کر ہزاروں لاکھوں افراد نے علم وعمل کی دولت حاصل کی اور اپنے ملک اور اپنی ملت کیلئے باعث صد افتخار بنے۔

مسلمانوں کی خدمتِ تعلیم کا اعتراف

مسلمانوں کی اس خدمت کا اعتراف غیروں نے بھی کیا ہے اور ساتھ ہی مدح وستائش کی ہے۔ مشہور فرانسیسی منصف ڈاکٹر لیبان لکھتا ہے کہ:

''شہروں میں تعلیم وتربیت کے مرکز قائم کئے، تمام زبانوں کی کتابوں کو عربی زبان میں بدلا، پھر زبان سیکھی اور ہر علم کے امام بن گئے اور اس کو ترقی دی۔'' (تمدنِ عرب: ص ۳۹۷)

یہ بھی لکھا ہے کہ:

''عام تعلیمی مدارس کے علاوہ بغداد، قاہرہ، طلیلہ، قرطبہ وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں علمی تحقیقات کے کارخانے، رسد خانے، عظیم الشان کتب خانے، غرض کل مسالہ علمی تحقیقات کا موجود تھا۔''

(تمدنِ عرب: ص ۳۹۹)

مسلمانوں کے ذوقِ تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں رقمطراز ہے:

''عربوں نے جو مستعدی تحصیل علم میں ظاہر کی وہ فی الواقع حیرت انگیز ہے، جب وہ کسی شہر کو لیتے تو ان کا پہلا کام وہاں مسجد اور مدرسہ بنانا ہوا کرتا تھا۔'' (ایضاً)

خود اس ملک ہندوستان میں جب مسلمانوں کے قدم آئے تو ان کے ساتھ علم وعمل، عدل ومساوات اور رواداری وفیاضی بھی ساتھ آئی، جہاں اس ملک کو بہت کچھ انہوں نے عطا کیا وہاں علم وفن اور تعلیمی اداروں کی بھی کمی نہیں رکھی، خود انگریزوں نے لکھا ہے کہ حکومتِ برطانیہ سے پہلے صرف بنگال میں اسّی ہزار دیسی مدارس تھے۔ ایک انگریز مصنف لکھتا ہے کہ:

''ہندوستان اسکولوں سے بھرا ہوا ہے، وہاں ہر اکتیس لڑکوں پر ایک اسکول ہے۔''

سندھ کے متعلق مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ:

''وہاں مختلف علوم وفنون کے چار سو کالج تھے۔''

ہندوستان کا کوئی شہر اور صوبہ متعدد تعلیمی اداروں سے خالی نہیں تھا ہر جگہ درسگاہیں قائم تھیں جہاں بچے اور جوان تعلیم میں منہمک ہوتے تھے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے تعلیمی ہند)

برصغیر انقلاب کی زد میں

لیکن ہندوپاک اور بنگلہ دیش پر ایک ایسا وقت آیا کہ یہاں سے دینی درسگاہیں اسلامی مدارس ومراکز کا نام ونشان تک مٹ گیا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے بہت پہلے ۱۷۱۷ء میں شاہ فرخ سیر نے انگریزوں کو تجارت کی اجازت دیدی اور ان کی تجارت کو مخصوص ٹیکسوں اور چنگیوں سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ پھر ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم ثانی نے اکیس لاکھ سالانہ معاوضہ لے کر بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی ان کے حوالہ کردی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۰۲ء میں لارڈ لیک نے دہلی پر حملہ کر کے اور شاہ عالم ثانی کو گرفتار کر کے یہ معاہدہ لکھالیا کہ:

''شاہ عالم کی حکومت شہر، قلعہ اور اطرافِ دہلی قطب مینار تک محدود رہے گی اور بقیہ ملک پر انگریزوں کا تسلط رہے گا اور اب مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت بادشاہ سلامت کی جگہ کمپنی کے ذمہ ہوگی۔''

علماء کا احساسِ ذمہ داری

انہیں حالات سے متاثر ہو کر خاندانِ ولی اللّٰہی کے چشم وچراغ سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (م ۱۲۳۹ھ) نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا اور اعلان کیا

کہ مسلمانوں کے امام کا حکم قطعاً جاری نہیں ہے بلکہ عیسائی سرداروں کی حکمرانی ہے اور اس شہر دہلی سے کلکتہ تک نصاریٰ کی حکومت قائم ہے۔

اور یہ ہی حالات تھے کہ آپ کے فیض یافتہ حضرت سید احمد بریلویؒ شہید (م ۱۲۴۶ھ) اور آپ کے برادرزادہ حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہید (م ۱۲۴۶ھ) نے مجاہدین کی ایک منظّم جماعت کے ساتھ برصغیر میں عدل ومساوات کی اسلامی حکومت قائم کرنے کی بھرپور جدوجہد کی اور اس راستہ میں جامِ شہادت نوش کیا۔

اس کے بعد بھی خاندانِ ولی اللّٰہی کے ایک نیرِ تاباں حضرت مولانا محمد اسحاق محدث دہلوی (م ۱۲۶۲ھ) اپنے نانا جان شاہ عبدالعزیزؒ کی اس مسندِ درس وتدریس اور تعلیم وتعلّم کو آباد کئے رہے، جسے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) کے پدرِ بزرگوار حضرات شاہ عبدالرحیم (م ۱۱۳۱ھ) نے دہلی میں بچھائی تھی، اور جس کے غلغلہ سے پورا برصغیر پُر شور تھا، مگر حالات سے مایوس ہوکر وہ بھی ۱۲۵۸ھ میں راہِ ہجرت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے اور ہندوستان سے نکل کر حجازِ مقدس میں پناہ لی۔

آپ کے بعد قال اللہ اور قال الرسول کا آوازہ مجددی خاندان کے چشم وچراغ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددی (م ۱۲۹۶ھ) سے قائم تھا، اور آپ سے علم وعمل کے چشمے پھوٹ پھوٹ کر ملک کو سیراب کررہے تھے، مگر انقلابِ زمانہ نے اس محدث کو بھی یہاں چین سے بیٹھنے نہ دیا اور ۱۲۷۶ھ میں آپ نے بھی یہاں سے ہجرت فرماکر حجازِ مقدس کی راہ لی، اس کا انجام یہ ہوا کہ برصغیر حدیث نبوی اور دینی تعلیمات کی اشاعت وترویج سے محروم سا ہوگیا۔

انگریزوں کا مکمل تسلط

بالآخر اس پرآشوب دور کا شباب ۱۸۵۷ء (۱۲۷۵ھ) پر مکمل ہوگیا، اور پورے ملک پر انگریزوں کی حکمرانی قائم ہوگئی۔ مسلمانوں کا دہلی میں قتل عام ہوا، اور دہلی لاشوں سے پٹ گئی، علماء بے دریغ تہِ تیغ کئے گئے، پھانسیوں پر بے دردی سے لٹکائے گئے، جو بچ بچا گئے تھے ان کو گرفتار کرکے جزیرہ انڈمان میں قید کردیا گیا، پھر اس کے بعد ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی، اوقاف ومعافیات جن

سے مدارس چلتے تھے، نئی حکومت نے اپنے قبضہ میں کرلیا، ڈبلوڈبلو ہنٹر نے لکھا ہے کہ:

''ہم نے ان کے طریق تعلیم کو بھی اس سرمایہ سے محروم کردیا جس پر اس کی بقا کا دارومدار تھا، اس سے مسلمانوں کا تعلیمی نظام اور ان کے تعلیمی ادارے یک قلم مٹ گئے۔''

تفصیل ملاحظہ کرنا ہو تو اس کے لئے ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' کا بغور مطالعہ کریں، پھر اندازہ ہوگا کہ اس ملک میں مسلمانوں کا کیا حال ہوگیا تھا۔

عیسائیت کا پرچار

انگریزوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حکومت کے قدم جمتے ہی عیسائیت کی تبلیغ شروع کی اور وہ بھی اس طرح کہ:

''دیسی پادریوں کے علاوہ جن کا کوئی شمار نہیں صرف نوسو ولایتی پادری تھے جو تندہی کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف تھے، اس کے علاوہ ایک مکتی فوج تھی جس کے اسّی دستے ان کی پشت پناہی اور امداد کرتے تھے اور ان کے کام میں ہاتھ بٹاتے تھے۔'' (سیرت مولانا محمد علی مونگیری ص ۴۶)

برطانوی پارلیمنٹ کے ایک رکن نے ۱۸۵۷ء کے بعد ایوان میں تقریر کی:

''خداوند تعالیٰ نے یہ دن ہمیں اس لئے دکھایا ہے......تا کہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرادے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت ہندوستان کے عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہئے اور اس میں کسی طرح تساہل نہیں ہونا چاہئے۔''

دارالعلوم کا قیام

یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ وقت بڑا ہی صبر آزما تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جو چند علمائے ربانیّین اور مشائخ عظام انگریزوں کی گرفت سے بچ گئے تھے اور جو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے حالات نے ان کو جھنجھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب میں آزاد مدارسِ دینیہ کے قیام کی اسکیم ڈال دی، تا کہ ان کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کے بقاء وتحفظ اور کتاب وسنت کی اشاعت وترویج کا سلسلہ جاری ہوسکے۔

چنانچہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (م ۱۲۹۷ھ) اور آپ کے رفقائے کار نے باہم مشورہ سے ''مدرسہ اسلامی عربی'' کے نام سے دیوبند میں ۱۵/محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰/مئی ۱۸۶۶ء کو ایک عربی مدرسہ کی داغ بیل ڈال دی۔ یہ اس دورِ پرفتن کا سب سے پہلا دینی مدرسہ تھا جو بہت جلد ام المدارس جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند کے نام سے پوری دنیائے علم میں مشہور ومقبول ہوگیا، اور بین الاقوامی حیثیت کا مالک بن گیا۔ پھر اس کے بعد مظاہر العلوم سہارنپور، منبع العلوم گلاؤٹھی، جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد اور دوسرے مدارس قائم ہوئے، آج بحمد اللہ ہزاروں کی تعداد میں برصغیر کے مختلف صوبوں اور اضلاع میں قائم ہیں اور دینی تعلیم کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند نے اپنے مخلص بانیوں کے صدقہ میں ملک وملت اور دین ومذہب کی بڑی اہم خدمتیں انجام دی ہیں، یہ واضح رہے کہ دارالعلوم صرف ایک تعلیمی درسگاہ نہیں بلکہ ایک تحریک ہے، جہاں علم کی دولت کے ساتھ عملِ صالح اور اخلاقِ فاضلہ کی روح طلبہ میں پیوست کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔

دارالعلوم کا امتیاز

بانئ دارالعلوم دیوبند حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے اپنے قلم فیض رقم سے جو اصولِ ہشتگانہ تحریر فرمائے ہیں ان میں یہ بھی صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ:

(۱) اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں اس وقت تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلتا رہے گا، اور اگر کوئی آمدنی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانۂ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ، تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجاء جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہوجائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی رہے۔

(۲) سرکاری شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔ (دیکھئے صد سالہ تاریخ)

بانیوں کے خلوص وللّٰہیت کا نتیجہ یہ ہے کہ دارالعلوم کے فضلاء اور اس کے فرزندوں نے یہاں

سے نکل کر دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں چھوڑا جہاں ان میں سے کوئی نہ کوئی نہ پہنچا ہو، اور اس نے وہاں ایمان واسلام کی شمع روشن نہ کی ہو، عقاید کی پختگی، معاملات کی صفائی اور اعمال واخلاق کی بلندی ان کا خاص مشن ہے۔

دارالعلوم کے اربابِ بست وکشاد نے بانی کی وصیت پر پورا پورا عمل کیا اور کبھی حکومت کی امداد قبول نہیں کی اور رجوع الی اللہ کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا، یہی ذوق کم وبیش اس ادارہ کے فرزندوں میں بھی رہا اور انہوں نے بھی کبھی حکومت کے در پر جبہ سائی کو پسند نہیں کیا، بلکہ غیر ملکی حکومت کے خلاف صف آرا ہو کر اس وقت تک جنگ کرتے رہے جب تک وہ ختم نہ ہوگئی اور ملک آزاد نہ ہوگیا۔

دارالعلوم کا نصاب

دارالعلوم دیوبند کا نصاب خالص مذہبی اور دینی تجویز کیا گیا، اس کی وجہ خود بانی کی زبان سے سنئے، فرماتے ہیں:

''در بابِ تحصیل یہ طریقۂ خاص تجویز کیا گیا اور علومِ جدیدہ کو کیوں شامل نہ کیا گیا، منجملہ دیگر اسباب بڑا سبب اس بات کا ایک تو یہ ہے کہ تربیت عام ہو یا خاص اس پہلو کا لحاظ چاہئے جس طرف سے ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو۔ سواہلِ عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علومِ جدیدہ تو بوجہ کثرتِ مدارسِ سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علومِ قدیمہ کو سلاطین زمانہ سابق میں بھی ترقی نہیں ہوئی ہوگی، ہاں علومِ نقلیہ کا تنزل ہوا کہ ایسا تنزل بھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا ہوگا، ایسے وقت میں رعایا کو مدارسِ علومِ جدیدہ کا بنانا تحصیل لاحاصل نظر آیا۔ دوسرے یہ کہ زمانہ واحد میں علومِ کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعثِ نقصانِ استعداد ہوتی ہے۔''

تحصیل علومِ جدیدہ کی ترغیب

لیکن آپ نے یہ بھی مشورہ دیا کہ یہاں سے فراغت کے بعد علومِ جدیدہ حاصل کرنے کی سعی کی جائے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''اس کے بعد طلبۂ مدرسہ ہذا کو مدارسِ سرکاری میں جا کر علومِ جدیدہ میں کمال پیدا کرنے کی سعی

جاری رکھنی چاہئے۔'' (روداد ۱۲۹۰ھ)

بعد میں دارالعلوم دیوبند کے نصابِ تعلیم میں بقدرِ ضرورت علومِ جدیدہ کا بھی اضافہ کیا گیا، تاکہ یہ اس طرف سے بالکل ناآشنا نہ ہوں، لیکن زیادہ توجہ اور محنت علوم دینیہ پر کی گئی جو دارالعلوم کا خاص موضوع ہے اور جو موجودہ دور میں توجہ کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔

دارالعلوم کی دینی خدمات کا اعتراف

اس میں قطعاً شبہ نہیں ہے کہ دارالعلوم دیوبند نے اپنے موضوعِ اصلی پر جو خدمت انجام دی ہیں وہ اس قابل ہیں کہ اس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ پاکستان کے ایک علمی رسالہ میں ایک صاحب نے لکھا تھا جو علومِ جدیدہ کے دلدادہ ہیں:

''متذکرہ بالا جدید مذہبی عقلیت کے مقابلہ میں نقل کی دفاع کا سب سے بڑا مرکز دیوبند بنا، جس نے قال اللہ وقال الرسول کے حصار میں محصور ہو کر مذہب کا تحفظ کیا۔''

ہم پہلے بھی یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں کہ دیوبند ایک درس گاہ نہیں ایک عظیم تحریک بھی ہے، جس نے اس دور میں مؤثر رول ادا کیا اور جس سے متعدد علمی وعملی سوتے پھوٹے، چنانچہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے بعد شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مجاہد حریت مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مبلغ ملت مولانا محمد الیاسؒ اور اس کے تمام علمی وروحانی، مذہبی وسیاسی اور دعوتی وتبلیغی سلسلوں کا اصل منبع دیوبند ہی ہے، حتیٰ کہ اوپر کی مثال کے مطابق حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی اکثر دینی درسگاہوں، دینی ومذہبی تحریکوں کا تعلق بھی دیوبند کے ساتھ وہی ہے جو دنیا بھر کی مساجد کا خانہ کعبہ کے ساتھ ہے۔'' (میثاق لاہور)

مولانا محمد الحسنی نے لکھا ہے:

''اس حقیقت سے کوئی ہوشمند اور منصف انسان انکار نہیں کر سکتا کہ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے اور اس کو بدعت، تحریف اور تاویل سے محفوظ رکھا ہے، اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام وبقاء اور استحکام میں بیش قیمت مدد ملی ہے اور آج جو صحیح اسلامی عقاید، دینی علوم، اہل دین کی وقعت اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے

اس میں بلاشبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے۔“(پیامِ ندوہ)

یہ واقعہ ہے کہ اگر ۱۸۵۷ء کے بعد دارالعلوم دیوبند کی تحریک نہ ہوتی تو شاید برصغیر میں اسلام کی صورت یا تو مسخ ومحرف ہو چکی ہوتی اور یا اس کا نام ونشان مٹ چکا ہوتا۔ جس طرح دارالعلوم نے برصغیر کو متاثر کیا اسی طرح بیرونی دنیا کو بھی اسلام پر باقی رکھنے کے لئے اس نے بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں۔

ان چند کلمات کے بعد دارالعلوم کے نظم وانتظام اور خدمات پر ایک نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔

دارالعلوم کی مجالس

دارالعلوم میں تین ذمہ دار مجالس ہیں:

(۱) مجلس شوریٰ (۲) مجلس عاملہ (۳) مجلس علمیہ

(۱) مجلس شوریٰ

یہ مجلس دارالعلوم کی سب سے بڑی بااختیار مجلس ہے۔ دارالعلوم کا تمام نظم ونسق اسی جماعت کے ہاتھ میں ہے، اس کی جملہ تجاویز دربارہ انتظام وتعلیم قطعی اور جملہ کارکنانِ دارالعلوم کے لئے واجب التعمیل ہوتی ہیں۔ اس مجلس کے کل ارکان کی تعداد اکیس ہے جس میں کم ازکم گیارہ علماء کا ہونا ضروری اور لازمی ہے، باقی ارکان مسلمانوں کے دیگر طبقات سے منتخب ہو سکتے ہیں، مگر حتی الامکان دو ممبر باشندگانِ دیوبند سے لئے جاتے ہیں، مہتمم اور صدر مدرس بحیثیت عہدہ مجلس شوریٰ کے رکن رہتے ہیں۔ اس مجلس کے سال میں دو جلسے ہوتے ہیں ایک محرم میں دوسرا رجب میں، اس مجلس کا کورم سات ہوتا ہے۔

(۲) مجلس عاملہ

یہ مجلس مجلس شوریٰ کے ماتحت ایک مستقل مجلس ہے جو مجلس شوریٰ کے فیصلوں اور منظور کردہ تجاویز کے عمل درآمد کے سلسلہ میں ذمہ داروں کے طریق عمل پر نظر رکھتی ہے، نظم وتعلیم اور دفاتر کے

حسابات کی اور کارکردگی کی نگرانی اس کے ذمہ ہے۔ اس مجلس کے ارکان کی تعداد نو ہے، مہتمم اور صدر مدرس باعتبار عہدہ اس کے مستقل رکن ہوتے ہیں، اس مجلس کا انتخاب سالانہ ہوتا ہے، مجلس عاملہ کے سال بھر میں چار جلسے ہوتے ہیں، پہلا ربیع الاول میں دوسرا جمادی الاول میں تیسرا شعبان میں اور چوتھا ذی قعدہ میں، مجلس عاملہ کا کورم پانچ ہے۔

(۳) مجلس علمیہ

تمام درجات عربی فارسی، اردو، دینیات اور تجوید وغیرہ کے تعلیمی کاموں میں صدرالمدرسین کو مشورہ دینے کے لئے ایک مجلس ہے جس کا نام مجلس علمیہ ہے، اس کے ممبران میں صدرالمدرسین، مہتمم دارالعلوم اور اساتذۂ طبقہ اعلیٰ شامل ہیں۔

دارالعلوم کا دفاع عن الدین

دارالعلوم کی جماعت اپنے مسلک کی ہمہ گیری کی وجہ سے ہر فتنہ کی مدافعت کے لئے سینہ سپر رہی، خواہ وہ فتنہ نقل وروایت کی راہوں سے آیا یا عقلیت پسندی کی بنیادوں سے اٹھا، اس جماعت نے ہر دور میں اعلائے کلمۃ اللہ اور امر بالمعروف کا فرض ادا کیا، اور اسی اسلوب اور اسی رنگ میں جس رنگ ڈھنگ میں کسی دینی فتنہ نے سر اٹھایا۔ متصوفین بے تصوف کی جانب سے بدعات محدثات اور شرکیہ حرکات کا فتنہ روایتی انداز میں ابھرا تو اس نے روایتی ہی طور پر مقابلہ کیا، اور فتنہ کی بے سروپا اور بے سند روایتوں کی قلعی کھول کر شریعت وطریقت کی مستند نقول سے اس کا استیصال کیا اور مقابلے میں نقل وروایات کا ایک بڑا ذخیرہ پیش کر دیا۔

مدعیانِ عقل واجتہاد کی طرف سے آزادیٔ فکر، عدمِ اتباعِ سلف اور نیچریت کا فتنہ عقلِ محض کا سہارا لے کر دین میں داخل ہونے لگا تو اس نے عقلی دلائل پیش کر کے کامیاب مدافعت کی اور جس کے لئے حضرت بانیٔ دارالعلوم قدس سرہٗ نے ایک مستقل حکمت ہی مدوّن فرمادی جس کے سامنے فلسفہ کسی بھی روپ میں آیا تو اس نے فلسفہ کے اندازِ قد کو پہچان کر اس کے راستے روک دیئے۔ غرض بدعت پسندی، ہوا پرستی، دہریت نوازی، بے قیدی، مطلق العنانی اور آزادیٔ افکار کی جڑیں دارالعلوم

نے کھو کھلی کر کے رکھ دیں اور عقل ونقل، روایت ودرایت اور حکمتِ دین کی جڑیں مضبوط کر دیں۔

فضلائے دارالعلوم

دارالعلوم نے اس نوعیت کے افراد پیدا کئے جنہوں نے تعلیم، تزکیۂ اخلاق، تصنیف، افتاء، مناظرہ، صحافت، خطابت وتذکیر، تبلیغ، حکمت اور طب وغیرہ میں بیش بہا خدمات انجام دیں، ان افراد نے کسی مخصوص خطہ میں نہیں بلکہ برصغیر کے ہر ہر گوشہ اور بیرونِ ممالک کے ہر ہر حصہ میں قابل قدر کارنامے انجام دیئے۔ ۱۳۸۳ھ تک ایک سو سترہ سال کی مدت میں اگر دارالعلوم کی ان خدمات کا جائزہ لیا جائے جو اس نے برصغیر اور دوسرے ممالک میں انجام دی ہیں تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے ہر ہر حصہ میں اس نے اپنے ایسے فرزندانِ رشید پہنچائے جو اس حصہ میں آفتاب وماہتاب بن کر چمکے اور مخلوقِ خدا کو ظلمتِ جہل سے نکال کر انہوں نے نورِ علم سے مالا مال کر دیا۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے فضلائے دارالعلوم کی صوبہ وار فہرست ۱۲۸۳ھ تا ۱۳۹۸ھ درج ذیل ہے:

ہندوستان

نمبر شمار	نام صوبہ	تعداد فضلاء	نمبر شمار	نام صوبہ	تعداد فضلاء
۱	یوپی	۵۴۹۹	۲	مغربی بنگال	۶۰۳
۳	آسام ومنی پور	۸۱۳	۴	بہار واڑیسہ	۲۶۱۶
۵	مدراس	۱۲۰	۶	ٹرانکور	۴
۷	کیرالہ	۳۹۰	۸	آندھرا	۱۸۵
۹	میسور	۵۲	۱۰	مدھیہ پردیش	۸۱

نمبر شمار	نام	تعداد فضلاء	نمبر شمار	نام	تعداد فضلاء
۱۱	مشرقی پنجاب وہریانہ	۴۴۰	۱۲	دہلی	۳۱
۱۳	مہاراشٹر	۲۰۰	۱۴	گجرات	۴۱۱
۱۵	راجستھان	۱۴۲	۱۶	جموں کشمیر	۲۷۴
				میزان کل فضلائے ہندوستان	۱۱۸۶۱

فضلائے ہندو پاکستان و بنگلہ دیش و برما

نمبر شمار	نام ملک	تعداد فضلاء	نمبر شمار	نام ملک	تعداد فضلاء
۱	مغربی پاکستان	۱۵۲۰	۲	برما	۱۴۹
۳	بنگلہ دیش	۱۶۹۰	۴	ہندوستان	۱۱۸۶۱
				میزان کل فضلاء	۱۵۲۲۰

ان فضلائے دار العلوم نے اپنے اپنے وقت میں اپنے اپنے رنگ سے دین کے کسی نہ کسی شعبہ میں شخصی یا اجتماعی حیثیت سے کام کیا اور کررہے ہیں۔

دار العلوم کے فیوض برِ صغیر سے باہر

پھر دار العلوم نے اپنے علمی فیوض سے صرف ہندو پاک اور بنگلہ دیش و برما ہی کو بہرہ اندوز نہیں کیا بلکہ ایشیاء اور افریقہ کے اسلامی ممالک بھی اس کی ضیا پاشیوں سے جگمگا اٹھے، چنانچہ غیر ملکی فضلاء کی فہرست از ۱۲۸۳ھ تا ۱۳۹۸ھ یہ ہے۔

تعداد فضلائے دارالعلوم بیرونِ برصغیر

نمبر شمار	نام ملک	تعداد فضلاء	نمبر شمار	نام ملک	تعداد فضلاء
۱	ملیشیا	۳۵۸	۲	چین	۴۴
۳	سائبیریا	۱	۴	افریقہ	۶۷
۵	عراق	۲	۶	ایران	۱۳
۷	کویت	۲	۸	نیپال	۲۱
۹	سعودی عرب	۲	۱۰	تھائی لینڈ	۴
۱۱	سیام	۱	۱۲	کمبوڈیا	۱
۱۳	یمن	۱	۱۴	ری یونین	۱
۱۵	افغانستان	۱۰۹	۱۶	انڈونیشیا	۲
۱۷	روس	۶۹			

بیرونِ برصغیر کے فضلاء کی تعداد	۶۹۸
برصغیر کے فضلاء کی تعداد	۱۵۲۲۰
مجموعی تعداد	۱۵۹۱۸

یہ تعداد ان طلبہ کی ہے جنہوں نے باضابطہ دورۂ حدیث میں داخلہ لے کر سندِ فراغت حاصل کی، حفاظ، مجوّدین، فضلائے فارسی، فارغین درجہ دینیات اردو، فارغین درجہ خوش خطی، فارغین دارالافتاء، فارغین جامعہ طبیہ ان کے علاوہ ہیں۔

میزان بیرونی ممالک	۸۵۱
میزان ہندوپاک	۱۵۰۷۱
ہندوپاک اور بیرونی ممالک کے فضلاء کی مجموعی تعداد	۱۵۹۲۲

فضلائے کرام کے علاوہ وہ طلباء جنہوں نے دارالعلوم سے درجاتِ حفظِ قرآن، تجوید، فارسی کی اعلیٰ تعلیم، ناظرہ قرآن، اردو دینیات میں داخلہ لیکر استفادہ کیا، ان کی تعداد ۷۷۶۴۶ ہے۔

میزان کل ۹۳۶۶۸

دارالعلوم کا حصہ تصانیف میں

دارالعلوم کا مسلک اور مخصوص رنگ علمائے دارالعلوم کی تصانیف میں صاف نمایاں رہا، ہمیشہ بروقت اور برمحل تصانیف اس ادارہ سے نکلتی رہیں۔ دارالعلوم نے ایک سوستره سال کے عرصہ میں ہزاروں مصنّفین پیدا کئے، چند مشہور مصنّفین کی فہرست درجِ ذیل ہے۔

نام مصنف

۱ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانئ دارالعلوم دیوبند

۲ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سرپرست سابق دارالعلوم دیوبند

۳ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ

۴ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبہٹویؒ

۵ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

۶ حضرت مولانا رحیم اللہ صاحب بجنوریؒ

۷ حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ

۸ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ

۹ حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوریؒ

۱۰ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ

۱۱ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ

۱۲ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ

۱۳ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ

۱۴ حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ

۱۵ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ

۱۶ حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانیؒ

۱۷ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ

۱۸ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ

۱۹ حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنیؒ

۲۰ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ

۲۱ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ

۲۲ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن محدث اعظمی مدظلہ

۲۳ حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہ

۲۴ ڈاکٹر مولانا محمد مصطفٰے احسن علوی مدظلہ

۲۵ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ

۲۶ حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی مدظلہ

۲۷ حضرت مولانا عبدالصمد صاحب صارم سہاروی مدظلہ

۲۸ حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب مدظلہ

۲۹ احقر محمد طیب

ان میں سب سے زیادہ کتابیں حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی ہیں جن کی تعداد نوسو سے زیادہ ہے۔

دارالعلوم کے اسلاف

دارالعلوم دیوبند کے اسلاف میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ سے لے کر حضرت نانوتوی قدس سرہ تک کے سارے بزرگ شمار ہوتے ہیں کیونکہ ”مسلکاً اور روایۃً“ دارالعلوم دیوبند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ کی جانب منسوب ہے اور سلوک میں حضرت حاجی امداد اللہ

صاحب قدس سرہ' کا سلسلہ اکابر دارالعلوم میں جاری وساری ہوا، چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ' اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ' یہ دونوں بزرگ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ' کے اجل خلفاء میں سے تھے، اور خود حاجی صاحب قدس سرہ' دارالعلوم کے اسلاف میں سے ہیں، دارالعلوم کے قیام اور اس کی ترقی میں حضرت کے مشورے اور حوصلہ افزائی کا بڑا حصہ ہے۔

ان کے علاوہ دارالعلوم کے اسلاف میں وہ حضرات بھی ہیں جنہوں نے دارالعلوم کی رسمی یا معنوی سرپرستی فرمائی، مثلاً حضرت مولانا احمد علی صاحب قدس سرہ' محدث سہارنپوری جن کا دخل دارالعلوم کے معاملات سے رہا اور ان کی مبارک رایوں کو اہمیت حاصل رہی۔ چنانچہ تعمیر مدرسہ اور عمارتی سنگ بنیاد کے سلسلے میں حضرت نانوتوی قدس سرہ' کا ذوق تو یہ تھا کہ مدرسہ کی عمارات خام ہوں، گھاس پھونس پر بیٹھ کر طلبا تعلیم پائیں تا کہ زہد وقناعت، سادگی اور صبر وتوکل کی شان ان میں نمایاں رہے۔ لیکن دوسرے اہل الرائے حضرات کی رائے یہ تھی کہ دارالعلوم کی عمارات پختہ اور مستحکم بنوائی جائیں تا کہ مدرسہ اپنی صورت کے لحاظ سے بھی نمایاں رہے، لیکن اس بارہ میں جب کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ' کی رائے متاثر نہ ہوئی تو آخر کار حضرت مولانا احمد علی صاحب قدس سرہ' سے حضرت نانوتوی قدس سرہ' پر اثر ڈلوایا گیا اور آپ نے حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے بعد اپنی رائے تبدیل فرمادی اور مدرسہ کی پختہ عمارت کا سنگِ بنیاد رکھ دیا گیا۔

اسی طرح حضرت مولانا قاضی محمد اسماعیل صاحب منگلوری رحمۃ اللہ علیہ، جو صاحبِ سلسلہ اور نہایت پایہ کے بزرگوں میں سے تھے، دارالعلوم کے قیام کے سلسلے میں ان کے مکاشفات بھی تھے، جن کا ظہور قیامِ دارالعلوم کی صورت میں ہوا، اس لئے آپ بھی اسلافِ دارالعلوم ہی میں شمار کئے جاتے ہیں۔

دارالعلوم کے اعلیٰ مناصب

دارالعلوم میں اعلیٰ ذمہ دارانہ عہدے چار رہے ہیں:

(۱) سرپرستی (۲) اہتمام (۳) صدارتِ تدریس (۴) افتاء

ان چاروں عہدوں کے لئے ہمیشہ ایسی ممتاز شخصیتوں کا انتخاب عمل میں آتا رہا ہے جو اہل اللہ، اہل دین واہل تقویٰ اور جامع شریعت وطریقت ہوا کرتے تھے۔

دارالعلوم کے سرپرست

دارالعلوم کے سب سے پہلے سرپرست بانیٔ دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ العزیز تھے، جن کا پرامن وبابرکت عہد آج تک احاطہ دارالعلوم میں ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ ۱۲۸۳ھ سے ۱۲۹۷ھ (۱۸۷۹ء) تک سرپرست رہے۔ حضرت نانوتویؒ کی وفات کے بعد دوسرے سرپرست حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ مقرر ہوئے۔ آپ کے عہد کی برکات دارالعلوم پرنورِ آفتاب کی طرح چھائی رہیں، جن سے ظلمتوں کو قرار پکڑنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ آپ ۱۲۹۸ھ سے تاحیات ۱۳۲۳ھ (۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۵ء) تک سرپرست رہے۔ آپ کے بعد ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۶ء) میں باجماعِ اہل دارالعلوم شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب نوراللہ مرقدہٗ سرپرست تسلیم کئے گئے، جن کے نورانی آثار سے آج تک دارالعلوم کا احاطہ چمک رہا ہے۔ ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۴ء) میں جب آپ حجاز تشریف لے گئے تو حضرت اقدس مولانا عبد الرحیم صاحب رائے پوری قدس سرہٗ کو سرپرست تسلیم کیا گیا۔ آپ ۱۳۳۴ھ (۱۹۱۵ء) سے ۱۳۳۷ھ (۱۹۱۸ء) تک رہے، لیکن جب حضرت شیخ الہند مالٹا سے رہا ہوکر واپس تشریف نہ لائے تو پھر آپ ہی ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۰ء) تک سرپرست رہے۔

آپ کے بعد ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۵ء) میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز سرپرست ہوئے۔ آپ نے اپنی باطنی توجہات اور صرفِ ہمت کے ذریعہ دارالعلوم کے جہاز کو فتن وحوادث کے تھپیڑوں سے محفوظ رکھا، ۱۳۵۴ھ (۱۹۳۵ء) میں اپنے گوناگوں مشاغل اور اس وقت کے اندرونی حالات کی وجہ سے حضرت تھانوی قدس سرہ العزیز نے سرپرستی سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد سے آج تک سرپرست کے نام سے کسی شخصیت کا انتخاب عمل میں نہیں آیا۔

دارالعلوم کے مہتمم

اہتمام کے عہدہ پر بھی ہمیشہ اپنے وقت کے منتخب مخصوص حضرات کا انتخاب ہوتا رہا۔ سب سے پہلے مہتمم حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی تھے، جو طریقہ چشتیہ صابریہ کہ ایک معروف صاحبِ سلسلہ بزرگ تھے اور زہد وریاضت کا پیکر تھے۔ آپ کا حلقۂ اثر دیوبند اور اطراف وجوانب میں بہت وسیع تھا، آپ اولاً محرم ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷ء) سے رجب ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۸ء) تک مہتمم رہے۔ ثانیاً ۱۲۸۶ھ (۱۸۷۰ء) تا ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۰ء) اور ثالثاً ربیع الاول ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۹ء) تا شعبان ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۳ء) مہتمم رہے۔

آپ کے اہتمامِ اول کے بعد حضرت اقدس مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندیؒ عہدۂ اہتمام پر فائز ہوئے، آپ طریقت وحقیقت کے ایک بلند پایہ شیخ اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی دہلوی نوراللہ مرقدہٗ کے ارشد خلیفہ تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ ان پر فخر کیا کرتے تھے۔ موصوف بہت سے اکابرِ دارالعلوم مثل حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ اور حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب سابق ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند وغیرہ کے شیخ طریقت تھے۔

دارالعلوم کی معنوی ترقیات میں حضرت ممدوح کی تربیت وصرفِ ہمت کا اسی طرح حصہ ہے جس طرح قطبِ عِلم عارف باللہ حضرت مولانا نانوتویؒ اور قطب الارشاد عارف باللہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کا تھا۔ آپ اولاً شعبان ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۸ء) اور ثانیاً ذی قعدہ ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۳ء) تا ربیع الاول ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۹ء) دارالعلوم کے مہتمم رہے۔ آپکے بعد تیسرے مہتمم حاجی محمد فضل حق صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ مقرر ہوئے، جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، اور ایک صالح ومتقی بزرگ تھے۔ آپ شعبان ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۳ء) سے ذیقعدہ ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۴ء) تک مہتمم رہے۔

آپ کے بعد ذی الحجہ ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۴ء) میں حضرت مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے چوتھے مہتمم ہوئے، آپ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے رشتہ کے بھائی اور جہادِ شاملی کے ردیف کی حیثیت رکھتے تھے، نہایت ہی باخدا بزرگ اور صاحبِ دیانت وتقویٰ لوگوں میں

تھے۔آپ کے زمانۂ اہتمام کی انتہا جمادی الاول ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۵ء) ہے۔

آپ کے بعد جمادی الثانی ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۵ء) میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب ابن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ دارالعلوم کے پانچویں مہتمم بنائے گئے، آپ کا عہد سابقہ تمام عہدوں سے زیادہ طویل، پرشوکت اور پرہیبت دور گذرا ہے، یہ دور چالیس برس تک ممتد رہا، اور اس چالیس سالہ مدت میں دارالعلوم نے نمایاں ترقی کی۔

حضرت ممدوح کی ذاتی وآبائی وجاہت نے بہت سے پیدا شدہ فتنوں کو دبا کر دارالعلوم کے حلقہ اثر کو وسیع تر بنایا، مالی امدادیں کثیر مقدار میں بڑھیں، بڑی بڑی عمارتیں مثلاً دارالطلبہ قدیم، دارالطلبہ جدید کا کچھ حصہ، دارالحدیث تحتانی، مسجد دارالعلوم، کتب خانہ، دارالمشورہ، قدیم مہمان خانہ اور مختلف احاطے ارضِ دارالعلوم پر نمایاں ہوئے، کارکنوں میں اضافہ ہوا، حاصل یہ کہ اس درس گاہ نے مدرسہ سے دارالعلوم اور دارالعلوم سے ایک جامعہ کی صورت اسی زمانے میں اختیار کی جس کے ماتحت آج بہت سے اضلاع اور صوبجات کے بہت سے ادارے چل رہے ہیں۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کے بعد جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ (۱۹۲۹ء) میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ دارالعلوم کے چھٹے مہتمم ہوئے۔آپ ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۷ء) میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کی نیابت میں رکھے گئے تھے، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اپنی دانش وبینش اور فہم وفراست میں یگانۂ ہند تسلیم کئے جاتے تھے۔ممدوح نے اپنے خداداد تدبر سے دارالعلوم کے انتظامات کو نہایت اعلیٰ پیمانے پر منظّم کیا، تقسیم کار کے ذریعہ مخلوط امور کو شعبوں میں تقسیم کیا اور دارالعلوم کو حقیقی معنی میں مرکزی حیثیت دی۔

موصوف کا یہ مستقل اہتمام گو تقریباً ڈیڑھ برس رہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ راست اور ان کی چالیس سالہ خدمات کے روحِ رواں نیابت کی صورت میں آپ ہی رہے، آپ کا زمانہ اہتمام شعبان ۱۳۴۸ھ (۱۹۳۰ء) تک رہا۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے بعد ۱۳۴۸ھ (۱۹۳۰ء) میں دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کا بارِ گراں شدید انکار کے باوجود احقر کے ناتواں دوش پر ڈالا گیا، اور اب تک یہ خدمت

خاکسار ہی کے سپرد ہے۔

دارالعلوم کے نام پر ہندوپاک اور بنگلہ دیش سے گذر کر افغانستان، برما، حجازِ مقدس، ایران، مصر، ایسٹ افریقہ، جنوبی افریقہ، امریکہ اور یورپ تک سفر کرنا پڑا، اوران تمام ممالک میں دارالعلوم کا تعارف ہوا اور وہاں سے بھی امدادی رقوم حاصل ہوئیں۔

اس عرصہ میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر واحسان ہے کہ دارالعلوم نے نمایاں ترقی کی اور دارالعلوم کا حلقہ اثر کافی وسیع ہوا، مالیات میں بھی بے حد اضافہ ہوا اور تعمیرات بھی بہت زیادہ ہوئیں۔

دارالعلوم کے صدرالمدرسین

(الف) دارالعلوم دیوبند کی صدراتِ تدریس پر سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ فائز ہوئے جو اپنی جامعیتِ علومِ ظاہرہ وباطنہ کے سبب شاہ عبدالعزیز ثانی تسلیم کئے جاتے تھے۔ آپ ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷ء) سے ربیع الاول ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۶ء) تک اس عہدے پر فائز رہے۔

(ب) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے انتقال کے بعد ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۶ء) میں حضرت مولانا سید احمد صاحب دہلویؒ صدر مدرس مقرر فرمائے گئے جو علومِ منقولہ کے ساتھ علومِ معقولہ خصوصاً علم ہیئت وریاضی میں امامِ وقت تسلیم کئے جاتے تھے۔ آپ ۱۳۰۷ھ (۱۸۸۹ء) تک صدارتِ تدریس پر فائز رہے۔

(ج) ۱۳۰۸ھ (۱۸۹۰ء) میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ دارالعلوم کے تیسرے صدر مدرس مقرر فرمائے گئے۔ آپ نے پچیس برس تک مسلسل حدیث اور تفسیر کلامِ ربانی کے علوم کے دریا بہائے اور تشنگانِ علوم اس بحر ذخار سے سیراب ہو کر دوسروں کو سیراب کرتے رہے۔ آپ ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۴ء) تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ آپ سے فیض یافتہ تمام اپنے دور کے بے نظیر محدث، مفسر، فقیہ، متکلم، ادیب اور ہر فن میں مہارتِ تامہ رکھنے والے تھے، اور یہ واقعہ ہے کہ آپ کے تلامذہ سے ہندوپاک اور دوسرے ممالک میں علم وعمل کو بہت فروغ حاصل ہوا۔

(د) ۱۳۳۴ھ (۱۹۱۵ء) میں بحر العلوم، محدثِ دوراں، علامہ عصر، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ قائم مقام صدر مدرس مقرر فرمائے گئے۔ آپ شیخ الہند کے ممتاز تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ پھر ۱۳۳۹ھ (۱۹۱۹ء) میں موصوف مستقل صدر مدرس ہوئے۔ آپ اپنے علم وعمل، زہد وتقویٰ، تبحر وتفقہ اور حفظ وروایت کے لحاظ سے یگانۂ روزگار تھے۔ آپ ۱۳۳۴ھ سے لیکر ۱۳۳۸ھ تک قائم مقام صدر مدرس اور ۱۳۳۹ھ سے اوائل ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۶ء) تک صدر مدرس رہے۔

(ہ) شوال ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۶ء) میں استاذ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ مسند نشین صدارتِ تدریس ہوئے۔ آپ کا بھی حضرت شیخ الہندؒ کے ممتاز تلامذہ میں شمار ہے۔ آپ کے علم وفضل اور اخلاقِ فاضلہ سے ہزاروں تشنگانِ علوم نے ظاہری وباطنی تکمیل کر کے اپنی علمی وروحانی پیاس بجھائی۔ آپ جمادی الاول ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۸ء) تک اس عہدے پر فائز رہے۔

(و) ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۸ء) میں جامع معقول ومنقول حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم کے صدر مدرس مقرر فرمائے گئے، آپ معقولات کے امام، حضرت شیخ الہندؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ پہلے اپنے استاذِ محترم سے ہی بیعت ہوئے، پھر بعد میں حضرت اقدس مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائے پوریؒ اور حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ سے باطنی تعلق رہا، مؤخر الذکر بزرگ نے جو آپ کے شاگرد بھی تھے، اصرار کیا کہ بیعت فرمایا کریں، خصوصیت سے صحیح مسلم آپ کے درس کا شاہکار رہی ہے، جس کی مقبولیت طالبانِ علمِ حدیث میں عام رہی ہے۔

حضرت علامہ بلیاویؒ کے بعد ۱۳۸۷ھ کے اخیر میں اس عہدۂ جلیلہ پر شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب مراد آبادیؒ فائز ہوئے۔ آپ ۱۳۷۷ھ سے بخاری شریف پڑھاتے آرہے تھے، اب بھی آپ کے یہاں یہی کتاب رہی۔ آپ کا درسِ بخاری مشہور ومقبول تھا۔ آپ کے دورِ صدارت میں طلبائے دورۂ حدیث کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا۔ ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ تک آپ کا درس جاری رہا، بیمار ہو کر مراد آباد تشریف لے گئے مگر باوجود کافی علاج معالجہ کے صحت نہ ہوئی۔ ۲۰؍ صفر ۱۳۹۲ھ میں آپ کی وفات ہوگئی، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کے بعد اس سال کے بقیہ حصوں میں بخاری شریف کا سبق کچھ مہینوں احقر کو پڑھانا

پڑا، لیکن عہدۂ صدارت پر حضرت مولانا سید فخر الحسن صاحب مرادآبادی رونق افروز ہوئے۔ مولانا نے اپنی صحت کی کمزوری کی وجہ سے بخاری شریف کا سبق ذی قعدہ ۱۳۹۲ھ میں حضرت مولانا شریف حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منتقل کر دیا اور تاحیات مولانا شریف احمد دیوبندی ہی بخاری شریف کا درس دیتے رہے۔ ۱۵ر جمادی الثانی ۱۳۹۷ھ کو مولانا کی وفات ہوگئی تو یہ سبق مجلس شوریٰ نے حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب کے سپرد کر دیا، جسے مولانا موصوف اب تک حسن وخوبی سے پڑھا رہے ہیں۔

بلکہ محرم ۱۴۰۰ھ میں مجلس شوریٰ نے متفقہ طور پر آں محترم کو صدر المدرسین کا قائم مقام بنا دیا ہے، کیونکہ عملاً حضرت مولانا فخر الحسن صاحب مدظلہٗ صدارت سے قطعاً معذور ہیں۔

دارالعلوم کے مفتی

(الف) دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس کے علاوہ افتاء کا کام بھی ابتدا ہی سے ہوتا رہا۔ سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ جو دارالعلوم کے صدر المدرسین تھے وہی اس اہم کام کو بھی انجام دیتے رہے، چنانچہ آپ نے ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۰۱ھ تک اس خدمت کو بھی انجام دیا۔

(ب) اس کے بعد کسی مخصوص شخصیت کے ذمہ یہ کام نہیں رکھا گیا بلکہ مختلف اساتذۂ کرام سے افتاء کا کام لیا جاتا رہا، چنانچہ ۱۳۰۲ھ سے ۱۳۰۹ھ تک اسی طرح کام چلتا رہا۔

(ج) استفتاؤں کی تعداد بڑھ کر غیر معمولی حد تک پہنچ جانے کے سبب باقاعدہ ایک دارالافتاء کی بنیاد ڈالی گئی اور ۱۳۱۰ھ میں دارالافتاء قائم کر کے حضرت اقدس مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی قدس سرہٗ کو مفتی کا عہدہ سپرد کر دیا گیا۔ آپ کے زمانے میں دارالافتاء سے (۱۳۳۰ھ سے ۱۳۶۴ھ تک) ۱۶ برس کی مدت میں ۴۲۶۲۱ فتاویٰ روانہ کئے گئے۔ ۱۳۳۰ھ سے پہلے کا کوئی ریکارڈ محفوظ نہیں ملتا اسلئے ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۲۹ھ تک انیس (۱۹) سال کے فتاویٰ کی تعداد سامنے نہیں آسکی۔

(د) ۱۳۴۷ھ میں حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ صدر مفتی اور حضرت مولانا مفتی ریاض الدین صاحبؒ مفتی کی حیثیت سے دارالافتاء کے ذمہ دار بن گئے، یہ دور ۱۳۴۸ھ تک رہا اور

اس دور میں ۴۴۴۸ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

(ہ) ۱۳۴۹ھ میں تنہا حضرت مولانا مفتی ریاض الدین صاحب کی ذمہ داری میں دارالافتاء آ گیا اور اس دور میں ۲۴۵۳ فتاویٰ روانہ کئے گئے۔

(و) ۱۳۵۰ھ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ (سابق مفتی اعظم پاکستان وناظم اعلیٰ دارالعلوم کراچی) مفتیٔ دارالعلوم بنائے گئے۔ آپ اس عہدہ پر ۱۳۵۴ھ تک فائز رہے۔ آپ کے زمانے میں ۱۸۳۹۵ افتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

(ز) ۱۳۵۵ھ میں حضرت مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوری مفتی مقرر فرمائے گئے، آپ ۱۳۵۷ھ تک مفتی رہے۔ آپ کے دور میں ۱۵۱۸۵ افتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

(ح) ۱۳۵۸ھ میں حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب میرٹھی مفتی مقرر فرمائے گئے، آپ ۱۳۵۹ھ تک مفتی رہے۔ آپ کے دور میں ۱۵۱۸۵ افتاویٰ دارالعلوم سے روانہ کئے گئے۔

(ط) ۱۳۵۹ھ میں دوبارہ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مفتی مقرر فرمائے گئے، اور ۱۳۶۱ھ تک آپ مفتی رہے۔ اس دوران ۷۶۸۷ افتاویٰ دارالعلوم سے روانہ کئے گئے۔

(ی) ۱۳۶۲ھ میں حضرت مولانا محمد فاروق صاحب انبہٹوی ابن حضرت مولانا صدیق احمد صاحب مفتی مالیر کوٹلہ، دارالعلوم کے مفتی مقرر فرمائے گئے، آپ ۱۳۶۳ھ تک مفتی رہے۔ آپ کے دور میں ۸۴۲۷ فتاویٰ روانہ کئے گئے۔

(ک) ۱۳۶۴ھ میں حضرت مولانا اعزاز علی صاحب مفتی مقرر فرمائے گئے، آپ ۱۳۶۶ھ تک مفتی رہے، اور آپ کے زمانے میں ۲۰۴۰۷ فتاویٰ دارالعلوم سے روانہ کئے گئے۔

(ل) ۱۳۶۷ھ میں حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجانپوریؒ مفتی مقرر فرمائے گئے۔ فتاویٰ میں آپ کی محنت وعرق ریزی اور شب وروز کا انہماک معروف اور زبان زد ہے۔ آپ کے زمانے میں ۱۳۸۲ھ تک ایک لاکھ ۳۷ ہزار ۵۳ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

آپ کے بعد صدارتِ افتاء پر حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی مدظلہ فائز ہیں اور نسبتاً فتاویٰ کی تعداد ہر سال بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

سلسلہ تالیفات وافاداتِ حکیم الاسلامؒ
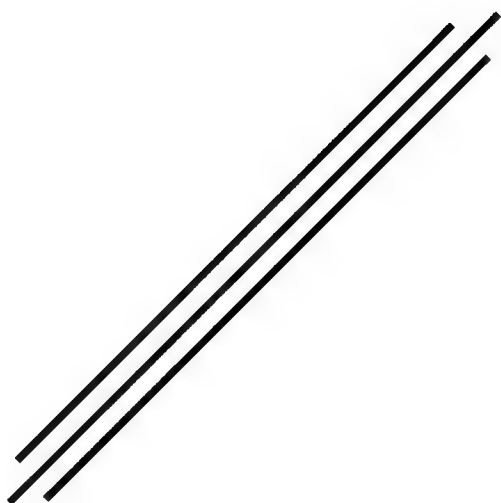
مختصر تاریخ دار العلوم دیوبند

مختصر تاریخ دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کی سو سالہ زندگی، اسکی تاسیس، وجہِ تاسیس، تعلیمی، تبلیغی، انتظامی اور عام افادی کوائف واحوال اور مشاہیرِ دارالعلوم کے حالاتِ زندگی کا مختصر مگر جامع مرقع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للّٰہ وسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی. امّا بعد:

ایک عرصہ سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ دار العلوم دیوبند کی ایک اجمالی تاریخ اُردو، عربی، انگریزی، گجراتی اور ہندی میں کتابی صورت سے پیش کی جائے۔ کیونکہ دار العلوم دیوبند نہ صرف دینی تعلیم کی ایک مرکزی تعلیم گاہ ہے بلکہ اسلامی تہذیب وثقافت اور دینی تربیت کا ایک بین الاقوامی مرکز بھی ہے، اس کے فضلاء تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے علمی اور تہذیبی رشتے عالمی انداز سے شخصیتوں اور اداروں سے قائم ہیں اور اس کے اثرات شعوری اور غیر شعوری طور پر عام قلوب تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اسلئے متعلقین دار العلوم کے علاوہ وارِدین وصادرین کا ایک سلسلہ ہے جو نہ صرف اطرافِ ہند بلکہ غیر ممالک سے شدّ رحال کر کے اس کی طرف کھنچتا ہوا آتا رہتا ہے۔

پھر یہ نہ صرف علمی افراد تک ہی محدود ہے بلکہ تاریخ پسند سیاح بھی اس کی شہرت وعظمت کی داستانیں سن سن کر اس کے مشاہدہ کے لئے بکثرت آتے رہتے ہیں۔ آنے والوں اور آنے کے آرزو مندوں کے دلوں میں معائنہ سے قبل اور بعد قدرتاً یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ ''دار العلوم کیا ہے؟ کب قائم ہوا؟ کیوں ہوا؟ کس نے قائم کیا؟ کن حالات میں قائم ہوا؟ اور قائم ہو کر اس نے کیا کیا؟'' ان سوالات کا تفصیلی جواب ظاہر ہے کہ زبانی اور وہ بھی ہر واردو صادر کے لئے علیحدہ علیحدہ دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی تھا۔ اس لئے بجز اس کے کوئی اور چارۂ کار نہ تھا کہ ان پُرس وجُو کرنے والوں کے سامنے دار العلوم کی سالانہ رودادیں، ماہانہ رسالے، ہنگامی اشتہارات اور وقتی پمفلٹ وغیرہ رکھ کر ان کی اشک شوئی کر دی جائے۔ لیکن یہ صورت ناکافی ہونے کے ساتھ ساتھ ان سوالات کا تشفی بخش جواب ہونے کے بجائے سوالات میں مزید اضافہ کا باعث بنتی رہی جس سے طلبِ حقیقت کا اشتیاق تو بڑھتا گیا اور تشفی کی سعی پیاس میں مزید اضافہ کرتی رہی۔

ان کاغذات سے ہنگامی اور جزوی حالات ضرور سامنے آجاتے تھے لیکن ان سے نہ وہ بنیادی سوالات حل ہوسکتے تھے جو ہر وارد و صادر کے دل کی آواز تھے اور نہ ہی اصل ادارہ، اس کی بناء کی غرض وغایت، اس کے مؤسّسین اور بانیوں کا کردار بلاتخصیص سال وماہ اس کی اساسی پوزیشن کا کوئی تعارف ہی ہوسکتا تھا۔

اس سلسلہ میں احقر نے ۱۳۵۰ھ میں ایک تحریر بنام ''سرسٹھ سالہ روداد دارالعلوم'' مرتب کی، جس میں ضروری عنوانات کے تحت دارالعلوم کا کچھ تاریخی مواد فراہم کرکے اس سنہ کے سالانہ جلسہ تقسیم انعام میں پیش کیا۔ حاضرینِ جلسہ اور واردین وصادرین اس سے غیر معمولی طور پر متأثر ہوئے اور ان کے چہروں پر خوشی کی چمک نمایاں طریق پر محسوس ہونے لگی۔ لیکن بہر حال روداد سرسٹھ سالہ تھی تو سرسٹھ سال ہی کی اس میں کارگزاری بھی دکھائی جاسکتی تھی اور وہ بھی ایک جلسہ میں پڑھی جانے والی روداد کی حیثیت سے مجمل اور مختصر بھی تھی جس سے اس عظیم ادارہ کی پوری پوری حقیقت واہمیت اور ہمہ گیر پوزیشن نمایاں نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لئے یہ روداد بھی ایک حد تک وقتی اور جزوی کاغذ ہی کی حیثیت میں رہ گئی جس سے یہ عمومی منصوبہ پورا نہ ہوسکا اور بدستور دل کی یہ خلش قائم رہی کہ پورے دارالعلوم کی ایک اجمالی مگر مکمل تاریخ بیک وقت آنکھوں کے سامنے آئے جس سے ادارہ کے سنوی یا وقتی حالات پر نہیں بلکہ خود ادارہ پر روشنی پڑے اور اس کی اساسی اور عالمگیر نوعیت، اس کی رفتارِ ترقی اور ترقی پذیر منصوبوں کے درخشاں آثار کھل کر سامنے آجائیں، جن سے بحیثیت مجموعی خود ادارہ کی حقیقی عظمت وشان نمایاں ہو۔

تب یہ اہم منصوبہ ایک مہم کے طور پر محترم سید محبوب صاحب رضوی انچارج محافظ خانہ دارالعلوم دیوبند کے سپرد کیا گیا۔ واقعات کی جستجو اور تلاش کے لئے عنوانات کی ایک فہرست احقر نے انہیں دی، تاکہ ان نشانوں پر مواد بآسانی فراہم کیا جاسکے، ساتھ ہی ذہنی معلومات بھی اُن کے سامنے رکھیں جو اکابر دارالعلوم کی مبارک مجلسوں اور صحبتوں کے ذریعہ میرے ذہن کی امانت بنی ہوئی تھیں۔ موصوف نے کام شروع کیا لیکن وہ اپنے دفتری فرائض اور متعلقہ خدمات کے ساتھ خاطر خواہ اس موضوع پر کام نہ کرسکے اور کام بدستور تشنۂ تکمیل رہا۔

بالآخر قرعۂ فال محترم مولانا عزیز احمد صاحب قاسمی ناظم شعبہ تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیو بند کے نام پر نکلا جنہیں ذاتی طور پر بھی اس قسم کے امور کی تدوین وتالیف سے دلچسپی تھی، اور وہ دار العلوم دیو بند کے مختلف شعبہ جات کے متعدد اہم تاریخی نقشے تیار کر چکے تھے، جن میں ادارہ کی اصولی اور اساسی معلومات کا اچھا خاصا ذخیرہ فراہم ہو گیا تھا۔ اس لئے انہیں اس منصوبے سے بطورِ خاص ذاتی دلچسپی پیدا ہوئی۔ احقر نے سابقہ عنوانات کی فہرست اُن کے سامنے رکھی اور کچھ ان کی رسا طبیعت نے خود بھی مضمون خیز عنوانات پیدا کیے، جن سے احوال کے مختلف تاریخی پہلو سامنے آسکتے تھے۔ موصوف نے دار العلوم کی قدیم وجدید رودادوں اور مستند دفتری کاغذات سے ان عنوانات کے تحت مواد فراہم کرنا شروع کر دیا اور ہر جمع شدہ حصہ وقتاً فوقتاً احقر کو دکھاتے رہے، جس میں ترمیم وتنسیخ، حذف واز دیاد اور ترتیب میں تقدیم وتاخیر کے ساتھ جا بجا اپنی معلومات کا اضافہ کیا جاتا رہا۔

الحمد للہ کہ سال بھر کی عرق ریزی سے دار العلوم دیو بند کی اجمالی تاریخ پر ایک ایسا مجموعہ مرتب ہو گیا جس کے مطالعہ سے بالا جمال پورا دار العلوم بیک وقت سامنے آسکتا ہے اور واردین وصادرین کے یہ سوالات کہ ''دار العلوم کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کب سے ہے؟ کس سے ہے؟ کیا کر رہا ہے؟'' وغیرہ وغیرہ اس سے بآسانی حل ہو سکتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اس مجموعہ کے آئینہ میں دار العلوم کی پوری تصویر اُن کے سامنے آسکتی ہے۔

میں محترم بھائی مولانا عزیز احمد صاحب قاسمی کا ممنون ہوں کہ ان کی شبانہ روز محنت سے میں اس مقصد میں کامیاب ہو سکا اور آج دار العلوم کی تاریخ کا یہ اجمالی مگر جامع خاکہ اس کے متوسلین، بہی خواہوں اور متعلقین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اس تاریخ کو اُردو سے عربی، انگریزی، ہندی اور گجراتی میں منتقل کرنے کا منصوبہ بھی پیش نظر ہے تاکہ ہندو بیرونِ ہند کے متعلقین دار العلوم، مشتاقانِ دید اور بیرونی ممالک کے مختلف وارد وصادر سیاح اور ساتھ ہی دور دراز ملکوں میں دار العلوم کی محبت لئے ہوئے ہزاروں افراد اُسے اپنی اپنی لغت کی آنکھ سے دیکھ سکیں۔ اُردو کا ایڈیشن فی الحال پیش کیا جا رہا ہے اور عربی، انگریزی، ہندی اور گجراتی کے ایڈیشن وسائل کی فراہمی کے بعد کسی قریبی مدت میں تیار کیے جا سکیں گے۔

اس مختصر تاریخ کے اوراق میں دارالعلوم کے اس قلمی چہرے کے ساتھ اس کے عکس چہرے (فوٹو) بھی موقعہ بموقعہ دے دیئے گئے ہیں تاکہ دارالعلوم کی معنویت سے آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی صورت سے بھی ایک حد تک شناسائی میسر آجائے۔(۱)

اس نوعیت کے ساتھ یہ تاریخ سو سے زائد صفحات پر ہدیۂ ناظرین ہے، جس سے ہند و بیرونِ ہند میں اس کی سو سالہ سرگرمیوں اور غیر معمولی خدمات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے اور دیکھا جاسکتا ہے کہ اس ملک کی کوئی بھی علمی و عملی، اخلاقی اور سیاسی، ملکی اور ملی، تعلیمی اور تبلیغی تحریک اس کے فیوض سے نہ صرف یہ کہ خالی نہیں ہے بلکہ بہت حد تک اس کی قیادت اور اس کے فضلاء کی سیادت کی رہینِ منت ہے۔**وذالك فضل الله يؤتيه من يشآء**۔

وانا العبد الضعيف

محمد طیب غفرلہ، مہتمم دارالعلوم دیوبند

۱۵؍محرم الحرام ۱۳۸۵ھ

---

(۱) دارالعلوم دیوبند کی تعمیرات میں اب اس قدر تغیر آگیا ہے کہ اگر حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کے دیئے ہوئے عمارتوں کے نقشے اس کتاب کا حصہ بنائے جائیں جو آج سے قریب چالیس سال (یعنی ۱۳۸۵ھ سے) پہلے کے ہیں، تو آج کا دارالعلوم دیکھنے والا حسی طور پر موجود عمارات کو اس کتاب میں موجود عمارات کی تصاویر سے ہم آہنگ نہیں پاسکے گا، لہٰذا ہم نے ان تصاویر کو شامل اشاعت نہیں کیا ہے۔ یوں بھی اب دارالعلوم میں انقلاب کے بعد ایک نیا دارالعلوم (وقف دارالعلوم) تیار ہو چکا ہے، اُدھر دارالعلوم دیوبند میں قدیم تعمیرات کی تزئین، بعض پر اضافے اور بعض کے انہدام کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے، ایسے میں ان چالیس پچاس سال قبل کی تصویروں کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نظر نہیں آتا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کے عہدِ میمون کی ترقیات کی منہ بولتی تعمیراتی تصاویر ایک یادگار ضرور بن سکتی ہیں، لیکن حضرتِ والا نے دارالعلوم دیوبند، مسلکِ دیوبند کی حفاظت وترقی کے ساتھ دین اسلام اور اہل اسلام کی جو خدمات انجام دیں اُن کے نقوشِ خدمات کو مٹانا تو درکنار ان سے صرفِ نظر کیا جانا بھی ممکن نہیں۔ بہر حال ان پرانی تصاویر کو شامل کتاب نہیں کیا گیا۔

محمد عمران قاسمی بگیانوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مختصر تاریخ دار العلوم دیو بند

تمہید

تیرہویں صدی ہجری آخری سانس لے رہی تھی، ہندوستان میں اسلامی شوکت کا چراغ گل ہو چکا تھا، صرف اٹھتا ہوا دھواں رہ گیا تھا، جو چراغ بجھ جانے کا اعلان کر رہا تھا، دہلی کا تخت مغل اقتدار سے خالی ہو چکا تھا، صرف ڈھول کی منادی میں ''ملک بادشاہ کا'' رہ گیا تھا۔ اسلامی شعائر رفتہ رفتہ رو بہ زوال تھے، دینی علم اور تعلیم گاہیں پشت پناہی ختم ہو جانے کی وجہ سے ختم ہو رہی تھیں، علمی خاندانوں کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا، دینی شعور رخصت ہو رہا تھا اور جہل وضلال مسلم قلوب پر چھاتا جا رہا تھا، مسلمانوں میں پیغمبری سنتوں کے بجائے جاہلانہ رسوم ورواج، شرک وبدعت اور ہوا پرستی وغیرہ زور پکڑتے جا رہے تھے، مشرقی روشنی چھپتی جا رہی تھی اور مغربی تہذیب وتمدن کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا، جس سے دہریت والحاد، فطرت پرستی اور بے قیدیٔ نفس، آزادیٔ فکر اور بیباکی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں، جس سے نگاہیں خیرہ ہو چلی تھیں، اسلام کی جیتی جاگتی تصویر بیمار آنکھوں میں دھندلی نظر آنے لگی تھی اور اتنی دھندلی کہ اسلامی خد وخال کا پہچاننا بھی مشکل ہو چکا تھا۔

چمن اسلام میں خزاں کا دور دورہ تھا، خوش آواز اور شیریں ادا پرندوں کے زمزمے مدھم ہوتے جا رہے تھے اور ان کی جگہ زاغ وزغن کی مکروہ آوازوں نے لے لی تھی، یہ اور اسی قسم کے اور ہزار ہا حوادث اور المناک واقعات کے چند اجمالی عنوانات ہیں جن سے اس وقت کے ہندوستان کی مسموم فضا کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔

اندکے باتو بگفتیم وبدل ترسیدم　　　　که از دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

ان حالات سے یقین ہو چلا تھا کہ اسلام کا چمن اب اجڑا، اور یہ کہ اب ہندوستان بھی اسپین کی

تاریخ دوہرانے کے لئے کمر بستہ ہو چکا ہے، کہ چند نفوسِ قدسیہ نے بالہامِ خداوندی اپنے دل میں ایک خلش اور کسک محسوس کی، یہ خلش علومِ نبوت کے تحفظ، دین کو بچانے اوراس کے راستہ سے ستم رسیدہ مسلمانوں کو بچانے کی تھی۔ وقت کے یہ اولیاء اللہ ایک جگہ جمع ہوئے اوراس بارہ میں اپنی اپنی قلبی واردات کا تذکرہ کیا جواس پر مجتمع تھیں کہ اس وقت بقائے دین کی صورت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ دینی تعلیم کے ذریعہ مسلمانانِ ہند کی حفاظت کی جائے اور تعلیم وتربیت کے راستہ سے ان کی بقاء کا سامان کیا جائے اوراسکی واحد صورت یہی ہے کہ ایک درسگاہ قائم کی جائے جس میں علومِ نبویہ پڑھائے جائیں اوران ہی کے مطابق مسلمانوں کی دینی، معاشرتی اور تمدنی زندگی اسلامی سانچوں میں ڈھالی جائے، جس سے ایک طرف تو مسلمانوں کی داخلی رہنمائی ہواور دوسری طرف خارجی مدافعت نیز مسلمانوں میں صحیح اسلامی تعلیمات بھی پھیلیں اور ایماندارانہ سیاسی شعور بھی بیدار ہو۔

ان مقاصد کیلئے کمر باندھ کر اٹھنے والے یہ لوگ رسمی قسم کے رہنما اور لیڈر نہ تھے بلکہ خدا رسیدہ بزرگ اور اولیائے وقت تھے اور اُن کی یہ باہمی گفت وشنید کوئی رسمی قسم کا مشورہ یا تبادلۂ خیال نہ تھا، بلکہ تبادلۂ الہامات تھا، جیسا کہ میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمہ اللہ مہتمم سادس دار العلوم دیو بند سے سنا کہ وقت کے ان تمام اولیاء اللہ کے قلوب پر بیک وقت یہ الہام ہوا کہ اب ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ وبقاء کی واحد صورت قیامِ مدرسہ ہے۔

چنانچہ اس مجلس مذاکرہ میں کسی نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ حفظِ دین ومسلمین کے لئے اب ایک مدرسہ قائم کیا جائے، کسی نے کہا کہ مجھے کشف ہوا ہے کہ ایک مدرسہ قائم ہو، کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا کہ مدرسہ کا قیام ضروری ہے، کسی نے بہت صریح لفظوں میں کہا کہ مجھے منجانب اللہ الہام کیا گیا ہے کہ ان حالات میں تعلیم دین کا ایک مدرسہ قائم ہونا ضروری ہے۔ ان اہل اللہ کا اس تبادلۂ واردات کے بعد قیامِ مدرسہ پر جم جانا درحقیقت عالمِ غیب کا ایک مرکب اجماع تھا، جو قیامِ مدرسہ کے بارہ میں منجانب اللہ واقع ہوا۔

اس سے جہاں یہ واضح ہے کہ اس وقت کے ہندوستان میں قیامِ مدرسہ کی یہ تجویز کوئی رسمی تجویز نہ تھی بلکہ الہامی تھی، وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس تجویز کے پردہ میں ملک گیر اصلاح کی اسپرٹ

چھپی ہوئی تھی، جو محض مقامی یا ہنگامی نہ تھی کیونکہ اسلامی شوکت ختم ہو جانے کا اثر بھی مقامی نہ تھا، جس کے تدارک کی فکر تھی۔ وہ پورے ملک پر پڑ رہا تھا اس لئے اس کے دفعیہ کی یہ ایمانی رنگ کی تحریک بھی مقامی انداز کی نہ تھی بلکہ اس میں عالمگیریت پنہاں تھی، گو ابتداء میں اس کی شکل ایک چھوٹے سے تخم کی سی تھی مگر اس وقت اس میں ایک تناور شجرۂ طیبہ لپٹا ہوا تھا جس کی جڑیں سچے قلوب کی زمین میں پھیلی ہوئی تھیں اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں، اس سلسلہ میں ان نفوسِ قدسیہ کے سربراہ حجۃ الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ' تھے جنھوں نے اس غیبی اشارہ کو سمجھا اور اُسے ایک تجویز کی صورت دی۔

(۱) بنائے دارالعلوم

کچھ وقت گذرنے کے بعد یہ مبارک تجویز عملی صورت میں نمودار ہوئی اور ۱۵؍محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰؍مئی ۱۸۶۷ء کو دارالعلوم کی بناء رکھ دی گئی۔

بناء رکھنے کی تفصیلات سوانح قاسمی میں ملیں گی۔ اس بناء میں خصوصیت سے حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب قدس سرہ'، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب قدس سرہ' اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدس سرہ' قابل ذکر ہیں، جن کا ہاتھ ابتدا ہی سے تاسیس مدرسہ میں تھا۔ یہ حضرات خصوصیت سے حضرت نانوتوی قدس سرہ' کے دست وباز و رہے ہیں اور بناءِ مدرسہ کے بعد بھی اس کی ذمہ دار مجلس کے رکن رکین کی حیثیت سے مدرسہ کے تمام امور میں عملاً شریک رہے ہیں، بعد میں حضرت اقدس مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مجلس خیر کے رکن رکین ہوئے اور بالآخر حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے ارشاد وایماء پر دارالعلوم کے عہدۂ اہتمام پر فائز ہوئے اور آپ کا عہدِ اہتمام خیر وبرکت کا سرچشمہ ثابت ہوا۔

دارالعلوم کی معنوی بناء کے لئے تو حضرت نانوتوی قدس سرہ' نے آٹھ اصول تحریر فرمائے جو اس ادارہ میں تمام قوانین کے لئے اساس وبنیاد کا درجہ رکھتے ہیں اور حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آٹھ اصولِ عملی تجویز فرمائے جو اس ادارہ کے نظم وانتظام کی اساس وبنیاد

ہیں۔ دونوں بزرگوں کے اصولِ ہشتگانہ درجِ ذیل ہیں جو اس دار العلوم کی حکمتِ عملی اور نظم وانتظام کی اساس ہیں۔

اساسی اصولِ ہشتگانہ

از حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ بانئ دار العلوم دیو بند

(۱) اصل اول یہ ہے کہ تا مقدور کارکنانِ مدرسہ کی ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں۔ خیر اندیشانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے۔

(۲) ابقاءِ طعامِ طلبہ بلکہ افزائش طعامِ طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشانِ مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

(۳) مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو، اپنی بات کی پچ نہ کی جائے۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفتِ رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا۔

القصہ تہِ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس وپیش میں اسلوبئ مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو، اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہارِ رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیتِ نیک اس کو سنیں، یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل وجان قبول کریں گے اور اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم امورِ مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد وصادر جو علم وعقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو۔ اور نیز اس وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدرِ ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا، ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر ہر اہل مشورہ معترض ہوسکتا ہے۔

(۴) یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسینِ مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علمائے

روزگار خود بیں اور دوسروں کے درپئے توہین نہ ہوں، خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

(۵) خواندگی مُقررہ اسی انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور اندازہ مشورہ سے تجویز ہو، پوری ہو جایا کرے، ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

(۶) اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرطِ توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجاء جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی رہے۔

(۷) سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

(۸) تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجبِ برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندے سے امیدِ ناموری نہ ہو، بالجملہ حسنِ نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

انتظامی اصولِ ہشتگانہ

از حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دار العلوم دیو بند

(۱) ہر کارخانہ کے امورِ جزئیہ کی بناء ایک شخص کی رائے پر رہنی چاہئے۔ اسی قاعدہ پر اس کارخانہ کے امورِ جزئیہ کے انجام میں کسی صاحب کو اہل مشورہ میں سے دخل نہ ہوالاّ مشورہ اور رائے کہ وہ اپنے موقع پر اظہار فرمادیں جیسا اہل شوریٰ مل کر پسند کریں۔

(۲) امورِ جزئیہ میں جو کوئی صاحب بندہ کے مددگار ہوں گے یا اچھا مشورہ دیں گے بندہ ان کا مشکور ہوگا مگر انجام ان کا موقوف بندہ ہی کی رائے پر رہنا چاہئے۔

(۳) جس کسی صاحب کو، خواہ اہل شوریٰ خواہ اور عام خلق، کوئی امر قابل اعتراض معلوم ہو تو مہتمم سے مزاحمت نہیں جلسۂ شوریٰ میں پیش کر کے اس کو طے کرا لیں اور جیسا قرار پائے اس کے

انجام پر مہتمم کو عذر نہ ہوگا۔

(۴) مشورہ کے جلسے جب کبھی ہوں بے حاضری مہتمم نہ ہوں گے، اگر چہ اس کی ہی کسی بات پر خوردہ ہو اور یوں اہل شوریٰ کو اختیار اعتراض کا ہر وقت ہے اور مہتمم کو موقع جواب کا۔

(۵) مہتمم اگر اہل شوریٰ کے اجتماع تلک کسی امر ضروری کے انجام پر انتظار نہ کر سکے تو بذریعہ خط سب صاحبوں کو اطلاع دے گا اور اس ضروری امر کو سب صاحبوں کو قبول کرنا ہوگا۔

(۶) آمدنی مدرسہ کی مہتمم کے ہاتھ میں رہے گی کیونکہ صرفِ ضروریہ کے لئے کسی قدر روپیہ مہتمم کے ہاتھ میں رہنا ضروری ہے، حاجتِ ضروری سے زیادہ روپیہ جب جمع ہو جایا کرے گا تو خزانچی کے پاس جمع کر دیا جائے گا۔

(۷) ہر روز وقتِ مقررہ مدرسہ پر مہتمم مدرسہ میں جایا کرے گا اور اسی وقت میں امورِ متعلقہ مدرسہ کو انجام دیا کرے گا۔

(۸) مناسب ہے کہ سب اہل شوریٰ مل کر اپنے دستخط اس معروضہ پر فرمادیں کہ مہتمم کو جائے سند رہے۔

دستخط: العبد محمد قاسم دستخط: العبد ذوالفقار علی دستخط: العبد محمد عابد

(تحریر ۳/ ذی قعد ۱۲۸۸ھ)

(۲) دار العلوم کی تاسیس اور پیشین گوئیاں

دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جسے چھتہ کی مسجد کہتے ہیں، ایک انار کا درخت ہے، اسی درخت کے نیچے سے آبِ حیات کا یہ چشمہ پھوٹا اور اسی چشمہ نے ایک طرف تو دین کے چمن کی آبیاری شروع کر دی اور دوسری طرف اسکی تیز و تندرو نے شرک، بدعت، فطرت پرستی، الحاد و دہریت اور آزادیٔ فکر کے اُن خس وخاشاک کو بھی بہانا اور راستہ سے ہٹانا شروع کر دیا جنھوں نے مسلمانوں کے قلوب میں جڑ پکڑ کر انہیں یہ روزِ بد دکھایا تھا۔ بانیٔ دار العلوم کا یہ خواب کہ:

”میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوا ہوں اور میرے ہاتھوں اور پیروں کی دسوں انگلیوں سے نہریں جاری ہیں اور اطرافِ عالم میں پھیل رہی ہیں“

پورا ہوا اور مشرق ومغرب میں علومِ نبوت کے چشمے جاری ہونے کی راہ ہموار ہوگئی۔ دارالعلوم کے مہتمم ثانی حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب مہاجر مدنی قدس سرہٗ کا یہ خواب کہ:

''علومِ دینیہ کی چابیاں میرے ہاتھ میں دے دی گئیں ہیں''

خواب ہی نہ رہا بلکہ حقیقت کے لباس میں جلوہ گر ہوگیا۔

اور اس مدرسہ کے ذریعہ ان چابیوں نے اُن قلوب کے تالے کھول دیئے جو علم کا ظرف تھے یا ظرف بننے والے تھے۔ جن سے علم کے سوتے ہر طرف پھوٹنے لگے اور چند نفوسِ قدسیہ کا علم آن کی آن میں ہزارہا علماء کا علم ہوگیا۔ حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ دیوبند سے گذرتے ہوئے جب اس مقام پر پہنچے تھے جہاں دارالعلوم کی عمارت کھڑی ہوئی ہے تو فرمایا تھا کہ:

''مجھے اس جگہ سے علم کی بو آتی ہے''

پس وہ خوشبو جس کو سید صاحبؒ کی روحانی قوتِ شامہ نے سونگھا تھا ایک سدا بہار گلاب کے پھول بلکہ گلاب آفریں درخت کی شکل میں آگئی جس سے ہزاروں پھول کھلے اور ہندوستان کا اُجڑا ہوا چمن تختۂ گلاب بن گیا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ خوشبو بیج بنے گی، بیج سے کلی کھلے گی، شگفتہ کلی سے پھول بنے گی، پھول سے گلدستہ بنے گی اور اس گلدستہ کی خوشبو سے سارا عالمِ انسانی مہک اُٹھے گا۔ اور کسے پتہ تھا کہ ایشیاء کی فضا میں مغربی استعماریت کے جو جراثیم پھیلے ہوئے ہیں وہ اس کی جراثیم کش مہک سے آپ ہی اپنی موت مرنے شروع ہو جائیں گے۔

چنانچہ اس وقت کے برطانوی ہند میں فاتح قوم (انگریز) کو فکر تھی کہ ہندوستان کے دل ودماغ کو یورپین سانچوں میں کس طرح ڈھالا جائے جس سے برطانویت اس ملک میں جڑ پکڑ سکے۔ ظاہر ہے کہ دل ودماغ کے بدل دینے کا واحد ذریعہ تعلیم ہوسکتی تھی، جس نے ہمیشہ اُن سانچوں میں دلوں اور دماغوں کو ڈھالا ہے جن کو لے کر تعلیم آگے آئی ہے، اس لئے ہندوستان کو فرنگی رنگ میں ڈھالنے کے لئے لارڈ میکالے نے تعلیم کی اسکیم پیش کی اور وہ اسکولی اور کالجی تعلیم کا نقشہ لے کر یوروپ سے ہندوستان پہنچا اور یہ نعرہ بلند کیا کہ:

''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل ودماغ کے لحاظ سے انگلستانی ہوں''

یقیناً یہ آوازہ جب کہ ایک فاتح اور برسرِ اقتدار قوم کی طرف سے اُٹھا اور تھا بھی وہ تعلیم کا، جو بذاتِ خود ایک انقلاب آفریں حربہ ہے، تو اُس نے ملک پر ذہنی انقلاب کا خاطر خواہ اثر ڈالا۔ اس تعلیم سے ایسی نسلیں اُبھرنی شروع ہوگئیں جو اپنے گوشت پوست کے لحاظ سے یقیناً ہندوستانی تھیں لیکن اپنے طرزِ فکر اور سوچنے کے ڈھنگ کے اعتبار سے انگریزی جامہ میں نمایاں ہونے لگیں۔ اسی ذہنی مگر خطرناک انقلاب کو دیکھ کر بانئ دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ نے دارالعلوم قائم کر کے اپنے عمل سے یہ نعرہ بلند کیا کہ:

''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل ودماغ کے لحاظ سے اسلامی ہوں۔ جن میں اسلامی تہذیب وتمدن کے جذبات بیدار ہوں اور دین وسیاست کے لحاظ سے اُن میں اسلامی شعور زندہ ہو۔''

اس کا ایک ثمرہ یہ نکلا کہ مغربیت کے ہمہ گیر اثرات پر بریک لگ گیا اور بات یک طرفہ نہ رہی بلکہ ایک طرف اگر مغربیت شعار افراد نے جنم لینا شروع کر دیا تو دوسری طرف مشرقیت نواز اور اسلامیت طراز جنبہ بھی برابر کے درجہ میں سامنے آنا شروع ہوگیا جس سے یہ خطرہ باقی نہ رہا کہ مغربی سیلاب سارے خشک وتر کو بہالے جائے گا بلکہ اگر اس کی رَو کا ریلا بہاؤ پر آئے گا تو ایسے بند بھی باندھ دیئے گئے ہیں جو اُسے آزادی سے آگے نہ بڑھنے دیں گے۔

بہر حال وہ ساعتِ محمود آگئی کہ مدرسہ کا آغاز اور اُس کی یہ تعمیر ودفاع کی ملی جلی تعلیم عملاً ساحتِ وجود پر آگئی۔ ملا محمودؒ دیوبندی نے (جو حضرت بانئ دارالعلوم دیوبند کے امر پر مدرسہ دیوبند کا یہ تعلیمی منصوبہ جاری کرنے کے لئے بحیثیت مدرس میرٹھ سے دیوبند تشریف لائے)، اپنے سامنے ایک شاگرد کو (کہ اُن کا نام بھی محمود ہی تھا اور جو آخر کار شیخ الہند مولانا محمود حسن کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے) بٹھا کر کسی عمارت میں نہیں جو مدرسہ کے نام سے بنائی گئی ہو بلکہ چھتہ کی مسجد کے کھلے صحن میں ایک انار کے درخت کے سایہ میں بیٹھ کر اس مشہورِ عام درسگاہ دارالعلوم دیوبند کا افتتاح کر دیا، نہ کوئی مظاہرہ تھا، نہ شہرت پسندی کا جذبہ، نہ نام ونمود کی تڑپ تھی اور نہ پوسٹر واشتہارات کی بھرمار۔

پس ایک شاگرد اور ایک اُستاد، شاگرد بھی محمود اور اُستاد بھی محمود، دو نفر سے یہ لاکھوں کے ایمانوں کی حفاظت کی اسکیم معرضِ وجود میں آگئی۔ سادگی اور ندرتِ ایمان کا دور دورہ شروع ہوگیا جو

سنتِ نبوی اور اتباعِ سلف کی رُوح ہے، مقصد نہ ترفہ تھا نہ تنعم، نہ تعیش نہ تفاخر، نہ تکاثر بلکہ صرف ''مانا علیه الیوم و اصحابی'' کا مرقع بنانا، ور''علیکم بسنّتی الخ'' ''وَاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ'' کی سیدھی راہ کی عملی تصویر کھینچنی تھی۔ اوراس تصویر کشی میں کمالِ احتیاط واعتدال بھی پیش نظر تھا کہ صراطِ مستقیم کے یہ خطوط کہیں ان بہتر (۷۲) فرقوں کے خطوط سے نہ مل جائیں جنہیں شریعت کی اصطلاح میں سُبُلِ متفرقہ کہا گیا ہے۔

ہفتادودوطریق حسد (۷۲) کے عدد سے ہیں اپنا ہے وہ طریق کہ باہر حسد سے ہے

اس لئے جامعیت واعتدال اور دین ودانش کے ملے جلے اندازوں کے ساتھ اس درسگاہ میں تعلیم وتربیت کا خطِ مستقیم کھینچا گیا۔

(۳) دارالعلوم کا سلسلۂ سند واستناد

دارالعلوم دیوبند کا سلسلۂ سند حضرت الامام شاہ ولی اللہ صاحب فاروقی قدس سرہ العزیز سے گذرتا ہوا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچتا ہے۔ شاہ صاحب اس جماعتِ دیوبند کے مورثِ اعلیٰ ہیں جن کے مکتب فکر سے اس جماعت کی تشکیل ہوئی، حضرتِ ممدوح نے اولاً اس وقت کے ہندوستان کے فلسفیانہ مزاج کو اچھی طرح پرکھا، پھر علومِ شریعت کو ایک مخصوص جامع عقل ونقل طرز میں پیش فرمایا، جس میں نقل کو عقل کے جامہ میں ملبوس کر کے نمایاں کرنے کا ایک خاص حکیمانہ انداز پنہاں تھا۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ' بانیٔ دارالعلوم دیوبند نے ولی اللّٰہی سلسلہ کے تلمذ سے اس رنگ کو نہ صرف اپنایا جو انہیں ولی اللّٰہی خاندان سے ورثہ میں ملا تھا، بلکہ مزید تنور کے ساتھ اس کے نقش ونگار میں اور رنگ بھرا، اور وہی منقولات جو حکمتِ ولی اللّٰہی میں معقولات کے لباس میں جلوہ گر تھے، حکمت قاسمیہ میں محسوسات کے لباس میں جلوہ گر ہو گئے۔ پھر آپ کے سہل ممتنع اندازِ بیان نے دین کی انتہائی گہری حقیقتوں کو جو بلاشبہ علمِ لدنی کے خزانہ سے ان پر بالہامِ غیب منکشف ہوئیں، استدلالی اور لمیاتی رنگ میں آج کی خوگرِ محسوس یا حس پرست دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور ساتھ ہی اس خاص مکتبِ فکر کو جو ایک خاص طبقہ کا سرمایہ اور خاص حلقہ تک محدود

تھا، دار العلوم دیو بند جیسے ہمہ گیر ادارہ کے ذریعہ ساری اسلامی دنیا میں پھیلا دیا۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ولی اللّٰہی مکتبِ فکر کے تحت دیو بندیت در حقیقت قاسمیت یا قاسمی طرزِ فکر کا نام ہے۔

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے وصال کے بعد اس دار العلوم کے سر پرستِ ثانی قطبِ ارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ نے قاسمی طرزِ فکر کے ساتھ دار العلوم دیو بند کی تعلیمات میں فقہی رنگ بھرا، جس سے اصول پسندی کے ساتھ فروعِ فقہیّہ اور جزئیاتی تربیت کا قوام بھی پیدا ہوا، اور اس طرح فقہ اور فقہاء کے سرمایہ کا بھی اس میراث میں اضافہ ہو گیا۔

ان دونوں بزرگوں کی وفات کے بعد دار العلوم دیو بند کے اولین صدر مدرس جامع العلوم اور شاہ عبد العزیز ثانی حضرت مولانا محمد یعقوب قدس سرہٗ نے جو حضرت بانیٔ دار العلوم سے سلسلۂ تلمذ بھی رکھتے تھے، دار العلوم کی تعلیمات میں عاشقانہ، والہانہ اور مجذوبانہ جذبات کا رنگ بھرا جس سے یہ صہبائے دیانت سہ آتشہ ہو گئی۔

آپ کے وصال کے بعد دار العلوم دیو بند کے سر پرستِ ثالث شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہٗ صدر المدرسین دار العلوم دیو بند جو حضرت بانیٔ دار العلوم قدس سرہٗ کے تلمیذِ خاص بلکہ علم و عمل میں نمونۂ خاص تھے، ان تمام الوانِ علوم کے محافظ ہوئے اور انہوں نے چالیس سال دار العلوم کی صدارتِ تدریس کی لائن سے علوم و فنون کو تمام منطقہ ہائے اسلامی میں پھیلایا اور ہزار ہا تشنگانِ علوم انکے دریائے علم سے سیراب ہو کر اطراف میں پھیل گئے، اس لحاظ سے یوں سمجھنا چاہئے کہ شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ جماعتِ دار العلوم کے جد امجد ہیں، حضرت نانوتوی قدس سرہٗ جدِ قریب، حضرت گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ اخ الجد اور حضرت شیخ الہندؒ بمنزلہ پدرِ بزرگوار ہیں۔

(۴) دار العلوم کا مسلک

علمی حیثیت سے یہ ولی اللّٰہی جماعت مسلکاً اہل السنّت والجماعت ہے جس کی بنیاد کتاب وسنت اور اجماع و قیاس پر قائم ہے، اُس کے نزدیک تمام وسائل میں اولین درجہ نقل و روایت اور

آثارِ سلف کو حاصل ہے، جس پر پورے دین کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے یہاں کتاب وسنت کی مرادات اقوالِ سلف اور اُن کے متوارث مذاق کی حدود میں محدود رہ کر محض قوتِ مطالعہ سے نہیں بلکہ اساتذہ اور شیوخ کی صحبت وملازمت اور تعلیم وتربیت ہی سے متعین ہوسکتی ہیں۔ اسی کے ساتھ عقل ودرایت اور تفقہ فی الدین بھی اس کے نزدیک فہمِ کتاب وسنت کا ایک بڑا اہم جزو ہے، وہ روایات کے مجموعہ سے حنفی فقہ کی روشنی میں شارع علیہ السلام کی غرض وغایت کو سامنے رکھ کر تمام روایات کو اسی کے ساتھ وابستہ کرتا ہے اور سب کو درجہ بدرجہ اپنے اپنے محل پر اس طرح چسپاں کرتا ہے کہ وہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں دکھائی دیں، اس لئے جمع بین الروایات اور تعارض کے وقت تطبیقِ احادیث اس کا خاص اصول ہے، جس کا منشاء یہ ہے کہ وہ کسی ضعیف سے ضعیف روایت کو بھی چھوڑ نا اور ترک کر دینا نہیں چاہتا جب تک کہ وہ قابلِ احتجاج ہو، اسی بنا پر اس جماعت کی نگاہ میں نصوصِ شرعیہ میں کہیں تعارض اور اختلاف نہیں محسوس ہوتا بلکہ سارے کا سارا دین تعارض اور اختلاف سے مبرا رہ کر ایک ایسا گلدستہ دکھائی دیتا ہے جس میں ہر رنگ کے علمی وعملی پھول اپنے اپنے موقع پر کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اسی کے ساتھ بطریق اہل سلوک جو رسمیات اور رواجوں اور نمائشی حال وقال سے بیزار اور بری رہے، تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن بھی اس کے مسلک میں ضروری ہے۔ اس نے اپنے منتسبین کو علم کی رفعتوں سے بھی نوازا اور عبدیت وتواضع جیسے انسانی اخلاق سے بھی مزین کیا، اور اس جماعت کے افراد ایک طرف علمی وقار، استغناء (علمی حیثیت سے) اور غناءِ نفس (اخلاقی حیثیت سے) کی بلندیوں پر فائز ہوئے وہیں فروتنی، خاکساری اور ایثار وزہد کے متواضعانہ جذبات سے بھی بھرپور ہوئے، نہ رعونت اور کبر ونخوت کا شکار ہوئے اور نہ ذلتِ نفس اور مسکنت میں گرفتار۔

وہ جہاں علم واخلاق کی بلندیوں پر پہنچ کر عوام سے اونچے دکھائی دینے لگے، وہیں عجز ونیاز، تواضع وفروتنی اور لا امتیازی کے جوہروں سے مزین ہوکر عوام میں ملے جلے اور ''کاحد من الناس'' بھی رہے، جہاں مجاہدہ ومراقبہ سے خلوت پسند ہوئے وہیں مجاہدانہ اور غازیانہ اسپرٹ نیز قومی خدمت کے جذبات سے جلوہ آرا بھی ثابت ہوئے۔

غرض علم واخلاق، خلوت وجلوت اور مجاہدہ وجہاد کے مخلوط جذبات ودواعی سے ہر دائرۂ دین میں اعتدال اور میانہ روی ان کے مسلک کی امتیازی شان بن گئی، جو علوم کی جامعیت اور اخلاق کے اعتدال کا قدرتی ثمرہ ہے، اسی لئے اُن کے محدث ہونے کے معنی فقیہ سے لڑنے یا فقیہ ہونے کے معنی محدث سے بیزار ہوجانے یا نسبتِ احسانی (تصوف پسندی) کے معنی متکلم دشمنی یا علم کلام کی حذاقت کے معنی تصوف بیزاری کے نہیں، بلکہ اس کے جامع مسلک کے تحت اس تعلیم گاہ کا فاضل درجہ بدرجہ بیک وقت محدث، فقیہ، مفسر، مفتی، متکلم، صوفی (محسن) اور حکیم ومربی ثابت ہوا، جس میں زہد وقناعت کے ساتھ عدم تقشّف، حیا وانکسار کے ساتھ عدمِ مداہنت، رأفت ورحمت کے ساتھ امر بالمعروف ونہی عن المنکر، قلبی یکسوئی کے ساتھ قومی خدمت اور خلوت در انجمن کے ملے جلے جذبات راسخ ہو گئے۔ ادھر علم وفن اور تمام اربابِ علوم وفنون کے بارے میں اعتدال پسندی اور حقوق شناسی نیز ادائیگیٔ حقوق کے جذبات ان میں بطور جوہر نفس پیوست ہو گئے۔

بناء بریں دینی شعبوں کے تمام اربابِ فضل وکمال اور راسخین فی العلم خواہ محدثین ہوں یا فقہاء، صوفیا ہوں یا عرفاء، متکلمین ہوں یا اصولیین، امراءِ اسلام ہوں یا خلفاء اس کے نزدیک سب واجب الاحترام اور واجب العقیدت ہیں۔ اس لئے جذباتی رنگ سے کسی طبقہ کو بڑھانا اور کسی کو گرانا یا مدح وذم میں حدودِ شرعیہ سے بے پرواہو جانا اس کا مسلک نہیں۔ اس جامع طریق سے دار العلوم نے اپنی علمی خدمات سے (شمال میں) سائبیریا سے لیکر (جنوب میں) سماترا اور جاوا تک اور (مشرق میں) برما سے لے کر (مغربی سمتوں میں) عرب اور افریقہ تک علومِ نبویہ کی روشنی پھیلا دی جس سے پاکیزہ اخلاق کی شاہراہیں صاف نظر آنے لگیں۔

دوسری طرف سیاسی خدمات سے بھی اس کے فضلاء نے کسی وقت بھی پہلوتہی نہیں کی، حتیٰ کہ ۱۸۰۳ء سے ۱۹۴۷ء تک اس جماعت کے افراد نے اپنے اپنے رنگ میں بڑی سے بڑی قربانیاں پیش کیں جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ کسی وقت بھی ان بزرگوں کی سیاسی اور مجاہدانہ خدمات پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا، بالخصوص تیرھویں صدی ہجری کے نصفِ آخر میں مغلیہ حکومت کے زوال کی ساعتوں میں خصوصیت سے حضرت شیخ المشائخ مولانا حاجی محمد امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کی سرپرستی

میں ان کے ان دو مریدانِ خاص حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اوران کے منتسبین ومتوسلین کی مساعیٔ انقلاب، جہادی اقدامات اورحریت واستقلالِ ملّی کی فداکارانہ جدوجہد اور گرفتاریوں کے وارنٹ پران کی قید وبند وغیرہ وہ تاریخی حقائق ہیں جو نہ جھٹلائی جاسکتی ہیں نہ بھلائی جاسکتی ہیں۔

جولوگ ان حالات پر محض اس لئے پردہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ وہ خوداس راہِ سرفروشی میں قبول نہیں کیئے گئے تواس سے خودان ہی کی نامقبولیت میں اضافہ ہوگا۔اس بارہ میں ہندوستان کی تاریخ سے باخبر اور اربابِ تحقیق کے نزدیک ایسی تحریریں خواہ وہ کسی دیوبندی النسبت کی ہوں یا غیر دیوبندی کی، جن سے ان بزرگوں کی ان جہادی خدمات کی نفی ہوتی ہو لایعبأبہ اورقطعاً ناقابل التفات ہیں۔

اگرحسنِ ظن سے کام لیا جائے توان تحریرات کی زیادہ سے زیادہ توجیہ صرف یہ کی جاسکتی ہے کہ ایسی تحریریں وقت کے مرعوب کن عوامل کے نتیجہ میں محض ذاتی حدتک حزم واحتیاط کا مظاہرہ ہیں، ورنہ تاریخی اورواقعاتی شواہد کے پیش نظر نہ اُن کی کوئی اہمیت ہےاورنہ وہ قابلِ التفات ہیں۔ان خدمات کا سلسلہ مسلسل آگے تک بھی چلا اورانہیں متوارث جذبات کے ساتھ ان بزرگوں کے اخلافِ رشید بھی سرفروشانہ انداز سے قومی اور ملی خدمات کے سلسلہ میں آگے آتے رہے، خواہ وہ تحریکِ خلافت ہو یااستخلاصِ وطن، اور بروقت انقلابی اقدامات میں اپنے منصب کے عین مطابق حصہ لیا۔

مختصر یہ کہ علم واخلاق کی جامعیت اس جماعت کا طرۂ امتیاز رہا اور وسعتِ نظری، روشن ضمیری اور رواداری کے ساتھ دین وملت اور قوم ووطن کی خدمت اس کا مخصوص شعار، لیکن ان تمام شعبہ ہائے زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت اس جماعت میں مسئلہ تعلیم کو حاصل رہی ہے۔

جب کہ یہ تمام شعبے علم ہی کی روشنی میں صحیح طریق پر بروئے کار آسکتے تھے، اوراسی پہلو کواس نے نمایاں رکھا، اس لئے اس مسلک کی جامعیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ جامع علم ومعرفت، جامع دیانت وسیاست، جامع روایت، جامع خلوت وجلوت، جامع عبادت ومدنیت، جامع حکم وحکمت، جامع ظاہروباطن اور جامع حال وقال ہے، اس مسلک کو جوسلف وخلف کی نسبتوں سے حاصل شدہ

ہے، اگر اصطلاحی الفاظ میں لایا جائے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیناً مسلم، فرقتہً اہل سنت والجماعت، مذہباً حنفی، مشرباً صوفی، کلاماً اشعری، سلوکاً چشتی بلکہ جامع سلاسل، فکراً ولی اللّٰہی، اصولاً قاسمی، فروعاً رشیدی اور نسبتاً دیوبندی ہے۔

اس سلسلہ میں چونکہ ''مسلکِ دارالعلوم'' کے نام سے ہم نے ایک مستقل رسالہ لکھ دیا ہے اس لئے اس موقع پر اس کی زیادہ تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، اس کے بعض جامع جملے اس تحریر میں لے لئے گئے ہیں، تفصیلات کے لئے اس رسالہ کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا مجموعی مذاق اور اس کی تربیت کا رُخ

۱۸۵۷ء کے بعد کے دور میں جب کہ مسلمانوں کی شوکت ہندوستان سے پامال ہوچکی تھی اور حالات میں یکسر انقلاب اور تبدیلی آچکی تھی، دارالعلوم نے ان بدلتے ہوئے حالات میں جو سب سے بڑا کام کیا وہ یہ کہ مسلمانوں میں بلحاظِ دین ومذہب اور بلحاظِ معاشرت تبدیلی نہیں ہونے دی کہ وہ حالات کی رَو میں بہہ جائیں۔ پختگی اور عزیمت کے ساتھ انہیں اسلامی سادگی اور دینی ثقافت کے زاہدانہ ومتوکلانہ اخلاق پر قائم رکھا، مگر اس حکمت کے ساتھ کہ عوام کی حد تک اندرونِ حدود جائز توسعات سے گریز نہیں کیا جو بدلتے ہوئے تمدن ومعاشرت میں طبعی طور پر ناگزیر تھا، مگر خواص کی حد تک دائرہ وسیع نہیں ہونے دیا جس سے عام مسلمانوں میں اسلامی مدنیت کا سادہ نقشہ قائم رہا اور جدید تمدن ومعاشرت میں اغیار کی نقالی کا غلبہ نہیں ہوسکا اور اسلامی غیرت وحمیت باقی رہ گئی، مرعوبیت اور احساسِ کمتری قلوب میں جمنے نہیں پایا، ضمیر کی حریت وآزادی کا پورا پورا تحفظ کیا اور اتباعِ اغیار کے بجائے سنتِ نبوی کو معیارِ زندگی بنانے کے جذبات قلوب میں اُبھارے، جس سے عام تمدن ومعاشرت میں پرہیزگاری اور تقویٰ وطہارت کے دواعی اُجاگر رہے۔

بلحاظِ حقیقت یہ سب کچھ اس کا ثمرہ تھا کہ دارالعلوم اور اس کے پروردوں کے مسلک اور زندگی کے معاملات کی اساس وبنیاد فلسفہ اور عقلِ محض پر نہیں تھی بلکہ انبیاء علیہم السلام کے ڈالے ہوئے راستہ پر یعنی محبت وعشق پر تھی جو ایمان کا بنیادی جوہر اور غالب عنصر ہے۔ فلسفہ اختراعات اور آزادیٔ

فکر کی راہ لے جاتا ہے اور عشق ومحبت اتباع وادب کی راہ چلاتا ہے۔فلسفہ کی بنیاد چونکہ عقلی اختراعات پر ہے اس لئے اگلا فلسفی پچھلے کی تحمیق اور تغلیط کو اپنا واجبی حق سمجھتا ہے اور نبوت کی بنیاد چونکہ وحی اور عشق ومحبتِ خداوندی پر ہے اس لئے ہر اگلا پیغمبر پچھلے پیغمبر کی تصدیق ومحبت کو جزوِ ایمان بتاتا ہے۔اندرونی جذبات کا یہی فرق فلاسفہ اور انبیاء کے متبعین میں بھی ہے۔

پس دار العلوم کے طرزِ تربیت اور تعلیم وتمدن کا اہم جزو چونکہ وحیٔ الٰہی کے ساتھ ہمہ وقتی شغل واشتغال اور قال اللہ وقال الرسول ہی کا تمام تر مشغلہ تھا اس لئے طبعی طور پر اس کے حلقوں میں ادب واتباع اور عشق ومحبت کی بنیادیں استوار ہوئیں اور ان کا اثر اوپر کی تعمیر یعنی دیانت، معاشرت اور عادت وعبادت میں آنا ناگزیر تھا اس لئے اس نے بدلتے ہوئے حالات پر پچھلوں کے نقشِ قدم کو برقرار رکھا اور زمانہ کی رَو میں عوام کو کلیتہً بہنے نہیں دیا اور اس کی اس عزیمت کی عظمت دوستوں اور مخالفوں سب نے تسلیم کی۔

لیکن جن بزرگوں نے اس دور میں اپنے حسنِ نیت اور اخلاق سے ہندوستانی مسلمانوں کی عزتِ نفس اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ان کی مادی سربلندی کے لئے مساعی انجام دیں اُن سے کبھی آویزش نہیں کی، البتہ ان کے کسی اقدام سے اگر دین یا دینی ذوق اور دین کے کسی عقیدہ وعمل کو متاثر ہوتے دیکھا تو اس کا کھل کر مقابلہ کیا اور اس طرح امکانی حد تک دین میں آزاد فکری، آزادروشی اور بے قیدی کی مداخلت کے راستے روکے۔

دار العلوم کی مجالس

دار العلوم میں تین ذمہ دار مجالس ہیں۔

(۱) مجلس شوریٰ　　(۲) مجلس عاملہ　　(۳) مجلس علمیہ

(۱) مجلس شوریٰ

یہ مجلس دار العلوم کی سب سے بڑی بااختیار مجلس ہے، دار العلوم کا تمام نظم ونسق اسی جماعت کے ہاتھ میں ہے، اس کی تجاویز دربارہ انتظام وتعلیم قطعی اور جملہ کارکنانِ دار العلوم کے لئے واجب

التعمیل ہوتی ہیں، اس مجلس کے ارکان کی تعداد اکیس (۲۱) ہے جس میں کم از کم گیارہ (۱۱) علماء کا ہونا ضروری اور لازمی ہے اور باقی ارکان مسلمانوں کے دیگر طبقات سے منتخب ہو سکتے ہیں، مگر حتی الامکان دو ممبر باشندگانِ دیو بند سے لئے جاتے ہیں۔ مہتمم اور صدر مدرس بحیثیت عہدہ مجلس شوریٰ کے رکن رہتے ہیں۔ اس مجلس کے سال میں دو جلسے ہوتے ہیں، ایک محرم میں دوسرا رجب میں۔ اس مجلس کا کورم سات ہوتا ہے۔

(۲) مجلس عاملہ

یہ مجلس، مجلس شوریٰ کے ماتحت ایک مستقل مجلس ہے۔ جو مجلس شوریٰ کے فیصلوں اور منظور کردہ تجاویز کے عمل درآمد کے سلسلہ میں ذمہ داریوں کے طریق عمل پر نظر رکھتی ہے، نظم وتعلیم اور دفاتر کے حسابات کی کارکردگی کی نگرانی اس کے ذمہ ہے، اس مجلس کے ارکان کی تعداد نو ہے۔ مہتمم اور صدر مدرس باعتبار عہدہ اس کے مستقل رکن ہوتے ہیں۔ بقیہ سات ممبر مجلس شوریٰ کے ارکان میں سے منتخب کئے جاتے ہیں۔

اس مجلس کا انتخاب سالانہ ہوتا ہے، مجلس عاملہ کے سال بھر میں چار جلسے ہوتے ہیں، پہلا ربیع الاول میں دوسرا جمادی الاول میں، تیسرا شعبان میں اور چوتھا ذی قعد میں۔ مجلس عاملہ کا کورم پانچ ہے۔

(۳) مجلس علمیہ

تمام درجاتِ عربی، فارسی، اُردو، دینیات اور تجوید وغیرہ کے تعلیمی کاموں میں صدر المدرسین کو مشورہ دینے کے لئے ایک مجلس ہے، جس کا نام مجلس علمیہ ہے۔ اس کے ممبران میں صدر المدرسین، مہتمم دار العلوم اور اساتذۂ طبقۂ اعلیٰ شامل ہیں۔

دار العلوم کے شعبہ جات

دار العلوم دیو بند کے شعبہ جات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(ا) تعلیمی شعبہ جات (ب) انتظامی شعبہ جات (ج) مالی شعبہ جات

(ا)تعلیمی شعبہ جات کے ماتحت حسب ذیل شعبہ جات آجاتے ہیں۔

(ا) شعبہ تعلیم عربی

اس میں میزان الصرف سے لے کر دورۂ حدیث تک کی تعلیم ہوتی ہے اگر چہ کتابیں تقریباً سب عربی میں ہیں مگر ذریعہ تعلیم اُردو زبان ہے،اس شعبہ کا نصاب نو(۹) سال کا ہے۔

(۲) شعبہ تعلیم فارسی

اس شعبہ میں زبان فارسی کی تعلیم ابتدا سے لے کر مثنوی مولانائے روم تک ہوتی ہے۔یہاں بھی ذریعہ تعلیم اُردو زبان ہے۔فارسی زبان کے علاوہ حساب ،اقلیدس،جغرافیہ،ہندی اور تاریخ وغیرہ بھی نصاب میں داخل ہے،اس شعبہ کا نصاب پانچ (۵) سال کا ہے۔

(۳)شعبہ تجوید وقراءت

اس شعبہ میں تمام طلبہ کولازمی مضمون کے طور پر پارہ عم کی مشق قواعد تجوید کے ماتحت کرائی جاتی ہے جس کے بغیر طالب علم کوسند الفراغ نہیں دی جاتی اور جوطلبہ با قاعدہ فنِ تجوید کی تعلیم حاصل کرنا چاہیں انہیں تجوید کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور عملی مشق بھی کرائی جاتی ہے اور تکمیل کے بعد اس درجہ میں مستقل سند بھی دی جاتی ہے۔

(۴) شعبہ تعلیم قرآن شریف حفظ

اس شعبہ میں جوطلبہ قرآن شریف حفظ کرنا چاہتے ہیں انھیں حفظ کرایا جاتا ہے۔

(۵) شعبہ ابتدائی دینیات وتعلیم قرآن شریف ناظرہ

اس شعبہ میں چھوٹے بچوں کوقرآن شریف ناظرہ پڑھایا جاتا ہے،اسی کے ساتھ اُردو زبان، دینیات، ہندی، حساب،جغرافیہ اور تاریخ وغیرہ مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں۔اس شعبہ کا نصاب چارسال کا ہے۔

(۶) صف عربی

اس شعبہ میں طلبہ کو جدید عربی میں تقریر وتحریر کی مشق کرائی جاتی ہے۔

(۷) صف انگریزی

اس شعبہ میں طلبہ کو انگریزی زبان پڑھانے کا انتظام کیا گیا ہے جس کے تحت وہ دینی علوم ومسائل کی انگریزی زبان میں تقریر کرسکیں۔

(۸) شعبہ خوشنویسی

اس شعبہ میں طلبہ کو خوشنویسی کی مشق کرائی جاتی ہے، اس شعبہ کے دو درجے ہیں، ایک درجہ محض خط کی صفائی کا ہے تاکہ طالب علم بدخطی کے عیب سے محفوظ ہو جائے اور دوسرا درجہ فنِ کتابت کی فنی تکمیل کا ہے جس کے لئے طلبہ کو وظائف بھی دیئے جاتے ہیں اور اس درجہ کی مدتِ نصاب پوری کر کے اس فن کی سند کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جو طلبہ فنِ کتابت سیکھنا چاہتے ہیں انہیں کتابت (اُردو عربی رسم الخط) سکھا کر تکمیل کرادی جاتی ہے، یہ درجہ لازمی مضمون کا نہیں ہے۔

(۹) جامعہ طبیہ

اس شعبہ میں طلبہ کو طبِ قدیم وجدید مع سرجری وغیرہ پڑھائی جاتی ہے اور اس کی تکمیل پر باقاعدہ سند دی جاتی ہے جو گورنمنٹ کی جانب سے منظور شدہ ہے۔(۱)

(۱۰) دار الصنائع

اس شعبہ میں طلبہ کو ابتدائی درجہ کی کچھ دستکاریاں سکھائی جاتی ہیں جیسے لیدر ورک (سوٹ کیس، بٹوے، ہولڈال وغیرہ) نیز خیاطی اور جلد سازی کی تعلیم دی جاتی ہے تاکہ ایک طالب علم ضرورت کے وقت کسبِ معاش سے عاری نہ رہے۔

---

(۱) نہ معلوم کن ناگزیر حالات کے سبب اب یہ شعبہ دار العلوم سے ختم ہو چکا ہے۔ ۱۹۸۴ء تک یہ شعبہ قائم رہا۔
محمد عمران قاسمی بگیانوی

(۱۱) شعبہ مطالعہ علومِ قرآنی

اس شعبہ میں قرآن پاک پر ریسرچ کا انتظام ہے۔

(۱۲) شعبہ تعلیم الافتاء

منتخب طلبہ کو فتویٰ نویسی کی مشق کرانے کے لئے یہ شعبہ دارالافتاء کی نگرانی میں قائم ہے جس میں ہر سال اعلیٰ استعداد کے طلبہ کی ایک مختصر جماعت افتاء نویسی کے لئے منتخب کی جاتی ہے، جس کے لئے ایک کمیٹی زیر صدارت مہتمم دارالعلوم انتخاب کا کام سالانہ انجام دیتی ہے اور فارغ شدہ طلبہ کو افتاء کی سند دی جاتی ہے۔

(۱۳) مجلس معارف القرآن (اکیڈمی قرآن عظیم)

یہ ایک تصنیفی ادارہ ہے جو اپنے نظم اور کاموں میں مستقل اور آزاد ہے مگر دارالعلوم کی سرپرستی میں قائم ہے اور دارالعلوم ہی کا ادارہ ہے جو محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی صدارت میں کام کرتا ہے، اس کی مجلس منتظمہ الگ ہے، اس ادارہ کا مقصد قرآنی علوم کی ریسرچ اور تحقیق کے ساتھ وقت کے الجھے ہوئے مسائل کو قرآن حکیم کی روشنی میں حل کر کے اس طرح پیش کرنا ہے کہ قرآن حکیم دنیا کا رہنما اور امام ثابت ہو اور دنیا کو قرآن حکیم سے روشنی حاصل کرنے کی رغبت اور امنگ پیدا ہو۔

(۱۴) دارالافتاء

اس شعبہ سے ملک و بیرونِ ملک سے آنے والے سوالات پر فتوے دیئے جاتے ہیں۔ یہ شعبہ درحقیقت اسلامی عدلیہ کا شعبہ ہے جس کے ماتحت مسلمانوں کا پرسنل لاء ان کے ذاتی خانگی اور اجتماعی معاملات میں اُن کے سامنے رکھا جاتا ہے جس سے اسلامی قانون بڑی حد تک محفوظ ہے۔ اوپر کے شعبے تعلیم خواص کے ہیں اور یہ شعبہ تعلیم عوام کا ہے جو گھر بیٹھے انہیں دی جاتی ہے۔

(ب) انتظامی شعبہ جات

انتظامی شعبہ جات کے ماتحت حسبِ ذیل شعبہ جات آتے ہیں۔

(۱) کتب خانہ

اس شعبہ میں درسی، غیر درسی کتب اور مخطوطات کے عظیم ذخیرے محفوظ ہیں۔ جن میں سے تمام طلبہ و مدرسین کو مفت کتابیں دی جاتی ہیں اور باہر سے جو حضرات ریسرچ اور تحقیق کرنے آتے ہیں ان کے لئے مطالعہ کی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔

(۲) مطبخ

اس شعبہ میں طلبہ کے لئے کھانا تیار کیا جاتا ہے، دو وقت میں تقریباً ۱۸۰۰ (۱) طلبہ کا کھانا تیار ہوتا ہے اور مفت تقسیم کیا جاتا ہے جو مستطیع طلبہ قیمتاً کھانا خریدتے ہیں اُن سے کوئی نفع نہیں لیا جاتا بلکہ صرف اصل لاگت وصول کی جاتی ہے۔

(۳) تعمیرات

یہ ایک مستقل شعبہ ہے جس کا کام بارہ مہینے جاری رہتا ہے۔ دار العلوم کی نئی عمارتوں کی تعمیرات اور پرانی عمارتوں کی مرمت وغیرہ اس شعبہ کے وظائف میں داخل ہے۔

(۴) شعبہ دار المطالعہ

اس شعبہ میں طلبہ کے مطالعہ کے لئے اخبارات، رسائل اور ضروری کتب کا انتظام ہے جو ایک ذمہ دار کی نگرانی میں ہمہ وقت کھلا رہتا ہے اور مختلف اوقات میں طلبہ مطالعہ کے ذریعہ اپنے علم میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

(۱) اب یہ تعداد الحمدللہ صرف دار العلوم میں تین ہزار سے زائد ہے اور اگر وقف دار العلوم کو بھی شامل کیا جائے تو پانچ ہزار سے زائد مستحق طلبہ اس سے فیض اٹھاتے ہیں۔ محمد عمران قاسمی بگیانوی

(۵) شعبہ دار التربیت

اس شعبہ میں چھوٹی عمر کے طلبہ کی تربیت اور اخلاقی نگرانی کا انتظام ہے۔

(۶) شعبہ ترتیبِ فتاویٰ

اس شعبہ میں دار العلوم کے دار الافتاء سے جو فتاویٰ صادر کئے گئے ہیں اور ابتدا سے آج تک ان کا ریکارڈ محفوظ ہے، انہیں ترتیب دے کر کتابی صورت میں شائع کیا جاتا ہے، جس کے کئی مجلدات اب تک شائع ہو چکے ہیں۔

(۷) شعبہ دار الاقامہ

اس شعبہ کے ذریعہ دار الاقامتوں میں رہنے والے طلبہ کی جائے رہائش کی باقاعدہ تنظیم اور ان کی اخلاقی نگرانی کی جاتی ہے۔

(۸) شعبہ تنظیم ابنائے قدیم

اس شعبہ کے ذریعہ ابتدا سے اب تک جتنے طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلے ان کی ضلع وار تنظیم کی جاتی ہے اور ان کی خدمات کو جو وہ مختلف دائروں میں انجام دے رہے ہیں بطور ریکارڈ دار العلوم میں رکھا جاتا ہے اور شائع کیا جاتا ہے۔

(۹) شعبہ برقیات ومتفرقات

اس شعبہ کے ذریعہ دار العلوم میں صفائی، آب رسانی، حوائج مہمان خانہ، ضروریاتِ مسجد، احاطوں میں چمن بندی اور پورے دار العلوم میں برقی روشنی وغیرہ کا انتظام کیا جاتا ہے۔

(۱۰) محافظ خانہ

اس شعبہ میں دار العلوم کی ابتدا سے اب تک کے تمام شعبہ جات کا ریکارڈ رکھنے کا انتظام ہے۔

(۱۱) شعبہ امور خارجہ

اس شعبہ میں بیرونی طلبہ کے پاسپورٹ، ویزا کے سلسلہ میں ضروری تحفظات واندراجات اور عام طلبائے دارالعلوم کے لئے ریلوے کنسیشن فراہم کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔

(۱۲) شعبہ نشریاتِ دارالعلوم

اس شعبہ سے دارالعلوم کا ماہوار آرگن ''دارالعلوم'' شائع ہوتا ہے اور دارالعلوم کے سلسلہ کے ذمہ دارانہ اعلانات نیز اس کی ضروریات کے اظہار وغیرہ کی نشرواشاعت کا انتظام کیا جاتا ہے، اس رسالہ کے علمی ودینی مضامین اور مطبوعات پر تبصرے مقبولِ عام ہیں۔

(۱۳) شعبۂ تبلیغ

اس شعبہ سے ملک کے مختلف حصوں میں مبلغین روانہ کئے جاتے ہیں تاکہ لوگوں کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے روشناس کرائیں۔ اقدامی تبلیغ کے لئے الگ اور عام اصلاحی جلسوں کے لئے الگ مبلغین نامزد ہیں جو منظّم پروگراموں کے ماتحت بھیجے جاتے ہیں۔

(۱۴) شعبۂ ورزش

اس شعبہ کا موضوع طلبہ کی جسمانی ورزش کا انتظام ہے تاکہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی عام جسمانی تندرستی بھی برقرار رہے۔

(۱۵) شعبۂ جمعیۃ الطلباء

یہ طلبائے دارالعلوم کی انجمن ہے جسکے ماتحت رہ کر طلباء تقریر اور مناظرہ کی مشق کرتے ہیں۔

(ج) مالی شعبہ جات

(۱) محاسبی

اس شعبہ کے دفتر میں دارالعلوم کی آمدنی وخرچ کا تفصیلی حساب رکھا جاتا ہے جس کے بنیادی کاغذات، حساب کتاب آمدنی، روزانہ کا کھاتہ اور ماہانہ گوشوارہ ہیں۔ تمام حسابات ہر سال سرکاری آڈیٹروں (چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ) سے باضابطہ آڈٹ کرائے جاتے ہیں۔

(۲) شعبہ اوقاف

اس دفتر میں دارالعلوم کے نام جس قدر جائدادیں صحرائی یا سکنائی وقف کی گئی ہیں یا کی جاتی رہتی ہیں، ان تمام اوقاف کا تفصیلی حساب رکھا جاتا ہے اور تحصیل ووصول کا ایک منظّم دفتر ہے جس کے ذریعہ آمدنی وخرچ اور دادوستد کا باقاعدہ انتظام رکھا جاتا ہے۔

(۳) شعبہ تنظیم وترقی

اس شعبہ کے ماتحت تحصیل سرمایہ کے لئے سفراء ہیں جو ملک کے مختلف حصوں میں حلقہ وار پھیل کر دارالعلوم کے لئے چندہ فراہم کرتے ہیں اور مقررہ چندوں کی وصول یابی میں حصہ لیتے ہیں۔

(۴) ادارہ اہتمام

ان سب پر آخری اور مرکزی ادارہ اہتمام ہے جس سے ہر شعبہ کے بارے میں خواہ تعلیمی ہو یا مالی وانتظامی، تجاویز واحکام نافذ ہوتے ہیں۔

اس طرح دارالعلوم کا نظام ۳۳ شعبوں پر منقسم ہے جن میں سے ہر شعبہ ایک مستقل ادارہ کی صورت رکھتا ہے، جس کا عملہ اور ذمہ دار انچارج الگ الگ ہے۔

دار العلوم کا نصابِ تعلیم

دار العلوم کے اصل موضوع اور مقصد کے سلسلہ میں سب سے زیادہ بنیادی اور اساسی چیز دار العلوم کا نصابِ تعلیم ہے، جس سے یہاں کے فضلاء کا دینی رُخ متعین ہوتا ہے، جو ہر تعلیمی شعبہ کا الگ الگ ہے۔ درجاتِ عربیہ کے نصاب میں ۲۲ علوم وفنون داخل ہیں جن میں کچھ علوم عالیہ ہیں جو مقاصد کا درجہ رکھتے ہیں اور کچھ علوم آلیہ ہیں جو علومِ عالیہ کے لئے ممد ومعاون یا وسائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

علومِ عالیہ

قرآن عظیم، تفسیر، اصولِ تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، علمِ عقائد وکلام، علمِ الاحسان (تصوف)، علم الفرائض والمواریث۔

علومِ آلیہ

صرف، نحو، معانی وبیان، ادب عربی، منطق، فلسفہ، عروض وقوافی، مناظرہ، ہیئت، ہندسہ، حساب، طب، تجوید، قراءت۔

حال ہی میں درجاتِ عربیہ میں بمقتضائے وقت نصاب میں جغرافیہ، تاریخ، مبادیٔ سائنس اور معلوماتِ عامہ کا مزید اضافہ کیا گیا ہے۔

دار العلوم میں درجہ بندی نہیں ہے بلکہ درجاتِ عربیہ کے پورے نصاب کو گیارہ (۱۱) سال پر تقسیم کر دیا گیا ہے، ایک سال کی مقررہ کتابیں ختم کرنے کے بعد طالب علم دوسرے سال کی مقررہ کتابوں کو پڑھتا ہے، البتہ اس میں فنون وکتب کی ترتیب پیش نظر رکھی گئی ہے تاکہ تمام علوم وفنون ایک خاص تناسب اور ترتیب کے ساتھ اول سے آخر تک زیر تعلیم آتے رہیں اور طالب علم کو تمام علوم کے ساتھ بیک وقت تدریجی مناسبت پیدا ہوتی رہے جیسا کہ ذیل کے سال وار مرتب نصاب سے واضح ہے۔

درجاتِ عربیہ کا گیارہ سالہ نصابِ تعلیم

سالِ اول

صرف (میزان الصرف، منشعب، پنج گنج، علم الصیغہ)۔ نحو (نحو میر، شرح مأتہ عامل)۔ عربی ادب (مفید الطالبین)۔ منطق (صغریٰ، کبریٰ)

سالِ دوم

صرف (فصولِ اکبری تا بحث مخارج، مراح الارواح)۔ نحو (ہدایۃ النحو کامل، کافیہ کامل)۔ عربی ادب (نفحۃ الیمن، دوباب، تحریر عربی)۔ منطق (مرقات، شرح تہذیب تا ضابطہ)۔ فقہ (نور الایضاح، قدوری)۔

سالِ سوم

نحو (شرح جامی بحث فعل وحرف وبحث اسم تا مبنیات)۔ عربی ادب (نفحۃ العرب، تحریر عربی)۔ منطق (قطبی تصدیقات، تا مختلطات)۔ فلسفہ (ہدیہ سعیدیہ)۔ فقہ (کنز الدقائق)۔ اصولِ فقہ (اصول الشاشی)۔

سالِ چہارم

علم معانی وبیان (مختصر المعانی، فن اول وثانی، تلخیص المفتاح تمام۔ منطق (قطبی تصورات تمام، میر قطبی تا مفہوم)۔ فقہ (شرح وقایہ تا ختم کتاب العتاق)۔ اصولِ فقہ (نور الانوار تا باب القیاس)۔ تفسیر (ترجمہ قرآن شریف اول پندرہ پارے)۔ تجوید وقراءت (مشق پارہ عم مع فوائد مکیہ)۔

سالِ پنجم

عربی ادب (مقاماتِ حریری ۲۰ مقامے، انشاء عربی)۔ منطق (سلم العلوم)۔ فقہ (ہدایہ اولین کامل)۔ اصولِ فقہ (حسامی تمام)۔ تفسیر (ترجمہ قرآن شریف آخری پندرہ پارے)۔

سالِ ششم

تفسیر (جلالین شریف تمام)۔ اصولِ تفسیر (الفوز الکبیر تمام)۔ منطق (ملاحسن تا بحث جنس)۔ فلسفہ (میبذی تمام)۔ علم کلام (مسامرہ تمام، شرح عقائد نسفی تمام)۔ علم الفرائض (سراجی)۔ اصولِ افتاء (رسم المفتی)۔

سالِ ہفتم

فقہ (ہدایہ اخیرین تمام) تفسیر (بیضاوی سورہ بقرہ سوا پارہ)۔ حدیث (مشکوٰۃ شریف تمام)۔ اصولِ حدیث (شرح نخبۃ الفکر تمام)۔ اصولِ فقہ توضیح تلویح تا بحث حقیقت ومجاز)۔ ہیئت (تصریح تمام)۔

سالِ ہشتم

حدیث {دورۂ حدیث} (نسائی، ابن ماجہ، ترمذی شریف، بخاری شریف، ابوداؤد شریف، مسلم شریف، شمائل ترمذی)۔

سالِ نہم

تفسیر: طحاوی شریف، مؤطا امام مالکؒ، مؤطا امام محمدؒ۔ بیضاوی شریف ثلث اول از رُبع ثانی پارہ سیقول تا سورہ مائدہ۔ بیضاوی شریف، ثلث ثانی از سورہ یونس تا سورہ مریم۔ بیضاوی شریف، ثلث ثالث از سورہ ق تا ختم قرآن شریف۔

دورۂ تفسیر

ابن کثیر، ثلث اول از سورہ آل عمران تا سورہ یونس۔ ابن کثیر، ثلث ثانی از سورہ رعد تا سورہ روم۔ ابن کثیر، ثلث ثالث از سورہ رُوم تا سورہ صف۔

درجہ تکمیل (سال اول)

ادب عربی (دیوانِ حماسہ، باب الحماسہ و باب المراثی، دیوان متنبّی تا قافیہ عین، سبعہ معلقہ، دو معلقہ) عروض وقوافی (نقطۃ الدائرۃ) علم المعانی (مطول تا بحث ما انا قلت) مناظرہ (رشیدیہ) منطق میر زاہد رسالہ تمام، میر زاہد ملا جلال تا بحث موضوع، صدرا دو فصل۔ فلسفہ شمس بازغہ تا بحث واتفاق، شرح چغمنی تا فصل رابع۔ ہیئت سبع شداد، بست باب تمام۔

درجہ تکمیل (سالِ دوم)

اصولِ فقہ (مسلم الثبوت) ریاضی (خلاصۃ الحساب اقلیدس) منطق (حمد اللہ تا شرطیات، قاضی مبارک تا ختم امہات المطالب، خیالی تا احوالِ برزخ)۔ علم کلام امورِ عامہ تا بحث وجودِ ذہنی، جلالی تا ختم صفات، عوارف المعارف)۔ حکمتِ شرعیہ (حجۃ اللہ البالغہ قسم اول)۔

نصابِ تعلیم صف عربی

صفِ ابتدائی

درس: کتبِ عربی، المطالعۃ المحمودۃ، المطالعۃ السعودیہ جزو ثالث، المطالعۃ المختارۃ، القراءۃ الرشیدۃ الذخیرۃ، معلم الانشاء جزو اول، المطالعۃ العربیہ خورد کے انتخابات اور ان کے سلسلہ میں عملی مشق)۔

ترجمہ: (اُردو سے عربی اور عربی سے اُردو ترجمہ)

تحریری کام: (رسم الخط کی مشق، املاء، الفاظ کے صحیح تلفظ)

اس درجہ میں درس زیادہ تر اُردو زبان میں ہوتا ہے مگر درس کا کچھ حصہ عربی زبان میں بھی ہوتا ہے، اس کی مدت ایک سال ہے۔

صفِ ثانوی

درس: کتبِ عربی، مدارج الانشاء، عربی اخبارات کا انتخاب، الذخیرۃ، معلم الانشاء جزء دوم وسوم، المطالعۃ السعودیۃ، حصہ خامس وسادس، المطالعۃ العربیۃ کلاں کے انتخابات اوران کے سلسلہ میں عملی مشق۔

انشاء: (ابتدائی انشاء) تقریر، اسلوب بیان، رقاع، املاء۔

کتاب محفوظات سے: قواعدِ نحو، حکم ومواعظ اور ضرب الامثال کوزبانی یاد کرنا، اشعار زبانی یاد کرنا۔

اس درجہ میں درس کا نصف حصہ اُردو زبان میں ہوتا ہے اور نصف حصہ عربی زبان میں، اس کی مدت ایک سال ہے۔

صفِ نہائی (آخری)

درس: معلم الانشاء العربی کلاں مصری، عربی زبان کے اخبارات، مضمون نگاری، تقریر، سیرت اورمختلف موضوعات پر معلوماتی مطالعہ۔

اس درجہ میں تدریس وتفہیم وغیرہ سب عربی زبان میں ہوتی ہے، اس کی مدت بھی ایک سال ہے، اس ادارۂ صفِ عربی کے سال وار جلسے اور اجتماعات ہوتے ہیں جس میں طلبہ عربی زبان میں تقریریں کرتے ہیں اور جلسے کے تمام معاملات عربی زبان ہی میں طے کئے جاتے ہیں، جس سے طلبہ کا حوصلہ بڑھتا ہے اور وہ نطق کے ساتھ عربی خطابت پر بھی قابو یافتہ ہوجاتے ہیں۔

نصاب درجہ قراءت وتجوید

نصاب درجہ اُردو حفص (سال اول)

مشق حروفِ تہجی، مخارج وصفات زبانی یاد کرنا، جمال القرآن، مشق پانچ پارے۔

نصاب درجہ اُردو حفص (سال دوم)

معرفۃ الوقوف، مشق قراءت پچیس پارے۔

نصاب درجہ حفص عربی (سال اول)

مشق حروف تہجی، مخارج وصفات زبانی یاد کرنا، فوائد مکیہ، جزری خلاصۃ البیان، مشق پارہ عم بروایت حفصؒ، اجراء پانچ پارے مع مشق لہجہ عربیہ۔

نصاب درجہ حفص عربی (سال دوم)

قرآن شریف پچیس پارے بروایت حفصؒ۔

نصاب سبعہ (عربی)

سال اول

شاطبیہ، رائیہ، مشق متفرق رکوع۔

سالِ دوم

اجراء قراءت سبعہ، مشق مختلف رکوع۔

نصابِ عشرہ (عربی)

سال اول

طیبہ، مشق متفرق رکوع۔

سالِ دوم

اجراء قراءت عشرہ، مشق متفرق رکوع۔

نصابِ تعلیم درجاتِ فارسی وریاضی دار العلوم دیوبند

درجات فارسی وریاضی میں مدتِ تعلیم پانچ سال رکھی گئی ہے۔اس شعبہ میں ادب فارسی،قواعد عربی،فقہ اُردو وفارسی،تاریخ اسلام،جغرافیہ،ہندی،حساب واقلیدس آٹھ مضامین زیر تعلیم ہیں۔

درجہ اول: ادب فارسی واُردو

مفید نامہ،قاعدہ تعلیم الاسلام،تعلیم الاسلام حصہ ۱،۲،اُردو کی دوسری کتاب۔**قواعد فارسی:** (حفظ مصادر مع مضارع،رسالہ نادر) **تاریخ:** (تاریخ الاسلام حصہ اول) **ریاضی:** ہندسہ سو(۱۰۰) تک،اعداد ومراتب،جمع تفریق بسیط،پہاڑہ ۲۰+۱۰ تک پوا،اڈّھا،دس تک۔

تحریری کام: (حروفِ تہجی لکھنا،مرکب جملوں کی مشق،جملوں کا املاء)

درجہ دوم: ادب فارسی واُردو

(گلزارِ دبستاں تمام،کریما مع ترجمہ،اُردو کی تیسری کتاب،تعلیم الاسلام حصہ ۳)۔**قواعد فارسی واُردو:** (آمد نامہ،رسالہ قواعد اُردو حصہ اول تمام)

تحریری کام: (اُردو کا املاء،ہفتہ میں ایک یا دو دن خط اور عرضی لکھنے کی مشق)۔**تاریخ:** (تاریخ الاسلام حصہ ۲، نصف اول)۔**جغرافیہ:** (اصطلاحاتِ جغرافیہ،جغرافیہ ضلع سہارنپور) **ہندی ادب:** (قاعدہ ہندی پرائمری) **ریاضی:** (ضربِ بسیط،تقسیمِ بسیط،تحویل ادنیٰ واعلیٰ جمع وتفریق،ضرب وتقسیم مرکب،پونا سوایا)۔

درجہ سوم: ادب فارسی واُردو

(گلستاں،چہار باب مع دیباچہ،پند نامہ عطار تا صفحہ ۳۰،انشاء فارغ تمام،تعلیم الاسلام حصہ چہارم)۔**قواعد فارسی:** (احسن القواعد تا بیان حروفِ مرکبہ) **تاریخ:** (تاریخ الاسلام ۲،نصف ثانی) **جغرافیہ:** (جغرافیہ صوبہ متحدہ آگرہ واودھ) **ہندی ادب:** (شکشا سوپان،پہلی سیڑھی،ہندی لکھنا)۔ **ریاضی:** (ذو اضعاف اقل،مقسوم علیہ اعظم،کسروں کا مفرد بنانا،کسور کا مقابلہ،جمع وتفریق،ضرب

وتقسیم، کسور عام، جمع وتفریق، کسورِ اعشاریہ)۔

درجہ چہارم: ادب فارسی واُردو

(بوستاں چہار باب، رقعاتِ عالمگیری)۔**فقہ:** (مالابدمنہ تا کتاب الحج)،**قواعد فارسی:** (احسن القواعد باب اول تا ص ۳۷)**صرف عربی:** (الصرف، منشعب، پنج گنج، صرف میر)،**تاریخ:** (تاریخ الاسلام حصہ ۳)،**جغرافیہ:** (تذکرہ سرزمین ہند معہ نقشہ دانی)،**ادب ہندی:** (شکشا سوپان، دوسری سیڑھی، ہندی لکھنا)،**ریاضی:** ضرب کسور اعشاریہ، تقسیم کسور اعشاریہ، جذر المربع اعداد صحیح، جذر المربع کسور عام وکسور اعشاریہ، حساب تجارت مفرد ومرکب، مربع، مستطیل، کمروں کا رقبہ نکالنا۔

تحریری کام: (درجہ سوم وچہارم میں اُردو سے فارسی اور فارسی سے اُردو میں ترجمہ کرایا جائے۔)

درجہ پنجم: ادب فارسی

(سکندر نامہ تا ختم رفتن سکندر درعجم ص ۱۴۴، انوار سہیلی صرف باب اول بغیر دیباچہ، مثنوی شریف دفتر اول نصف)۔**تحریری کام:** (فارسی میں مضمون لکھنے کی مشق، ہفتہ میں ایک مضمون)،**قواعد فارسی:** (احسن القواعد باب دوم کی فصل دوم وسوم ص ۳۷ تا ص ۷۰)،**عربی نحو:** (نحو میر، شرح مأتہ عامل)،**منطق:** (کبریٰ)،**عربی ادب:** (مفید الطالبین)،**جغرافیہ:** (تذکرہ سرزمین ایشیاء معہ نقشہ دانی)،**تاریخ:** (سرور المحزون)،**ریاضی:** (تحریر اقلیدس مقالہ اول بغیر نتائج غیر صریحہ، یونیٹری طریقہ، اربعہ متناسبہ اوسط فیصدی تناسب)۔

نصاب درجہ حفظ قرآن شریف

اس درجہ میں طلبہ کو پورا قرآن شریف حفظ کرایا جاتا ہے اس کے لئے کوئی مدت معین نہیں ہے ہر طالب علم اپنی استعداد کے مطابق مدت صرف کر کے قرآن شریف حفظ کر لیتا ہے۔عموماً اوسطاً ایک طالب علم کو پورا قرآن شریف حفظ کرنے میں ۴ سال خرچ کرنے پڑتے ہیں۔اس بات کی سعی کی جارہی ہے کہ اس سے کم مدت میں حفظِ قرآن شریف مکمل ہو جائے۔

درجاتِ ابتدائی اُردو دینیات کے لئے نصاب

درجہ اول

دینیات

(ا) قرآن شریف ناظرہ: قاعدہ، نصف پارہ عم مع تصحیح مخارج۔

(ب) قرآن شریف حفظ: تسمیہ، تعوذ، ثناء، درود شریف، الم ترکیف تک سورتیں حفظ۔

(ج) مذہبی عقائد: (کلمہ طیبہ مع مطلب زبانی)

(د) فقہ (زبانی): صفائی کی خوبیاں اور فائدے، بدن کو پاک رکھنا، کپڑوں کو پاک رکھنا، مسواک کرنا۔

(ہ) اخلاق (زبانی): لوگوں سے اچھا معاملہ کرنا، ماں باپ کی تعظیم، بڑوں کا ادب چھوٹوں پر مہربانی، سچ بولنا، دیانت داری کی خوبی، جھوٹ اور چوری کی برائی۔

(و) رہن سہن کے طریقے (زبانی): سلام کرنا، خندہ پیشانی سے ملنا، کھانے پینے کے آداب حروف شناسی اور رواں پڑھنا، املاء حروف ہجا اور ان کی مختلف صورتوں کی مشق تختی پر۔

حساب

(گنتی سو تک)

درجہ دوم

دینیات

(ا) قرآن شریف ناظرہ تا ختم پارہ لایحبّ اللہ (مع تصحیح مخارج)

(ب) قرآن شریف حفظ تا سورہ لم یکن۔

(ج) عقائد: اللہ تعالیٰ کی تعریف اور صفات (اجمالی طور پر) نبی، رسول، مشہور انبیاء علیہم السلام کے نام، نبیوں کے کام، سب سے پہلے نبی اور سب سے آخری نبی، اسلام اور مسلمان ہونے کا

مطلب، کلمہ شہادت معہ ترجمہ۔

(د) سیرت: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش، خاندان، وطن، شیرخوارگی، بچپن، ابوطالب کی سپردگی اور سفر تجارت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذریعۂ معیشت، شام کا دوسرا سفر، نکاح، سب سے پہلی بیوی، نبوت کا ملنا، سب سے پہلے مسلمان، تبلیغ، توحید کی تعلیم، راہِ حق میں مصیبتیں۔

(ہ) فقہ اور ضروری مسائل: بدن، کپڑوں اور جگہ کو پاک کرنے کا طریقہ، وضو کی خوبیاں، وضو کا طریقہ، وضو توڑنے والی چیزیں، نماز، نماز میں کیا پڑھا جاتا ہے۔

(و) اخلاق: ماں باپ کے احسانات، ان کی خدمت، رشتہ داروں کے ساتھ برتاؤ، بڑوں کا ادب، مخلوقِ خدا کی خدمت، اپنوں اور پرایوں سے اچھا سلوک، جانداروں پر رحم، سچ اور جھوٹ بری باتوں سے زبان کو روکنا۔

(ز) اسلامی تہذیب: بدن کی صفائی، کپڑے، مدرسہ، مکتب اور رہنے کی جگہ کی صفائی، مجلسی آداب، سلام ومصافحہ، ادب سے بات چیت، اچھے اور برے کھیل تماشے۔

اُردو

(ا) پڑھنا: درسی کتاب سے دیکھ کر عبارت پڑھنا، الفاظ اور جملوں کے معنی، عبارت کا مطلب۔

(ب) لکھنا: درسی کتاب کے الفاظ، جملوں اور عبارت کو تختی پر نقل کرنا، درسی کتاب کے آسان الفاظ اور جملوں کا املاء۔

حساب

پہاڑے پانچ تک، علامات جمع وتفریق، سادہ جمع تفریق جس کا مجموعہ بیس سے زیادہ نہ ہو، آدھ آنہ، ایک آنہ اور دو آنے کے پیسے، روپیہ کے آنے اور روپئے کے پیسے۔

معاشرتی علوم

تاریخ

(زبانی): سیرتِ مبارک کے خاص خاص واقعات زبانی بیان کر کے تاریخ کا تصور اور فوائد ذہن نشین کرائے جائیں اور بچوں میں سلیقہ پیدا کیا جائے کہ وہ سنے ہوئے واقعات ذہن نشین کریں پھر اپنے الفاظ میں اُن کا مفہوم ادا کریں۔

درجہ سوم

دینیات

(ا) قرآن شریف (ناظرہ): تا ختم پارہ بستم مع تصحیح مخارج۔

(ب) قرآن شریف (حفظ): نصف پارہ عم مع تصحیح مخارج۔

(ج) عقائد: توحید، صفاتِ خداوندی، اسمائے حسنیٰ، مشہور پیغمبروں کے نام، فرشتے، خدا کی کتابیں، قیامت، جنت اور دوزخ، عذاب وثواب۔

سیرت: مکہ معظّمہ میں ترقی اُسلام اور مخالفوں کی سازشیں، ہجرتِ حبشہ، شعبِ ابی طالب میں محاصرہ، حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کی وفات، دوسرا نکاح، بازاروں اور محلوں میں تبلیغ، سفر طائف، اہل مدینہ سے تعلق، مدینہ منورہ میں اسلام، ہجرت کا ارادہ، صحابہ کی دعوت، قریش کے منصوبے۔

(ہ) فقہ: وضو، فرائض وضو، آدابِ استنجاء، اذان وتکبیر، نماز پڑھنے کا طریقہ، رکوع وسجدہ وغیرہ کا صحیح طریقہ۔

(و) اخلاق: حق کا مطلب، حق داروں کے مرتبے، حقوق اللہ، حقوق العباد، خدمتِ خلق، شکر واحسان مندی، بڑوں کا احترام، ایفائے عہد، اچھی بری صحبت، دشمنوں کو دوست بنانے کا طریقہ، غیبت کسے کہتے ہیں، غیبت، چغلی اور جھوٹ۔

(ز) اسلامی تہذیب: آدابِ ملاقات، آدابِ گفتگو، آدابِ مجلس، کھانے پینے کے آداب۔

اُردو تحریر

املاء چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھائی جائیں، خط لکھنا سکھایا جائے۔

حساب

جمع، تفریق، ضرب، تقسیم (سادہ) پہاڑے دس سے بیس تک اور اُن کے متعلق سوالات کی زبانی مشق اور تحریری مشقوں، کسروں اور روزمرہ کے پیمانوں کا تصور۔

معاشرتی علوم

تاریخ

(زبانی): آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعات بیان کر کے ان کی مقدس زندگی اور پاک خدمات کا تصور بیٹھایا جائے۔

درجہ چہارم

دینیات

(ا) قرآن شریف (ناظرہ): تا ختم قرآن پاک مع تصحیح مخارج۔

(ب) قرآن شریف (حفظ): پورا پارہ عم سورہ یٰسین، آیت الکرسی۔

(ج) عقائد: شرک اور کفر کا اجمالی بیان، جلیل القدر ملائکہ اور ان کے نام، نبوت، ختم نبوت، وحی، معجزہ، قرآن شریف۔

(د) سیرت: مدینہ منورہ میں تشریف آوری سے وفات تک کے حالات اور غزوات وسرایا۔

(ہ) فقہ: فرائض، سنن ومستحبات وضو، فرائض وسنن غسل، اقسامِ نجاست، پانی کی پاکی و ناپاکی، تیمّم (کن چیزوں سے تیمّم کرسکتے ہیں) اوقاتِ نماز، اوقاتِ ممنوعہ، مکروہ اوقات، فرائض وسنن نماز، فرض، واجب، سنن موکدہ، سنن رواتب، نفل، جماعت، فوائد وفضائل جماعت، مقتدی، منفرد، امام، نمازِ جمعہ اور اس کے ضروری مسائل۔

(و) اخلاق: الحب فی اللہ والبغض فی اللہ، حقوق العباد، ماں باپ رشتہ دار اور پڑوسیوں کے حقوق، صلہ رحم، حسن سلوک، نرم دلی، خیر خواہیٔ خلقِ خدا کے فضائل وخوبیاں، حسد، بغض، خیانت

وغیرہ کی قباحتیں، غصہ اوراس کا صحیح استعمال۔

(ز) آدابِ معاشرت: حلال، حرام، مکروہ اور مباح کھانے، دسترخوان کے آداب، مہمان، سونے اور جاگنے کی دعائیں اوراُن کے آداب، وضع قطع، لباس، محلّہ اور گلی کی صفائی، برتنوں کی صفائی، مسکرات سے اجتناب، اسراف وبخل سے اجتناب۔

حساب

چاروں مرکب قاعدے، ہندوستانی سکوں، اوزان اور پیمانوں میں کسری پہاڑے، پوا، ادّھا، پونا، سوایا، دس تک، دام اور تول لکھنے کا طریقہ۔

معاشرتی علوم

(ا) تاریخ (زبانی): خلفائے راشدین، صحابہ کرام اوراکابرِ دین کے حالات۔

(ب) جغرافیہ: سمتیں، قبلہ کی سمت نقشہ میں، کھیت، باغ، مکان اور سڑکوں وغیرہ کی علامتیں نقشہ میں، گاؤں، تھانہ، پرگنہ، دریا، پہاڑ، جزیرہ، جھیل وغیرہ۔ اصطلاحاتِ جغرافیہ۔

دار العلوم کی سندیں اور سرٹیفکیٹ

دار العلوم میں درجاتِ عربیہ سے فارغ ہونے والوں کو تین سندیں دی جاتی ہیں۔

(ا) **سند العالم:** یہ سند اس شخص کو دی جائے گی جو دورۂ حدیث کا امتحان پاس کرلے۔

(ب) **سند الفاضل:** یہ سند اس شخص کو دی جائے گی جو دورۂ حدیث کے علاوہ دورۂ تفسیر بھی پڑھ چکا ہو۔(۱)

(ج) **سند الکامل:** یہ سند اس شخص کو دی جائے گی جو درجہ تکمیل کے علوم وفنون پڑھ چکا ہو۔ پھر مذکورہ بالا تینوں سندیں طالب علم کی استعداد اور اخلاقی حالت کے اعتبار سے تین درجے کی ہیں: اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ۔ جن میں بہ تفاوت الفاظ اور عنوان امتیاز رکھا گیا ہے۔ یہ سب سندیں عربی میں

(۱) اب دورۂ حدیث شریف سے فراغت کے بعد ہی ''فاضل'' کی سند دی جاتی ہے۔ درجاتِ تکمیل سے فراغت کے بعد اسی درجہ کی سند دی جاتی ہے، نہ کہ سند ''کامل'' وغیرہ۔ محمد عمران قاسمی بگیانوی

ہوتی ہیں۔ مذکورہ بالا تینوں سندوں کو علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، جامعہ ازہر قاہرہ (مصر) اور مدینہ یونیورسٹی مدینہ منورہ (حجاز) نے منظور کرلیا ہے۔

درجاتِ فارسی سے فارغ ہونے والے کو صرف ایک سند دی جاتی ہے۔ درجہ تجوید سے فارغ ہونے والے کو ایک سند دی جاتی ہے۔

درجہ ابتدائی دینیات سے فارغ ہونے والے کو طلب کرنے پر سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے۔ اس درجہ کے علاوہ اگر نصاب کی تکمیل سے پہلے کوئی شخص کسی مجبوری کی وجہ سے دارالعلوم کو چھوڑنا چاہے تو جس درجہ تک کی کتابیں اس نے پڑھیں ہیں اس کا سرٹیفکیٹ (تصدیق نامہ) دے دیا جاتا ہے۔ فراغت کے بعد اگر کوئی شخص سند کے علاوہ سرٹیفکیٹ بھی لینا چاہے تو اسے ایک مطبوعہ سرٹیفکیٹ بھی دیا جاتا ہے جو اُردو اور انگریزی میں ہے۔

دارالعلوم کا ملک کے دوسرے اداروں سے رابطہ

(۱) ملک کے دوسرے علمی اور ثقافتی اداروں سے دارالعلوم کا بھی ربط قائم ہے چنانچہ دارالعلوم کے کارکن ادارہ ثقافتِ ہند کے ممبر بنائے گئے۔

(۲) دارالعلوم وقتاً فوقتاً ہندوستان میں منعقد ہونے والی تعلیمی اور ثقافتی نمائشوں میں بھی ان کی درخواست پر باضابطہ شرکت کرتا ہے اور اس کی مخطوطات وہاں بھیجی جاتی ہیں، جس سے دارالعلوم کے کتب خانہ اور نوادر کے ذخیرے کی عظمت قائم ہوتی ہے۔

(۳) طبی اداروں میں اس کے کتب خانہ کی قلمی اور نادر کتابیں بھیجی جاتی ہیں۔

(۴) تصنیفی اداروں میں (مثلاً حیدرآباد دکن وغیرہ) یہاں کے نمائندے شریک ہوتے ہیں اور مخطوطات بھیجی جاتی ہیں۔

(۵) سرکاری کمیشنوں جیسے لسانی کمیشن یا اوقاف کمیشن وغیرہ میں بھی دارالعلوم کی مختلف اوقات میں شرکت ہوتی ہے اور شاہد طلب کئے جانے پر بطور نمائندہ شاہدین کو بھیجا جاتا ہے۔

جرائدِ دارالعلوم

دارالعلوم سے دو رسالے نکلتے ہیں:

(۱) رسالہ دارالعلوم

یہ رسالہ اُردو میں نکلتا ہے اور اس میں علمی مضامین شائع کئے جاتے ہیں جو مختلف اصولی، فروعی اور تاریخی مسائل پر مشتمل ہوتے ہیں، نیز معلوماتی ذخیرہ کافی حد تک پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ایک دینی اور علمی رسالہ ہے۔

(۲) رسالہ دعوۃ الحق

یہ رسالہ عربی زبان میں شائع ہوتا ہے جس میں اکابرِ دارالعلوم کے علمی اور مسلکی مضامین عربی میں شائع کئے جاتے ہیں تاکہ اکابرِ دارالعلوم کے علوم جو اُردو میں ہونے کی وجہ سے عرب ممالک تک نہیں پہنچ سکے پہنچ جائیں اور اُن سے عربی ممالک بھی مستفید ہوسکیں اور ساتھ ہی دارالعلوم کی خدمات اور کارناموں سے واقفیت حاصل کرسکیں۔ (۱)

(۵) دارالعلوم کا دفاع عن الدین

دارالعلوم کی جماعت اپنے مسلک کی ہمہ گیری کی وجہ سے ہر فتنہ کی مدافعت کے لئے سینہ سپر رہی خواہ وہ فتنہ نقل و روایت کی راہوں سے آیا یا عقلیت پسندی کی بنیادوں سے اُٹھا۔ اس جماعت نے ہر دور میں اعلائے کلمۃ اللہ اور امر بالمعروف کا فرض ادا کیا اور اسی اسلوب اور اسی رنگ میں جس رنگ ڈھنگ میں کسی دینی فتنہ نے سر اُٹھایا متصوفین بے تصوف کی جانب سے بدعات، محدثات اور شرکیہ حرکات کا فتنہ روایتی انداز میں اُبھرا تو اس نے روایتی ہی طور پر مقابلہ کیا اور فتنہ کی بے سروپا اور

(۱) اب رسالہ دعوۃ الحق تو بند ہوچکا ہے البتہ اس کی جگہ ''الداعی'' جاری ہے جس کو مولانا نور عالم صاحب خلیل الامینی کی ادارت نے چار چاند لگا رکھے ہیں اور ہندوعرب کی عربی صحافت میں ایک باوقار مقام اسے حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ''آئینہ دارالعلوم'' کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار بھی جاری ہوا تھا، اب معلوم نہیں نکل رہا ہے کہ نہیں۔ محمد عمران قاسمی بگیانوی

بے سند روایتوں کی قلعی کھول کر شریعت وطریقت کی مستند نقول سے اس کا استیصال کیا اور مقابلہ میں نقل وروایات کا ایک بڑا ذخیرہ پیش کر دیا۔

مدعیانِ عقل واجتہاد کی طرف سے آزادئ فکر، عدمِ اتباعِ سلف اور نیچریت کا فتنہ عقل کا سہارا لے کر دین میں داخل ہونے لگا تو اس نے عقلی دلائل پیش کر کے کامیاب مدافعت کی اور جس کے لئے حضرت بانئ دارالعلوم قدس سرہٗ نے ایک مستقل حکمت ہی مدوّن فرما دی جس کے سامنے فلسفہ کسی بھی روپ میں آیا تو اس نے فلسفہ کے اندازِ قد کو پہچان کر اس کے راستے روک دیئے۔

غرض بدعت پسندی، ہواپرستی، دہریت نوازی بے قیدی، مطلق العنانی اور آزادئ افکار کی جڑیں دارالعلوم نے کھوکھلی کر کے عقل ونقل، روایت ودرایت اور حکمت ودین کی جڑیں مضبوط کر دیں۔

(۶) دارالعلوم نے ملک کو کیا نفع پہنچایا

دارالعلوم نے اس نوعیت کے افراد پیدا کئے جنہوں نے تعلیم، تزکیہ، اخلاق، تصنیف، افتاء، مناظرہ، صحافت، خطابت، تذکیر، تبلیغ، حکمت اور طب وغیرہ میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ان افراد نے کسی مخصوص خطہ میں نہیں بلکہ ہندوپاک کے ہر ہر صوبہ اور بیرونی ممالک میں قابل قدر کارنامے انجام دیئے۔ ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۲ھ تک سو سال کی مدت میں اگر دارالعلوم دیوبند کی ان خدمات کا جائزہ لیا جائے جو اس نے ہندوپاک میں انجام دیں تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں ملکوں کے ہر ہر حصہ میں اس نے اپنے ایسے فرزندانِ رشید پہنچائے جو اس خطہ میں آفتاب وماہتاب بن کر چمکے اور مخلوقِ خدا کو ظلمتِ جہل سے نکال کر انہوں نے نوعِ علم سے مالا مال کر دیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے فضلائے دارالعلوم کی صوبہ وار فہرست ۱۲۸۳ھ تا ۱۳۸۲ھ درجِ ذیل ہے۔

ہندوستان

نمبر شمار	نام صوبہ	تعداد فضلاء	نمبر شمار	نام صوبہ	تعداد فضلاء
۱	یوپی	۱۸۹۶	۲	مغربی بنگال	۱۵۱

۳	آسام ومنی پور	۲۶۵	۴	بہار واڑیسہ	۷۸۰
۵	مدراس	۳۰	۶	ٹراونکور	۴
۷	کیرالہ	۴۲	۸	آندھرا	۵۲
۹	میسور	۶	۱۰	مدھیہ پردیش	۲۸
۱۱	مشرقی پنجاب وہریانہ	۱۹۶	۱۲	دہلی	۱۲
۱۳	مہاراشٹر	۳۹	۱۴	گجرات	۱۳۸
۱۵	راجستھان	۴۳	۱۶	جموں کشمیر	۳
۱۷	نیپال	۳			
				میزان کل فضلاءِ ہندوستان	۳۷۹۵

فضلائے پاکستان

نمبر شمار	نام ملک	تعداد فضلاء	نمبر شمار	نام ملک	تعداد فضلاء
۱	مغربی پاکستان	۱۵۱۹	۲	مغربی پاکستان	۱۶۷۲
میزان پاکستان		۳۱۹۱	میزان ہندوستان		۳۷۹۵
				میزان کل فضلاء ہندوستان وپاکستان	۶۹۸۶

ان فضلائے دار العلوم نے اپنے اپنے وقت میں اپنے اپنے رنگ سے دین کے کسی نہ کسی شعبہ میں شخصی یا اجتماعی حیثیت سے کام کیا اور کر رہے ہیں۔

دار العلوم کے فیوض بیرونِ ہند میں

پھر دار العلوم نے اپنے علمی فیوض سے صرف ہند و پاک ہی کو بہرہ اندوز نہیں کیا بلکہ ایشیاء اور افریقہ کے اسلامی ممالک بھی اس کی ضیا پاشیوں سے جگمگا اٹھے، چنانچہ غیر ملکی فضلاء دار العلوم کی فہرست از ۱۲۸۳ھ تا ۱۳۸۲ھ مندرجہ ذیل ہے۔

تعداد فضلائے دار العلوم بیرونِ ہند و پاک

نمبر شمار	نام ملک	تعداد فضلاء	نمبر شمار	نام ملک	تعداد فضلاء
۱	ملیشیا	۲۸	۲	چین	۴۴
۳	روس بشمول سائبیریا	۷۰	۴	افریقہ	۱۴
۵	عراق	۲	۶	ایران	۱۱
۷	کویت	۲	۸	انڈونیشیا	۱
۹	سعودی عرب	۲	۱۰	یمن	۱
۱۱	سیام	۱	۱۲	سیلون	۲
۱۳	ملائشیا	۲۸	۱۴	افغانستان	۱۰۹

بیرونِ ممالک کے فضلاء کی تعداد ۴۳۱

ہند و پاک کے فضلاء کی تعداد ۶۹۸۶

ہندوستان اور بیرونی ممالک کے فضلاء کی مجموعی میزان ۷۴۱۷

فضلائے کرام کے علاوہ جن طلباء نے دار العلوم سے استفادہ کیا ان کی تعداد	۵۸۳۱۰
ان فضلائے کرام اور طلبہ کی مجموعی تعداد جنہوں نے دار العلوم سے استفادہ کیا۔	۶۵۷۲۷

تفصیلات آئندہ صفحات میں آ رہی ہیں۔

(۸) دار العلوم کا حصہ تصانیف میں

دار العلوم کا مسلک اور مخصوص رنگ علمائے دار العلوم کی تصانیف میں صاف نمایاں رہا۔ ہمیشہ بروقت اور برمحل تصانیف اس احاطہ سے نکلتی رہیں۔ دار العلوم نے سو سال کے عرصہ میں ۱۱۶۴ مصنّفین پیدا کئے جن میں سے تقریباً ۲۷۶ درجہ اعلیٰ کے مصنّفین ہیں۔ علماءِ دار العلوم میں سے چند مشہور ومعروف مصنّفین کی فہرست درجِ ذیل ہے۔

نام مصنف	تصنیف کا رنگ
(۱) حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانیٔ دار العلوم دیو بند	متکلمانہ
(۲) شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ	محدثانہ
(۳) حضرت خلیل احمد صاحب انبیٹھویؒ	محدثانہ
(۴) حضرت مولانا محمد اشرف صاحب تھانویؒ	عارفانہ، صوفیانہ اور مفسرانہ
(آپ کی تصانیف کی تعداد جو ہر علم وفن میں ہیں، ایک ہزار سے زائد ہے)	
(۵) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ	محدثانہ
(۶) حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ	مناظرانہ
(۷) حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ	محدثانہ، فقیہانہ ومناظرانہ
(۸) حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ	سیاسی وفقیہانہ
(۹) حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ	مؤرخانہ
(۱۰) حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ	فقیہانہ ومؤرخانہ

(۱۱) حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ	محشّیانہ، فقیہانہ، ادیبانہ
(۱۲) حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ	فلسفیانہ ومتکلمانہ
(۱۳) حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانیؒ	مؤرخانہ ومحققانہ
(۱۴) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ	فقیہانہ
(۱۵) حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مدظلہٗ	محدثانہ ومتکلمانہ
(۱۶) حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مدظلہٗ، مہاجر مدنی	محدثانہ
(۱۷) حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ	سیاسی ومؤرخانہ
(۱۸) حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہٗ	مؤرخانہ
(۱۹) حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی مدظلہٗ	ادیبانہ ومؤرخانہ
(۲۰) حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہٗ	محدثانہ
(۲۱) حضرت مولانا عبد الصمد صاحب صارم سیوہاری مدظلہٗ	محققانہ

(۲۲) احقر کو اس فہرست میں اپنا نام شمار کراتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے، تاہم تحدیثا للنّعمۃ اظہارِ نعمت بھی شکرِ نعمت ہے کہ اس ناکارہ کی تالیفات کا عدد بھی جو مختلف موضوعات پر ہیں تقریباً سوا سو (۱۲۵) ہے، جن کا رنگ ان کے مطالعے سے واضح ہوسکتا ہے۔

مشاہیر دار العلوم دیو بند

علمائے دیو بند میں ایسے مشاہیر بھی ہوئے جو اپنے اپنے وقت کے امامِ ملت، علم وعمل کا نمونہ، خواص وعوام کی رشد وہدایت کا مرکز، روایتِ حدیث، رنگِ تفسیر، فقہ و درایت میں راسخ اور ذاتی خدا پرستی کے ساتھ مخلوق کے حق میں مربیٔ اخلاق و مصلحِ دین اور دوسرے قومی وملکی امور میں مسلمہ طور پر قائد تسلیم کئے گئے ہیں۔ مثلاً:

اسماء گرامی مشاہیر دار العلوم

ا۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانیٔ دار العلوم دیو بند

آپ بانیٔ دار العلوم ہیں مگر جماعت کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے نیز اس حیثیت سے کہ تاسیس وبناءِ دار العلوم بھی دار العلوم ہی کی ایک نسبت ہے، اس موقعہ بھی پر آپ کا تذکرہ کر دیا گیا۔

خدمات

(۱) مذہبی خدمات

متعدد مناظرے عیسائیوں اور آریہ سماجیوں سے کئے، تصانیف اور تقریروں کے ذریعہ ولی اللّٰہی مسلک کی وضاحت اور اشاعت کی، متکلمانہ اور عارفانہ انداز سے اصولِ اسلامیہ اور اساسی عقائد دین کو عقلی دلائل سے مستحکم اور مضبوط کیا اور دین اسلام کی سرحدات کو اتنا مضبوط بنا دیا کہ اغیار کے حملے ان پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔

(۲) سیاسی خدمات

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں عملی اور قائدانہ حصہ لیا۔ جنگِ شاملی میں خود سپاہیانہ جنگ کی۔

(۳) سماجی اصلاحات

معاشرہ (سوسائٹی) میں غلط قسم کی رسوم سے جو ابتری پھیلی ہوئی تھی اُسے پہلے اپنے گھر سے ختم کیا اس کے بعد دوسروں کو ان کے ترک پر آمادہ کر کے معاشرے کو صاف کیا جس کی تفصیل کتاب ''مسلکِ دار العلوم'' میں بقدرِ ضرورت کر دی گئی ہے۔ مزید تفصیلات کیلئے کتاب ''سوانح قاسمی'' ملاحظہ ہو۔

۲۔ قطبِ ارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ

آپ بھی دارالعلوم کے طالب علم نہیں بلکہ بانیوں میں ہیں اور سربراہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔مگر چونکہ یہ بھی دارالعلوم ہی کی ایک نسبت ہے اس لئے اس موقعہ پر بھی آپ کا تذکرہ کیا گیا۔

خدمات

(۱) دینی خدمات

علم حدیث، فقہ اور تصوف سے بہت زیادہ شغف رہا، ہزار ہا انسانوں نے آپ سے استفادہ کیا۔آپ نے علماء کی دینی تربیت فرمائی اور انہیں دین کے بارے میں اتنا راسخ اور مستحکم بنادیا کہ ان افراد پر کوئی بھی فتنہ اثر انداز نہ ہوسکا۔

(۲) سیاسی خدمات

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں حضرت نانوتویؒ کے دوش بدوش قائدانہ حصہ لیا اور نو ماہ تک اسیرِ فرنگ رہے، جن لوگوں نے ان سیاسی اور جہادی خدمات پر پردہ ڈالنا چاہا ہے، خواہ اپنی لاعلمی اور معاملات سے بے خبری کی بناء پر یا اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے، ان کی مصلحت اندیشی لایعبا بہ اور باخبر لوگوں کے نزدیک لغو ہے۔

۳۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ

خدمات

(۱) دینی خدمات

آپ حضرت نانوتویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور حضرت کے بعد قاسمی علوم کا جو فیضان عالم میں آپ کی ذات سے ہوا اس کی نظیر دوسرے تلامذہ میں نہیں ملتی۔اپنے استاد میں فانی، استاد کے علم میں غرق تھے۔دین کے ہر دائرے میں آپ کی خدمات نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔

درس، تصنیف، ارشاد وتلقین اور جذبۂ جہاد وغیرہ میں آپ کی خاموش خدمتیں زبانِ حال سے گویا ہیں۔ آپ اپنے استاد حضرت نانوتویؒ کے علوم کے امین اور خزینہ دار تھے۔ آپ نے ان علوم کی ایضاح وتفصیل اور تفہیم وتیسیر میں نمایاں حصہ لیا اور عظیم خدمات انجام دیں۔

حضرت نانوتویؒ کی تصانیف کی اعلیٰ ترین طباعت بہ تزئین حواشی وعنوانات آپ ہی نے شروع فرمائی اور ''حجۃ الاسلام'' پر آپ ہی نے سب سے پہلے عنوانات قائم کئے۔ قرآن شریف کا ترجمہ فرمایا، بخاری کے ابواب وتراجم پر ایک جامع اور دبیز رسالہ تصنیف فرمایا، متعدد مناظرانہ تصانیف بھی فرمائیں اور مناظرے بھی کئے۔

دارالعلوم دیوبند میں چالیس برس تک مسلسل درسِ حدیث دے کر (۸۶۰) اعلیٰ استعداد کے صاحبِ طرز عالمِ دین، فاضلِ علوم اور ماہرین فنون پیدا کئے۔ آپ کا درسِ حدیث اس دور میں امتیازی شان رکھتا تھا اور مرجع علماء تھا۔ آپ کو علمائے عصر نے محدثِ عصر تسلیم کیا۔ بیعت وارشاد کے راستہ سے ہزار ہا تشنگانِ معرفت کو عارف باللہ بنایا اور آپ کا سلسلۂ طریقت ہندوستان سے گذر کر افغانستان اور عرب تک پہنچا۔ متعدد علمی تصانیف آپ نے ترکہ میں چھوڑیں۔

(۲) سیاسی خدمات

ہندوستان کو غیر ملکیوں سے آزاد کرانے کے لئے ایک زبردست انقلابی تحریک چلائی جس کو ریوولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں ''ریشمی رومال کی تحریک'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ تحریک بہت زیادہ مؤثر تھی مگر راز میں نہ رہ سکی اور ناکام ہوگئی۔ پھر بھی اس کی آگ جن کے دلوں میں لگی ہوئی تھی، انہوں نے آئندہ کام کر کے ہندوستان کو آزاد کرایا۔ آپ تقریباً پانچ برس مالٹا میں قید رہے۔

۴۔ حضرت مولانا عبداللہ صاحب انبیٹھویؒ

آپ حضرت بانئ دارالعلوم دیوبند کے داماد تھے۔ حضرت کے تلامذہ میں سے بھی تھے۔ حضرت حاجی امداداللہ صاحب قدس سرہٗ کے خلیفہ مجاز تھے۔ مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کے پاس عرصہ تک قیام رہا۔ سرسیدؒ نے آپ کو علی گڑھ بلا کر مسلم یونیورسٹی میں ناظم دینیات کے عہدہ پر

فائز کیا۔ سرسید اس پر اظہارِ مسرت کیا کرتے تھے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھی مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی نسبت سے خالی نہیں ہے۔

احقر نے بھی مولانا عبداللہ صاحبؒ سے اجازتِ حدیث حاصل کی ہے۔

۵۔ حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب امروہویؒ

آپ حضرت نانوتویؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے اور جلیل القدر محدث تھے۔ آپ مدرسہ جامع مسجد امروہہ میں جسے حضرت نانوتویؒ نے قائم فرمایا تھا، ایک طویل عرصہ تک بحیثیت صدرالمدرسین فائز رہے اور آخر عمر تک درسِ حدیث میں منہمک رہے۔ آپ علومِ قاسمیہ کے امین تھے اور ان کی ترویج میں عمر بھر نمایاں حصہ لیتے رہے، اپنی مخصوص صلاحیتوں کے لحاظ سے آپ علومِ قاسمیہ کی مجسم تصویر اور بالفاظِ دیگر حضرت نانوتویؒ کے مثیل شمار کئے جاتے تھے۔ آپ کا فیضانِ علمی دور دور تک پہنچا اور سینکڑوں طالب علم آپ کے درس سے عالم وفاضل بن کر نکلے۔ عالم بے مثل حضرت مولانا عبدالرحمٰن خاں صاحب خورجویؒ، مفسر شہیر حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب امروہویؒ اور اس قسم کے دوسرے اور بھی بہت سے ماہرین علم وفضل آپ کے تلامیذ ہیں جن سے علم و دین پھیلا اور ایمان وعرفان کا رنگ دلوں میں جما۔

۶۔ حضرت مولانا حکیم جمیل الدین صاحب نگینویؒ

آپ مشہور اطباء میں سے تھے۔ حکیم اجمل خاں صاحبؒ کے استاد تھے۔ طبیہ کالج دہلی کے ممتحن رہے، آخر دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی ہو گئے تھے۔ باوقات بزرگ، معمولات کے شدت سے پابند، ذاکر وشاغل، تہجد گزار اور شب بیدار لوگوں میں سے تھے۔ علم نہایت راسخ اور نکھرا ہوا تھا، ابتداءً غازی پور میں قیام رہا، آخر میں دہلی کو اپنا وطن بنالیا۔

۷۔ حضرت مولانا عبدالعلی صاحب دہلویؒ

آپ حضرت مولانا نانوتویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ دہلی کے محدث شمار ہوتے تھے۔ مدرسہ عبدالرب دہلی میں ایک طویل مدت تک بحیثیت صدر مدرس درسِ حدیث دیا۔ آپ نے

سینکڑوں شاگرد چھوڑے۔ تقویٰ وطہارت اور استقامت میں آپ خود ہی اپنی مثال تھے، آخر سانس تک جماعت کی نماز اور صفِ اولیٰ ترک نہیں ہوئی تھی۔ آخری عمر میں فالج کا اثر ہو گیا، نقل وحرکت سے معذور ہو گئے، اسی حالت میں حکم کے مطابق خدام آپ کو اُٹھا کر صفِ اولیٰ میں رکھ دیتے تھے اور آپ بیٹھ کر امام کی اقتدا کرتے تھے۔ اپنے استاد میں فنائیت کا درجہ رکھتے تھے اور ہر وارد وصادر سے فرماتے تھے کہ ''قاسمی بن جاؤ محروم نہیں رہو گے'' حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ جیسے اکابر آپ کے تلامذہ میں سے تھے۔

۸۔ حضرت مولانا نواب محی الدین خاں صاحبؒ

آپ بھی حضرت نانوتویؒ کے مخصوص تلامذہ اور جلیل القدر علماء میں سے تھے۔ ریاست بھوپال میں آپ مفتی کے عہدے پر فائز رہے۔ آپ کے علم اور پاکیزہ زندگی سے بھوپال اور اس کی ریاست نے برسہا برس فیوض وبرکات حاصل کئے۔ آپ گھر کے نواب اور امراء میں سے تھے۔ آپ کے والد ماجد بادشاہِ دہلی ظفر شاہ کے مصاحبین خاص میں سے تھے، اور حضرت نانوتویؒ کے معتقد تھے۔ حضرت نانوتویؒ نے جہاد کے سلسلہ میں ان ہی کے ذریعہ بادشاہ تک اپنی اسکیم پہنچائی تھی۔ شاہ ظفر جب انگریزوں کے خلاف اُٹھے تو ایک جنگی مورچہ پر ممدوح بھی سربراہ تھے۔

۹۔ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھویؒ

آپ بھی حضرت نانوتویؒ کے تلامذہ میں سے تھے اور دار العلوم دیوبند میں عرصہ دراز تک رہ کر تعلیم حاصل کی اور پھر دار العلوم دیوبند ہی میں عرصہ تک درس دیا۔ دار العلوم سے مالیر کوٹلہ تشریف لے گئے اور وہاں ریاست کی طرف سے عہدۂ افتا پر فائز ہوئے۔ مشاہیر اہل افتاء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ عمر کا آخری حصہ تمام مالیر کوٹلہ عہدۂ افتا پر ہی گزارا، اور وہیں آپ کی وفات ہوئی۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحبؒ بھی آپ کے شاگردوں میں سے تھے۔ آپ صاحبِ بیعت وارشاد بزرگوں میں سے تھے جن سے ایک بڑے حلقے نے تربیتِ باطنی حاصل کی۔ خواجہ فیروز الدین مرحوم اکاؤنٹینٹ جنرل ریاست کپورتھلہ آپ کے مخصوص متوسلین میں سے تھے جو

دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے ہیں۔احقر نے حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد کچھ دنوں آپ سے بھی تربیتِ باطنی حاصل کی ہے۔علومِ عقلیہ وعالیہ میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے،اور آپ کی تدریس میں ایک خاص برکت تھی جو محسوس ہوتی تھی۔دار العلوم کے درجاتِ ابتدائیہ کے ممتحن تھے۔ صاحبِ اسرار ومعارف تھے اور اکثر وبیشتر آپ کی تشریف آوری دیوبند کے موقعہ پر اساتذہ وطلبہ آپ کے حلقہ میں بیٹھ کر مستقبل کے بارے میں باتیں پوچھتے تھے اور آپ بطور پیشین گوئی کچھ نہ کچھ فرمادیا کرتے تھے۔آپ کا تقویٰ وطہارت مسلم اور نمایاں تھا۔شب بیدار علماء میں سے تھے۔

۱۰۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ

آپ دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے باضابطہ مفتی بلکہ دار العلوم میں دار الافتاء کا نقطۂ آغاز ہیں۔دار العلوم میں دار الافتاء کی منضبط صورت آپ ہی کے وجود باجود سے معرضِ وجود میں آئی۔ آپ عارف باللہ،صاحبِ درس وتدریس،صاحبِ بیعت وارشاد اور مربیٔ اخلاق بزرگ تھے۔آپ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندی قدس سرہ‘ کے خلیفہ مجاز تھے جو حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی کے ارشد خلفاء میں سے تھے۔آپ سے دار العلوم کے حلقوں نے ظاہری وباطنی فیوض وبرکات کافی حد تک حاصل کئے۔افتاء کی خدمات کے ساتھ ساتھ حدیث،فقہ اور تفسیر کے اونچے اسباق بھی آپ پڑھاتے تھے۔جلالین شریف میں احقر ناکارہ کو بھی حضرت مفتی اعظمؒ ہی سے تلمذ حاصل ہے۔آپ کا بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی کافی پھیلا۔آپ ہی کے خلیفہ اعظم حضرت مولانا قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھیؒ تھے جن کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی ہیں۔جن سے عرب اور افریقہ اور ایسٹ افریقہ میں نقشبندیہ طریق کا کافی شیوع ہوا اور سینکڑوں کی اصلاح ہوئی،ساؤتھ افریقہ اور ایسٹ افریقہ کے لوگ جب حج کے لئے حاضر ہوتے ہیں تو اکثر وبیشتر مولانا بدر عالم صاحب مدظلہ‘ کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو کر جاتے ہیں۔ابتدا میں حضرت مفتی اعظمؒ ہی حضرت مہتمم صاحب کی غیبت میں نیابتِ اہتمام کے فرائض انجام دیتے تھے۔بہرحال دار العلوم آپ کے علم،سلوک،افتاء اور انتظام وغیرہ سے سارے ہی شعبوں میں

مستفید ہوتا رہا ہے۔

۱۱۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

آپ حکیم الامت، مشہور محدث، عارف باللہ، فقیہ اور بزرگ تھے۔ آپ دین کے ہر شعبہ کے کاموں کے لئے من اللہ موفق تھے۔ قریب ۳۵ برس کان پور کے مدرسہ جامع العلوم میں درسِ قرآن وحدیث دیا جس سے آپ کے تلامذہ ملک کے ہر ہر خطہ میں پھیل گئے، ہندوستان کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا کہ سفر کر کے وعظ وتبلیغ نہ فرمایا ہو۔ تصنیف کے میدان میں قدم رکھا تو ہر علم وفن میں ہزار سے اُوپر تصانیف ورثہ میں چھوڑیں۔ آخر میں خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں مقیم ہوئے تو ہند وبیرونِ ہند کے ہزارہا انسانوں کو بیعت وارشاد کے سلسلہ سے واصل فرمایا۔ بڑی تعداد میں آپ کے خلفاء ہیں، جنہوں نے مختلف خطوں میں اصلاح وتربیت کا کام مختلف رنگوں سے انجام دیا۔ آپ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اولین صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند سے زیادہ مستفید ہیں جو حدیث وتفسیر میں حضرت نانوتویؒ سے بھی مستفید ہیں، نیز آپ حضرت نانوتویؒ سے براہِ راست بھی بعض تفسیری درسوں میں مستفید ہوئے۔ حکیم الامت کا لقب آپ کے لئے اسم بامسمّٰی تھا۔

بہر حال آپ کی تقریر، تحریر، تصنیف اور تبلیغ سے لاکھوں مسلمانوں کو علمی وعملی فیض پہنچا اور ہزاروں مسلمانوں کی باطنی اصلاح ہوئی۔ آپ دارالعلوم میں اس سال بغرضِ حصولِ تعلیم تشریف لائے تھے جس سال حضرت نانوتویؒ کا وصال ہوا۔ اس لئے حضرت نانوتویؒ سے مزید استفادہ نہیں فرما سکے۔ مگر حضرت کے تلامذہ مثلاً حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مولانا عبد العلی صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے استفادۂ کمالات کیا۔

۱۲۔ حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن صاحب امروہویؒ

آپ حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ تفسیر کے بعض اسباق حضرت نانوتویؒ سے بھی پڑھے۔ ان دونوں بزرگوں کے فیوض سے آپ کے اوپر حدیث، فقہ اور تفسیر وغیرہ کے اسباق میں متکلمانہ رنگ غالب تھا۔ جگہ جگہ حضرت نانوتویؒ کے علوم کا حوالہ بھی

دیتے تھے اور انہیں وضاحت کے ساتھ بیان بھی فرماتے تھے۔ امروہہ میں ایک عرصہ تک درس دیا اور آخر میں کچھ عرصہ جب کہ ۱۳۶۲ھ میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ گرفتار کر لئے گئے تو دیوبند میں بھی بعہدۂ صدر مدرسی درسِ حدیث دیا ہے۔

۱۳۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ

آپ حضرت بانئ دارالعلوم کے صاحبزادے تھے۔ علم وفضل کی لائن میں آپ کی تفہیم ضرب المثل تھی۔ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم خامس ہوئے، مگر دورِ اہتمام میں بھی درس وتدریس کا مشغلہ نہیں چھوڑا۔ مشکوٰۃ، جلالین، صحیح مسلم اور منطق میں میر زاہد وغیرہ آپ کے درس میں رہتی تھیں۔ مشکوٰۃ اور مسلم احقر نے بھی انہیں سے پڑھی ہیں، کٹھن سے کٹھن مسئلہ کو اپنے اندازِ تفہیم سے پانی کر دیتے تھے۔ آپ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کے متوسل اور خلیفہ تھے۔ بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی تھا مگر کم۔ زیادہ مصروفیت نظمِ دارالعلوم اور اہتمام میں رہتی تھی۔

آپ کا چالیس سالہ دور تاریخ دارالعلوم کا اہم دور سمجھا جاتا ہے، یہ دینی ادارہ مدرسہ کی حیثیت سے ترقی کر کے آپ ہی کے دورِ اہتمام میں ''دارالعلوم'' بنا اور اس کا حلقۂ اثر ہندوستان کے تمام خطوں میں زیادہ پھیلا۔ آپ مشاہیر ہند میں سے تھے۔ زیادہ انہماک انتظامِ دارالعلوم اور درس وتدریس میں تھا لیکن وقتی طور پر ملکی سیاست میں بھی کم وبیش آپ نے حصہ لیا۔ چنانچہ جمعیۃ العلماء روہیلکھنڈ کے اجلاسِ عام مراد آباد کی آپ نے صدارت فرمائی اور ۳؍ ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ کو اپنا خطبۂ صدارت پڑھا، جو اس زمانہ میں کتابی صورت میں شائع بھی ہوا جس میں انگریزوں سے ترکِ مولات پر زور دیا گیا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے عہدۂ اہتمام کی عظمت کے پیش نظر نظام دکن نے آپ کو حیدر آباد کے عہدۂ مفتی عدالتِ عالیہ کے لئے نامزد کر کے بلانے کی استدعا کی جسے آپ نے بمشورہ جماعت منظور فرما لیا اور چار سال وہاں گزارے۔ واپسی پر بدستور اپنے فرائض سنبھال لئے۔ آپ کا اخلاص اور ظاہر وباطن کی یکسانی جماعت میں مسلم تھی، آپ کی آبائی نسبت کی عظمت کی وجہ سے خصوصیت کے ساتھ آپ کے اساتذہ بھی آپ کا احترام کرتے تھے۔

۱۴۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی دیو بندیؒ

آپ دار العلوم دیو بند کے چھٹے مہتمم تھے۔حق تعالیٰ نے آپ کو دین کا خاص فہم عطا فرمایا تھا۔ آپ کی دانش وتدبیر مشہورِ زمانہ تھی۔ادبیات کے ماہر تھے،عربی نظم ونثر دونوں پر کمال قدرت رکھتے تھے۔دار العلوم کے نظم ونسق نے آپ کے تدبر ودانش سے عظیم استفادہ کیا۔آپ کی اس دانش وبینش اور عظیم علمی شخصیت کی بنا پر حکومت حیدر آباد کا عہدۂ افتاء مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے بعد آپ ہی کو تفویض کیا گیا تھا۔آپ کا حلم،تواضع،مروت اور تحمل مشہورِ زمانہ تھا۔

آپ حضرت گنگوہیؒ کے متوسل اور طریقت کے معمولات کے نہایت پابند تھے۔وفات کے دن مجھ سے حسرت کے ساتھ فرمایا کہ میرا بارہ ہزار اسمِ ذات افسوس کہ آج پورا نہیں ہو سکا۔شب بیدار اور ہمہ وقت مشغولِ کار رہتے تھے۔ان کی مجلس پر شکوہ اور مورثِ طمانینت ہوتی تھی۔کئی عربی قصیدے اور کئی مفید ترین تصانیف آپ کا ترکہ ہے جو امت کو ملا۔ان میں ’’اشاعتِ اسلام‘‘ ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے جو مقبولِ خواص وعوام ہے۔

۱۵۔ مولانا حکیم عبد الوہاب صاحبؒ یوسف پوری (ضلع غازی پور) المعروف بہ حکیم نابینا

آپ دہلی کے مشہور طبیب،حضرت گنگوہیؒ قدس سرہٗ کے عاشق ومرید اور علومِ دینیہ کے ماہر تھے،نابینائی کی حالت میں تحصیل علم کی اور مہارتِ تامہ پیدا کی،حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہٗ کے تلامذہ میں سے تھے۔انہیں کی طالب علمی کے زمانہ میں یوروپ کا ایک سیاح دار العلوم دیو بند دیکھنے آیا تو اس نے واپس ہو کر یوروپ کے اخبارات میں دار العلوم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ دار العلوم میں پہنچ کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب میں نے دیکھا کہ ایک نابینا طالب علم اپنے ساتھیوں کو اقلیدس کا تکرار کرا رہا تھا اور اقلیدس کی مشکل مشکل شکلیں سامنے کے طالب علم کی کمر پر انگلی سے کھینچ کھینچ کر اسے سمجھا رہا تھا،یہ طالب علم یہی حضرت مولانا حکیم عبد الوہاب صاحبؒ تھے۔ بعد تعلیم حضرت مولانا گنگوہیؒ سے بیعت کی اور حضرت کی صحبت سے مستفید ہو کر باطنی کمال پیدا کیا۔

خود مجھ سے ایک دفعہ ذکر فرمایا کہ:

''جب میں نے طب پڑھنے کے بعد حضرت گنگوہیؒ سے عرض کیا کہ ذریعۂ معاش کے طور پر میں نے طب پڑھ لی ہے لیکن اطباء مریض کا چہرہ مہرہ دیکھ کر، قارورہ دیکھ کر اور دوسرے مشاہدوں سے مرض کی تشخیص کرتے ہیں لیکن میں نابینا ان تمام مشاہدات سے معذور ہوں اور چاہتا ہوں کہ معاش اس فن (طب) سے پیدا کروں۔ اس لئے میرے حق میں دعا فرما دیجئے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ:

''اللہ تعالیٰ تمہیں نباضی کی مہارت عطا فرمائیں گے اور تم نبض دیکھ کر وہ تمام باتیں معلوم کرو گے جو دوسرے اطباء مشاہدوں سے معلوم کرتے ہیں۔''

یہ قصہ سنا کر فرمایا کہ الحمدللہ میں اپنے شیخ گنگوہیؒ کی اس کرامت کا روزانہ مشاہدہ کرتا ہوں اور نبض پر ہاتھ رکھتے ہی مجھ پر مرض اور مریض کے احوال کی تمام نوعتیں منکشف ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ان کی نبض شناسی کی مہارت اس درجہ میں پہنچ چکی تھی کہ باپ یا بھائی کی نبض دیکھ کر بیٹے اور دوسرے بھائی کے احوالِ مریض بتا دیا کرتے تھے، باوجود علمی استحضار کے شغل آخر تک طب اور مطب ہی کا غالب رہا اور اسی میں پوری عمر گزار دی، لوگ شفاءِ بدن کے ساتھ ان کے تقویٰ وطہارت اور معمولات کی پابندی اور پختگی سے شفاءِ روح بھی حاصل کرتے تھے۔

۱۶۔ حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوریؒ

آپ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے ارشد تلامذہ میں سے اور حضرت تھانویؒ کے ہمعصروں میں سے تھے۔ ذکی، طباع اور تیز فہم علماء میں سے تھے۔ آپ کی تقریر معروف ومشہور تھی۔ زبردست مناظر تھے۔ مبتدعین اور قادیانیوں کو تا بہ دروازہ آپ ہی نے پہنچایا۔ عرصۂ دراز تک دربھنگہ اور مرادآباد وغیرہ میں صدارتِ تدریس کے فرائض انجام دیئے اور آخر میں دارالعلوم کے عہدۂ نظامتِ تعلیم اور پھر نظامتِ تبلیغ پر فائز ہوئے۔ دارالعلوم میں درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا آپ کی نمایاں اور غیر معمولی خطابت نے ملک کے گوشہ گوشہ کو مستفیض کیا۔ آپ کو ردِ بدعات اور ردِ قادیانیت سے خاص شغف تھا اور اس سلسلہ میں آپ کی بہت سی قابل قدر تصانیف ہیں جو طبع ہو چکی ہیں۔

۱۷۔ حضرت مولانا نجم الدین صاحبؒ

سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور۔ آپ مشہور حلیم و سلیم عالم تھے، لاہور کے علمی حلقوں میں آپ کے علم کی خاص شہرت تھی۔

۱۸۔ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ

سابق صدر المدرسین دار العلوم دیو بند۔ آپ حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص شاگردوں میں سے ہیں۔ علم کا چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ آپ تمام علوم منقولات و معقولات میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ قوتِ حافظہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ کئی مشہور محققانہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کا درسِ حدیث اپنے دور کا مشہور درس تھا جو ایک خاص امتیازی طرز لئے ہوئے تھا۔ آپ کے تبحرِ علمی نے درسِ حدیث کو جامع علوم و فنون بنا دیا تھا۔ آپ کے درس نے نقل و روایت کی راہ سے آنے والے فتنوں کے لئے آنے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ آج بھی نمایاں علماء اور صاحبِ طرز فضلاء زیادہ تر آپ ہی کے تلامذہ ہیں جو ہندو پاک میں علمی مسندوں کو آراستہ کئے ہوئے ہیں۔

آپ کے یہاں ردِ قادیانیت کا خاص اہتمام تھا اور اس فتنہ کو اعظم الفتن شمار کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں کئی معرکۃ الآرا کتابیں خود بھی تصنیف فرمائیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے تلامذہ سے بھی لکھوائیں۔ اس بارے میں شغف کے ساتھ لکھنے والوں کو علمی مدد دیتے تھے اور کوئی بھی اپنا نوشتہ لا کر سناتا تو غیر معمولی خوشی کا اظہار فرما کر دعائیں دیتے تھے۔ تقریباً ۱۳۲۷ھ سے آپ نے دار العلوم میں درس کا آغاز فرمایا۔ ۱۳۳۴ھ سے ۱۳۴۵ھ تک آپ دار العلوم کے صدر مدرس رہے، اس دوران میں تقریباً ایک ہزار طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا جن میں سے آپ کے دورِ صدر مدرسی میں ۸۰۹ طلبہ نے درسِ حدیث لیا اور اس فن پاک کو تقریراً و تحریراً اور درساً و تدریساً دور دور تک پھیلایا۔

۱۹۔ حضرت مولانا شاہ وارث حسن صاحب لکھنویؒ

آپ مشہور صاحبِ سلسلہ بزرگ تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کے خلیفہ مجاز تھے۔ دار العلوم میں تعلیم حاصل کی، انگریزی داں طبقہ بالخصوص گورنمنٹ کے بڑے بڑے عہدیدار آپ سے زیادہ مستفید

ہوئے۔ ابتدائے عہد میں آپ سے بعض خوارق کا ظہور بھی ہوا ہے۔ ریاضت کافی کی اور آپ پر اس کے اثرات نمایاں تھے۔

۲۰۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ

آپ مدرسہ امینیہ دہلی کے محدث، ہندوستان کے مفتیٔ اعظم اور اپنے زمانہ کے مشہور و مسلم فقیہ و مفتی تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ نکتہ رس علماء میں سے تھے۔ تدریس و افتاء کے ساتھ سیاسی لائن میں بھی نمایاں کام انجام دیا۔ آپ ہی جمعیۃ العلماء ہند کے سب سے پہلے صدر ہوئے اور عرصۂ دراز تک صدر رہے۔ جمعیۃ العلماء اور کانگریس کی تحریکوں میں قائدانہ حصہ لیا۔ کئی مرتبہ جیل گئے۔ آپ کا علم و فہم علماء میں تسلیم شدہ تھا۔ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ' جیسی مردم شناس ہستی نے فرمایا کہ:

"میں مفتی کفایت اللہ کے تدبر اور مولوی حسین احمد کے جوشِ عمل کا معتقد ہوں۔"

مجموعی حیثیت سے آپ فقیہ، محدث، مفتی، مجاہد اور نکتہ سنج علماءِ دیو بند میں سے تھے۔

۲۱۔ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ

آپ دار العلوم دیو بند کے پانچویں صدر المدرسین تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ علم و فضل کے ساتھ غیر معمولی مقبولیت رکھتے تھے۔ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ' کے خلفاء مجازین میں سے تھے۔ علم سے فراغت کے بعد اپنے والد مرحوم کے ساتھ ۱۳۱۶ھ میں مدینہ طیبہ پہنچے اور اٹھارہ سال مدینہ منورہ میں رہ کر مختلف علوم وفنون اور بالخصوص حدیث شریف کا درس دیا۔ زندگی کمال زہد و قناعت کی تھی، جو کمال صبر و تحمل سے اس مدت میں بسر ہوئی۔

مدینہ منورہ میں قیام کے دوران ۱۳۱۸ھ میں ہندوستان تشریف لائے پھر ۱۳۲۰ھ میں واپس تشریف لے گئے۔ بعد ازاں ۱۳۲۷ھ میں دار العلوم میں بحیثیت مدرس آپ کا تقرر ہوا۔ ۱۳۲۹ھ تک درس دیا۔ پھر اسی سال مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ ۱۳۳۱ھ میں پھر ہندوستان واپس تشریف لائے اور اسی سال مدینہ پاک واپس تشریف لے گئے۔ ۱۳۳۵ھ میں حضرت شیخ الہندؒ کے ہمراہ حجاز

ہی میں اسیر کر کے مالٹا بھیج دیئے گئے۔ ۱۳۳۸ھ میں مالٹا سے رہا ہو کر حضرت شیخ الہندؒ کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے اور اسی سال اکابر کے حکم پر جامعہ اسلامیہ امروہہ میں صدارتِ تدریس کی خدمات انجام دیں۔ پھر ۱۳۳۹ھ میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں صدر مدرس رہے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جامعہ اسلامیہ سلہٹ میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہو گیا۔ سلہٹ میں آپ ۱۳۴۵ھ تک قیام پذیر رہے۔ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے ڈابھیل تشریف لے جانے پر آپ شوال ۱۳۴۵ھ میں دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس بنائے گئے۔

آپ بڑے درجہ کے محدث تھے۔ حدیث کے مشہور اسکالر تھے۔ آپ کا درسِ حدیث بہت مقبول تھا۔ کئی تصانیف فرمائیں جو سیاست وتصوف پر ہیں۔ ۱۳۴۵ھ سے ۱۳۷۷ھ تک بتیس برس آپ دار العلوم میں صدر مدرس اور ناظم تعلیمات رہے۔ اس دوران میں ۳۴۸۳ طلباء نے آپ سے بخاری شریف اور ترمذی پڑھ کر دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔ آپ ان تعلیمی خدمات کے ساتھ ساتھ اپنی ہمتِ مردانہ سے سیاسی کام بھی پوری تندہی سے انجام دیتے رہے۔ اسی دوران آپ جمعیۃ العلماء ہند کے بار بار صدر بنائے گئے۔ آپ جمعیۃ العلماء اور کانگریس کے قائدین میں سے تھے۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں آپ نے نمایاں حصہ لیا اور سردھڑ کی بازی لگا دی۔ کئی مرتبہ جیل گئے اور آخر کار ملک کو آزاد کرایا۔ بہرحال مجموعی حیثیت سے آپ عالم، فاضل، شیخِ وقت، مجاہد، جفاکش، جری اور اولوالعزم فضلائے دار العلوم دیوبند میں سے تھے۔

۲۲۔ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھیؒ

سابق ناظم جمعیۃ الانصار دار العلوم دیوبند۔ سکھ مت سے آپ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ آپ دار العلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ غیر معمولی ذکاوت، ذہانت اور حافظہ کے مالک تھے۔ دماغ خلقی طور پر سیاسی تھا سیاست میں گہری نظر تھی۔ ابتداءً طبعی اور علمی انداز میں بعد میں مشاہداتی انداز میں، یورپ اور ایشیاء کے بہت سے انقلابات آپ کے سامنے گذرے۔ اس لئے سیاسی اسکیموں کی ساخت وپرداخت میں آپ کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ آپ نے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رومال میں سرگرم حصہ لیا، افغانستان کی آزادی

کی اسکیم آپ ہی نے مرتب فرمائی تھی۔ ۲۵ سال تک جلاوطن رہے واپس تشریف لاکر فلسفۂ ولی اللّٰہی سے ملک کو روشناس کرایا۔ سندھ ساگر اکاڈیمی اور محمد قاسم ولی اللّٰہی سوسائٹی قائم کی جس نے حضرت نانوتویؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے علوم کی کافی خدمت کی۔

افغانستان میں آپ نے انڈین نیشنل کانگریس کی ایک باضابطہ شاخ قائم کر کے افغانستان کے حق میں ہندوستان کی ہمدردیاں حاصل کیں۔ آپ کانگریس میں شرکت کے حامی تھے مگر انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ من حیث القوم۔

دار العلوم میں آپ نے جمعیۃ الانصار قائم کی جس کے بڑے بڑے دو اجلاس مراد آباد اور میرٹھ میں ہوئے اور اس کے حلقۂ اثر میں وسعت اور قوت پیدا ہوئی۔ آپ دار العلوم کو ایک علمی انداز سے ملی تنظیم بنانا چاہتے تھے، جس کا نقش اول جمعیۃ الانصار کا قیام تھا۔

۲۳۔ حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب سہسرامیؒ

آپ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں پرنسپل تھے۔ مشہور عالم، ذی استعداد فاضل ہیں۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے راستہ سے آپ کا علمی فیضان بنگال کے گردونواح میں کافی پھیلا۔ متواضع، فہیم اور خلیق علماء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔

۲۴۔ حضرت مولانا عبد الرزاق صاحب پشاوریؒ

آپ افغانستان میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہے۔ حکومتِ افغانستان میں آپ کا خاص وقار تھا۔ آپ وہاں کی پریوی کونسل کے صدر بھی تھے اور شرعی احکام میں آپ کا فیصلہ آخری ہوتا تھا، جس پر بادشاہ اور حکومت سب سر جھکا دیتے تھے۔

۲۵۔ حضرت مولانا عبد العزیز صاحبؒ

خطیب جامع مسجد گوجرانوالہ۔ آپ قابل قدر علم کے حامل تھے۔ ''ارشاد الباری'' آپ کی مشہور تالیف ہے، آپ گہرا علم رکھتے تھے۔ اور حضرت شیخ الہندؒ کے شاگردِ رشید تھے۔

۲۶۔ حضرت مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوریؒ

آپ دار العلوم کے ممتاز ابنائے قدیم میں سے تھے۔ دار العلوم سے فارغ ہونے کے بعد مختلف دینی مدارس میں آپ نے مدرسی کی۔ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل رہے۔ دار العلوم دیوبند میں تقریباً ۸ سال درس دیا۔ پھر تقریباً تین سال یہاں کے مفتی کی حیثیت سے کام کیا۔ بعد ازاں مدرسہ عالیہ سلہٹ میں صدر مدرس ہوکر تشریف لے گئے اور عمر کا آخری حصہ وہیں گزارا۔

آپ کا علمی فیض بہت ہوا۔ شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ جیسے لائق اور فاضل علماء آپ کے شاگردوں میں سے تھے۔ ممدوح رقتِ قلت کے ساتھ صاحبِ دل تھے اور اکابر واسلاف کے نقش قدم کے انتہائی طور پر محافظ تھے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ آپ دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر بھی رہے۔

۲۷۔ حضرت مولانا محمد میاں صاحب منصور انصاریؒ

آپ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے نواسے تھے، حضرت شیخ الہندؒ کے خاص معتمد تلمیذ رشید تھے۔ ابتداءً حضرت شیخ الہندؒ کے علمی کاموں میں شریک ہوتے رہے اور اخلاقی استفادہ کیا۔ پھر حضرت کے سیاسی منصوبوں میں شریک ہوئے اور آخر کار حضرتؒ کے امین اور راز دار رفقاء میں شمار ہوئے۔ ریشمی خطوط کو حجاز سے لے کر آپ ہی روانہ ہوئے تھے اور برطانوی حکام کی انتہائی کوشش کے باوجود ان کے قبضہ میں نہ آسکے اور بمبئی سے پشاور تک مخفی سفر کیا، ہندوستان کی سرحد پار کر کے افغانستان میں داخل ہوگئے اور ریشمی خط اپنے موقع پر پہنچا دیا۔

کابل کا انقلاب آپ کے سامنے ہوا۔ بچہ سقہ کی چند روزہ حکومت میں آپ کو کابل سے بھی جلاوطن کر دیئے جانے کا آرڈر دیا گیا اور آپ کسی نہ کسی طرح کابل سے روپوشی کے ساتھ روس کی سرحد میں داخل ہوگئے۔ اس عرصہ میں افغانستان میں انقلاب ہوگیا اور جنرل نادر شاہ حکمران ہوگئے۔ انہوں نے مولانا کو عقیدت کے ساتھ پھر بلایا اور روسی سفارت خانہ میں بحیثیت نائب سفیر آپ کو روس بھیجا گیا وہاں سے واپسی پر مستقلاً آپ کابل میں مقیم ہوئے۔ ۱۳۵۸ھ میں مجھے آپ نے

بحیثیت مہتمم دار العلوم دعوت دی اور مجلس شوریٰ نے اس دعوت کو بکمال خوشی قبول کرتے ہوئے مجھے بطور نمائندہ دار العلوم افغانستان بھیجا تاکہ میں امیر نادر شاہ کی وفات پر تعزیت اور موجودہ بادشاہ افغانستان امیر ظاہر شاہ کی تخت نشینی پر تہنیت پیش کروں۔

افغانستان میں آپ کا علمی اور سیاسی وقار قوم اور حکومت یکساں طور پر مانتی تھی، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا جذبہ اور فیصلہ یہ تھا کہ ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی وہ مولانا منصور کو ہندوستان لائیں گے لیکن آزادیٔ ہند سے چند ماہ پیشتر ۱۱/جنوری ۱۹۴۶ء مطابق ۴/صفر ۱۳۶۵ھ کو مولانا کا وصال ہوگیا۔ رحمہ اللہ۔

۲۸۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب آرویؒ

آپ پوربی علاقہ میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ مگر آخر میں اُن پر عدمِ تقلید کا غلبہ ہوگیا اور جماعتِ دیوبند سے انتساب کا رشتہ کمزور ہوگیا۔

۲۹۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ

آپ دار العلوم دیوبند کے مایۂ ناز فضلاء میں سے تھے اور حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد علیہ تلامذہ میں سے تھے۔ غیر معمولی ذہانت وذکاوت کے حامل تھے۔ علم متحضر تھا اور بڑا منقح علم تھا۔ علومِ عقلیہ سے خاص ذوق تھا، منطق وفلسفہ اور علم کلام میں غیر معمولی دسترس تھی۔ حکمتِ قاسمیہ کے بہترین شارح تھے۔ دار العلوم سے فراغت کے بعد مسجد فتح پوری دہلی کے مدرسہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے تدریس علوم میں مشغول ہوئے، پھر دار العلوم میں بحیثیت استاذِ حدیث بلائے گئے۔ اونچے طبقہ کے اساتذہ میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔

پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں ایک عرصہ تک شیخ التفسیر کی حیثیت سے کام کیا اور اپنے آخری دور میں چند سال دار العلوم دیوبند کے صدر مہتمم بھی رہے۔ صحیح مسلم کی بہترین شرح متکلمانہ انداز سے لکھی اور حکمتِ قاسمیہ کو اس میں نمایاں رکھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے تفسیری فوائد جو حضرت نے جو ترجمہ کے ساتھ شروع فرمائے تھے آپ نے پایۂ تکمیل کو پہنچائے۔ بے مثال خطیب تھے اور خطابت

میں قاسمی علوم بکثرت بیان فرماتے تھے، تحریر وتقریر میں ان ہی علوم کا غلبہ تھا۔

سیاسی شعور اونچے درجہ کا تھا۔ ملکی معاملات کے اتار چڑھاؤ کا پورا نقشہ ذہن کے سامنے رہتا تھا اور اس بارے میں بچی تلی رائے قائم کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رومال میں شریک رہے۔ جمعیۃ العلماء ہند کے کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیا، آخر میں مسلم لیگ کی تحریک میں شامل ہوگئے اور جمعیۃ علمائے اسلام کی بنیاد ڈالی، جمعیۃ علمائے اسلام کے ارکان علمائے کرام نے تحریک پاکستان میں عملی حصہ لیا اور سرحد وسلہٹ ریفرنڈم میں اہم کردار ادا کیا۔

تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستان پہنچ کر ترکِ وطن کر دیا اور پاکستانی پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کی جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا، قراردادِ مقاصد پاس کرائی، وہاں کی قوم نے آپ کو ''شیخ الاسلام پاکستان'' کے لقب سے یاد کیا۔ ایک سفر کے دوران میں بہاول پور میں وفات پائی اور کراچی میں دفن ہوئے۔ پورا ملک اور حکومت سوگوار ہوئی اور عرصۂ دراز تک آپ کا غم منایا جاتا رہا۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

۳۰۔ حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب مدظلہٗ

سابق صدر المدرسین مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد موجودہ شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند۔ آپ اونچے درجہ کے محدث ہیں جمعیۃ العلماء ہند اور کانگریس کی تحریکوں میں برابر حصہ لیتے رہے اور کئی بار جیل گئے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحبؒ کی وفات کے بعد آپ ہی کو جمعیۃ العلماء ہند کا صدر منتخب کیا گیا۔ ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۸ء) سے ۱۳۸۲ھ (۱۹۶۳ء) تک دار العلوم میں آپ سے ۱۱۶۱ طلبہ نے بخاری شریف پڑھی۔

۳۱۔ حضرت مولانا فضل ربی صاحبؒ

آپ شیخ الہندؒ کے شاگردوں میں ایک جوشیلے عالم تھے۔ آپ حکومتِ افغانستان کی ہیئتِ تمیزیہ کے رکن کی حیثیت سے بہت ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔

۳۲۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی مدظلہٗ

آپ دارالعلوم دیوبند کے موجودہ صدرالمدرسین ہیں اور حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے ہیں۔اس وقت معقولات میں خصوصاً اور جمیع علوم میں عموماً فردِ تسلیم کیے جاتے ہیں۔موجودہ اساتذۂ دارالعلوم ودیگر مدارسِ دینیہ اکثریت کے ساتھ آپ ہی کے شاگرد ہیں۔درسِ حدیث میں آپ خاص امتیاز رکھتے ہیں۔مختلف مدارسِ دینیہ، فتح پوری دہلی، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، مدرسہ ہاٹ ہزاری چاٹ گام وغیرہ میں صدارتِ تدریس کے عہدہ پر فائز رہے۔

آپکے اساتذہ نے بالآخر آپ کا دارالعلوم کیلئے انتخاب فرمایا اور بہت اونچے طبقہ کے اساتذہ میں شمار ہوتا رہا۔۱۳۷۷ھ میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد آپ دارالعلوم کے صدر مدرس، ناظم تعلیمات اور مجلس شوریٰ کے ممبر بنائے گئے۔آپ کے زمانہ صدر مدرسی میں ۱۳۷۷ھ سے ۱۳۸۲ھ تک ۱۱۶۱ طلبہ دورۂ حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔

۳۳۔ حضرت مولانا ماجد علی صاحبؒ

آپ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں پرنسپل رہے اور اس نواح کے مشاہیر علم وفضل میں سے تھے۔

۳۴۔ حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ

آپ بھی حضرت شیخ الہندؒ کے شاگردوں میں سے ہیں۔حدیث وقرآن پر اچھی اور وسیع نظر رکھتے تھے۔آریوں اور قادیانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور متعدد مناظرے کئے۔آپ کا لقب ''شیر پنجاب'' تھا۔میلان عدمِ تقلید کی طرف تھا۔آزادیٔ ملک کی تحریک میں جمعیۃ العلماء ہند کے ساتھ رہے اور باوجود اختلافِ مسلک کے اکابر واسلافِ دیوبند کے بہت زیادہ گرویدہ اور اخلاقی طور پر اُن سے غیر معمولی انداز سے وابستہ رہے۔اس احقر سے بھی بہت زیادہ مانوس تھے، ہمیشہ ملاقات کے وقت مصافحہ اور معانقہ ہی پر قناعت نہ کرتے تھے بلکہ پیشانی بھی چومتے تھے اور بعض اوقات آنکھوں میں آنسو بھر لاتے تھے۔

۳۵۔ حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ

آپ بھی مشاہیر فضلائے دیوبند میں سے تھے۔ صاحبِ طرز مصنف نیز ذہن وذکاء اور طباعی میں منفرد تھے۔ تحصیل علوم سے فراغت کے بعد دارالعلوم کے آرگن رسالہ ''القاسم'' کے ایڈیٹر اور رئیس التحریر منتخب کئے گئے اور عرصۂ دراز تک قلمی خدمات سے ہندوستان کے علمی حلقوں کو مستفید کرتے رہے۔ اس کے بعد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کی سفارش پر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) کے پروفیسر مقرر رہوئے۔ اس دوران بہت سی مفید اور علمی تصانیف آپ کے قلم سے نکلیں۔ ''کائناتِ روحانی'' ''سوانح ابوذر غفاری'' اور ''مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' وغیرہ آپ کی مخصوص اور مشہور تصانیف ہیں۔

تصانیف اور علمی مقالات کا عدد بہت کافی ہے جو مقبولِ خواص وعوام ہے۔ آخر میں احقر کی فرمائش پر آپ نے ''سوانح قاسمی'' تین جلدوں میں مرتب کی جو آپ کی تصانیف میں ایک شاہکار تصنیف ہے، اس کے بارے میں جب احقر نے آپ سے فرمائش کی تو بہت خوشی اور امنگ سے اسے قبول کرتے ہوئے لکھا کہ:

''میری علمی زندگی کی ابتداء ''القاسم'' ہی سے ہوئی تھی اور شاید انتہا بھی ''القاسم'' (یعنی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ) ہی پر ہوگی۔''

چنانچہ یہی ہوا کہ سوانح قاسمی کی چوتھی جلد آپ نے شروع کی، پانچ صفحے لکھنے پائے تھے کہ عمر فانی نے جواب دے دیا اور ''القاسم'' پر انتہا ہوگئی۔ آپ کی تقریر وخطابت نہایت عالمانہ ادیبانہ اور پرجوش ہوتی تھی۔ دقیقہ سنج اور نکتہ رس علماء میں آپ کا شمار ہوتا تھا اور ہندوستان کے مشاہیر علماء میں آپ کی ممتاز حیثیت مانی جاتی تھی۔ ۱۳۷۵ھ میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

۳۶۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کیملپوری مدظلہٗ

آپ بھی شیخ الہندؒ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ حدیث سے خاص لگاؤ تھا۔ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں عرصہ تک صدر مدرس رہے اور علوم وفنون کا درس دیتے رہے۔ آج کل اپنے وطن کیملپور میں خانہ نشین ہیں۔

۳۷۔ حضرت مولانا سیف الرحمٰن صاحب کابلیؒ

آپ مشہور سیاسی لیڈر تھے جنہوں نے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک میں بہت زیادہ کام کئے۔ دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد عرصہ تک دہلی میں قیام کیا۔ پھر اپنے وطن کابل واپس جا کر وہیں مقیم ہو گئے۔ میں جب ۱۳۵۸ھ میں افغانستان حاضر ہوا تھا تو بقید حیات تھے اور میرے ساتھ غیر معمولی محبت اور ادب واحترام بلکہ نیاز مندی سے پیش آتے تھے۔ حالانکہ میں ان کا ایک حقیر سا خورد تھا۔ آپ زبردست مجاہد تھے اور جہاد کا جوش سینہ میں ابلتا ہوا رکھتے تھے۔ ہٹلر نے جب یوروپ پر حملہ کیا تو میں اس وقت کابل ہی میں تھا اور اتفاق سے مولانا ہی کے مکان پر موجود تھا، حملہ کی خبر سنتے ہی جوشِ مسرت میں رو پڑے۔ سجدے میں گر گئے اور فرمایا کہ:

''خداوندا! تیرا شکر ہے کہ بھیڑیوں میں باہم جنگ شروع ہوگئی۔ جس سے انسانوں کے بچ جانے کی توقع ہوگئی۔''

۳۸۔ حضرت مولانا وصی اللہ صاحب مدظلہ

آپ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز علما اور شیوخ میں سے ہیں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے اجل خلفا میں سے ہیں۔ آپ کا طرزِ اصلاح وتہذیب نفس ہو بہو حضرت تھانویؒ کی طرح ہے۔ پہلے ضلع اعظم گڑھ میں پھر شہر گورکھپور میں اور اس وقت الٰہ آباد شہر میں آپ نے اپنی خانقاہیں قائم فرمائی ہیں۔ بڑے بڑے ذی علم اور صاحبِ جاہ وثروت حضرات کی اصلاح آپ کے ذریعہ سے ہوئی اور ہو رہی ہے۔ ہزاروں بندگانِ خدا کو روحانی فیض پہنچ رہا ہے اور یہ خطہ آپ کے وجود باجود سے روحانیت سے بہرہ اندوز ہو رہا ہے۔

۳۹۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ ممتاز فضلائے دیوبند میں سے ہیں اور ابتدائے طالب علمی سے انتہا تک احقر محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے رفقائے تعلیم میں سے ہیں۔ قوی الاستعداد ہیں اور استحضار علم کے ساتھ معروف، فقہ اور ادب میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔

فراغتِ تعلیم کے بعد دار العلوم کے درجہ ابتدائی کے مدرس ہوئے اور تعلیمی ترقی کی منزلیں طے کر کے طبقہ وسطیٰ اور پھر طبقہ اعلیٰ کے مدرسین میں شمار کئے گئے۔ فقہی مناسبت اور فقہ کے خاص ذوق کی بناء پر حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتیٔ اعظم دار العلوم کے حلقۂ افتاء میں شامل ہوئے اور ایک ممتاز فتویٰ نویس ثابت ہوئے۔ بالآخر حضرت ممدوح کی وفات کے بعد دار العلوم کے عہدۂ افتا پر بحیثیت مفتی دار العلوم آپ ہی کا انتخاب کیا گیا۔

حضرت شیخ الہندؒ کے اسارتِ مالٹا سے رہا ہو کر آجانے کے بعد آپ حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے اور حضرت کے وصال کے بعد احقر کی معیت میں حضرت اقدس مولانا تھانویؒ کی طرف رجوع کیا اور حضرت مرشد تھانویؒ سے خلافت حاصل کی اور پھر تعلیم ظاہر کے ساتھ تعلیم باطن میں مشغول ہوئے۔ الحمد للہ مولانا کے متوسلین بکثرت ہیں اور مخلوق کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ تصنیف وتالیف کا ذوق ابتدا ہی سے تھا، فقہ وحدیث اور مناظرہ میں نہایت مفید تصانیف کا ایک ذخیرہ ہے جو آپ کے قلم سے نکلا اور خواص وعوام کے لئے مفید ثابت ہو رہا ہے۔ شعر وشاعری کا ذوق بھی زمانہ طالب علمی ہی سے تھا، عربی فارسی اور اُردو میں نہایت عمدہ قصائد، مراثی اور واقعاتی نظمیں کہیں جن کا مجموعہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستانی قومیت اختیار فرمائی اور آج وہاں کے ممتاز مفتیوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ گورنمنٹ پاکستان نے اسلامی قانون کی تدوین کے لئے علماء کی جو کمیٹی بنائی آپ اس کے رکن رکین رہے۔ آپ نے شرافی (۱) (کراچی) میں ایک بڑے دار العلوم کی بنیاد ڈالی جو آج مرکزی حیثیت کی ممتاز تعلیم گاہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ آپ فضلائے دار العلوم دیو بند میں ایک ہمہ جہتی امتیاز رکھتے ہیں۔

۴۰۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ

(از عزیز احمد قاسمی ناظم شعبہ تنظیم ابنائے قدیم وناظم شعبہ تبلیغ دار العلوم دیو بند)

آپ حضرت بانیٔ دار العلوم قدس سرہٗ کے پوتے اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ

(۱) اب یہ جگہ ''کورنگی ٹاؤن'' کہلاتی ہے۔

مہتمم خامس دارالعلوم کے صاحبزادے ہیں۔آپ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص تلامذہ میں سے ہیں۔آپ نے ۱۳۳۷ھ میں علومِ درسیہ سے فراغت حاصل کی اور دارالعلوم میں حسبۃً للہ درس و تدریس کا آغاز کیااور درس نظامی کی مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھائیں۔۱۳۴۳ھ سے ۱۳۴۸ھ تک دارالعلوم کے نائب مہتمم رہے اور ۱۳۴۸ھ سے اب تک کہ ۱۳۷۴ھ ہے،آپ ہی دارالعلوم کے مہتمم ہیں۔

اس وقت پورے ہندوستان میں بہترین خطیب تسلیم کئے جاتے ہیں۔ہندوستان کے ہر خطہ میں پہنچ کر تقریر وخطابت کے ذریعہ اسلامی مقاصد کی اشاعت اور مسلکِ دارالعلوم کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا۔تقریباً ایک سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ایک مستقل ادارہ آپ کی تصانیف کو شائع کررہا ہے جوملک میں مقبول ہیں۔شعروسخن میں بھی اپنے بزرگوں کی طرح ثقہ انداز میں دخل رکھتے ہیں۔آپ کی متعدد نظمیں،مثنویاں اور قصائد ہیں جو رسالہ ''دارالعلوم'' اور ''القاسم'' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔بعض بلیغ نظمیں کتابی صورت میں بھی مستقلاً شائع ہوئی ہیں۔آپ ہندوستان کے متعدد علمی اور تعلیمی اداروں کے ممبر اور سرپرست ہیں اور متعدد مدارس کے بانی ہیں۔مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر ہیں اور عرصۂ دراز تک سنی سنٹرل وقف بورڈ کے ممبر رہے۔دارالعلوم کے ذمہ داروں میں سے آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے بیرونی ممالک کے متعدد سفر کئے۔ افغانستان، برما، عدن، حجاز،مصر،اُردن ،لبنان،ساؤتھ افریقہ، روڈیشیا، کینیا، ٹانگانیکا، زنجبار، مڈغاسکر،حبش،ماریشس،ری یونین، پاکستان وغیرہ میں جاکر دارالعلوم کا تعارف کرایا۔

آپ کے زمانہ میں دارالعلوم نے غیر معمولی ترقی کی۔تعلیمی اور تعمیری سلسلہ کافی بڑھا۔کاموں اور شعبوں میں اضافہ ہوا،اساتذہ،طلبہ اور عملہ کا عدد بہت بڑھ گیا۔آمدنی کی رفتار غیر معمولی طور پر ترقی پذیر ہوئی جس کی تفصیل آنے والے نقشوں سے معلوم ہوگی۔شعبوں نے محکموں کی صورت اختیار کرلی جیسا کہ آگے متعلقہ نقشہ جات سے تفصیلات معلوم ہوں گی۔

ممدوح حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت اور حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ مجاز ہیں۔آپ کا بیعت وارشاد کا سلسلہ ہندو بیرونِ ہند میں پھیلا ہوا ہے،اہتمام کے طویل الذیل کاموں کے باوجود درس

وتدریس کا مشغلہ آپ کا کبھی ترک نہیں ہوا۔ حدیث وتفسیر اور فن حقائق واسرار کی کتابیں جیسے حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ اکثر زیر تدریس رہتی ہیں۔ دیو بند میں آپ کی ایک مستقل مجلس مذاکرہ قائم ہے جس میں طلبہ اور شہر کے لوگ جمع ہو کر علمی استفادہ کرتے ہیں۔

۴۱۔ حضرت مولانا عبدالغفور صاحب مہاجر مدنی مدظلہ

آپ دار العلوم دیو بند کے فیض یافتہ اور آخری دورِ طالب علمی میں خصوصیت کے ساتھ حضرت مفتیٔ اعظم ہند مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ سے مستفید ہیں۔ نقشبندیہ سلسلہ کے ممتاز مشائخ میں سے ہیں۔ اصل سے صوبہ سرحد کے باشندے ہیں لیکن عرصہ دراز سے مدینہ طیبہ میں مہاجر کی حیثیت سے مقیم ہیں اور حجازی قومیت اختیار فرمالی ہے۔ آپ پر غلبہ باطنی ارشاد وہدایت کا ہے۔ سرحدی وپاکستانی لوگ بکثرت آپ کے سلسلۂ بیعت میں داخل ہیں۔ مدینہ منورہ میں آپ کا مقامِ سکونت ایک مستقل خانقاہ کی حیثیت رکھتا ہے جس میں ہر وقت طالب علموں اور مستفیدین کا مجمع لگا رہتا ہے۔ اس وقت حجاز میں آپ ممتاز مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔

۴۲۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مدظلہ

آپ دار العلوم کے ممتاز فضلاء وعلماء میں سے ہیں۔ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہٗ کے مخصوص اور معتمد علیہ تلامذہ میں سے ہیں۔ احقر کے خاص تعلیمی رفیق اور دورۂ حدیث کے ساتھی ہیں، اوپر سے ہم نسب بھی ہیں۔ حدیث، فقہ اور تفسیر میں امتیازی مہارت کے حامل ہیں۔ قوتِ حافظہ امتیازی ہے، علوم اور کتب کا استحضارِ تام ہے، اونچے درجہ کے اربابِ تدریس میں سے ہیں۔ علوم سے فراغت کے بعد بعض مدارس میں سلسلۂ تدریس سے منسلک رہ کر بالآخر دار العلوم دیو بند میں شیخ التفسیر کی حیثیت سے بلائے گئے اور کتبِ تفسیر کے ساتھ دورہ کی کتبِ حدیث بالخصوص ابوداؤد شریف اکثر وبیشتر آپ ہی کے درس میں رہتی تھی۔ اتباعِ سنت اور عظمتِ سلف کا خاص شغف ہے۔ علومِ شرعیہ اور ردِ مذاہبِ باطلہ میں بہت سی کتب کے بہترین مصنف ہیں۔ محققانہ انداز سے بحث کرتے ہیں جس میں علمی مواد کافی ہوتا ہے، علمی تصانیف کے سلسلہ میں مشکوٰۃ المصابیح

کی شرح (التعليق الصبيح) آپ کا تصنیفی شاہکار ہے جو پانچ جلدوں میں ہے۔
ممالک اسلامیہ کا سفر کئے ہوئے ہیں اور بیروت جا کر آپ نے خود ہی شرح مشکوٰۃ طبع کرائی۔ سیرۃ المصطفیٰ کے نام سے تین جلدوں میں محققانہ سیرت لکھی، جس میں آزاد خیال مصنفوں پر علمی انداز سے تنقید کی ہے اور اُن کے بہت سے شکوک وشبہات کے مسکت جوابات دیئے ہیں۔ عربی ادب میں خاص مہارت ہے، عربی اشعار برجستگی سے کہتے ہیں۔ فارسی میں بھی آپ کی نظمیں ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستانی قومیت اختیار کر لی اور آج جامعہ اشرفیہ لاہور کے شیخ الحدیث ہیں۔ تقریباً ہر جمعہ کو آپ کے وعظ کی مجلس ہوتی ہے جس میں ہزاروں کا اجتماع ہوتا ہے۔ حق گوئی میں (حکیمانہ انداز کے ساتھ) یدِطولیٰ رکھتے ہیں اور سچی بات بلاخوفِ لومۃ لائم برملا کہتے ہیں۔ تقویٰ اور خشیت اللہ آپ پر نمایاں نظر آتا ہے۔ ممتاز مشاہیر علم وفضل میں سے ہیں۔

۴۳۔ حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی مدظلہٗ

آپ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے ہیں۔ متعدد کتب میں احقر کے ہم سبق رہے۔ علمی استعداد شروع سے مضبوط تھی۔ اصل وطن ضلع ہزارہ (پاکستان) ہے۔ صاف گو طبیعت ہیں آپ کی صلاحیتوں کے پیش نظر آپ کو جمعیۃ علمائے اسلام پاکستان کا ناظم منتخب کیا گیا ہے۔ موصوف کی علمی شہرت کی بنا پر مصر نے آپ کو بطور نمائندہ جمعیۃ علمائے اسلام پاکستان دعوت دی اور آپ نے وہاں کی عالمی مؤتمر میں علمائے عالم کو خطاب فرمایا، آپ کا شمار وہاں کے مشاہیر میں ہے۔

۴۴۔ حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مدظلہٗ

آپ بھی دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے ہیں۔ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ فراغتِ تحصیل کے بعد دارالعلوم دیوبند کے درجہ ابتدائی کے مدرس رہے۔ فنِ حدیث میں خاص دلچسپی اور لگاؤ ہے۔ فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد کئی بار حضرت شاہ صاحبؒ کے یہاں ترمذی اور بخاری کی سماعت فرمائی۔ آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم کے خاص ترجمان ہیں۔ فیض الباری شرح صحیح بخاری آپ کی

تالیفات کا شاہکار ہے۔

حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے خلیفہ مجاز، حضرت قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھی سے بیعت اور ان کے خلیفہ مجاز ہیں۔ آپ کا سلسلۂ ارشاد و ہدایت الحمدللہ وسیع ہے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستانی قومیت اختیار کی اور ٹنڈ والہ یار کے مدرسہ میں ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے کام کیا اور درسِ حدیث میں مشغول رہے۔ پھر پاکستان سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی اور اب وہیں مقیم ہیں۔ آپ کا سلسلۂ بیعت و ارشاد خصوصیت سے افریقہ میں بہت پھیلا۔ بکثرت افریقی آپ سے بیعت ہیں۔ زمانہ حج میں جو قافلے ایسٹ یا ساؤتھ افریقہ سے آتے ہیں وہ اکثر و بیشتر آپ کے سلسلۂ بیعت میں داخل ہو کر واپس ہوتے ہیں۔ آپ کی تصنیف و تالیف میں ترجمان السنۃ، علم حدیث میں ایک شاہکار تصنیف ہے جس میں اکابر دار العلوم اور بالخصوص حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحبؒ کے علوم کو جمع کر کے خود اپنے علم اور علمی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اس مبارک کتاب کی تین ضخیم جلدیں ندوۃ المصنّفین دہلی سے شائع ہو چکی ہیں جو خواص و عوام میں مقبول ہیں۔

۴۵۔ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مدظلہٗ

آپ حضرت مفتیٔ اعظم الشیخ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی قدس سرہٗ کے فرزندِ رشید اور دار العلوم دیوبند کے ہونہار فاضل ہیں۔ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب قدس سرہٗ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ درسیات سے فراغت کے بعد دار العلوم کے درس و تدریس کے سلسلے میں لئے گئے۔ پھر دار الافتاء میں اپنے والد بزرگوار کی زیر تربیت افتاء نویسی کی مشق کی اور دار الافتاء میں بحیثیت نائب مفتی کام شروع کیا اور فتویٰ نویسی میں مہارت حاصل کی۔

ایک عرصہ تک حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحبؒ کی معیت میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر ایک عرصۂ دراز تک کلکتہ میں مقیم رہے اور وہاں کے لوگوں کو علم اور دین سے مستفید کیا، اس کے بعد دہلی آ کر ادارہ المصنّفین قائم کیا جو وقت کا ایک بہترین معیاری ادارہ ہے، جس نے اسلامی علوم و فنون کی بہت سی قابل قدر تصانیف ملک کے سامنے پیش کیں۔

آپ اس وقت دہلی کے مشاہیر علم و فضل میں شمار کئے جاتے ہیں، بہت سے علمی اور دینی

اداروں کے ممبر ہیں اور مرکزی حج کمیٹی کے صدر ہیں، گورنمنٹ بھی آپ کی بات کا اثر لیتی ہے، قومی کاموں میں آپ کا خاص حصہ ہے، تحریک آزادیٔ ہند کے سپاہیوں میں سے ہیں۔

جمعیۃ علمائے ہند کے کاموں میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کے دستِ راست رہے ہیں اور ان کے وصال کے بعد جمعیۃ علمائے ہند کے صدرِ عامل کے عہدہ پر فائز ہیں۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے مؤثر ممبروں میں سے ہیں، جری اور شیر دل مقرر ہیں۔ بیرونی ممالک میں بھی آپ کی آمد و رفت رہی ہے۔ حال ہی میں آپ نے روس کے بعض دینی اداروں کی دعوت پر روس کا سفر کیا تھا۔ مجموعی حیثیت سے دارالعلوم کے ممتاز فضلاء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

۴۶۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ

آپ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ اعلیٰ ترین علمی استعداد کے مالک، غایت درجہ کے ذکی اور طباع فضلاء میں سے تھے۔ ابتداءً دارالعلوم میں مدرس کی حیثیت سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھائیں پھر دارالعلوم کی طرف سے مدراس بھیجے گئے اور وہاں درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا، پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرس رہے۔

تصنیف وتالیف کی مخصوص صلاحیتیں رکھتے تھے۔ متعدد اعلیٰ ترین کتابوں کے مصنف تھے۔ ہندوستان کے بڑے بلند پایہ مقرر اور خطیب تھے۔ بہترین سیاستداں تھے۔ ندوۃ المصنّفین کے مخصوص کار پردازوں میں سے تھے۔ جمعیۃ علمائے ہند اور کانگریس کے صفِ اول کے لیڈروں میں سے تھے، کئی بار جیل گئے، طویل عرصہ تک جمعیۃ علمائے ہند کے ناظم اعلیٰ رہے۔ ۱۹۴۷ء کے انقلابی ہنگاموں میں اپنی جان پر کھیل کر ہزاروں کی جانیں بچائیں۔ پارلیمنٹ کے بے لوث اور نڈر ممبر تھے، فرقہ پرست بھی ان کا لوہا مانتے تھے۔ گورنمنٹ بھی انہیں مانتی تھی اور ان کے اثرات قبول کرتی تھی۔ غرض اُن کی شخصیت ایک جامع اور مؤثر شخصیت تھی جس کا ہندوستان کے تمام علمی اور سیاسی طبقات پر اثر تھا۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور اس کے کاموں میں دخیل تھے۔

۴۷۔ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی مدظلہ

آپ دار العلوم دیوبند کے ہونہار فاضل اور حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ علومِ درسیہ سے فراغت کے بعد مدرسہ شاہی مراد آباد میں مدرس اور مفتی کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ جمعیۃ علمائے ہند کے ذمہ دار کارکنوں میں سے ہیں۔ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ کے حکم پر جمعیۃ علمائے ہند کے ناظم بنے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی وفات کے بعد ایک سال تک ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماءِ ہند کے عہدہ پر فائز رہے۔ جمعیۃ اور کانگریس کے بڑے مخلص سپاہی اور صفِ اول کے لیڈروں میں سے ہیں۔ کئی بار جیل گئے متعدد مفید کتابوں کے مصنف ہیں۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی، کئی جلدوں میں اور تاریخ اسلام آپ کی شاہکار تصانیف ہیں۔ بچوں کی اسلامی تعلیم سے بہت زیادہ شغف ہے۔ چنانچہ دینی تعلیم کے متعدد رسائل تصنیف فرمائے جو بہت زیادہ مقبول ہوئے۔ تعلیم کے ہر شعبہ میں اور ہر مضمون میں اسلامی رنگ دیکھنے کی تڑپ ہے اور اس تڑپ کا مظاہرہ تصنیف کردہ کتابوں اور چارٹوں سے ہوتا ہے۔ دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے کارگزار ممبر ہیں۔ مجموعی حیثیت سے علم وعمل میں دستگاہ اور صلاح وتقویٰ حاصل ہے۔

۴۸۔ حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی مدظلہ

آپ نے دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ایم- اے کیا، دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔ پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے۔ آج کل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سنی دینیات کے شعبہ کے انچارج ہیں۔ رسالہ برہان کے ایڈیٹر ہیں۔ آپ کی قابلیت اپنی جماعت میں مسلم ہے، کناڈا، انگلینڈ وغیرہ میں آپ کے لکچر بہت مقبول ہوئے، متعدد مفید کتابوں کے مصنف ہیں۔ دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور ادارہ مجلس معارف القرآن (اکاڈیمی قرآن عظیم) کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین ہیں۔ آپ بھی حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے تلامذہ میں سے ہیں۔

اس وقت آپ کی شخصیت ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔ مصر، شام، حجاز، کویت، لبنان،

کناڈا، انگلستان وغیرہ کے آپ نے قومی طور پر سفر کیے اور اپنی قابلیت سے ادبی اور علمی حلقوں میں ممتاز رہے۔ مصر کی عالمی موتمر میں احقر کی معیت میں آپ کا خصوصی سفر ہوا، اور عالمی موتمر میں آپ کے خطاب کو سنا گیا۔

۴۹۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہٗ

آپ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے مایۂ ناز شاگردوں میں سے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم کے امین ہیں۔ جن کی ذات سے حضرت کے علوم کی بہت زیادہ اشاعت ہوئی۔ علمی دنیا میں آپ کا ایک خاص درجہ اور مقام ہے۔ ادبیت اور عربی وفارسی کی ادبی قوت بے مثال ہے۔ عربی زبان میں بے تکان اور بے تکلف بولتے ہیں، جس میں برجستگی اور روانی ہوتی ہے۔ عربی تحریر اور انشاء پردازی میں ایک بے نظیر صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ متعدد علمی کتب کے مصنف ہیں۔ ترمذی شریف کی نہایت ہی جامع اور بلیغ شرح لکھی ہے جس میں محدثانہ اور فقیہانہ انداز سے کلام کیا گیا ہے۔ اس کی عربیت اور طرزِ ادا معیاری ہے اور ذخیرۂ معلومات بہت کافی ہے۔ اس میں تبحر اور تفقہ دونوں نمایاں ہیں۔

آپ نے مصر، بیروت، شام، حجاز، عراق اور افغانستان وغیرہ کے سفر کیے۔ مصر میں علمائے دیوبند کا سب سے پہلے آپ نے تعارف کرایا اور وہاں کے اخبارات ورسائل نے آپ کے بلیغ مضامین نہایت شوق وذوق سے شائع کیے، جس سے مصر وشام میں آپ کی علمیت کا چرچا ہی نہیں ہوا بلکہ دھاک بیٹھ گئی اور معیاری علماء کی مجلسوں میں آپ کو نہایت توقیر اور احترام کے ساتھ طلب کیا جانے لگا۔ علامہ طنطاوی مصری صاحبِ تفسیر طنطاوی پر آپ نے مصنف کے روبرو نقد وتبصرہ کیا جس سے خود مصنف متاثر ہوئے اور بہت سی تنقیدات کو انصاف پسندی کے ساتھ انہوں نے قبول کیا اور ''یا استاذ'' کے الفاظ سے خطاب کیا۔

عربی میں بھی برجستگی اور یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ مؤتمر عالم اسلامی قاہرہ (مصر) میں رئیس وفد پاکستان کی حیثیت سے آپ کو بلایا گیا اور وہاں آپ نے مسلک علمائے دیوبند کے مطابق مسائل پر نقد وتبصرہ فرمایا۔ بعض مسائل کے متعلق آپ کے مقالہ کو اہمیت دی گئی اور کتابی صورت میں شائع کیا

گیا۔ آپ نے کراچی میں ایک مثالی دارالعلوم قائم فرمایا اور اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر نیوٹاؤن کی عظیم مسجد میں ابتداءً زہد وقناعت اور بے سروسامانی کے ساتھ تعلیم دینی شروع کردی۔ فقر وفاقہ تک کو برداشت کیا مگر کارِ تعلیم جاری رکھا۔ بالآخر سنتِ الٰہیہ کے مطابق آخر میں لوگوں کا رجوع ہوا اور آج یہ دارالعلوم کئی لاکھ کی عمارت ہے جس میں پندرہ بیس کے قریب اساتذہ کارِ تعلیم وتدریس میں مشغول ہیں۔ حدیث وفقہ میں ممدوح کی استعداد ولیاقت ممتاز حیثیت رکھتی ہے جسے ان کے ہم عصر بھی بطوع واعتراف تسلیم کرتے ہیں۔ آپ فضلائے دیوبند میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور ملک میں معروف ہیں۔ صوبہ سرحد (مغربی پاکستان) آپ کا وطن ہے اور اس وقت بحیثیت ناظم اعلیٰ دارالعلوم نیوٹاؤن کراچی میں قیام فرما ہیں۔

۵۰۔ حضرت مولانا حامد الانصاری غازی مدظلہٗ

آپ حضرت مولانا منصور انصاریؒ، رفیق سیاست حضرت شیخ الہندؒ کے صاحبزادے ہیں اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے تلامذہ میں سے ہیں اور حضرت بانئ دارالعلوم قدس سرہٗ کے نواسوں میں سے ہیں۔ علمی ذوق سے طبعی مناسبت رکھتے ہیں۔ اُردو ادب کے صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ مشہور اخبار ''مدینہ'' بجنور کے برسہابرس ایڈیٹر رہے، پھر ممبئی میں اپنا مستقل اخبار ''جمہوریت'' جاری کیا۔ آپ کے سیاسی مقالات کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا اور پڑھا جاتا ہے، قادر الکلام شاعر بھی ہیں۔ صوبہ بمبئی کی جمعیۃ العلماء کے صدر ہیں۔ سیاست پر کافی نظر اور سیاسی نشیب و فراز میں مہارت وحذاقت رکھتے ہیں ''اسلام کا نظامِ حکومت'' آپ کی معرکۃ الآراء تصنیف ہے جو مقبول ہے۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور ادارہ مجلس معارف القرآن (اکاڈیمی قرآن عظیم) کی مجلس کے رکن ہیں۔

۵۱۔ حضرت مولانا مفتی محمد محمود صاحب مدظلہٗ، ایم۔ پی (پاکستان)

آپ کی شخصیت علمی حلقوں میں بہت زیادہ معروف ہے۔ اس وقت پاکستان کی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ حق گوئی میں بے باک ہیں۔ فقہی اور حدیثی استعداد کے ساتھ عصری معلومات پر کافی عبور

رکھتے ہیں۔ پارلیمنٹ میں آپ کی تقریریں شرعی اور عصری معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہوتی ہیں۔ افتاء آپ کا خاص منصب ہے اور آپ کے فتاویٰ ملک میں اعتماد ووقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ وطن صوبہ سرحد (مغربی پاکستان) ہے۔ آپ اپنی گونا گوں علمی خصوصیات کی وجہ سے مصر کی عالمی موتمر میں بھی طلب کئے گئے اور وہاں آپ کا بلیغ خطاب وقعت کے ساتھ سنا گیا۔ آپ دار العلوم کے ممتاز فضلاء اور پاکستان کے مشاہیر میں سے ہیں۔ (۱)

۵۲۔ حضرت مولانا سید محمد منت اللہ صاحب رحمانی مدظلہ

آپ بھی دار العلوم دیو بند کے ایک ہونہار ابن قدیم ہیں۔ دار العلوم دیو بند سے فراغت کے بعد خانقاہ رحمانی میں اپنے والد بزرگوار کے جانشین کی حیثیت سے گدی نشین ہوئے اور خلقِ خدا کی روحانی اصلاح میں مشغول ہو گئے۔ ساتھ ساتھ درس وتدریس کا مشغلہ بھی جامعہ رحمانی میں جاری رکھا۔ آپ کی وجہ سے جامعہ رحمانی کو کافی ترقی ہوئی تا آنکہ جامعہ کی سابقہ عمارت ناکافی ہو جانے کی وجہ سے آپ نے جدید عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا جو آج نہایت شاندار صورت میں دیدہ زیبی کے ساتھ کھڑی ہوئی علومِ دینیہ کی اشاعت وترویج کر رہی ہے۔

اسی کے ساتھ آپ نے ایک نہایت ہی شاندار لائبریری اور کتب خانہ بھی تیار کرایا ہے جس کی شاندار عمارت تمام ضروری علوم وفنون کی کتابوں سے بھرپور اور آراستہ ہے۔ عالمی مؤتمر اسلامی قاہرہ (مصر) کے لئے بحیثیت امیر شریعت بہار آپ کا نام منتخب کیا گیا۔ احقر کی معیت میں آپ نے مصر وحجاز کا سفر فرمایا۔ مؤتمر اور الرابطۃ الاسلامیہ مکہ مکرمہ میں آپ نے مقالات پیش فرمائے جن کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ آپ مشاہیر ملک میں سے ہیں اور فضلائے دیو بند میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی دینی وملی خدمات اور ساتھ ہی آپ کے والد ماجد حضرت اقدس مولانا محمد علی صاحبؒ خلیفہ ارشد حضرت اقدس مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی قدس سرہٗ کی روحانی نسبت اور حلقۂ اثر کے زیر اثر اہل بہار واڑیسہ نے آپ کو امارتِ شرعیہ بہار واڑیسہ کا امیر شریعت منتخب کیا۔ آپ کی امارت کے زمانہ میں امارتِ شرعیہ نے بہت زیادہ ترقی کی اور اس کی شاخیں صوبہ

(۱) بعد میں حضرت مفتی صاحب صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے۔ محمد عمران قاسمی بگیانوی

کے مختلف اضلاع میں قائم ہوگئیں جو شرعی قانون کو عملی طور پر اس خطہ میں نافذ العمل کئے ہوئے ہیں۔ آپ دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین اور مؤثر ممبر بھی ہیں۔

یہ مختصر فہرست ان مشاہیر کی ہے جن کے فیوض سے ہندو پاک کا گوشہ گوشہ سیراب ہو رہا ہے، یہی نہیں بلکہ بیرونِ ہند میں بھی ان حضرات کے فیوض جاری ہیں۔ مشاہیر میں بہت سے ذی استعداد افراد ایسے ہیں جو پڑھنے پڑھانے میں تو زیادہ مشہور نہیں ہوئے لیکن اپنی اہلیت اور قابلیت کی بنا پر دوسرے علمی کاموں میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ مثلاً تصنیف، خطابت، طب اور صحافت وغیرہ میں بہت مشہور ہوئے۔ چند افراد کی فہرست درجِ ذیل ہے۔

۱۔ مولانا احسان اللہ خاں صاحب تاجور نجیب آبادیؒ

سابق پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور۔ وایڈیٹر ''ادبی دنیا'' لاہور۔ آپ بہت مشہور صحافی اور ممتاز شاعر تھے۔

۲۔ مولانا مظہر الدین صاحب بجنوریؒ

سابق ایڈیٹر ''الامان'' دہلی۔ آپ مشہور مقرر اور صحافی تھے۔ مسلم لیگ کے ممتاز لیڈروں میں سے تھے۔ دار العلوم دیوبند میں کچھ عرصہ مدرس بھی رہے۔

۳۔ مولانا شائق احمد صاحب عثمانی

سابق ایڈیٹر ''عصر جدید''۔ آپ دیوبند کے ممتاز فاضل اور ذہن وذکا اور علمی استعداد میں اپنے دور میں فرد مانے جاتے تھے، مگر فراغت کے بعد علمی سلسلہ قائم نہیں رہا بلکہ اخباری دنیا میں آ کر اسی میں منہمک رہے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستانی قومیت اختیار کر لی۔

۴۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بجنوریؒ

سابق ایڈیٹر ''منصور'' و ''نجات'' بجنور۔

۵۔ مولانا حکیم الدین صاحب بجنوریؒ

آپ مشہور طبیب تھے۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحبؒ کے اُستاد تھے۔

دارالعلوم کے فضلائے کرام کی کارکردگی

دارالعلوم دیوبند نے بحیثیت تعلیم گاہ ہونے کے ہر جہتی تعلیم دی اور ہمہ نوع فضلاء پیدا کئے، جنہوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں کام کیا۔ ذیل میں فضلائے دارالعلوم کی کارکردگی کا مختصر تذکرہ بصورتِ اعداد وشمار پیش کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند نے کون کون سی خدمات انجام دیں۔ یہ اعداد وشمار کارکردگی کے لحاظ سے ہیں۔ یعنی اگر ایک ابن قدیم نے پانچ چھ کام کئے ہیں تو ہر کام میں اس ابن قدیم کا نام شمار کیا گیا ہے۔ یہ اعداد وشمار سن آغاز دارالعلوم ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۲ھ تک کے ہیں (یعنی گذشتہ سو سال کے)۔

۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۲ھ تک سو سال کے عرصہ میں

- دارالعلوم دیوبند نے ۵۳۶ مشائخ طریقت پیدا کئے۔
- دارالعلوم دیوبند نے ۵۸۸۸ مدرسین پیدا کئے۔
- دارالعلوم دیوبند نے ۱۱۶۴ مصنّفین پیدا کئے۔
- دارالعلوم دیوبند نے ۱۷۸۴ مفتی پیدا کئے۔
- دارالعلوم دیوبند نے ۱۵۴۰ مناظر پیدا کئے۔
- دارالعلوم دیوبند نے ۶۸۴ صحافی پیدا کئے۔
- دارالعلوم دیوبند نے ۴۲۸۸ خطیب ومبلغ پیدا کئے۔
- دارالعلوم دیوبند نے ۲۸۸ طبیب پیدا کئے۔
- دارالعلوم دیوبند کے ۴۸۷ فضلاء نے صنعت حرفت اور تجارت کے ساتھ دینی خدمات انجام دیں۔

❖ ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند نے ۸۹۳۶ مدارس ومکاتب قائم کیئے۔

مذکورہ بالا خدمات میں جن حضرات نے اونچے درجہ کا مقام حاصل کیا انکی تعداد درجِ ذیل ہے۔

اعلیٰ درجہ کے معلّمین ومدرسین	۴۴۸
اعلیٰ درجہ کے مصنّفین	۲۷۶
اعلیٰ درجہ کے مفتی	۱۶۴
اعلیٰ درجہ کے مناظر	۱۱۲
اعلیٰ درجہ کے صحافی	۱۰۸
اعلیٰ درجہ کے خطیب ومبلغ	۲۸۸
اعلیٰ درجہ کے طبیب	۱۶۴

ملک میں دار العلوم کی شاخیں اور زیر اثر مدارس

دار العلوم کے فیضان نے ایک طرف تو ایسی شخصیتیں پیدا کیں جن میں سے ایک ایک فرد ایک مستقل امت اور ایک مستقل جماعت کی حیثیت رکھتا ہے، دوسری طرف ملک میں مدارسِ دینیہ کا سلسلہ قائم کر کے شخصیتیں اور کردار بنانے کی مشینیں نصب کرادیں اور منتسبہ مدارس اور انجمنوں کے ذریعہ اپنے غیر معمولی فیضان کا سلسلہ ہمہ گیر انداز میں پھیلا دیا۔

دار العلوم کی تاسیس کے بعد تقریباً ایک ہزار مدارسِ عربیہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں قائم ہوئے، ان میں سے بہت سے مدارس ایسے ہیں جن کے امتحانات اور کارگزاری کی نگرانی بھی دار العلوم ہی کے ذمہ ہے۔ مگر وہ خود اپنے اثر کے لحاظ سے مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے جامعہ ملیہ نواکھالی (تقسیم کے بعد اس کی نگرانی ختم ہوگئی)، یا مدرسہ قاسم العلوم مرادآباد، یا مدرسہ جامع مسجد امروہہ، یا مدرسہ گلاؤٹھی وغیرہ۔ اگر ان متعلقہ مدارس کے فضلاء اور تعلیم یافتہ بھی دار العلوم کے فیض یافتہ حضرات میں شامل کیئے جائیں جیسا کہ بالواسطہ وہ یقیناً شامل ہیں تو ہندوستان کا کوئی علمی حلقہ ایسا نظر نہ آئے گا جہاں دار العلوم کی ظاہری اور معنوی برکات کام نہ کر رہی ہوں۔

پھر اگر ان تمام مدارسِ متعلقہ ومکاتب اور اجتماعی اداروں کے حلقہائے اثر کو بھی دیکھا جائے تو بلا مبالغہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کا کوئی صحیح العقیدہ مسلمان خواہ وہ کسی حصہ کا رہنے والا ہو دارالعلوم کے ربقۂ توسل وانتساب سے سبک بار نہیں ہو سکتا جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ اس تخم سعادت کا شجرۂ طیبہ کہاں کہاں تک پھیلا اور اس کے شیریں ثمرات نے کتنوں کو حیاتِ لازوال بخشی۔

بیرونِ ہند ممالکِ غیر میں دارالعلوم کا اثر

پھر کوئی اسلامی منطقہ ایسا نہیں جہاں دارالعلوم کے علمی اثرات کسی نہ کسی صورت میں نہ پہنچے ہوں اور قائم نہ ہوں۔ حتیٰ کہ مرکزِ اسلام ومہبطِ وحی کی خدمت کے لئے بھی دارالعلوم ہمہ وقت حاضر رہا۔ اسے یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے متعدد فضلاء نے حجاز مقدس میں بھی مستقل افادہ ودرس کا سلسلہ جاری کیا اور ان حضرات کا درس اس قدر مقبول ہوا کہ اہل حجاز نے دور دور سے آ کر اس میں شرکت کی اس طرح مرکزِ اسلام (حجاز مقدس) اور مرکزِ علوم دارالعلوم کے درمیان ایک مخصوص ربط قائم ہو گیا۔ سب سے پہلے حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسری مہاجر مدنیؒ نے حرمِ مکہ میں حدیث، تفسیر اور مختلف فنون کے درس کا کامیاب سلسلہ جاری فرمایا۔ اس درس سے اہل مکہ واہل مدینہ اور دوسرے حجازیوں کو بہت زیادہ فائدہ پہنچا۔ دوسرے ممالک سے جو زائرین آتے تھے وہ بھی اس درس سے فیضیاب ہوتے تھے۔

اسکے بعد حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ نے حرمِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والتسلیم میں اٹھارہ سال تک علومِ کتاب وسنت کے دریا بہائے جس سے ہزاروں حجازی، شامی، عراقی اور مختلف بلادِ اسلامیہ کے لوگوں نے اپنی علمی پیاس بجھائی اور ان تک دارالعلوم کی سند پہنچی۔

پھر حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب قدس سرہ کے برادرِ بزرگ حضرت مولانا سید احمد صاحب فیض آبادی قدس سرہ مہاجر مدنی فاضل دارالعلوم دیوبند نے مدینہ طیبہ میں مستقل طور پر ایک مدرسہ ''المدرستہ الشرعیہ'' کے نام سے جاری کیا، جو اب تک کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس مدرسہ کی

روداد ہر سال چھپتی ہے، اس میں کئی سو طلبہ اور متعدد مدرسین کام کر رہے ہیں، اس مدرسہ میں جملہ علوم وفنون پڑھائے جاتے ہیں اور بچوں کو دستکاری بھی سکھائی جاتی ہے۔ اسی مدرسہ میں دارالعلوم کے مشہور استاذ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب دیوبندی نے بھی مستقل مدینہ منورہ میں قیام فرما کر برسہا برس تعلیم دی۔ اہل مدینہ نیز مضافاتِ مدینہ کے لوگ اس سرچشمۂ عالم سے اب تک سیراب ہو رہے ہیں۔

اس کے علاوہ حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مدظلہ، سابق استاذ دارالعلوم دیوبند نے بھی جو ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند میں سے ایک ہونہار فاضل، عالم اور شیخ طریقت ہیں، مدینہ منورہ میں مستقل قیام فرما کر بیعت وارشاد، اصلاح اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری فرمایا ہے جو تا حال قائم ہے۔ گو مولانا محترم بوجہ امراض وکبر سنی ضعیف ہو گئے ہیں لیکن ہمتِ باطنی سے فیضان کے یہ سب سلسلے بدستور قائم ہیں اور نہ صرف اہل حجاز بلکہ دوسرے ممالک مثلاً ساؤتھ افریقہ اور ایسٹ افریقہ وغیرہ کے ہزاروں افراد آپ کے علوم وفیضان سے مستفید ہو رہے ہیں۔

اس کے علاوہ افغانستان، پاکستان، برما، افریقہ وغیرہ میں تقریباً ہر صوبہ اور بعض ممالک میں شہر بہ شہر مدارس اور خانقاہیں قائم ہیں جہاں فضلائے دارالعلوم ظاہری وباطنی افاضات میں مشغول ہیں۔ تاریخی اعداد وشمار کے علاوہ خود اس ناچیز کا مشاہدہ بھی گواہ ہے۔

دارالعلوم کے تعلیمی مصارف اور اس کی کفایت شعاری

دارالعلوم کے تعلیمی مصارف پیش کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مصارف کی نوعیتیں بھی پیش کر دی جائیں تا کہ دوسرے اداروں سے مقابلہ کرنے میں آسانی ہو۔

دارالعلوم میں ابتدا ہی سے مفت تعلیم کا انتظام ہے۔ مفت تعلیم کا صرف یہ مفہوم نہیں ہے کہ طلبہ سے کوئی تعلیمی فیس نہیں لی جاتی بلکہ ہر امیر وغریب طالب علم کو حسبِ ذیل چیزیں بالکل مفت فراہم کی جاتی ہیں۔

تعلیم، کتابیں، رہنے کے کمرے، بجلی کی روشنی، سردیوں میں گرم پانی، گرمیوں میں سرد پانی،

طبی امداد، ایسے طلبہ کی تعداد تقریباً ڈیڑھ ہزار ہوتی ہے۔اس کے علاوہ جو طلبہ غیر مستطیع ہوتے ہیں، انہیں مذکورہ بالا سہولتوں کے علاوہ حسبِ ذیل امداد بھی مفت دی جاتی ہے۔

دونوں وقت کا کھانا، سال میں چار جوڑے کپڑے، سال میں دو جوڑے جوتے، تیل اور صابون وغیرہ کے اخراجات کے لئے ۲۵ روپئے ماہوار، سردیوں میں لحاف اور کمبل، ایسے طلبہ کی تعداد تقریباً ۹۰۰ ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ حضرات مدرسین اور کارکنان کی تنخواہیں ہیں جن پر ہر ماہ تقریباً ۲۰ ہزار روپیہ صرف ہوتا ہے۔اس مرکزی ادارے کی شان، اس کی وسعت اور پھیلاؤ کو دیکھئے پھر اس کے تعلیمی اخراجات پر نظر ڈالئے تو آپ کو اس کے کارکنوں کی دیانت داری، کفایت شعاری اور اخلاص مندی کا اندازہ ہو جائے گا۔

ذیل میں ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۲ھ تک ایک سو سال کی آمدنی وخرچ وغیرہ کے کچھ اعداد وشمار پیش کئے جاتے ہیں۔

	پائی	آنہ	روپیہ
سو برس کی کل آمدنی	۲	۱۳	۱،۰۸،۳۱،۵۶۶
سو برس کا کل خرچ	۳	۱۱	۱،۰۸،۴۶،۹۴۶
سو برس کا کل خرچہ تعمیرات	۶	۱۳	۱۱۰۰،۸۹۵
سو برس کی تعداد فضلائے کرام			۷۴۱۷
سو برس کی تعدادِ فتاویٰ			۲،۶۹،۲۱۵
سو برس کی تعداد وقفی جو کتب خانہ میں موجود ہیں			۸۲،۳۵۰

فضلاء ومستفیدین دارالعلوم کی عددی تفصیلات

سو برس میں جن طلبہ نے دارالعلوم سے استفادہ کیا اور جن کے تعلیمی اخراجات دارالعلوم نے برداشت کئے ان کی مجموعی تعداد ۶۵،۲۷،۷ ہے۔

سو برس میں فضلائے کرام کی تعداد جنہوں نے سند و دستار حاصل کی یعنی ۷۴۱۷ کو منہا کرنے کے بعد ان طلبہ کی تعداد جنہوں نے دار العلوم سے استفادہ کیا ۳۱۰،۵۸ ہے۔

کل خرچ میں سے صرفہ تعمیرات منہا کرنے کے بعد سو برس میں کل خرچ کی مقدار

پائی	آنہ	روپیہ
۹	۱۳	۹۷،۴۶،۰۵۰

۹۷،۴۶،۰۵۰ روپیہ ۱۳ آنہ ۹ پائی کو اگر ۲۷،۵۶ طلبہ پر تقسیم کیا جائے تو ایک طالب علم پر خرچ کی مقدار ۱۴۹ روپیہ آتی ہے۔

۹۷،۴۶،۰۵۰ روپیہ ۱۳ آنہ ۹ پائی کو اگر ۷۴۱۷ فضلائے کرام پر تقسیم کیا جائے تو ایک مکمل عالم تیار کرنے پر خرچ کی مقدار ۱۳۱۴ روپیہ آتی ہے۔

اتنی حقیر رقم سے ایک ایسے عالم کا تیار ہونا جو قوم کی تمام دینی ضروریات، مثلاً تزکیۂ نفوس، تدریس، تصنیف، افتاء و مناظرہ، صحافت، خطابت و تبلیغ اور اصلاحِ عام کے فرائض وغیرہ کو بخوبی انجام دے سکے، یقیناً ایک معیاری اور مثالی کامیابی ہے جس کی نظیر دنیا کے رسمی اداروں میں ملنی ناممکن ہے۔ دار العلوم اس پر بجا طور فخر و ناز کر سکتا ہے۔ بالخصوص جب کہ یہ بھی پیش نظر رکھا جائے کہ اس ۷۴۱۷ کی تعداد میں کتنی ہستیاں ایسی بھی ہیں کہ اگر لاکھوں روپیہ ان میں سے کسی ایک پر نچھاور کر دیئے جائیں تو کم ہیں۔ جن میں سے بعض کے نام ہم اوپر شمار کرا چکے ہیں۔

بہر حال دار العلوم کا فیض بارانِ رحمت کی طرح عام رہا، علم کے پیاسے دور دور سے آئے اور اس نے ہر ایک کے ظرف اور ایک کی طلب کے موافق اس کی پیاس بجھائی۔ ہند و پاک کا کوئی شہر کوئی قصبہ اور کوئی گوشہ ایسا نہ ملے گا جہاں اس چشمۂ دین سے نکلی ہوئی کوئی نہر موجود نہ ہو، جس سے سب لوگ سیراب ہوتے ہیں۔

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

نوٹ: مذکورہ بالا سطور میں ۹۷۴۶۰۵۰ روپیہ ۱۳ آنے اور ۹ پائی کا جو خرچ دکھایا گیا ہے وہ

تعمیرات کے علاوہ باقی تمام شعبہ جاتِ دارالعلوم کا خرچ ہے۔ اسی میں دارالافتاء کا خرچ بھی شامل ہے جس سے سو سال کے عرصہ میں ۲۱۵،۶۹،۲ فتاویٰ صادر کئے گئے اور کتب خانہ کے اخراجات بھی ہیں، جس میں سو سال کے اختتام پر ۸۲۳۵۰ کتب موجود ہیں۔

دارالعلوم کے اسلاف

دارالعلوم دیو بند کے اسلاف میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ سے لے کر حضرت نانوتوی قدس سرہٗ تک کے سارے بزرگ شمار ہوتے ہیں۔ کیونکہ مسلکاً اور روایتہً دارالعلوم دیو بند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ کی جانب منسوب ہے، اور سلوک میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کا سلسلہ اکابرِ دارالعلوم میں جاری وساری ہوا۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ کے اجل خلفاء میں سے تھے اور خود حاجی صاحب قدس سرہٗ دارالعلوم کے اسلاف میں ہیں۔

ان کے علاوہ دارالعلوم کے اسلاف وہ حضرات بھی ہیں جنہوں نے دارالعلوم کی رسمی یا معنوی سرپرستی فرمائی، مثلاً حضرت مولانا احمد علی صاحب قدس سرہٗ محدث سہارن پوری جن کا دخل تعمیر مدرسہ کے معاملات میں رہا اور ان کی مبارک رایوں کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ تعمیر مدرسہ اور عمارتی سنگ بنیاد کے سلسلہ میں حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کا ذوق تو یہ تھا کہ مدرسہ کی عمارات خام ہوں، گھاس پھونس پر بیٹھ کر طلبہ تعلیم پائیں تا کہ زہد وقناعت، سادگی و بذاذت اور صبر وتوکل کی شان ان میں نمایاں رہے، لیکن دوسرے اہل الرائے حضرات کی رائے یہ تھی کہ دارالعلوم کی عمارت پختہ اور مستحکم بنوائی جائیں تا کہ مدرسہ اپنی صورت کے لحاظ سے بھی نمایاں رہے، لیکن اس بارہ میں جب کہ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی رائے متاثر نہ ہوئی تو آخر کار حضرت مولانا احمد علی صاحب قدس سرہٗ سے حضرت نانوتوی قدس سرہٗ پر اثر ڈلوایا گیا اور آپ نے مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے بعد اپنی رائے تبدیل فرمادی اور مدرسہ کی پختہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔ اسی طرح

حضرت مولانا قاضی محمد اسماعیل صاحب منگلوریؒ جو صاحبِ سلسلہ اور نہایت پایہ کے بزرگوں میں سے تھے، دارالعلوم کے قیام کے سلسلہ میں ان کے مکاشفات بھی تھے جن کا ظہور قیامِ دارالعلوم کی صورت میں ہوا، اس لئے آپ بھی اسلافِ دارالعلوم ہی میں شمار کئے جاتے ہیں۔

دارالعلوم کے اعلیٰ عہدیدار

دارالعلوم میں اعلیٰ ذمہ دارانہ عہدے صرف چار ہی ہیں۔

(۱) سرپرستی (۲) اہتمام (۳) صدارتِ تدریس (۴) افتاء

ان چاروں عہدوں کے لئے ہمیشہ ایسی ممتاز شخصیتوں کا انتخاب عمل میں آتا رہا ہے جو اہل اللہ، اہل دین واہل تقویٰ اور جامع شریعت وطریقت ہوں۔

۱۔ دارالعلوم کے سرپرست

دارالعلوم کے سب سے پہلے سرپرست بانئ دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ العزیز تھے، جن کا پُرامن وبابرکت عہد آج تک احاطہ دارالعلوم میں ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷ء) سے ۱۲۹۷ھ (۱۸۷۹ء) تک سرپرست رہے۔ حضرت نانوتویؒ کی وفات کے بعد دوسرے سرپرست حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ مقرر ہوئے۔ آپ کے عہد کے برکات دارالعلوم پر نورِ آفتاب کی طرف چھائی رہیں جن سے ظلمتوں کو قرار پکڑنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ آپ ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۰ء) سے ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) تک سرپرست رہے۔ آپ کے بعد ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۶ء) میں باجماعِ اہل دارالعلوم شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ پرسرست تسلیم کئے گئے۔ جن کے نورانی آثار سے آج تک دارالعلوم کا احاطہ چمک رہا ہے۔

۱۳۳۳ھ (۱۹۱۴ء) میں جب آپ حجاز تشریف لے گئے تو حضرت اقدس مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری قدس سرہٗ کو سرپرست تسلیم کیا گیا، آپ ۱۳۳۴ھ (۱۹۱۵ء) سے ۱۳۳۷ھ

(۱۹۱۸ء) تک سرپرست رہے۔۱۳۳۷ھ (۱۹۱۸ء) میں جب حضرت شیخ الہندؒ مالٹا سے رہا ہوکر واپس تشریف لائے تو پھر آپ ہی ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۰ء) تک سرپرست رہے۔

آپ کے بعد ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۵ء) میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ العزیز سرپرست ہوئے۔آپ نے اپنی باطنی توجہات اور صرفِ ہمت کے ذریعہ دارالعلوم دیوبند کے جہاز کو فتن وحوادث کے تھپیڑوں سے محفوظ رکھا۔۱۳۵۴ھ (۱۹۳۵ء) میں اپنی گوناگوں مشغولیات کی وجہ سے حضرت تھانوی قدس سرہ العزیز نے سرپرستی سے استعفیٰ دے دیا،اس کے بعد سے آج تک سرپرست کے نام سے کسی شخصیت کا انتخاب عمل میں نہیں آیا۔

۲۔ دارالعلوم کے مہتمم

اہتمام کے عہدہ پر بھی ہمیشہ اپنے وقت کے منتخب مخصوص افراد کا انتخاب ہوتا رہا۔سب سے پہلے مہتمم حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی تھے جو طریقہ چشتیہ صابریہ کے ایک معروف صاحبِ سلسلہ بزرگ تھے اور زہد وریاضت کا پیکر تھے،آپ کا حلقۂ اثر دیوبند اور اطراف وجوانب میں بہت وسیع تھا۔آپ اولاً محرم ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷ء) سے رجب ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۸ء) تک مہتمم رہے،ثانیاً ۱۲۸۶ھ (۱۸۷ء) تا ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۲ء) اور ثالثاً ربیع الاول ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۹ء) تا شعبان ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۳ء) مہتمم رہے۔

آپ کے اہتمامِ اول کے بعد حضرت اقدس مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندیؒ عہدۂ اہتمام پر فائز ہوئے۔آپ طریقت وحقیقت کے ایک بلند پایہ شیخ اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی نوراللہ مرقدہٗ کے ارشد خلیفہ تھے۔حضرت شاہ صاحبؒ اُن پر فخر کیا کرتے تھے۔موصوف بہت سے اکابرِ دارالعلوم مثل حضرت مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند وغیرہ کے شیخ طریقت تھے۔دارالعلوم کی معنوی ترقیات میں حضرت ممدوح کی تربیت وصرفِ ہمت کا اسی طرح حصہ ہے جس طرح قطب عالم عارف باللہ حضرت مولانا نانوتویؒ اور قطبِ ارشاد عارف باللہ حضرت مولانا گنگوہی کا تھا۔آپ اولاً شعبان ۱۲۸۴ھ

(۱۸۶۸ء) تا ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ء) اور ثانیاً ذیقعدہ ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۳ء) ربیع الاول ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۹ء) دار العلوم کے مہتمم رہے۔ آپ کے بعد تیسرے مہتمم حاجی محمد فضل حق صاحب دیو بندی رحمۃ اللہ علیہ مقرر ہوئے، جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور ایک صالح و متقی بزرگ تھے۔ آپ شعبان ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۳ء) سے ذیقعدہ ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۴ء) تک مہتمم رہے۔

آپ کے بعد ذی الحجہ ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۴ء) میں حضرت مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم کے چوتھے مہتمم ہوئے۔ آپ حضرت نانوتوی قدس سرہ کے رشتہ کے بھائی اور جہادِ شاملی میں ردیف کی حیثیت رکھتے تھے۔ نہایت ہی باخدا بزرگ اور صاحبِ دیانت وتقویٰ لوگوں میں تھے۔ آپ کے زمانۂ اہتمام کی انتہاء جمادی الاول ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۵ء) ہے۔

آپ کے بعد جمادی الثانی ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۶ء) میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب ابن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ دار العلوم کے پانچویں مہتمم بنائے گئے، آپ کا عہد سابقہ تمام عہدوں سے زیادہ طویل، پرشوکت اور پر ہیبت دور گذرا ہے۔ یہ دور چالیس برس تک ممتد رہا اور اس چالیس سالہ مدت ہی میں دار العلوم نے نمایاں ترقی کی۔ حضرت ممدوح کی ذاتی وآبائی وجاہت نے بہت سے پیدا شدہ فتنوں کو دبا کر دار العلوم کے حلقۂ اثر کو وسیع تر بنایا، مالی امدادیں کثیر مقدار میں بڑھیں، بڑی بڑی عمارتیں مثلاً دار الطلبہ قدیم، دار الطلبہ جدید کا کچھ حصہ، دار الحدیث تحتانی، مسجد دار العلوم، کتب خانہ، دار المشورہ، قدیم مہمان خانہ اور مختلف احاطے ارضِ دار العلوم پر نمایاں ہوئے۔ کارکنوں میں اضافہ ہوا۔ حاصل یہ کہ اس درسگاہ نے مدرسہ سے دار العلوم اور دار العلوم سے ایک جامعہ کی صورت اسی زمانہ میں اختیار کی جس کے ماتحت آج بہت سے اضلاع اور صوبجات کے بہت سے ادارے چل رہے ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ (۱۹۲۹ء) میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ دار العلوم کے چھٹے مہتمم ہوئے۔ آپ ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۷ء) میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کی نیابت میں رکھے گئے تھے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ اپنی دانش وبینش اور فہم وفراست میں یگانۂ ہند تسلیم کئے جاتے تھے۔ ممدوح نے اپنے خداداد

تدبر سے دار العلوم کے انتظامات کو نہایت اعلیٰ پیمانے پر منظّم کیا۔ تقسیم کار کے ذریعہ مخلوط امور کو شعبوں میں تقسیم کیا اور دار العلوم کو حقیقی معنی میں مرکزی حیثیت دی۔ موصوف کا یہ مستقل اہتمام گو تقریباً ڈیڑھ برس رہا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے دستِ راست اور ان کی چالیس سالہ خدمات کے روحِ رواں نیابت کی صورت میں آپ ہی رہے۔ آپ کا زمانۂ اہتمام شعبان ۱۳۴۸ھ (۱۹۳۰ء) تک رہا۔

(اضافہ از مولانا عزیز احمد صاحب قاسمی، ناظم شعبہ ابنائے قدیم دار العلوم دیو بند)

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کے بعد ۱۳۴۸ھ (۱۹۳۰ء) میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ دار العلوم دیو بند کے ساتویں مہتمم ہوئے اور بحمد للہ اب تک آپ ہی کے دستِ مبارک میں زمامِ اہتمام ہے۔ آپ کا حلقۂ اثر ہندو پاک سے گذر کر افغانستان، برما، حجازِ مقدس، ایران، مصر، ایسٹ افریقہ اور جنوبی افریقہ تک پھیل گیا۔ آپ کے زمانہ اہتمام میں انگلینڈ، امریکہ میں بھی دار العلوم کا تعارف ہوا اور وہاں سے بھی امدادی رقوم وصول ہوئیں۔ آپ کے زمانے میں دار العلوم نے نمایاں ترقی کی، دار العلوم کا حلقۂ اثر بھی وسیع ہوا، مالیات میں بھی بے حد اضافہ ہوا، اور تعمیرات بھی بہت زیادہ ہوئیں جس کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ جس میں دار العلوم کی ترقیات اور اضافوں کی دو حصوں میں تقسیم کر کے موازنہ کیا گیا ہے، ایک حصہ آغازِ دار العلوم ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۴۷ھ تک چھ مہتمموں کا ۶۴ سالہ دورِ اہتمام ہے اور دوسرا حصہ ۱۳۴۸ھ سے ۱۳۸۲ھ تک کا ہے جو حضرت مولانا محمد طیب کا ۳۵ سالہ دورِ اہتمام ہے، اس میں ان دونوں ادوار کی آمد و صرف، مصارفِ تعمیر، تعدادِ کتب در کتب خانہ، تعدادِ فتاویٰ اور تعدادِ فضلاء موازنہ کر کے دکھلائی گئی ہے اور نتیجتاً دورِ ثانی میں بہ نسبت دورِ اول اضافوں اور ترقیات کے اعداد پیش کر دیئے گئے ہیں۔

از ۱۲۸۳ھ تا ۱۳۸۲ھ

آمدنی چودہ لاکھ اٹھاسی ہزار آٹھ سو تئیس روپے نو آنے گیارہ پائی

۱۴,۸۸,۸۲۳ ۹-۱۱

خرچ پندرہ لاکھ دو سو ستاون روپے سات آنے تین پائی

۱۵,۰۰,۲۵۷ ۷-۳

تفصیلات خرچ

نمبر شمار	نام مدات	پائی	آنہ	روپیہ
۱	صرفہ تعمیرات	۱۱	۷	۳,۴۶,۷۸۵
۲	کتب خانہ میں تعدادِ کتب			۳۰۴۶۱
۳	تعداد فتاویٰ جو دار العلوم سے روانہ کئے گئے			۴۴۸۹۴
۴	تعداد فضلاءِ کرام			۱۸۸۴
۵	مجموعی تعداد طلبہ دار العلوم			۷۹۰
۶	تعداد امدادی طلباء			۳۶۵
۷	تعداد مدرسین			۲۴
۸	تعداد دیگر ملازمین			۳۲

۹	دارالاقامہ میں کمروں کی تعداد			۱۰۰(اندازاً)
۱۰	دارالاقامہ میں طلبہ کی تعداد			۵۰۰(اندازاً)
۱۱	شعبہ جات کی تعداد			۱۱

تفصیلات آمدنی وخرچ مع اضافہ از ۱۳۴۸ھ تا ۱۳۸۲ھ

آمدنی: ترانوے لاکھ بیالیس ہزار سات سو تینتالیس روپے تین آنے تین پائی

۹۳۴۲,۷۴۳ ۳-۳

خرچ: ترانوے لاکھ چھیالیس ہزار چھ سو نواسی روپے چار آنے

۹۳,۴۶,۶۸۹ ۴-۰۰

اضافہ آمدنی: اٹھتر لاکھ ترپن ہزار نو سو انیس روپے نو آنے چار پائی

اضافہ خرچ: اٹھتر لاکھ چھیالیس ہزار چار سو اکتیس روپے بارہ آنے نو پائی

تفصیلات خرچ مع اضافہ

نمبر شمار	نام مدات	پائی	آنہ	روپیہ	اضافہ
۱	صرفہ تعمیرات	۷	۹	۷,۵۴,۱۱۰	۴,۰۷,۳۲۵
۲	کتب خانہ میں تعدادِ کتب			۵۱۸۸۹	۲۱۴۲۸
۳	تعداد فتاویٰ جو دارالعلوم سے روانہ کیے گئے			۲۶۴۳۲۱	۱۷۹۴۲۷

۴	تعداد فضلاءِ کرام			۵۵۳۳	۳۶۴۹
۵	مجموعی تعداد طلبہ دارالعلوم			۱۵۶۹	۷۷۹
۶	تعداد امدادی طلباء			۸۲۵	۴۶۹
۷	تعداد مدرسین			۵۹	۳۵
۸	تعداد دیگر ملازمین			۱۸۲	۱۵۰
۹	دارالاقامہ میں کمروں کی تعداد			۲۲۸	۱۲۸
۱۰	دارالاقامہ میں طلبہ کی تعداد			۱۰۷۳	۵۷۳
۱۱	شعبہ جات کی تعداد			۳۰	۱۹

۳۔ دارالعلوم کے صدر مدرس

(الف) دارالعلوم دیوبند کی صدارتِ تدریس پر سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ' فائز ہوئے جو اپنی جامعیتِ علومِ ظاہرہ وباطنہ کے سبب شاہ عبدالعزیز ثانی تسلیم کئے جاتے تھے۔آپ ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۷ء) سے ربیع الاول ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۶ء) تک اس عہدہ پر فائز رہے۔آپ سے حدیث پڑھ کر ۷ طلبہ فارغ التحصیل ہوئے۔

(ب) ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۶ء) میں حضرت مولانا سید احمد صاحب دہلویؒ صدر مدرس مقرر فرمائے گئے، جو علومِ منقولہ کے ساتھ علومِ معقولہ خصوصاً علم ہیئت وریاضی میں امامِ وقت تسلیم کئے جاتے تھے۔آپ ۱۳۰۷ھ (۱۸۸۹ء) تک صدارتِ تدریس پر فائز رہے اور آپ کے ذریعہ ۲۸ طلبہ فارغ التحصیل ہوئے۔

(ج) ۱۳۰۸ھ (۱۸۹۰ء) میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیو بندیؒ دار العلوم کے تیسرے صدر مدرس مقرر فرمائے گئے۔ آپ نے پچیس برس تک مسلسل حدیث اور تفسیرِ کلامِ ربانی کے علوم کے دریا بہائے اور تشنگانِ علوم اس بحر ذخار سے سیراب ہو کر دوسروں کو سیراب کرتے رہے۔ آپ ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۴ء) تک اس عہدہ پر فائز رہے، اس عرصہ میں ۸۶۰ طلبہ آپ سے حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔

(د) ۱۳۳۴ھ (۱۹۱۵ء) میں بحر العلوم، محدثِ دوراں، علامۂ عصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ قائم مقام صدر مدرس مقرر فرمائے گئے۔ پھر ۱۳۳۸ھ (۱۹۱۹ء) میں موصوف مستقل صدر مدرس ہوئے۔ آپ اپنے علم وعمل، زہد وتقویٰ، تبحر وتفقہ اور حفظ وروایت کے لحاظ سے یگانۂ روزگار تھے۔ آپ ۱۳۳۴ھ سے ۱۳۳۸ھ تک قائم مقام صدر مدرس اور ۱۳۳۸ھ سے اوائل ۱۳۴۵ھ (۱۹۲۶ء) تک صدر مدرس رہے۔ اس بارہ سالہ مدت میں آپ سے حدیث پڑھ کر ۸۰۹ طلبہ نے فراغت حاصل کی۔

(ہ) شوال ۱۳۴۵ھ (۱۹۲۶ء) میں استاذ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ مسند نشین صدارتِ تدریس ہوئے، جن کے علم وفضل اور اخلاقِ فاضلہ سے ہزاروں تشنگانِ علوم نے ظاہری وباطنی تکمیل کر کے اپنی علمی وروحانی پیاس بجھائی۔ آپ جمادی الاول ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۸ء) تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ اس دوران آپ سے ۴۴۸۳ طلبہ نے بخاری وترمذی پڑھ کر فراغت حاصل کی۔

(و) ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۸ء) میں جامع معقول ومنقول حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی مدظلہٗ دار العلوم کے صدر مدرس مقرر فرمائے گئے۔ آج آپ ہی بحمد اللہ اس عہدہ پر فائز ہیں۔ آپ معقولات کے امام ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ سے ظاہراً وباطناً مستفید ہیں اور طریقت میں حضرت اقدس مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائپوری قدس سرہٗ سے سلسلۂ بیعت رکھتے ہیں، عرصۂ دراز سے آپ بحیثیت محدثِ دار العلوم احادیث کی مختلف کتابوں کا درس دیتے رہے ہیں۔ خصوصیت سے صحیح مسلم آپ کے درس کا شاہکار رہی ہے، جس کی مقبولیت طالبانِ علم حدیث میں عام ہے۔ آپ کے

زمانہ میں ۱۳۷۷ھ سے ۱۳۸۲ھ تک ۱۱۶۰ طلبہ فارغ التحصیل ہوئے اور بحمد اللہ اب بھی آپ کا فیض جاری ہے۔

۴۔ دارالعلوم کے مفتی

(ا) دارالعلوم دیو بند میں درس وتدریس کے علاوہ افتاء کا کام بھی ابتدا ہی سے ہوتا رہا، سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ جو دارالعلوم کے صدر المدرسین تھے وہی اس اہم کام کو بھی انجام دیتے رہے۔ چنانچہ آپ نے ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۰۱ھ تک اس خدمت کو بھی انجام دیا۔

(ب) اس کے بعد کسی مخصوص شخصیت کے ذمہ یہ کام نہیں رکھا گیا بلکہ مختلف اساتذۂ کرام سے افتاء کا کام لیا جاتا رہا۔ چنانچہ ۱۳۰۲ھ سے ۱۳۰۹ھ تک اسی طرح کام چلتا رہا۔

(ج) استفتاء کی تعداد بڑھ کر غیر معمولی حد تک پہنچ جانے کے سبب باقاعدہ ایک دارالافتاء کی بنیاد ڈالی گئی اور ۱۳۱۰ھ میں دارالافتاء قائم کر کے حضرت اقدس مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیو بندی قدس سرہٗ کو مفتی کا عہدہ سپرد کیا گیا۔ آپ کے زمانہ میں دارالافتاء سے ۱۳۳۰ھ سے ۱۳۴۶ھ تک ۱۶ برس کی مدت میں ۴۲۶۲۱ فتاویٰ روانہ کئے گئے۔ ۱۳۳۰ھ سے پہلے کا کوئی ریکارڈ محفوظ نہیں ملتا۔ اس لئے ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۲۹ھ تک ۱۹ سال کے فتاویٰ کی تعداد سامنے نہیں آسکی۔

(د) ۱۳۴۷ھ میں حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ صدر مفتی اور حضرت مولانا مفتی ریاض الدین صاحبؒ مفتی کی حیثیت سے دارالافتاء کے ذمہ دار بنائے گئے۔ یہ دور ۱۳۴۸ھ تک رہا، اور اس دور میں ۴۴۴۸ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

(ہ) ۱۳۴۹ھ میں تنہا حضرت مولانا مفتی ریاض الدین صاحبؒ کی ذمہ داری میں آگیا اور اس دور میں ۲۴۵۳ فتاویٰ روانہ کئے گئے۔

(و) ۱۳۵۰ھ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ حال مفتی پاکستان وناظم اعلیٰ دارالعلوم کراچی مفتیٔ دارالعلوم بنائے گئے۔ آپ اس عہدہ پر ۱۳۵۴ھ تک فائز رہے، آپ کے زمانہ میں ۱۸۳۹۵ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

(ز) ۱۳۵۵ھ میں حضرت مولانا محمد سہول صاحبؒ مفتی مقرر فرمائے گئے، آپ ۱۳۵۷ھ تک مفتی رہے۔آپ کے دور میں ۱۵۱۸۵ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

(ح) ۱۳۵۸ھ میں حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب میرٹھی مفتی مقرر فرمائے گئے، آپ صرف ایک سال تک رہے اور ایک سال میں ۵۸۴۰ فتاویٰ دارالعلوم سے روانہ کئے گئے۔

(ط) ۱۳۵۹ھ میں دوبارہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ مفتی مقرر فرمائے گئے اور ۱۳۶۱ھ تک آپ مفتی رہے۔اس دوران میں ۶۸۷ ۱۷ فتاویٰ دارالعلوم سے روانہ کئے گئے۔

(ی) ۱۳۶۲ھ میں حضرت مولانا محمد فاروق صاحب انبیٹھویؒ ابن حضرت مولانا صدیق احمد صاحب مفتی مالیر کوٹلہ دارالعلوم کے مفتی مقرر فرمائے گئے۔آپ ۱۳۶۳ھ تک رہے۔آپ کے دور میں ۸۴۲۷ فتاویٰ روانہ کئے گئے۔

(ک) ۱۳۶۴ھ میں پھر حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ مفتی مقرر فرمائے گئے۔آپ ۱۳۶۶ھ تک مفتی رہے اور آپ کے اس زمانہ میں ۲۰۴۰۷ فتاویٰ دارالعلوم سے روانہ کئے گئے۔

(ل) ۱۳۶۷ھ میں حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہاں پوری مدظلہ مفتی مقرر فرمائے گئے، اور اس وقت تک کہ ۱۳۸۴ھ ہے آپ ہی مفتیٔ دارالعلوم ہیں۔فتاویٰ میں آپ کی محنت وعرق ریزی اور شب وروز کا انہماک معروف اور زبان زد ہے، آپ کے زمانہ میں ۱۳۸۲ھ تک ۱۳۳۷۵۲ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم

از ۱۲۸۳ھ تا ۱۳۸۲ھ

نمبر شمار	اسمائے گرامی حضرات نائبین اہتمام	از	تا	کیفیت
۱	مولوی عبدالقدیر صاحب دیوبندیؒ	۱۳۰۷ھ	ربیع الاول ۱۳۰۹ھ	

۲	مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندیؒ	۱۳۰۹ھ ربیع الاول	صرف ایک سال	۱۳۱۰ھ تا ۱۳۲۶ھ کوئی نہیں رہا۔
۳	مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندیؒ	۱۳۱۷ھ	۱۳۲۳ھ	۱۳۲۴ھ میں کوئی نہیں رہا
۴	مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندیؒ	۱۳۲۵ھ	۱۳۴۳ھ	
۵	مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ	۱۳۴۴ھ	۱۳۴۷ھ	۱۳۴۸ھ میں کوئی نہیں رہا
۶	حضرت مولانا سید محمد مبارک علی صاحب نگینوی مدظلہٗ	۱۳۵۰ھ	تاحال	
۷	حضرت مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی دیوبندی	۱۳۵۱ھ	صرف ایک سال	

دارالعلوم کے صدر مہتمم

نوٹ: دارالعلوم میں یہ کوئی مستقل عہدہ نہیں رہا، وقتی طور پر حسبِ ذیل دو حضرات اس منصب پر فائز رہے۔

نمبر شمار	اسمائے گرامی حضرات صدر مہتمم	از	تا	کیفیت
۱	حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ	۱۳۴۴ھ	۱۳۴۷ھ	۱۳۴۸ھ تا ۱۳۵۳ھ کوئی نہیں رہا۔

۲	حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ	۱۳۵۴ھ	۱۳۶۲ھ	۱۳۶۲ھ تاحال کوئی نہیں رہا۔

دارالعلوم دیوبند کے ممبران مجلس شوریٰ

ذیل میں ان حضرات کے اسمائے گرامی درج کئے جاتے ہیں جو ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۴ھ تک دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے یا ہیں۔

اسمائے گرامی حضرات ممبران مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

از ۱۲۸۳ھ تا ۱۳۸۴ھ

نمبر شمار	اسمائے گرامی	ابتدائی سن	تا	آخری سن
۱	حضرت حاجی عابد حسین صاحب دیوبندیؒ	۱۲۸۳ھ	تا	۱۳۱۰ھ
۲	حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ	۱۲۸۳ھ	تا	۱۲۹۷ھ
۳	مولانا مہتاب علی صاحبؒ	۱۲۸۳ھ	تا	۱۳۰۴ھ
۴	مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندیؒ	۱۲۸۳ھ	تا	۱۳۲۱ھ
۵	مولانا فضل الرحمٰن صاحب دیوبندیؒ	۱۲۸۳ھ	تا	۱۳۲۳ھ
۶	منشی فضل حق صاحبؒ	۱۲۸۳ھ	تا	۱۳۱۱ھ
۷	شیخ نہال احمد صاحبؒ	۱۲۸۳ھ	تا	۱۳۰۴ھ
۸	حکیم مشتاق احمد صاحبؒ	۱۲۹۸ھ	تا	۱۳۰۹ھ
۹	حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ	۱۲۹۸ھ	تا	۱۳۲۳ھ

۱۰	حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوریؒ	۱۳۰۵ھ	تا	۱۳۱۲ھ
۱۱	شیخ ظہور الدین صاحب دیوبندیؒ	۱۳۱۲ھ	تا	۱۳۲۳ھ
۱۲	مولانا احمد حسن صاحب امروہویؒ	۱۳۱۳ھ	تا	۱۳۲۹ھ
۱۳	مولانا قاضی محمد محی الدین صاحب مرادآبادیؒ	۱۳۱۳ھ	تا	۱۳۴۷ھ
۱۴	مولانا محمد عبد الحق صاحب پورقاضیؒ	۱۳۱۳ھ	تا	۱۳۴۱ھ
۱۵	شاہ مظہر حسین صاحب گنگوہیؒ	۱۳۱۳ھ	تا	۱۳۳۸ھ
۱۶	حکیم محمد اسماعیل صاحب گنگوہیؒ	۱۳۱۳ھ	تا	۱۳۴۱ھ
۱۷	شاہ سعید احمد صاحب انبیٹھویؒ	۱۳۱۳ھ	تا	۱۳۳۹ھ
۱۸	حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ	۱۳۲۱ھ	تا	۱۳۵۴ھ
۱۹	حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب رائپوریؒ	۱۳۲۱ھ	تا	۱۳۳۷ھ
۲۰	مولانا حافظ حکیم احمد صاحب رامپوریؒ	۱۳۲۱ھ	تا	۱۳۴۱ھ
۲۱	خلیفہ احمد حسن صاحب دیوبندیؒ	۱۳۲۳ھ	تا	۱۳۲۸ھ
۲۲	حافظ داد الٰہی صاحب دیوبندیؒ	۱۳۲۳ھ	تا	صرف ایک سال
۲۳	منشی مظہر حسن صاحب دیوبندیؒ	۱۳۲۳ھ	تا	۱۳۵۰ھ
۲۴	منشی فراغت علی صاحب دیوبندیؒ	۱۳۲۳ھ	تا	۱۳۲۸ھ
۲۵	شیخ محمد حسین صاحب دیوبندیؒ	۱۳۲۳ھ	تا	صرف ایک سال
۲۶	مولانا حکیم مسعود احمد صاحب ابن حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ	۱۳۲۴ھ	تا	۱۳۵۰ھ
۲۷	مولانا سعید الدین صاحب رامپوریؒ مدار المہام ریاست بھوپال	۱۳۲۴ھ	تا	۱۳۴۷ھ

۲۸	مولوی ظہور علی احمد صاحب پور قاضی وکیل سرکار بھوپال	۱۳۲۴ھ	تا	۱۳۴۷ھ
۲۹	شیخ حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی محلہ کوٹلہ	۱۳۲۴ھ	تا	۱۳۲۵ھ
۳۰	مولانا قاضی محمد حسن صاحب مرادآبادی قاضی القضاۃ بھوپال	۱۳۳۰ھ	تا	۱۳۶۵ھ
۳۱	حاجی حافظ فصیح الدین صاحب میرٹھیؒ	۱۳۴۴ھ	تا	صرف ایک سال
۳۲	مولانا حکیم جمیل الدین صاحب نگینویؒ	۱۳۴۴ھ	تا	۱۳۵۴ھ
۳۳	مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب کٹھوریؒ	۱۳۴۴ھ	تا	۱۳۷۳ھ
۳۴	مولانا حکیم مشیت اللہ صاحب بجنوریؒ	۱۳۴۴ھ	تا	۱۳۷۲ھ
۳۵	مولانا عبد الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ	۱۳۴۴ھ	تا	۱۳۵۰ھ
۳۶	مولانا حکیم محمد اشفاق صاحب رائپوریؒ خواہرزادہ حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحبؒ رائپوری قدس سرہٗ	۱۳۴۵ھ	تا	۱۳۶۷ھ
۳۷	مولانا حکیم رضی الحسن صاحب کاندھلویؒ	۱۳۴۵ھ	تا	۱۳۴۹ھ
۳۸	حاجی شیخ رشید احمد صاحب میرٹھیؒ	۱۳۴۵ھ	تا	۱۳۷۱ھ
۳۹	مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند (بحیثیت عہدہ)	۱۳۴۸ھ	تا	حال
۴۰	مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، دکن۔	۱۳۵۰ھ	تا	۱۳۶۷ھ
۴۱	مولانا حکیم مقصود علی صاحب مقصود جنگ ناظم الاطباء حیدرآباد، دکن	۱۳۵۰ھ	تا	۱۳۸۱ھ

۴۲	مولانا صادق صاحبؒ کراچی بانی مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی	۱۳۵۰ھ	تا	۱۳۶۷ھ
۴۳	مولانا حکیم سعید احمد صاحب گنگوہیؒ المعروف بہ حکیم اجمیری	۱۳۵۰ھ	تا	۱۳۵۹ھ
۴۴	مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوریؒ سابق پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ	۱۳۵۰ھ	تا	۱۳۶۲ھ
۴۵	خواجہ فیروز الدین صاحب جنرل اکاؤنٹینٹ ریاست کپورتھلہ	۱۳۵۰ھ	تا	۱۳۶۲ھ
۴۶	مولانا محمد فضل اللہ صاحب وانمباڑی مدراس	۱۳۵۰ھ	تا	۱۳۵۲ھ
۴۷	مولانا عبدالرحمٰن صاحب خورجہ	۱۳۵۰ھ	تا	۱۳۶۱ھ
۴۸	مولانا سعید احمد صاحب صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ ہاٹ ہزاری ضلع چاٹگام	۱۳۵۰ھ	تا	۱۳۶۷ھ
۴۹	مولانا شاہ رحمت علی صاحب موضع بہڑ ضلع جالندھر	۱۳۵۰ھ	تا	صرف ایک سال
۵۰	مولانا حافظ محمود صاحب رامپوریؒ مدار المہام ریاست اندرگڈھ راجپوتانہ	۱۳۵۱ھ	تا	۱۳۵۹ھ
۵۱	مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی صدر مدرس مدرسہ عبدالرب دہلی	۱۳۵۱ھ	تا	۱۳۵۲ھ
۵۲	حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ بانی جماعت تبلیغ حضرت نظام الدین اولیاء دہلی	۱۳۵۱ھ	تا	۱۳۵۳ھ
۵۳	مولانا نواب حبیب الرحمٰن صاحب شروانیؒ صدر یار جنگ، علی گڈھ	۱۳۵۳ھ	تا	۱۳۵۹ھ

۵۴	مولانا حافظ محمد یوسف صاحب گنگوہیؒ	۱۳۵۲ھ	تا	۱۳۶۳ھ
۵۵	حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ بحیثیت عہدہ (صدر مدرس)	۱۳۵۳ھ	تا	۱۳۷۷ھ
۵۶	نواب عبدالباسط خاں صاحبؒ حیدرآبادی	۱۳۵۳ھ	تا	۱۳۶۶ھ
۵۷	خان بہادر شیخ ضیاء الحق صاحب راجو پوریؒ ضلع سہارن پور	۱۳۵۴ھ	تا	۱۳۷۳ھ
۵۸	حضرت مولانا علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی بحیثیت عہدہ (صدر مہتمم)	۱۳۵۴ھ	تا	۱۳۶۲ھ
۵۹	حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ صدر جمعیۃ العلماء ہند دہلی	۱۳۵۵ھ	تا	۱۳۷۳ھ
۶۰	مولانا محمد ابراہیم صاحب راندیریؒ	۱۳۵۵ھ	تا	۱۳۶۷ھ
۶۱	مولانا حکیم محمد یٰسین صاحب نگینویؒ	۱۳۶۰ھ	تا	۱۳۷۸ھ
۶۲	حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائپوری قدس سرہٗ	۱۳۶۰ھ	تا	صرف ایک سال
	دوبارہ	۱۳۷۷ھ	تا	۱۳۸۱ھ
۶۳	مولانا ظہیر الحسن صاحب کاندھلویؒ	۱۳۶۰ھ	تا	۱۳۶۲ھ
۶۴	مولانا حکیم عبدالرشید صاحب گنگوہی سلمہ اللہ تعالیٰ	۱۳۶۲ھ	تا	۱۳۶۷ھ
۶۵	مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلماء ہند دہلی	۱۳۶۲ھ	تا	۱۳۸۲ھ
۶۶	مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہٗ	۱۳۶۳ھ	تا	حال

۶۷	مولانا خیر محمد صاحب جالندھری مدظلہٗ	۱۳۶۳ھ	تا	۱۳۶۷ھ
۶۸	مولانا شبیر علی صاحب تھانوی مقیم حال پاکستان	۱۳۶۳ھ	تا	۱۳۶۷ھ
۶۹	مولانا بشیر علی صاحب کٹھوریؒ	۱۳۶۳ھ	تا	۱۳۷۳ھ
۷۰	مولانا احمد سعید صاحب دہلویؒ	۱۳۶۴ھ	تا	۱۳۷۷ھ
۷۱	حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب مدظلہٗ، شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند	۱۳۶۸ھ	تا	حال
۷۲	مولانا محمد نبیہ صاحب خانجہاں پوریؒ	۱۳۶۸ھ	تا	۱۳۸۱ھ
۷۳	مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مدظلہٗ، دہلی	۱۳۶۸ھ	تا	حال
۷۴	مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ اعظم گڈھ	۱۳۶۹ھ	تا	صرف ایک سال
۷۵	مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہٗ، دہلی	۱۳۷۰ھ	تا	حال
۷۶	مولانا ڈاکٹر مصطفیٰ حسن صاحب علوی لکھنوی	۱۳۷۰ھ	تا	حال
۷۷	حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہٗ، شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور	۱۳۷۰ھ	تا	۱۳۸۲ھ
۷۸	مولانا مفتی محمود احمد صاحب نانوتوی مدظلہٗ، مفتی مالوہ	۱۳۷۳ھ	تا	حال
۷۹	مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مدظلہٗ، مئو، ضلع اعظم گڈھ	۱۳۷۳ھ	تا	حال
۸۰	مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی مدظلہٗ، مانڈر ضلع مونگیر	۱۳۷۳ھ	تا	حال
۸۱	مولانا محمد سعید صاحب مدظلہٗ سملکی، سورت	۱۳۷۳ھ	تا	حال

۸۲	مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی مدظلہ امیر شریعت بہار واڑیسہ (مونگیر)	۱۳۷۴ھ	تا	حال
۸۳	مولانا حکیم محمد اسماعیل صاحب نگینویؒ دہلی	۱۳۷۴ھ	تا	۱۳۸۲ھ
۸۴	حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی مدظلہ، بحیثیت عہدہ (حاضر صدر مدرس)	۱۳۷۷ھ	تا	حال
۸۵	مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب رحمہ اللہ ناظم ندوۃ العلما لکھنؤ	۱۳۷۷ھ	تا	۱۳۸۰ھ
۸۶	مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ لکھنؤ	۱۳۸۲ھ	تا	حال
۸۷	مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد مدظلہ، میرٹھی	۱۳۸۲ھ	تا	حال
۸۸	مولانا عبد القادر صاحب مدظلہ مالیگاؤں	۱۳۸۲ھ	تا	حال
۸۹	مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی مدظلہ صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ	۱۳۸۲ھ	تا	حال
۹۰	مولانا حامد الانصاری غازی صاحب مدظلہ صدر جمعیۃ العلماء بمبئی	۱۳۸۲ھ	تا	حال
۹۱	مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہ بجنوری	۱۳۸۲ھ	تا	حال
۹۲	مولانا فضل اللہ صاحب مدظلہ حیدرآباد	۱۳۸۲ھ	تا	حال
۹۳	مولانا سید حمید الدین صاحب مدظلہ فیض آبادی، شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ کلکتہ	۱۳۸۲ھ	تا	حال

دار العلوم دیوبند کے عام مدرسین، معلّمین نظمائے شعبہ جات و مبلغین وغیرہ

ذیل میں ان تمام حضرات کے اسمائے گرامی پیش کئے جاتے ہیں جو ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۴ھ تک ۱۰۲ سال کے دوران مدرس، معلم، مفتی، ناظم، شعبہ یا مبلغ وغیرہ رہے۔

نمبر شمار	اسما گرامی حضرات مدرسین عربی	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ صدر مدرس عربی	۱۲۸۳ھ	تا	۱۳۰۲ھ	
۲	مولانا محمد محمود صاحب دیوبندی مدرس عربی	۱۲۸۳ھ	تا	۱۳۰۳ھ	
۳	مولانا محمد فاضل صاحب پھلتیؒ مدرس عربی	۱۲۸۳ھ	تا	۱۲۹۳ھ	
۴	مولانا میر باز خاں صاحبؒ مدرس عربی	۱۲۸۳ھ	تا	۱۲۸۷ھ	
۵	مولانا فتح محمد صاحبؒ مدرس عربی	۱۲۸۳ھ	تا	۱۲۸۷ھ	
۶	مولانا سید احمد صاحب دہلویؒ مدرس عربی	۱۲۸۶ھ	تا	۱۳۰۷ھ	
۷	حضرت مولانا صدیق صاحب انبیٹھویؒ مدرس عربی	۱۲۹۰ھ	تا	۱۲۹۲ھ	
۸	مولانا عبداللہ صاحب گوالیاریؒ مدرس عربی	۱۲۹۰ھ	تا	۱۲۹۲ھ	دوبارہ ۱۳۰۵ میں صرف ایک سال
۹	مولانا عبدالحق صاحب بریلویؒ مدرس عربی	۱۲۹۰ھ	تا	۱۲۹۵ھ	

۱۰	مولانا محمد مراد صاحب پاک پٹنؒ مدرس عربی	۱۲۹۰ھ	تا	صرف ایک سال	
۱۱	مولانا عبداللہ صاحب انبیٹھویؒ مدرس عربی	۱۲۹۱ھ	تا	۱۲۹۲ھ	
۱۲	مولانا عبدالعزیز خاں صاحبؒ مدرس عربی	۱۲۹۱ھ	تا	صرف ایک سال	
۱۳	مولانا منفعت علی صاحبؒ مدرس فارسی و عربی	۱۲۹۱ھ	تا	۱۳۱۸ھ	
۱۴	مولانا سراج الحق صاحب دیوبندی مدرس عربی	۱۲۹۲ھ	میں	صرف ایک سال	
۱۵	حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ (شیخ الہند) مدرس عربی	۱۲۹۲ھ	تا	۱۳۳۳ھ	
۱۶	مولانا عبدالعلی صاحبؒ مدرس عربی	۱۲۹۴ھ	تا	۱۲۹۷ھ	
۱۷	مولانا احمد صاحبؒ مدرس عربی	۱۲۹۴ھ	تا	۱۲۹۹ھ	
۱۸	مولانا حافظ محمد اسحاق صاحبؒ مدرس عربی	۱۲۹۴ھ	تا	۱۲۹۹ھ	
۱۹	مولانا حامد حسن صاحبؒ مدرس عربی	۱۲۹۴ھ	میں	صرف ایک سال	
۲۰	مولانا عبدالحق صاحبؒ مدرس عربی	۱۲۹۴ھ	تا	۱۲۹۵ھ	
۲۱	مولانا بشیر احمد صاحبؒ مدرس عربی	۱۲۹۴ھ	تا	۱۲۹۵ھ	
۲۲	مولانا رحیم بخش صاحبؒ مدرس عربی	۱۲۹۵ھ	تا	۱۲۹۷ھ	
۲۳	مولانا عبدالحکیم صاحبؒ مدرس عربی	۱۲۹۵ھ	میں	صرف ایک سال	

۲۴	مولانا حاجی احمد علی صاحبؒ مدرس عربی	۱۲۹۵ھ	میں	صرف ایک سال	
۲۵	مولانا احمد الدین صاحبؒ مدرس عربی	۱۲۹۶ھ	میں	صرف ایک سال	
۲۶	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ مفتی و مدرس عربی (۱۲۹۸ھ تا ۱۳۰۹ھ مدرس، ۱۳۱۰ھ تا ۱۳۴۶ھ مفتی)	۱۲۹۸ھ	تا	۱۳۴۶ھ	
۲۷	مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ مدرس عربی	۱۲۹۸ھ	تا		
۲۸	مولانا حافظ اشرف علی صاحبؒ مدرس عربی	۱۳۰۰ھ	تا	صرف ایک سال	
۲۹	مولانا حکیم محمد حسن صاحبؒ طبیب و مدرس عربی	۱۳۰۲ھ	تا	۱۳۴۵ھ	
۳۰	مولانا عبد المومن صاحبؒ مدرس عربی	۱۳۰۳ھ	تا	۱۳۰۸ھ	
۳۱	مولانا حافظ احمد صاحب نانوتویؒ مہتمم و مدرس عربی	۱۳۰۳ھ	تا	۱۳۴۷ھ	
۳۲	مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی نائب مہتمم و مدرس عربی	۱۳۰۳ھ	تا	۱۳۴۸ھ	
۳۳	مولانا عبد العزیز خان صاحب دیوبندی مدرس عربی	۱۳۰۵ھ	تا	۱۳۰۶ھ	
۳۴	مولانا مظہر حسن خان صاحب رامپوریؒ مدرس عربی	۱۳۰۵ھ	تا	۱۳۰۶ھ	

۳۵	مولانا عطاء الحق صاحب چاند پوریؒ	۱۳۰۵ھ	میں	صرف ایک سال	
۳۶	مولانا حافظ نور محمد صاحب فتح پوریؒ مدرس عربی	۱۳۰۵ھ	میں	صرف ایک سال	
۳۷	مولانا غلام رسول ہزارویؒ مدرس عربی	۱۳۰۷ھ	تا	۱۳۳۷ھ	
۳۸	حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی (شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور) مدرس عربی	۱۳۰۸ھ	تا	۱۳۱۴ھ	
۳۹	مولانا محمد یٰسین صاحب شیرکوٹیؒ مدرس عربی	۱۳۱۱ھ	میں	صرف ایک سال	دوبارہ ۱۳۱۹ھ تا ۱۳۲۴ھ
۴۰	مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسریؒ مدرس عربی	۱۳۱۲ھ	تا	۱۳۱۴ھ	
۴۱	مولانا عبدالعلی صاحبؒ مدرس عربی	۱۳۱۴ھ	تا	۱۳۱۷ھ	
۴۲	مولانا گل محمد خاں صاحب مدرس عربی	۱۳۱۶ھ	تا	۱۳۱۹ھ	دوبارہ ۱۳۲۰ھ تا ۱۳۳۹ھ
۴۳	مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوریؒ، رئیس المبلّغین و مدرس عربی (دوبارہ ۱۳۲۷ھ تا ۱۳۳۱ھ سہ بارہ ۱۳۳۹ھ تا ۱۳۵۰ھ)	۱۳۱۹ھ	تا	۱۳۲۲ھ	

۴۴	مولانا عبدالصمد صاحب نگینویؒ مدرس عربی	۱۳۲۴ھ	تا	۱۳۲۸ھ	
۴۵	مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوریؒ مدرس عربی (دوبارہ بحیثیت مفتی ۱۳۵۵ھ تا ۱۳۵۷ھ)	۱۳۲۴ھ	تا	۱۳۳۱ھ	
۴۶	حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ مدرس عربی	۱۳۲۷ھ	تا	۱۳۴۵ھ	
۴۷	حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ مدرس عربی (دوبارہ بحیثیت صدر مدرس ۱۳۴۶ھ تا ۱۳۷۷ھ)	۱۳۲۷ھ	تا	۱۳۲۹ھ	
۴۸	مولانا نبی حسن صاحب دیوبندیؒ مدرس عربی	۱۳۲۷ھ	تا	۱۳۵۱ھ	
۴۹	مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ مدرس عربی (دوبارہ بحیثیت صدر مہتمم ۱۳۵۴ھ تا ۱۳۶۲ھ)	۱۳۲۸ھ	تا	۱۳۴۳ھ	
۵۰	حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب مدظلہٗ، مدرس عربی (دوبارہ میں صرف ایک سال، سہ بارہ میں ۱۳۷۷ھ تا حال)	۱۳۲۸ھ	میں	صرف ایک سال	
۵۱	مولانا عبدالسمیع صاحب دیوبندیؒ مدرس عربی	۱۳۲۹ھ	تا	۱۳۶۶ھ	

۵۲	مولانا احمد امین صاحب امروہویؒ مدرس عربی	۱۳۲۹ھ	تا	۱۳۳۹ھ	
۵۳	مولانا اعزاز علی صاحب امروہویؒ مدرس عربی	۱۳۳۰ھ	تا	۱۳۷۴ھ	
۵۴	مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندیؒ مدرس عربی	۱۳۳۰ھ	تا	۱۳۶۴ھ	
۵۵	حضرت مولانا ابراہیم صاحب بلیاوی مدظلہٗ مدرس عربی (دوبارہ ۱۳۴۳ھ تا ۱۳۶۲ھ سہ بارہ ۱۳۶۶ھ تاحال ۱۳۷۷ھ سے صدر مدرس ہوئے)	۱۳۳۱ھ	تا	۱۳۳۹ھ	
۵۶	حضرت مولانا مظہر الدین صاحب شیرکوٹیؒ مدرس عربی	۱۳۳۱ھ	تا	۱۳۳۲ھ	
۵۷	مولانا سید حسن صاحب چاندپوریؒ مدرس عربی	۱۳۳۱ھ	تا	۱۳۳۲ھ	
۵۸	مولانا شائق احمد صاحب عثمانی مدرس عربی	۱۳۳۱ھ	میں	صرف ایک سال	
۵۹	مولانا احمد شیر صاحب مدرس عربی	۱۳۳۲	تا	۱۳۴۲ھ	
۶۰	مولانا قاضی مسعود احمد صاحب دیوبندی مدظلہٗ، نائب مفتی ومدرس عربی	۱۳۳۲ھ	تا	۱۳۸۴ھ	
۶۱	مولانا محمد ادریس صاحب سکروڈویؒ مدرس عربی	۱۳۳۲ھ	تا	۱۳۴۶ھ	

۶۲	مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ مدرس عربی	۱۳۳۲ھ	میں	صرف ایک سال	
۶۳	مولانا محمد صدیق صاحب نجیب آبادیؒ مدرس عربی	۱۳۳۲ھ	تا	۱۳۳۴ھ	
۶۴	مولانا محمد رسول خان صاحب مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۳۳ھ	تا	۱۳۵۳ھ	
۶۵	مولانا سراج احمد صاحبؒ مدرس عربی	۱۳۳۴ھ	تا	۱۳۴۶ھ	
۶۶	مولانا خلیل الرحمٰن صاحبؒ مدرس عربی	۱۳۳۴ھ	تا	۱۳۳۵ھ	
۶۷	مولانا تفضّل حسین صاحب بارہ بنکوی مدرس عربی	۱۳۳۵ھ	تا	۱۳۳۹ھ	
۶۸	مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ، مفتی ومدرس عربی	۱۳۳۷ھ	تا	۱۳۶۲ھ	
۶۹	مولانا حکیم سید محفوظ علی صاحب گنگوہیؒ مدرس عربی	۱۳۳۷ھ	تا	۱۳۳۹ھ	دوبارہ ۱۳۸۰ھ میں چندماہ
۷۰	مولانا اسحاق صاحب کانپوریؒ مدرس عربی	۱۳۳۷ھ	تا	۱۳۳۸ھ	
۷۱	مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مدظلہٗ، مدرس عربی	۱۳۳۸ھ	تا	۱۳۴۶ھ	
۷۲	مولانا علی محمد صاحب سورتی مدرس عربی	۱۳۳۸ھ	تا	۱۳۳۹ھ	

۷۳	مولانا سعید احمد صاحب گنگوہی مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۴۰ھ	تا	حال	
۷۴	مولانا افتخار علی صاحب مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۴۰ھ	تا	۱۳۴۴ھ	
۷۵	مولانا سید میرک شاہ صاحب کشمیری مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۴۱ھ	تا	۱۳۴۴ھ	
۷۶	مولانا غلام محمد صاحب سیتاپوری مدرس عربی	۱۳۴۲ھ	تا	۱۳۴۴ھ	
۷۷	مولانا ابورحمت صاحب مدرس عربی	۱۳۴۲ھ	میں	صرف چند ماہ	
۷۸	منشی امتیاز علی صاحب مدرس عربی	۱۳۴۲ھ	میں	صرف چند ماہ	
۷۹	مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب دیوبندی مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۴۴ھ	تا	۱۳۴۶ھ	
۸۰	مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی مدرس عربی	۱۳۴۴ھ	میں	صرف ۸/ماہ	
۸۱	مولانا محمد نقی صاحب مدرس عربی	۱۳۴۴ھ	میں	صرف ۹/ماہ	
۸۲	مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۴۴ھ	تا	۱۳۴۶ھ	
۸۳	مولانا محمد میاں صاحب مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۴۴ھ	میں	صرف چند ماہ	

۸۴	مولانا محمد یحییٰ صاحب مدرس عربی	۱۳۴۴ھ	تا	۱۳۴۶ھ	
۸۵	مولانا سید اختر حسین صاحب دیوبندی مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۴۴ھ	تا	حال	
۸۶	مولانا محمد قاسم صاحب شاہجہاں پوری مدظلہٗ، مدرس عربی	۱۳۴۶ھ	میں	صرف ایک سال	
۸۷	مولانا سید وحید احمد صاحب مدنی مدرس عربی	۱۳۴۶ھ	تا	۱۳۴۷ھ	
۸۸	مولانا قاری محمد طاہر صاحب قاسمی دیوبندیؒ، مدرس عربی	۱۳۴۶ھ	تا	۱۳۴۷ھ	
۸۹	مولانا قاری اصغر علی صاحب بجنوریؒ مدرسِ تجوید و مدرس عربی (۱۳۴۷ھ تا ۱۳۵۷ھ مدرس تجوید ۱۳۵۸ھ تا ۱۳۸۴ھ مدرس عربی)	۱۳۴۷ھ	تا	۱۳۴۷ھ	
۹۰	مولانا مفتی ریاض الدین صاحب مفتی و مدرس عربی	۱۳۴۷ھ	تا	۱۳۶۳ھ	
۹۱	مولانا حکیم رمضان الحق صاحبؒ طبیب و مدرس عربی	۱۳۴۸ھ	تا	۱۳۴۹ھ	
۹۲	مولانا ظہور احمد صاحب دیوبندیؒ مدرس عربی	۱۳۴۹ھ	تا	۱۳۶۲ھ	
۹۳	مولانا محمد انور صاحب چاندپوری مدرس عربی	۱۳۴۹ھ	میں	صرف ایک سال	

۹۴	مولانا محمد حمید حسن صاحب دیوبندی مدظلہٗ، مدرس عربی	۱۳۴۹ھ	میں	صرف ایک سال	
۹۵	مولانا خلیل احمد صاحب مرادآبادیؒ مدرس عربی	۱۳۴۹ھ	میں	صرف ایک سال	
۹۶	مولانا محمد جلیل صاحب کیرانوی مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۵۰ھ	تا	حال	
۹۷	مولانا محمد مجتبیٰ صاحب رامپوری مدرس عربی	۱۳۵۰ھ	تا	۱۳۵۵ھ	
۹۸	مولانا عبدالحق صاحب نافع گل پشاوری مدظلہٗ، مدرس عربی	۱۳۵۲ھ	تا	۱۳۶۶ھ	
۹۹	مولانا شمس الحق صاحب پشاوریؒ مدرس عربی	۱۳۵۴ھ	تا	۱۳۵۷ھ	
۱۰۰	مولانا محمد عثمان صاحب دیوبندی مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۵۴ھ	تا	حال	
۱۰۱	مولانا سید حسن صاحب دیوبندیؒ مدرس فارسی و مدرس عربی (۱۳۵۷ھ تا ۱۳۷۰ھ مدرس فارسی ۱۳۷۱ھ تا ۱۳۸۱ھ مدرس عربی)	۱۳۵۷ھ	تا	۱۳۸۱ھ	
۱۰۲	مولانا مشیت اللہ صاحب دیوبندی مدرس عربی	۱۳۵۸ھ	میں	صرف چند ماہ	

۱۰۳	مولانا عبدالاحد صاحب دیوبندی مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۵۸ھ	تا	حال	
۱۰۴	مولانا سید فخر الحسن صاحب مدظلہٗ مرادآبادی مدرس عربی	۱۳۶۲ھ	میں	صرف چندماہ	دوبارہ ۱۳۶۳ھ تاحال
۱۰۵	مولانا قاضی شمس الدین صاحب پنجابی مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۶۲ھ	میں	صرف چندماہ	
۱۰۶	مولانا بشیر احمد خاں صاحب بلندشہری مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۶۲ھ	تا	حال	
۱۰۷	مولانا عبدالحق صاحب اکوڑوی مدظلہٗ ضلع پشاور مدرس عربی	۱۳۶۲ھ	تا	۱۳۶۶ھ	
۱۰۸	مولانا سیاح الدین صاحب پشاوری مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۶۲ھ	میں	صرف چندماہ	
۱۰۹	مولانا حبیب اللہ صاحب میرٹھیؒ مدرس عربی	۱۳۶۲ھ	تا	۱۳۶۷ھ	
۱۱۰	مولانا جمال الدین صاحبؒ مدرس عربی	۱۳۶۲ھ	میں	صرف چندماہ	
۱۱۱	مولانا معراج الحق صاحب دیوبندی مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۶۳ھ	تا	حال	
۱۱۲	مولانا عبدالخالق صاحب ملتانی مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۶۳ھ	تا	۱۳۶۷ھ	

۱۱۳	مولانا عبدالشکور صاحب دیوبندیؒ مدرس عربی	۱۳۶۳ھ	تا	۱۳۶۷ھ	
۱۱۴	مولانا محمد شریف صاحب کشمیری مدظلہ مدرس عربی	۱۳۶۳ھ	تا	۱۳۶۶ھ	
۱۱۵	مولانا محمد کفیل صاحب بجنوریؒ مدظلہ مدرس عربی	۱۳۶۳ھ	میں	صرف ایک سال	
۱۱۶	مولانا حشمت علی صاحب گلاؤٹھی مدظلہ مدرس عربی	۱۳۶۴ھ	میں	صرف ایک سال	
۱۱۷	مولانا محمد نور صاحب میانوالی مدرس عربی	۱۳۶۵ھ	میں	صرف ایک سال	
۱۱۸	مولانا نصیر احمد خاں صاحب بلندشہری مدظلہ مدرس عربی	۱۳۶۶ھ	تا	حال	
۱۱۹	مولانا محمد نعیم صاحب دیوبندی مدظلہ مدرس عربی	۱۳۶۶ھ	تا	حال	
۱۲۰	مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی مدظلہ مدرس عربی	۱۳۶۶ھ	میں	صرف ایک سال	
۱۲۱	مولانا محمد حسین صاحب بہاری مدظلہ مدرس عربی	۱۳۶۷ھ	تا	حال	
۱۲۲	مولانا محمد ہارون صاحب دیوبندی مدظلہ مدرس عربی	۱۳۶۷ھ	تا	حال	
۱۲۳	مولانا محمود صاحب شاہجہاں پوری مدظلہ مدرس عربی	۱۳۶۷ھ	میں	صرف ایک سال	

نمبر	نام	از		تک	کیفیت
۱۲۴	مولانا ریاض احمد صاحب بہاری مدرس عربی	۱۳۶۹ھ	تا	۱۳۷۰ھ	
۱۲۵	مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۷۰ھ	تا	حال	
۱۲۶	مولانا سید فیض شاہ صاحب مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۷۰ھ	تا	۱۳۷۷ھ	
۱۲۷	مولانا سید اسعد صاحب مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۷۰ھ	تا	۱۳۸۲ھ	
۱۲۸	مولانا محمد اکرم صاحب بخاری مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۷۰ھ	میں	صرف ایک سال	
۱۲۹	مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیری مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۷۳ھ	تا	حال	
۱۳۰	مولانا حامد میاں صاحب امروہوی مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۷۴ھ	تا	حال	
۱۳۱	مولانا سید حمید الدین صاحب فیض آبادی مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۷۴ھ	تا	۱۳۷۵ھ	
۱۳۲	مولانا بہاؤالحسن صاحب مرادآبادی مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۷۸ھ	میں	چند ماہ	دوبارہ ۱۳۸۳ھ تا حال
۱۳۳	مولانا اسلام الحق صاحب اعظمی مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۸۰ھ	تا	حال	

۱۳۴	مولانا خورشید عالم صاحب دیوبندی مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۸۳ھ	تا	حال	
۱۳۵	مولانا محمد شریف صاحب دیوبندی مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۸۳ھ	تا	حال	
۱۳۶	مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی مدظلہٗ مدرس عربی	۱۳۸۳ھ	تا	حال	
نمبر شمار	اسمائے گرامی حضرات مدرسین درجۂ فارسی	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	حافظ احمد حسن صاحبؒ	۱۲۸۳ھ	تا	۱۳۰۷ھ	
۲	مولانا نہال احمد صاحبؒ	۱۲۸۹ھ	میں	صرف ایک سال	
۳	مولانا شہاب الدین صاحبؒ	۱۲۹۰ھ	تا	۱۲۹۱ھ	
۴	مولانا حافظ محمد یٰسین صاحبؒ	۱۳۰۰ھ	تا	۱۳۰۵ھ	
۵	پیر جی محمد حسن صاحب دیوبندیؒ	۱۳۰۴ھ	تا	۱۳۰۷ھ	
۶	مولانا محمد یٰسین صاحب دیوبندیؒ	۱۳۰۸ھ	تا	۱۳۵۳ھ	
۷	منشی محمد عاقل صاحب دیوبندیؒ	۱۳۰۹ھ	تا	۱۳۱۰ھ	
۸	منشی محمد یوسف علی صاحبؒ	۱۳۱۰ھ	تا	۱۳۵۰ھ	
۹	منشی منظور احمد صاحب دیوبندیؒ	۱۳۳۹ھ	تا	۱۳۶۲ھ	
۱۰	منشی بشیر احمد صاحبؒ	۱۳۵۰ھ	میں	صرف چند ماہ	
۱۱	مولانا نور الحسن صاحب دیوبندیؒ	۱۳۵۰ھ	تا	۱۳۵۶ھ	

۱۲	مولانا مشتاق احمد صاحب چرتھاولیؒ	۱۳۵۵ھ	میں	صرف چند ماہ	
۱۳	مولانا محمد فاروق صاحب گنگوہیؒ	۱۳۵۵ھ	تا	۱۳۵۶ھ	
۱۴	مولانا ظہیر احمد صاحب جھنجھانوی مدظلہٗ	۱۳۵۷ھ	تا	حال	
۱۵	جناب منشی احمد حسن صاحب عرف ماسٹر کلن دیوبندیؒ	۱۳۵۷ھ	تا	۱۳۶۷ھ	
۱۶	مولانا سید حسن احمد صاحب دیوبندیؒ (۱۳۷۱ھ تا ۱۳۸۱ھ مدرس عربی رہے اس کے بعد نگران دارالتربیت تا حال)	۱۳۵۷ھ	تا	۱۳۶۷ھ	
۱۷	حاجی شاہ عزیز حسین گنگوہی مدظلہٗ	۱۳۶۰ھ	تا	۱۳۷۹ھ	
۱۸	مولانا اصلح الحسینی مدظلہٗ گلاؤٹھی	۱۳۶۲ھ	تا	۱۳۶۷ھ	
۱۹	مولانا رحم الٰہی صاحب راجوپوری مدظلہٗ	۱۳۶۴ھ	تا	حال	
۲۰	مولانا فیض محمد صاحب کوکب جوالاپوریؒ	۱۳۶۷ھ	تا	۱۳۶۸ھ	
۲۱	مولانا شمیم احمد صاحب دیوبندی مدظلہٗ	۱۳۷۱ھ	تا	حال	
۲۲	مولانا مشفع حسن صاحب دیوبندی مدظلہٗ	۱۳۷۶ھ	تا	حال	
۲۳	مولانا فضیل الرحمٰن صاحب دیوبندی مدظلہٗ	۱۳۸۰ھ	تا	حال	

نمبر شمار	اسمائے گرامی حضرات مدرسین درجہ قراءت وتجوید	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	قاری عبدالوحید خاں صاحب الٰہ آبادیؒ	۱۳۲۱ھ	تا	۱۳۵۶ھ	
۲	مولانا حافظ قاری محمد شفیع صاحبؒ	۱۳۲۹ھ	تا	۱۳۳۱ھ	
۳	قاری محمد یامین صاحب	۱۳۴۱ھ	تا	۱۳۴۹ھ	

۴	مولانا قاری اصغر علی صاحب مدظلہٗ (۱۳۵۸ھ تا ۱۳۸۴ھ مدرس عربی)	۱۳۴۷ھ	تا	۱۳۵۷ھ	
۵	مولانا قاری عتیق احمد صاحب دیوبندی مدظلہٗ	۱۳۵۰ھ	تا	حال	
۶	مولانا قاری حفظ الرحمٰن صاحب پرتاب گڑھی مدظلہٗ	۱۳۵۰ھ	تا	حال	
۷	مولانا قاری محمد اسحاق صاحب بچھرایونیؒ	۱۳۵۲ھ	تا	۱۳۶۱ھ	
۸	قاری عبدالباری صاحب مدظلہٗ	۱۳۵۳ھ	تا	۱۳۵۴ھ	
۹	مولانا قاری اعزاز صاحب عرف احمد میاں امروہوی مدظلہٗ	۱۳۵۷ھ	تا	حال	
۱۰	قاری جلیل الرحمٰن صاحب دیوبندی مدظلہٗ	۱۳۶۰ھ	تا	حال	
۱۱	مولانا قاری محمد نعمان صاحب بلیاوی مدظلہٗ	۱۳۷۴ھ	تا	حال	

نمبر شمار	اسمائے گرامی حضرات مدرسین درجہ قرآن شریف	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	حافظ نامدار خاں صاحبؒ	۱۲۸۴ھ	تا	۱۳۳۹ھ	
۲	حافظ محمد عظیم صاحبؒ	۱۳۰۹ھ	تا	۱۳۲۳ھ	
۳	حافظ محمد ہاشم خاں صاحبؒ	۱۳۲۴ھ	تا	۱۳۲۷ھ	
۴	حافظ نور محمد صاحبؒ	۱۳۲۷ھ	تا	۱۳۶۱ھ	

نمبر شمار	اسمائے گرامی	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۵	پیر جی شریف احمد صاحب گنگوہی مدظلہٗ	۱۳۳۹ھ	تا	حال	
۶	حافظ کالے خاں صاحبؒ	۱۳۴۰ھ	تا	۱۳۵۴ھ	
۷	قاری بشیر احمد صاحب	۱۳۴۲ھ	میں	صرف چند ماہ	
۸	حافظ داؤد احمد صاحب	۱۳۴۴ھ	میں	صرف چند ماہ	
۹	حافظ شریف احمد صاحب دیوبندی	۱۳۴۵ھ	تا	۱۳۵۶ھ	
۱۰	قاری انعام الٰہی صاحب دیوبندی	۱۳۵۳ھ	میں	صرف چند ماہ	
۱۱	قاری حافظ محمد کامل صاحب دیوبندی مدظلہٗ	۱۳۵۷ھ	تا	حال	
۱۲	مولانا حافظ عبد الرقیب صاحب دیوبندی مدظلہٗ	۱۳۶۰ھ	تا	حال	
۱۳	حافظ بشیر الحق صاحب دیوبندی مدظلہٗ	۱۳۶۰ھ	تا	حال	
۱۴	قاری محمود احمد صاحب دیوبندی مدظلہٗ	۱۳۷۴ھ	تا	حال	
نمبر شمار	**اسمائے گرامی حضرات مدرسین درجہ اُردو، دینیات**	**ابتدائی سن**	**تا**	**آخری سن**	**کیفیت**
۱	ماسٹر ظفر احمد صاحب کالو دیوبندی مدظلہٗ	۱۳۷۲ھ	تا	حال	
۲	مولانا نور الحسن صاحب مراد آبادی مدظلہٗ	۱۳۷۳ھ	تا	حال	
۳	مولانا محمد خالد صاحب رامپوری	۱۳۷۴ھ	تا	حال	
۴	مولانا کفیل احمد صاحب کیرانوی مدظلہٗ	۱۳۷۸ھ	تا	حال	

۵	مولانا شاہد حسن صاحب دیوبندی مدظلہٗ	۱۳۸۱ھ	تا	حال	

نمبر شمار	اسمائے گرامی حضرات مدرسین درجہ صفِ عربی	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	مولانا عبدالمنعم صاحب نمر مصری مدظلہٗ مبعوث جامعہ ازہر قاہرہ	۱۳۷۵ھ	تا	۱۳۷۷ھ	
۲	مولانا عبدالعال صاحب عقباوی مصری مدظلہٗ مبعوث جامعہ ازہر قاہرہ	۱۳۷۵ھ	تا	۱۳۷۷ھ	
۳	مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دیوبندی مدظلہٗ	۱۳۷۸ھ	میں	صرف ایک سال	
۴	مولانا عبدالوہاب صاحب مصری مدظلہٗ مبعوث جامعہ ازہر قاہرہ	۱۳۷۹ھ	تا	۱۳۸۳ھ	
۵	مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی مدظلہٗ	۱۳۸۳ھ	تا	حال	

نمبر شمار	اسمائے گرامی حضرات نائبین مفتی دارالعلوم دیوبند	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	مولانا قاضی مسعود احمد صاحب دیوبندی	۱۳۳۳ھ	تا	۱۳۸۴ھ	
۲	مولانا سید احمد علی سعید صاحب نگینوی مدظلہٗ	۱۳۵۹ھ	تا	۱۳۷۴ھ	
۳	مولانا جمیل الرحمٰن صاحب مدظلہٗ	۱۳۷۵ھ	تا	حال	

نمبر شمار	اسمائے گرامی نظماء شعبہ جات دارالعلوم دیوبند	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	مولانا بشیر حسین صاحب نگینوی	۱۳۵۰ھ	تا	۱۳۵۴ھ	

۲	مولانا محمد یحییٰ صاحب (پیش کار صدر مہتمم)	۱۳۵۵ھ	تا	۱۳۵۸ھ	
۳	حاجی شاہ عزیز حسین صاحب	۱۳۵۷ھ	تا	۱۳۵۹ھ	۱۳۶۰ھ تا ۱۳۶۱ھ کوئی نہیں رہا
۴	مولانا حامد الانصاری غازی صاحب	۱۳۶۲ھ	میں	صرف ایک سال	۱۳۶۳ھ تا ۱۳۷۰ھ میں کوئی نہیں رہا۔
۵	مولانا عبدالحق صاحب غازی پوری	۱۳۷۱ھ	تا	حال	

نمبر شمار	اسمائے گرامی نظماء شعبہ تعلیمات	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوریؒ	۱۳۳۹ھ	تا	۱۳۵۱ھ	۱۳۵۲ھ تا ۱۳۶۷ھ کوئی نہیں رہا۔
۲	حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ	۱۳۶۸ھ	تا	۱۳۷۷ھ	
۳	حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی مدظلہ	۱۳۷۷ھ	تا	حال	

نمبر شمار	اسمائے معلمین ونظماء شعبہ خوشنویسی	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	منشی محبوب علی صاحب ناظم ومعلم خوشنویسی	۱۳۳۲ھ	تا	۱۳۳۹ھ	۱۳۴۰ھ میں کوئی نہیں رہا
۲	مولانا اشتیاق احمد صاحب دیوبندی ناظم ومعلم شعبہ خوشنویسی	۱۳۴۱ھ	تا	۱۳۴۵ھ	۱۳۴۵ھ تا ۱۳۵۱ھ میں کوئی نہیں رہا
۳	مولانا نوراللہ صاحب نواکھالی ناظم ومعلم شعبہ خوشنویسی	۱۳۵۲ھ	تا	۱۳۵۶ھ	۱۳۵۷ھ تا ۱۳۶۳ھ میں کوئی نہیں رہا۔
۴	مولانا اشتیاق احمد صاحب ممدوح الصدر ناظم شعبہ خوشنویسی	۱۳۶۴ھ	تا	حال	
۵	مولوی محمد حیات صاحب دیوبندی معلم خوشنویسی	۱۳۶۴ھ	تا	حال	
۶	منشی امتیاز احمد صاحب دیوبندی معلم خوشنویسی	۱۳۶۴ھ	تا	حال	
۷	منشی محبوب کریم صاحب دیوبندی معلم خوشنویسی	۱۳۶۴ھ	تا	۱۳۸۰ھ	

۸	مولانا گل رحیم صاحب اسماری معلم خوشنویسی	۱۳۶۴ھ	تا	۱۳۶۵ھ	

نمبر شمار	اسمائے گرامی نظماء شعبہ تنظیم وترقی ومبلغین شعبہ ہذا	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	مولانا عبدالوحید صاحب غازی پوری ناظم شعبہ تنظیم وترقی	۱۳۵۴ھ	تا	۱۳۷۰ھ	
۲	مولانا محمود احمد صاحب گل نگینوی ناظم شعبہ تنظیم وترقی	۱۳۷۱ھ	تا	حال	
۳	مولانا انوار الحسن صاحب ہاشمی مبلغ تنظیم وترقی	۱۳۷۰ھ	تا	حال	
۴	مولانا ضامن حسن صاحب شیرکوٹی مبلغ تنظیم وترقی (۱۳۷۳ھ سے قبل سفیر تھے)	۱۳۷۳ھ	تا	حال	
نمبر شمار	**اسمائے گرامی نظماء شعبہ برقیات وشعبہ جات متفرقہ (صفائی مسجد، باغبانی ومہمان خانہ وغیرہ)**	**ابتدائی سن**	**تا**	**آخری سن**	**کیفیت**
۱	پیر جی محمد عمر صاحب گنگوہیؒ	۱۳۷۲ھ	تا	۱۳۷۸ھ	
۲	مولوی محمد اسلم صاحب قاسمی دیوبندی مدظلہٗ	۱۳۷۹ھ	تا	حال	

نمبر شمار	اسمائے گرامی نظماء شعبہ جات، نظماء شعبہ تبلیغ ومبلغین	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	مولانا ابوالوفا صاحب شاہجہانپوری مدظلہ، ناظم شعبہ تبلیغ	۱۳۶۱ھ	تا	۱۳۶۲ھ	
۲	مولانا حامد الانصاری صاحب غازی مدظلہ، ناظم شعبہ تبلیغ	۱۳۶۳ھ	تا	۱۳۶۷ھ	
۳	مولانا خلیق احمد صاحب سردھنویؒ ناظم شعبہ تبلیغ	۱۳۶۷ھ	تا	۱۳۶۸ھ	
۴	مولانا عزیز احمد صاحب قاسمی فیض آبادی ناظم شعبہ تبلیغ	۱۳۸۳ھ	تا	حال	
۵	مولانا ہادی حسن صاحبؒ مبلغ	۱۳۲۹ھ	تا	۱۳۳۲ھ	
۶	مولانا سید معظم علی صاحب نجیب آبادیؒ مبلغ	۱۳۴۹ھ	تا	۱۳۵۹ھ	
۷	مولانا عطاء محمد صاحبؒ مبلغ	۱۳۲۲ھ	تا	۱۳۴۰ھ	
۸	مولانا محمد یونس صاحب بگھرویؒ، مبلغ	۱۳۵۳ھ	تا	۱۳۶۰ھ	
۹	مولانا عتیق الرحمٰن صاحب آروی مدظلہ، مبلغ	۱۳۵۳ھ	تا	۱۳۶۳ھ	
۱۰	مولانا شاہ علی صاحب بستوی مدظلہ، مبلغ (اس کے بعد سفیر تا حال)	۱۳۵۳ھ	تا	۱۳۵۶ھ	
۱۱	مولانا عبدالجبار صاحب ابوھریؒ، مبلغ	۱۳۶۰ھ	تا	۱۳۶۵ھ	
۱۲	مولانا عزیز احمد صاحب قاسمی مبلغ	۱۳۶۴ھ	تا	حال	

۱۳	مولانا سید سیف الرحمٰن صاحب ہاشمی مدظلہٗ مبلغ (۱۳۶۴ھ سے قبل سفیر تھے)	۱۳۶۴ھ	تا	حال	
۱۴	مولانا خلیق احمد صاحب سردھنویؒ مبلغ	۱۳۶۴ھ	تا	۱۳۶۸ھ	
۱۵	مولانا سلطان مسعود صاحب راجو پوری مبلغ	۱۳۶۵ھ	تا	۱۳۶۸ھ	
۱۶	مولانا سید ارشاد احمد صاحب فیض آبادی مدظلہٗ مبلغ	۱۳۶۷ھ	تا	حال	
۱۷	مولانا سید فرید الوحیدی صاحب فیض آبادی مدظلہٗ مبلغ	۱۳۷۵ھ	تا	۱۳۷۹ھ	
۱۸	مولانا ابوالکلام صاحب دیوبندی مدظلہٗ مبلغ	۱۳۸۰ھ	تا	حال	
۱۹	مولانا بلال اصغر صاحب دیوبندی مدظلہٗ مبلغ	۱۳۸۳ھ	تا	حال	

نمبر شمار	اسمائے گرامی نظماء شعبہ محافظ خانہ	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	منشی سید محمد شفیع صاحب حسن پوری (مرادآبادی)	۱۳۵۶ھ	تا	۱۳۵۹ھ	
۲	منشی عظیم بخش صاحب دیوبندی مرحوم	۱۳۶۰ھ	تا	۱۳۶۶ھ	
۳	سید محبوب صاحب رضوی دیوبندی	۱۳۶۶ھ	تا	حال	

نمبر شمار	نظمائے شعبہ مطبخ	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	صوفی محمد شفیع صاحب	۱۳۳۴ھ	تا	۱۳۴۰ھ	
۲	مولانا گل محمد خاں صاحب	۱۳۴۰ھ	تا	۱۳۴۹ھ	
۳	پیر جی محمد عمر صاحب گنگوہی (دوبارہ ۱۳۵۲ھ تا ۱۳۵۴ھ)	۱۳۵۰ھ	میں	صرف ایک سال	۱۳۵۱ھ میں کوئی نہیں رہا۔
۴	منشی مظہر الحق صاحب دیوبندی	۱۳۵۵ھ	تا	حال	

نمبر شمار	اسمائے گرامی نظماء شعبہ تنظیم ابنائے قدیم	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	مولانا عزیز احمد صاحب قاسمی بی۔اے (جامعہ)	۱۳۷۶ھ	تا	حال	

نمبر شمار	نظمائے شعبہ دار الصنائع ومعلّمین شعبہ ہذا	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی ناظم	۱۳۶۸ھ	تا	۱۳۷۱ھ	
۲	مولانا خالد سیف اللہ صاحب گنگوہی ناظم	۱۳۷۲ھ	تا	۱۳۷۸ھ	
۳	مولانا احمد علی سعید صاحب نگینوی ناظم	۱۳۷۸ھ	تا	۱۳۸۰ھ	
۴	منشی محمد کامل صاحب دیوبندی معلم چرم دوزی	۱۳۶۸ھ	میں	صرف چند ماہ	

۵	منشی افضال احمد صاحب دیوبندی معلم چرم دوزی	۱۳۶۸ھ	میں	صرف ایک سال	
۶	منشی مطلوب احمد صاحب دیوبندی معلم جلد سازی	۱۳۶۸ھ	تا	حال	
۷	منشی شوکت حسین صاحب دیوبندی معلم جلد سازی	۱۳۶۸ھ	تا	حال	
۸	ماسٹر احمد حسن صاحب عرف ماسٹر چونا دیوبندی معلم خیاطی	۱۳۷۰ھ	تا	۱۳۷۱ھ	
۹	ماسٹر رشید احمد صاحب دیوبندی معلم خیاطی	۱۳۷۰ھ	تا	حال	
۱۰	منشی احتشام غازی صاحب دیوبندی معلم ٹائپ رائٹنگ	۱۳۷۱ھ	تا	۱۳۷۳ھ	
۱۱	ماسٹر محمد شفیق صاحب دیوبندی معلم خیاطی	۱۳۷۲ھ	تا	حال	
۱۲	مولوی معین الدین صاحب حیدرآبادی معلم چرم دوزی	۱۳۷۴ھ	تا	حال	

نمبر شمار	نظمائے شعبہ اوقاف	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	منشی سید مشتاق حسین صاحب خورجوی	۱۳۳۵ھ	تا	۱۳۴۷ھ	۱۳۴۸ھ میں کوئی ناظم نہیں رہا۔

۲	مولانا نورالحسن صاحب دیوبندی	۱۳۴۹ھ	تا	صرف ایک سال	
۳	مولانا رحمت علی صاحب پھپھوندوی	۱۳۵۰ھ	تا	۱۳۵۳ھ	
۴	منشی مرتضیٰ حسن صاحب سیکروی	۱۳۵۲ھ	تا	۱۳۵۳ھ	۱۳۵۴ھ تا ۱۳۵۸ھ میں کوئی ناظم نہیں رہا
۵	مولوی محمد احمد صاحب نگینوی	۱۳۵۹ھ	تا	۱۳۶۰ھ	
۶	سید شوکت حسین صاحب	۱۳۶۱ھ	تا	۱۳۶۲ھ	
۷	منشی حامد حسن صاحب	۱۳۶۳ھ	تا	۱۳۶۴ھ	
۸	پیر جی محمد عمر صاحب قدوسی گنگوہی	۱۳۶۵ھ	تا	۱۳۷۲ھ	
۹	مولوی عبدالواحد صاحب ناظم محاسبی	۱۳۷۳ھ	تا	حال	

نمبر شمار	نظماء ومعین صدر جمعیۃ الطلباء	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	مولانا عزیز احمد صاحب قاسمی بی، اے فیض آبادی ناظم ومعین صدر جمعیۃ الطلبہ	۱۳۶۷ھ	تا	۱۳۷۰ھ	
۲	مولانا یعقوب الرحمٰن صاحب عثمانی دیوبندی معین صدر جمعیۃ الطلبہ	۱۳۷۰ھ	میں	صرف ایک سال	۱۳۷۱ھ میں کوئی نہیں رہا
۳	مولانا فرید الوحیدی صاحب فیض آبادی ایم، اے معین صدر جمعیۃ الطلبہ	۱۳۷۲ھ	تا	۱۳۷۴ھ	

نمبر شمار	نظمائے شعبہ محاسبی	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	مولانا بشیر حسین صاحب نگینوی	۱۳۵۳ھ	تا	۱۳۵۴ھ	
۲	ماسٹر طفیل احمد صاحب بی، اے	۱۳۵۴ھ	تا	۱۳۵۵ھ	
۳	بابو سعید احمد صاحب عثمانی دیوبندی	۱۳۵۶ھ	تا	۱۳۶۲ھ	
۴	مولوی عبد الواحد صاحب دیوبندی	۱۳۶۲ھ	تا	حال	
نمبر شمار	**نظمائے شعبہ تعمیرات**	**ابتدائی سن**	**تا**	**آخری سن**	**کیفیت**
۱	مولانا رحمت علی صاحب پھپھوندوی	۱۳۳۲ھ	تا	۱۳۴۰ھ	۱۳۴۱ھ تا ۱۳۴۳ھ میں کوئی نہیں رہا۔
۲	حافظ عزیز الرحمٰن صاحب سیکروی	۱۳۴۳ھ	تا	۱۳۴۴ھ	
۳	مولانا حافظ نور الحسن صاحب دیوبندی	۱۳۴۴ھ	تا	۱۳۴۵ھ	
۴	حاجی محمد قاسم صاحب دیوبندی	۱۳۴۶ھ	تا	۱۳۶۲ھ	
۵	منشی محمد مظہر صاحب فاروقی گنگوہی	۱۳۶۲ھ	تا	۱۳۶۷ھ	
۶	بابو رفیق احمد صاحب دیوبندی	۱۳۶۸ھ	تا	۱۳۷۶ھ	
۷	بابو محبوب حسن صاحب دیوبندی	۱۳۷۷ھ	تا	حال	
نمبر شمار	**نظمائے شعبہ کتب خانہ**	**ابتدائی سن**	**تا**	**آخری سن**	**کیفیت**

۱	مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی	۱۳۳۴ھ	تا	۱۳۳۵ھ	۱۳۳۶ھ تا ۱۳۴۰ھ کوئی نہیں رہا
۲	مولانا رحمت علی صاحب پھپھوندوی	۱۳۴۱ھ	تا	۱۳۴۹ھ	
۳	مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی دیوبندی (دوبارہ پھر ۱۳۵۲ھ تا ۱۳۵۴ھ)	۱۳۵۰ھ	میں	صرف ایک سال	
۴	پیر جی محمد عمر صاحب قدوسی گنگوہی	۱۳۵۱ھ	میں	صرف چند ماہ	
۵	مولانا بشیر حسین صاحب نگینوی	۱۳۵۱ھ	تا	۱۳۵۲ھ	
۶	مولانا سلطان الحق صاحب بجنوری	۱۳۵۵ھ	تا	حال	

نمبر شمار	نظمائے شعبہ نشرواشاعت	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ ایڈیٹر رسالہ ''القاسم''	۱۳۲۷ھ	تا	۱۳۳۹ھ	
۲	حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ معین المدیر (مولانا مرحوم اگرچہ باضابطہ مدیر یا معین مدیر نہیں رہے لیکن درحقیقت رسالہ کا کام وہی کرتے تھے)	۱۳۲۷ھ	تا	۱۳۳۹ھ	

۳	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ ایڈیٹر رسالہ "القاسم" و "الرشید"	۱۳۳۲ھ	تا	۱۳۳۹ھ	۱۳۴۰ھ تا ۱۳۵۹ھ میں کوئی رسالہ نہیں نکلا۔
۴	مولانا عبدالوحید صاحب غازی پوری ایڈیٹر رسالہ "دارالعلوم"	۱۳۶۰ھ	تا	۱۳۶۴ھ	
۵	مولانا خلیق احمد صاحب سردھنوی ایڈیٹر رسالہ "دارالعلوم"	۱۳۶۵ھ	تا	۱۳۶۸ھ	
۶	مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی ایڈیٹر رسالہ "دارالعلوم"	صفر ۱۳۶۸ھ	تا	شعبان ۱۳۶۸ھ	
۷	جناب سید ازہر شاہ صاحب قیصر ایڈیٹر رسالہ "دارالعلوم"	۱۳۶۸ھ	تا	حال	

نمبر شمار	نظمائے شعبہ دارالاقامہ	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	مولانا سید رحمت علی صاحب پھپھوندوی	۱۳۵۲ھ	تا	۱۳۵۳ھ	۱۳۵۴ھ میں کوئی نہیں رہا۔
۲	حاجی شاہ عزیز حسین صاحب گنگوہی مدظلہ	۱۳۵۵ھ	تا	۱۳۵۶ھ	
۳	مولانا سلطان الحق صاحب بجنوری مدظلہ	۱۳۵۷ھ	تا	۱۳۵۹ھ	
۴	منشی سید محمد شفیع صاحب حسن پوری مدظلہ	۱۳۶۰ھ	تا	۱۳۶۳ھ	

۵	مولانا حبیب اللہ صاحب میرٹھیؒ	۱۳۶۴ھ	تا	۱۳۶۶ھ	
۶	حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب امروہویؒ	۱۳۶۶ھ	تا	۱۳۶۹ھ	
۷	حضرت مولانا سید فخرالحسن صاحب مرادآبادی مدظلہ	۱۳۶۶ھ	تا	۱۳۷۴ھ	
۸	مولانا عبدالحق صاحب عرف نافع گل صاحب پشاوری مدظلہ	۱۳۶۶ھ	میں	صرف چند ماہ	
۹	مولانا عبدالحق صاحب اکوڑوی مدظلہ	۱۳۶۶ھ	میں	صرف چند ماہ	
۱۰	مولانا عبدالخالق صاحب ملتانی مدظلہ (دوبارہ ۱۳۷۰ھ تا ۱۳۷۳ھ سہ بارہ ۱۳۸۱ھ تا حال)	۱۳۶۶ھ	میں	صرف چند ماہ	
۱۱	مولانا معراج الحق صاحب دیوبندی	۱۳۶۶ھ	تا	۱۳۶۹ھ	
۱۲	مولانا عبدالاحد صاحب دیوبندی مدظلہ	۱۳۶۷ھ	تا	۱۳۶۹ھ	دوبارہ ۱۳۷۳ھ تا ۱۳۸۰ھ
۱۳	حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی مدظلہ	۱۳۶۹ھ	تا	۱۳۷۰ھ	
۱۴	حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحب بلندشہری مدظلہ	۱۳۶۹ھ	تا	۱۳۷۳ھ	دوبارہ ۱۳۷۸ھ میں صرف ایک سال

۱۵	مولانا سید اختر حسین صاحب دیوبندی مدظلہٗ	۱۳۷۳ھ	تا	۱۳۷۴ھ	
۱۶	مولانا محمد حسین صاحب بہاری مدظلہٗ (دوبارہ ۱۳۷۸ھ میں ایک سال سہ بارہ ۱۳۸۰ھ تا ۱۳۸۱ھ)	۱۳۷۳ھ	تا	۱۳۷۶ھ	
۱۷	مولانا محمد نعیم صاحب دیوبندی مدظلہٗ (دوبارہ ۱۳۷۷ھ میں ایک سال، سہ بارہ ۱۳۸۰ھ تا حال)	۱۳۷۳ھ	میں	صرف ایک سال	
۱۸	مولانا نصیر احمد خاں صاحب بلند شہری مدظلہٗ	۱۳۷۷ھ	میں	صرف ایک سال	دوبارہ ۱۳۸۱ھ تا حال
۱۹	مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دیوبندی مدظلہٗ	۱۳۷۷ھ	میں	صرف ایک سال	دوبارہ ۱۳۷۹ھ میں ایک سال
۲۰	مولانا سید حسن صاحب دیوبندیؒ	۱۳۷۷ھ	میں	صرف ایک سال	
۲۱	مولانا عزیز احمد صاحب قاسمی فیض آبادی مدظلہٗ، بی-اے	۱۳۸۰ھ	میں	ایک ماہ	
۲۲	مولانا سید انظر شاہ صاحب دیوبندی مدظلہٗ	۱۳۸۰ھ	تا	۱۳۸۱ھ	

نمبر شمار	نظماء و معلّمین شعبہ طب وطبیب	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	حضرت مولانا حکیم محمد حسن صاحب دیوبندیؒ ناظم شعبہ طب وطبیب	۱۳۰۲ھ	تا	۱۳۴۵ھ	
۲	مولانا حکیم رمضان الحق صاحب لکھیم پوریؒ ناظم شعبہ طب وطبیب	۱۳۴۸ھ	تا	۱۳۴۹ھ	
۳	مولانا حکیم محمد عمر صاحب دیوبندی مدظلہ، طبیب و پرنسپل جامعہ طبیہ دار العلوم	۱۳۵۰ھ	تا	حال	
۴	مولانا حکیم انیس احمد صاحب دیوبندی نائب طبیب و معلم طب	۱۳۷۴ھ	تا	حال	
۵	حکیم عبد الکریم صاحب معلم طب	۱۳۸۰ھ	تا	۱۳۸۳ھ	
۶	مولانا حکیم سید محفوظ علی صاحبؒ معلم طب	۱۳۸۰ھ	میں	صرف چند ماہ	
۷	مولانا حکیم محمد وسیم صاحب قدوائی فیض آبادی معلم طب	۱۳۸۱ھ	تا	۱۳۸۲ھ	
۸	مولانا حکیم سید محمد ایوب صاحب فرخ آبادی معلم طب	۱۳۸۲ھ	تا	۱۳۸۳ھ	
۹	مولانا حکیم سید محمد نفیس صاحب خانجہانپوری معلم طب	۱۳۸۲ھ	تا	حال	
۱۰	مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب اعظمی معلم طب	۱۳۸۲ھ	تا	حال	

۱۱	حکیم شمیم احمد صاحب سعیدی میرٹھی معلم طب	۱۳۸۲ھ	تا	حال	
نمبر شمار	**نگراں شعبہ جات** **نگران شعبہ دارالمطالعہ**	**ابتدائی سن**	**تا**	**آخری سن**	**کیفیت**
۱	منشی محمد صادق صاحب دیوبندی مرحوم	۱۳۶۹ھ	تا	۱۳۸۳ھ	
۲	حافظ اخلاق احمد صاحب رامپوری	۱۳۸۳ھ	تا	حال	
نمبر شمار	**نگراں شعبہ دارالتربیت**	**ابتدائی سن**	**تا**	**آخری سن**	**کیفیت**
۱	حاجی شاہ عزیز حسین صاحب گنگوہی	۱۳۷۷ھ	تا	حال	
نمبر شمار	**نگراں شعبہ ترتیبِ فتاویٰ**	**ابتدائی سن**	**تا**	**آخری سن**	**کیفیت**
۱	مولانا احمد علی سعید صاحب نگینوی مرتب فتاویٰ	۱۳۷۴ھ	تا	۱۳۷۵ھ	
۲	مولانا مفتی جمیل الرحمٰن صاحب سیوہاروی مرتب فتاویٰ	۱۳۷۵ھ	تا	۱۳۷۶ھ	
۳	مولانا ظفیر الدین صاحب بہاری مرتب فتاویٰ	۱۳۷۷ھ	تا	حال	
نمبر شمار	**نگران شعبہ امور خارجہ** (جس سے بیرونِ ہند کے طلبہ کے پاسپورٹ اور ویزا وغیرہ کا تعلق ہے)	**ابتدائی سن**	**تا**	**آخری سن**	**کیفیت**
۱	مولوی عبداللہ جاوید صاحب غازی پوری	۱۳۷۸ھ	تا	حال	

نمبر شمار	نگراں شعبہ تعلیم انگریزی (صف انگریزی)	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	مولانا عزیز احمد صاحب قاسمی فیض آبادی بی،اے	۱۳۸۰ھ	تا	حال	

نمبر شمار	نگراں شعبہ معارف القرآن (اکاڈیمی قرآن عظیم)	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	مولانا عمید الزماں صاحب کیرانوی نگران ومنتظم	۱۳۸۳ھ	تا	۱۳۸۴ھ	
۲	مولانا محمد سالم صاحب قاسمی معتمد ادارہ	۱۳۸۵ھ	تا	حال	

نمبر شمار	نگراں شعبہ ورزش	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	استاد محمد ظہیر صاحب سیکروی (دوبارہ ۱۳۶۰ھ تا ۱۳۶۵ھ، سہ بارہ ۱۳۶۶ھ تا ۱۳۶۷ھ)	۱۳۵۸ھ	تا	۱۳۵۹ھ	
۲	استاد عبد الرحمٰن صاحب اعظمی	۱۳۶۰ھ	تا	۱۳۶۲ھ	
۳	استاد عبد الرشید صاحب اعظمی	۱۳۶۰ھ	تا	۱۳۶۲ھ	۱۳۶۳ھ تا ۱۳۶۵ھ تک کوئی نہیں رہا۔
۴	استاد عبد المجید صاحب شاہجہاں پوری	۱۳۶۶ھ	تا	۱۳۶۷ھ	
۵	مولانا محمد ابراہیم صاحب بمبئی	۱۳۶۶ھ	تا	۱۳۶۷ھ	

نمبر شمار	نگراں شعبہ تربیتِ معلّمین	ابتدائی سن	تا	آخری سن	کیفیت
۱	مولانا عزیز احمد صاحب قاسمی فیض آبادی بی، اے	۱۳۸۲ھ	تا	۱۳۸۳ھ	

سلسلہ تالیفات وافاداتِ حکیم الاسلامؒ
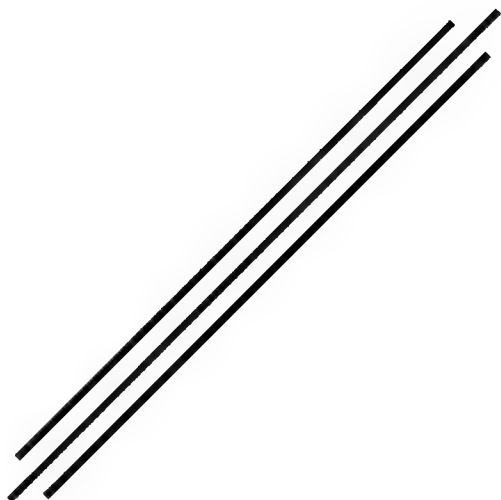
دارالعلوم دیوبند کی

پچاس مثالی شخصیات

• •

پیش لفظ

شیخ الاسلام علامہ محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی نور اللہ مرقدہ کی ذاتِ گرامی دارالعلوم دیوبند کے اس بابرکت دور کی دلکش یادگار تھی جس نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور ان جیسے دوسرے حضرات کا جلوۂ جہاں آراء دیکھا تھا۔ جس ہستی کی تعلیم وتربیت میں علم وعمل کے ان مجسم پیکروں نے حصہ لیا ہو اُس کے اوصاف وکمالات کا ٹھیک ٹھیک ادراک بھی ہم جیسوں کے لئے مشکل ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ حضرت حکیم الاسلام قدس سرہ کے پیکر میں معصومیت، حسنِ اخلاق اور علم وعمل کے جو نمونے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں ان کے نقوش دل ودماغ سے محو نہیں ہوسکتے۔

حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب قدس سرہ بانئ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے حکمتِ دین کی جو معرفت حضرت نانوتوی قدس سرہ کو عطا فرمائی تھی اس دور میں حضرت قاری صاحب اس کے تنہا وارث تھے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم کو جن حضرات نے اپنے مزاج ومذاق میں جذب کرکے انہیں شرح وبسط کے ساتھ امت کے سامنے پیش کیا ان میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ کے بعد حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی ثانی نہیں تھا، حضرت قاری صاحب قدس سرہ کو تعلیم سے فراغت کے بعد تدریس وتصنیف کے لئے باقاعدہ وقت بہت کم ملا اور نوعمری ہی میں دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم الشان ادارے کے انتظام وانصرام کی ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر آگئیں، ان ذمہ داریوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو عموماً علمی مشاغل سے دور کرکے اس کی علمی استعداد پر بہت برا اثر ڈالتی ہیں، لیکن حضرت قاری صاحب قدس سرہ کا

معاملہ اس لحاظ سے بھی حیرت انگیز تھا، انتظامی بکھیڑوں میں مبتلا رہنے کے باوجود ان کا علمی مذاق ہمیشہ تازہ اور ان کی علمی استعداد سدا بہار رہی۔

احقر کے والد ماجد مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ اور حضرت قاری صاحب قدس سرہ بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھی اور زندگی کے ہر مرحلے میں ایک دوسرے کے رفیق رہے ہیں، دونوں نے دارالعلوم دیوبند میں ساتھ پڑھا، ساتھ فارغ ہوئے، ساتھ ہی پڑھانا شروع کیا، دونوں ایک ہی وقت حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے دستِ مبارک پر بیعت ہوئے، اور پھر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ایک ہی ساتھ تھانہ بھون حاضر ہو کر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور تقریباً دونوں کو ساتھ حضرت حکیم الامت تھانوی کی طرف سے خلافت عطا ہوئی۔

۱۳۴۵ھ میں سب سے پہلا حج بھی دونوں نے ساتھ کیا۔ غرض ظاہری تعلیم اور باطنی تربیت سے لے کر سیر و تفریح تک ہر چیز میں دونوں کی رفاقت مثالی رفاقت تھی، پھر جب قیامِ پاکستان کی تحریک شروع ہوئی اور آزادیٔ ہند کے طریق کار سے متعلق علمائے دیوبند کے درمیان اختلاف رونما ہوا تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرح حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر بھی حکیم الامت حضرت تھانوی اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کی طرف مائل تھا، لیکن حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کو عملی سیاست سے بالکلیہ یکسو کر کے ہمہ تن دارالعلوم دیوبند کی خدمت کے لئے وقف کیا ہوا تھا اسلئے یہ نقطۂ نظر اسٹیج پر نہ آسکا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ قیامِ پاکستان کے بعد یہاں تشریف لے آئے اور حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لئے دارالعلوم کی گراں بار ذمہ داری کے پیش نظر دیوبند چھوڑنے کا سوال ہی نہ تھا، لیکن یہ بات میں نے حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بارہا سنی کہ جس روز حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ پاکستان کے لئے روانہ ہوئے اس روز میں دن بھر روتا رہا، آپ نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے موقع پر جو تعزیتی مکتوب ارسال فرمایا اس میں بھی لکھا تھا کہ:

"تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستانی قومیت اختیار فرمائی اور یہاں سے ہجرت فرما کر پاکستان

تشریف لے گئے۔کسی مرنے والے کے لئے بھی اتنا کبھی نہیں رویا تھا جتنا آپ کے فراق پر رویا تھا، یہ حالت دیکھ کر سب گھر والے پریشان ہوگئے تھے کہ آخر کیا حادثہ پیش آ گیا جو اتنا گریہ طاری ہے، یہ تعلق کی بناء پر تھا کہ ابتدائے عہد سے ہم رفیق رہے تھے۔"

اس کے بعد سے وہ ہمہ وقتی رفاقت چھوٹ گئی، قلب وروح کا رشتہ کسی مرحلے پر نہ ٹوٹا، ایک مرتبہ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خط میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ:

"کل یہاں مستحسن صاحب فاروقی کے ساتھ مولوی ظہور احمد صاحب نے میری بھی دعوت کی تھی آپ ہی کے مکان سے متصل منشی بشیر احمد صاحب مرحوم کے مکان میں کھانا کھلایا، مکان دیکھ کر مکینوں کی یاد تازہ ہوگئی اور دیر تک اس تصور میں استغراق رہا۔"

یہ لکھنے کے بعد حضرت قاری صاحب نے متمم بن نویرہ کے ان اشعار سے تمثل فرمایا کہ:

وکنا کند مانی جدیمة حقبة — من الدهر حتی قیل لن یتصدعا

قلما تفرقنا کانی و مالکا — لطول اجتماع لم نبت لیلة معا

قیامِ پاکستان کے بعد بارہا حضرت قاری صاحب قدس سرہ کراچی تشریف لائے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ کراچی تشریف لانے کے بعد آپ دارالعلوم تشریف نہ لائیں، چنانچہ ہر بار خدامِ دارالعلوم کو اپنی شفقتوں سے بہرہ ور فرماتے، طلباء اور اساتذہ سے خطاب بھی ہوتا اور پھر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے درمیان جو باغ و بہار مجلس ہوتی اُس میں علمی تبادلۂ خیال کے علاوہ ماضی کے تذکرے، زمانہ طالب علمی کی یادیں، اساتذہ کے واقعات اور نہ جانے کتنے موضوعات پر گفتگو ہوتی اور ہم خدام کو افادات کا نہ جانے کتنا خزانہ ہاتھ آ جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت قاری صاحب قدس سرہ کو تصنیف اور خطابت دونوں میں کمال عطا فرمایا تھا، اگرچہ انتظامی مشاغل کے ساتھ سفروں کی کثرت تھی اور یہ سفر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا جزوِ لازم بن کر رہ گئے تھے، حساب لگایا جائے تو عجب نہیں کہ آدھی عمر سفر ہی میں بسر ہوئی ہو، لیکن حیرت ہے کہ اتنی مصروفیات کے باوجود آپ تصنیف وتالیف کا وقت نکال لیتے تھے۔

چنانچہ آپ کی دسیوں تصانیف آپ کے بلند علمی مقام کی شاہد ہیں اور ان کے مطالعہ سے دین کی عظمت ومحبت میں اضافہ ہوتا ہے، جہاں تک وعظ وخطابت کا تعلق ہے اس میں تو اللہ تعالیٰ نے

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ایسا عجیب وغریب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔

بظاہر تقریر کی عوامی مقبولیت کے جو اسباب آج کل ہوا کرتے ہیں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وعظ میں وہ سب مفقود تھے، نہ جوش وخروش، نہ فقرے چست کرنے کا انداز، نہ پُر تکلف لسانی، نہ لہجہ اور نہ ترنم اور نہ خطیبانہ ادائیں، لیکن اس کے باوجود وعظ اس قدر مؤثر، دلچسپ اور مسحور کن ہوتا تھا کہ اس سے عوام اور اہل علم دونوں یکساں طور پر محظوظ اور مستفید ہوتے تھے۔ مضامین اونچے درجے کے عالمانہ اور عارفانہ لیکن الفاظ ومعانی کی ایک نہر سلسبیل تھی جو یکساں روانی کے ساتھ بہتی اور قلب ودماغ کو نہال کردیتی تھی، ایسا معلوم ہوتا کہ منہ سے ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے موتی جھڑ رہے ہیں، ان کی تقریر میں سمندر کی طغیانی کے بجائے ایک باوقار دریا کا ٹھہراؤ تھا جو انسان کو زیروزبر کرنے کے بجائے دھیرے دھیرے اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا تھا۔

حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مخالف فرقوں کی تردید کو اپنی تقریر کا موضوع کبھی نہیں بنایا، لیکن نہ جانے کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں نے ان کے مواعظ سے ہدایت پائی اور کتنے غلط عقائد و نظریات سے تائب ہوئے۔

لاہور میں ایک صاحب علمائے دیوبند کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈہ سے بہت متاثر اور علمائے دیوبند سے بری طرح برگشتہ تھے، طرح طرح کی بدعات میں مبتلا بلکہ ان کو کفر وایمان کا معیار قرار دینے والے، اتفاق سے حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ لاہور تشریف لائے اور وہاں ایک مسجد میں آپ کے وعظ کا اعلان ہوا۔ یہ صاحب خود سناتے ہیں کہ میں اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ان کے وعظ میں اس نیت سے پہنچا کہ انہیں اعتراضات کا نشانہ بناؤں گا اور موقع ملا تو اس مجلس کو خراب کرنے کی کوشش کروں گا، لیکن اول تو ابھی تقریر شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معصوم اور پرنور چہرہ دیکھ کر ہی اپنے عزائم میں زلزلہ سا آگیا، دل نے اندر سے گواہی دی کہ یہ چہرہ کسی بے ادب، گستاخ یا گمراہ کا نہیں ہوسکتا، پھر جب وعظ شروع ہوا اور اس میں دین کے جو حقائق ومعارف سامنے آئے تو پہلی بار اندازہ ہوا کہ عالمِ دین کسے کہتے ہیں؟ یہاں تک کہ تقریر کے اختتام تک میں حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے آگے موم ہوچکا تھا، میں نے

اپنے سابقہ خیالات سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے بزرگانِ دین کے بارے میں ایسی بدگمانیوں سے نجات عطا فرمائی۔ برصغیر کا تو شاید ہی کوئی کونہ ایسا ہو کہ جہاں قاری صاحب کی آواز نہ پہنچی ہو، اس کے علاوہ افریقہ، یورپ اور امریکہ تک آپ کے وعظ وارشاد کے فیوض پھیلے ہوئے ہیں اور ان سے نہ جانے کتنی زندگیوں میں انقلاب آیا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا منصبِ اہتمام کوئی معمولی چیز نہ تھی، حضرت قاری صاحب نے پچاس سال سے زائد اس منصب کی ذمہ داریوں کی خوش اسلوبی سے نبھایا، اس دوران دارالعلوم پر نہ جانے کتنے کٹھن اور نازک دور آئے، لیکن حضرت قاری صاحب نے ان تمام جھمیلوں کو نمٹایا اور اپنی ساری زندگی دارالعلوم کی خدمت کے لئے وقف کردی، سخت سے سخت مرحلوں پر بھی انہیں پُرسکون ہی دیکھا۔ اجلاسِ صدسالہ کا ہنگامہ دارالعلوم کے منتظمین کے لئے ایک کڑی آزمائش کی حیثیت رکھتا تھا، دیوبند جیسی مختصر جگہ میں لاکھوں افراد کے اجتماع کا انتظام انتہائی مشکل کام تھا، کوئی اور ہوتا تو اس موقع پر اس سراسیمگی سے نجات حاصل نہ کرسکتا، لیکن ٹھیک اجلاس کے افتتاح کے روز حضرت قاری صاحب کے پاس حاضری ہوئی تو حسبِ معمول انہیں متبسم اور پُرسکون دیکھا، چہرے پر تھکن ضرور تھی لیکن گھبراہٹ اور پریشانی نام کو نہ تھی۔

افسوس ہے کہ اجلاسِ صدسالہ کے بعد دارالعلوم دیوبند میں باہمی اختلافات نے ہنگاموں کی شکل اختیار کی، انہوں نے ماضی کے تمام ہنگاموں کو مات کردیا، دور ہونے کی وجہ سے ہمیں تمام حالات وواقعات سے واقفیت تو نہ تھی لیکن اس بات سے دل بے چین تھا کہ اس آخری عمر میں حضرت قاری صاحب پر ان ہنگاموں کی وجہ سے کیا بیت رہی ہوگی، اس زمانے کے حالات اس قدر پیچیدہ ہیں اور ان کے بارے میں ملنے والی اطلاعات اتنی متضاد ہیں کہ اب حق وناحق کا فیصلہ تو شاید آخرت ہی میں ہوسکے گا لیکن اتنی بات واضح ہے کہ حضرت قاری صاحب کے چھوٹوں نے ان کی نصف صدی سے زائد کی خدمات کا جو صلہ اس آخری عمر میں ان کو دیا ہے وہ انتہائی تکلیف دہ ہے۔

حضرت قاری صاحب قدس سرہ کی زندگی تک ایک ضعیف سی امید باقی تھی کہ شاید اس بحران کا کوئی مناسب حل نکل آئے لیکن اب ان کی وفات نے اس امید کو بھی خاکستر کردیا، حضرت قاری

صاحب کے دم سے دارالعلوم دیوبند میں بزرگوں کی روایات زندہ تھیں اور اس کے مخصوص مزاج ومذاق کی جھلک باقی تھی، اب دارالعلوم کی ان روایات کا اللہ ہی حافظ ہے۔

حضرت قاری صاحب کی وفات بلاشبہ پوری امت کے لئے عظیم سانحہ ہے وہ ۶؍شوال المکرّم ۱۴۰۳ھ کو ہمیں داغِ مفارقت دے کر اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے تھے، حضرت قاری صاحب دارالعلوم دیوبند میں سلف کی آخری یادگار تھے ان کی وفات کسی ایک شخص کی وفات نہیں یہ ایک پورے عہد کا، اس کے مزاج ومذاق کا اور اس کی دل آویز خصوصیات کا خاتمہ ہے اور اس سانحے کی ٹیس نہ جانے کب تک دلوں میں تازہ رہے گی۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

وماکان قیس ہلکہ ہلک واحد ولکنہ بنیان قوم تہدما

ہم میں سے ہر شخص پر ان کا حق ہے کہ اپنی وسعت کے مطابق انہیں ہمیشہ ایصالِ ثواب کرتے رہیں، حق تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں درجاتِ عالیہ عطا فرمائیں، البتہ حضرت قاری صاحب قدس سرہٗ کا زندگی میں جن بزرگوں اور جن معاصر علمائے کرام سے کسی بھی نوعیت کا رابطہ اور تعلق رہا اور جو اُن کی زندگی ہی میں اس دنیا سے سدھارے اور آخرت کی منزل کی طرف روانہ ہوئے تو آپ نے اپنے طبعی تاثرات ومشاہدات ماہنامہ ''دارالعلوم'' دیوبند، ''القاسم'' دیوبند اور دیگر کتب ورسائل میں وقتاً وقتاً تحریر فرمائے، خصوصاً ''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' میں آپ نے اکابر واساتذہ اور معاصر علماء کے حالات وخدمات وغیرہ کا جو تذکرہ لکھا ہے ان میں سے انتخاب کر کے ''پچاس مثالی شخصیات'' کے عنوان سے برادر مکرم جناب حافظ محمد اکبر شاہ بخاری صاحب نے حضرت کے یہ شذرات یکجا کتابی شکل میں جمع فرما دیئے ہیں جو لائق تحسین کام ہے۔ حضرت قاری صاحبؒ کے ان نادر تاثرات وشذرات سے ان مثالی شخصیات کے ایسے خدوخال، نقوش اور زندگی کی عمومی جھلک سامنے آگئی ہے جو تذکرہ نویسوں اور سوانح نگاروں کے لئے کارآمد ثابت ہوگی، یہ مجموعہ مُضامین کتابی صورت میں ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان سے شائع ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مجموعہ کو قارئین اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے عقیدت مندوں کے لئے مفید ونافع بنائے۔

محمد تقی عثمانی

اکابر دیوبند کی یاد میں

مولانا مشرف علی تھانوی

بھول کر بھی نہ آئیں گے یہ لوگ		جا کے واپس نہ آئیں گے یہ لوگ
سرمدی ہوگیا ہے ان کا سفر		اب کہاں پائے جائیں گے یہ لوگ
اپنے حق میں وسیع و بے پایاں		رحمت حق کو پائیں گے یہ لوگ
اب تو فردوس خلد میں جا کر		اپنی محفل سجائیں گے یہ لوگ
بے حجابانہ ہوگا نظارہ		جلوۂ حق کو پائیں گے یہ لوگ
کون ملک عدم سے داعی ہے		کس کی مجلس میں جائیں گے یہ لوگ
بستیاں کر کے چل دیئے ویراں		اپنی دنیا بسائیں گے یہ لوگ
ایک ہی راہ کے سالک تھے		ایک منزل پہ جائیں گے یہ لوگ
جا رہے ہیں جو آج کر کے حجاب		چھپ کے پھر دل میں آئیں گے یہ لوگ
کون پھر اس نظر میں جچتا ہے		جس نظر میں سمائیں گے یہ لوگ
ہم انہیں آج تک نہیں بھولے		کیا ہمیں بھول جائیں گے یہ لوگ
دل کی گہرائیوں میں بستے ہیں		کیوں نہ پھر یاد آئیں گے یہ لوگ
جتنی مدت گذرتی جائے گی		اور بھی یاد آئیں گے یہ لوگ
ہم بھلا بھول جائیں کیسے انہیں		جب نہ ہم کو بھلائیں گے یہ لوگ
محفل لامکاں میں اے عارفؔ		ہم کو کس دن بلائیں گے یہ لوگ

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

تاریخ کی ایک زندہ جاوید شخصیت

آل انڈیا ریڈیو دہلی نے اپنے یہاں علماء اور مصلحین امت کے تعارف کے لئے ایک سلسلۂ تقریر شروع کیا تھا، اس سلسلہ کی پہلی تقریر حضرت قاری محمد طیب صاحب کی تھی جو حضرت مولانا نانوتوی کے متعلق براڈ کاسٹ ہوئی، ہم اس سلسلہ کی پہلی تقریر بشکریہ ماہنامہ ''دارالعلوم'' شائع کر رہے ہیں۔

میری اس تقریر کا موضوع ہندوستان کی اسلامی تاریخ کی ایک زندۂ جاوید شخصیت حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند ہے۔ حضرت ممدوح کی ولادت ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) میں اور وفات ۱۲۹۷ھ (۱۸۷۹ء) میں ہوئی۔ اس ۴۹ سال کی قلیل مدت میں آپ نے اسلامی اور قومی خدمت کے سلسلہ میں جو عظیم کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ صدیوں کی وسعت کے تھے، جنہیں ہندوستان ہی نہیں پوری اسلامی دنیا کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

۱۸۵۷ء میں آپ نے اپنے مرشد حضرت حاجی امداداللہ کی قیادت میں ہندوستان سے غیر ملکیوں کا قبضہ اٹھانے کے لئے جنگ لڑی، لیکن جنگ میں شکست ہوگئی اور ملک پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہوگیا، اس سے تمام ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے اور ان میں احساسِ کمتری کے ساتھ ایک عام مایوسی پھیل گئی۔ ادھر مشنیریوں نے عیسائی اقتدار کے زیر سایہ صاف صاف یہ اعلان کرنا شروع کر دیا کہ انگریزوں کے لئے یہ ملک (ہندوستان) عیسیٰ مسیح کا عطیہ اور امانت ہے اس لئے اس میں مسیحی مذہب ہی کی اشاعت اور ترویج ہمارا نصب العین ہے اور ساتھ ہی کھلے بندوں ہندوستان کے تمام مذاہب اور خصوصیت سے اسلام پر اعتراضات اور اتہامات کی بوچھار بھی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے باشندے مایوسی میں مبتلا ہو کر اور بالخصوص مسلمان اس ابھرتی ہوئی مغربی تہذیب و تعلیم اور الحاد و دہریت کی زد میں بہنے لگے اور صاف نظر آنے لگا کہ اگر یہی لیل و نہار رہے تو وہ دن دور نہیں کہ آئندہ نسلیں خواہ وہ کسی بھی قوم کی ہوں، خود اپنے اخلاق

نظام اور تہذیب وکلچر سے بیگانہ محض ہوکر رہ جائیں گی۔

حضرت مولانا محمد قاسم نے اپنے نورِ معرفت سے وقت کی رفتار اور اس کے خطرناک نتائج کا اندازہ لگایا اور باشاراتِ غیب ہندوستان کے تمام باشندوں کو بجائے آپس میں الجھنے کے ایک عالمی نقطہ نظر پر ڈال دینے اور قوم میں ایک ذہنی انقلاب لانے کی ضرورت محسوس فرمائی تاکہ یہ احساسِ کمتری دور ہو، اس کے لئے آپ نے تعلیم وتربیت کا راستہ اختیار فرمایا جو بے ضرر اور رسمی سیاست سے دور تھا، چنانچہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے اپنی ایمانی فراست سے چھپتے ہوئے اقتدار کانعم البدل تعلیمی راہ سے حریتِ فکر کے بقاء وارتقاء کوقرار دیا اور اپنا یہ عظیم مقصد ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں دارالعلوم دیوبند قائم فرما کر بآسانی حاصل کرلیا۔

اس الہامی نقطۂ فکر کے تحت دارالعلوم دیوبند محض ایک مدرسہ نہیں بلکہ حریتِ فکر اور استقلالِ وطن کے جذبات کوزندہ رکھنے کا ایک ہمہ گیر مکتب فکر اور عظیم تحریک ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد مولانا محمد قاسم نے مقصد کی اہمیت کے تحت ملک گیر پیمانہ پر مدارس قائم فرمانے شروع کئے اور بہ نفس نفیس خود جا کر مرادآباد، گلاؤٹھی، امروہہ، مظفرنگر وغیرہ میں مدارس قائم فرمائے اور جابجا اپنے متوسلین کوزبانی اور خطوط کے ذریعہ قیامِ مدارس کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ بہت سے مدارس ہندوستان میں حضرت کی زندگی ہی میں قائم ہوگئے اور پھر حضرت مولانا محمد قاسم کے حریتِ فکر کے امین فضلاء نے پورے ملک میں حتیٰ کہ انہیں فضلاء نے ایشیاء، افریقہ اور یوروپ کے ممالک میں بھی اسی قاسمی طرزِ فکر پر تعلیم گاہیں قائم کیں اور میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ آج انگلستان میں یہ قاسمی فکر فروغ پا رہا ہے، علمی پیمانہ پر ہندوستان میں مفت تعلیم کا سب سے پہلا عوامی مرکز مدرسہ دارالعلوم دیوبند ہے جس کے لئے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو صاحبِ دل علماء اور صداقت شعار رفقائے کار حضرت مولانا رشید احمد صاحب، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب، حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمہم اللہ وغیرہ کا مخلصانہ تعاون حاصل رہا، یہی دارالعلوم دیوبند آج ایشیاء کی سب سے بڑی اسلامی مرکزی اور اقامتی یونیورسٹی بن کر ایک خاص مکتبِ فکر کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت وعظمت کا حامل ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نے دارالعلوم دیوبند کو ایسے اصولوں پر قائم فرمایا جن کے تحت روزِ اول سے یہ درسگاہ ایک عوامی ادارہ کی پوزیشن میں نمایاں ہوئی، چنانچہ حضرتِ والا نے اس سلسلہ میں آٹھ اصول اپنے دستِ مبارک سے لکھے جو دارالعلوم کے تاریخی ریکارڈ میں آج بھی محفوظ ہیں اور آج تک ہر دور میں بانیٔ دارالعلوم کے ان الہامی اور اساسی رہنما اصولوں کی پوری حفاظت ورعایت کی جاتی رہی ہے۔ یہ اصول درحقیقت دارالعلوم دیوبند کی معنوی بنیاد ہیں جن پر اس کی ظاہری اور باطنی تعمیر کھڑی ہوئی ہے، اور نہ صرف دارالعلوم کی بلکہ ان تمام مدارسِ ہند کی بھی اساس ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے رنگ پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور ان کے متوسلین نے قائم فرمائے۔ چنانچہ ان اصولِ ہشتگانہ پر حضرت اقدس نے سرخی بھی یہی قائم فرمائی کہ ''وہ اصول جن پر مدارسِ ہند مبنی معلوم ہوتے ہیں۔''

یہی ہمہ گیر اصول قیامِ مدارس کی اجتماعی تحریک کی بنیاد بنے، جس سے ۱۸۷۸ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو نئی زندگی اور نشأۃِ ثانیہ ملی، ان اصولوں کے مطابق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے دارالعلوم دیوبند کو صرف عوامی چندوں پر قائم فرمایا کہ اس میں ابتداءً ہی سے ہمہ گیری کا عنصر نمایاں رہے اور یہ دارالعلوم ہندوستان کے غریب عوام کا ادارہ ثابت ہو، ساتھ ہی اصول میں یہ ہدایت بھی ہے کہ اس مدرسہ کے لئے جائیدادوں اور کارخانہ ہائے تجارت سے کسی مستقل آمدنی کا کوئی بندوبست نہ کیا جائے، ایسا کرنے میں امدادِ غیبی منقطع ہو جائے گی، رجوع الی اللہ کا سرمایہ ہاتھ سے جاتا رہے گا اور کارکنوں میں پھوٹ پڑ جائے گی جس کو ان کے مخلص رفیق کار حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی نے اپنی ایک طویل نظم کے بعض اشعا میں بایں الفاظ ظاہر فرمایا ہے کہ:

اسکے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کیلئے	کوئی سرمایہ بھروسہ کا ذرا ہو جائے گا
پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ	یوں سمجھ لینا کہ بےنور وضیاء ہو جائے گا

ان اصول میں خصوصیت سے اسے اہمیت دی گئی ہے کہ تعلیم مکمل طریق پر آزاد رہے جو اجتماعیت کی روح ہے، پھر اسی کے ساتھ اصولاً معاملاتِ دارالعلوم کو مشورہ کے اصول پر قائم فرما کر اس کو اس عہدِ استبداد میں جمہوریت کا نقیب بنا دیا گیا اور خاص طور پر ذمہ دار ادارہ (مہتمم) کے لئے

یہ ہدایت فرمائی کہ وہ علاوہ مقرر اہل شوریٰ کے ایسے واردین وصادرین سے بھی مشورہ کرے جو مدارس کے خیر خواہوں اوران سے دلچسپی رکھتے ہوں۔

یہ اصول حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانیٔ دارالعلوم کے ہمہ گیر اور اجتماعی تفکر کے ناقابل انکار شواہد ہیں اور انہیں سے دارالعلوم دیوبند کی نوعیت واہمیت بھی واشگاف ہو جاتی ہے، انگریزوں کے قومی استبداد کو توڑنے کے لئے جس کا رخ خصوصیت سے مسلمانوں کی طرف تھا، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے اپنی ہمہ گیر سیاسی رہنمائی سے اس دور کی خلافتِ اسلامیہ یعنی خلافتِ ترکی کی تائید کی طرف مسلمانوں کو خاص طور پر جھکایا، سلطان ترکی کی مدح میں قصیدے لکھے اور بحیثیت خلیفۃ المسلمین اور خادم الحرمین ہونے کے مسلمانوں کو ان کی طرف مائل کرتے رہے۔

اس دور میں جنگ روم وروس ہوئی تو خود بہ نفس نفیس جگہ جگہ دورے کر کے ترکوں کے لئے ہزاروں روپیہ روانہ فرمایا اور خود اپنے گھر باہر کا تقریباً بڑا سامان بطور چندہ ترکی خلافت کی مدد کے لئے روانہ فرما دیا تاکہ خلافت سے وابستہ رہ کر ملی اجتماعیت برقرار اور شیرازہ بند رہے، اس جذبہ سے ملک کی دوسری قوموں کو بھی ہمدردی تھی اور اس کا اثر تھا کہ جب مسلمانانِ ہند نے احیائے خلافت کی تحریک شروع کی تو بلا تفریق مذہب وملت ملک کی تمام مذہبی اکائیاں متفق ومتحد ہو کر اس میں برابر کی شریک رہیں، اس اجتماعیت پسندی کی وجہ سے مولانا مسلمانوں کو سب سے زیادہ حج کی ترغیب دیتے تھے کہ بذاتِ خود حج ایک اجتماعی اور بین الاقوامی عبادت ہے تاکہ مشرق ومغرب کے مسلمان یکجا جمع ہو کر باہم وابستہ ہوں اور ان کی بین الاقوامی اجتماعیت کا رشتہ مضبوط ہو، اور ساتھ ہی ترکی کی خلافت سے بھی انہیں وابستگی رہے۔ یہ تفصیل فکرِ قاسمی کے ان تین بنیادی عناصر کو واشگاف کر دینے کے لئے کافی ہے کہ ملت کا بقاء وارتقاء تعلیم کی ہمہ گیری، ذوقِ اجتماعیت کے عموم اور مرکزیت سے باعظمت وابستگی ہی میں مضمر ہے۔

آخر کار یہی روح ان کے تربیت یافتوں میں بھی راسخ ہوئی اور ان کے بعد ان کے شاگرد رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن اس قاسمی فکر کے امین بنے اور ان کے بعد حضرت کے خلف الرشید حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب اس کے علمی امین بنے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے

حضرت شیخ الہندؒ نے ریشمی رومال کی تحریک اٹھائی اور پانچ برس مالٹا میں انگریز کی قید وبند کی صعوبتیں جھیلیں، ان کے بعد ان کے ہزار ہا شاگردوں میں بھی رنگ جو ہر نمایاں ہوتا رہا جن میں خصوصیت سے قابل ذکر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حضرت مولانا محمد میاں عرف مولانا منصور انصاری وغیر ہم تھے، جنھوں نے بالآخر ہندوستان کو آزاد کرایا اور انجام کار ان بزرگوں کا وحدتِ عالمِ اسلام کا خواب تعبیر کے قریب ہوتا جار ہا ہے۔

آخر عمر میں آپ نے بطور خاص اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں یوروپ پہنچ کر بتلاؤں کہ حکمت وہ نہیں ہے جسے تم غلط فہمی سے حکمت سمجھ رہے ہو بلکہ حکمت وہ ہے جس سے دنیا وعقبیٰ دونوں کے انکشافات تم پر عیاں ہو سکتے ہیں۔ مباحثہ شاہ جہاں پور کا واقعہ وہ تاریخی موڑ ہے کہ اس میں حضرت نے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی انگریزی سیاست کا رخ انگریزوں کی طرف موڑ دیا جس کا اعتراف اس دور کے ہندو زعماء نے یہ کہہ کر کیا کہ یہ مولوی ہے جس نے ہندوستان کی لاج رکھ لی۔

یہ روشن حقائق اس عظیم حقیقت کو طشت از بام کرنے کے لئے کافی ہیں کہ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی شخصیت ایک عالمی اور تاریخ ساز شخصیت تھی اور ان کے شیخ ومرشد حضرت حاجی امداد اللہ کا یہ قول کہ ”کئی صدی کے بعد اللہ نے مولانا محمد قاسم صاحب جیسی شخصیت پیدا فرمائی ہے“ اس کی عظمت واہمیت کے باب میں بلاخوفِ تردید حرفِ آخر قرار دیا جاسکتا ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

دار العلوم دیوبند ہندوستان میں علم حدیث کا سب سے عظیم مرکز شمار ہوتا ہے اور دار العلوم میں صدارتِ تدریس کی عظیم مسند پر ہمیشہ ایسے علماء فائز رہے ہیں جو اپنے علم وفضل خصوصاً علم حدیث کے ساتھ زہد وتقویٰ اور سلوک ومعرفت میں یگانۂ روزگار سمجھے جاتے ہیں اور طالبانِ علم ان سے علومِ ظاہری کے ساتھ ساتھ باطنی فیضان بھی حاصل کرتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے اس عظیم منصب پر سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہٗ فائز ہوئے انہوں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مملوک علی صاحب اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلویؒ سے تحصیل علوم کی تھی، حضرت مولانا مملوک علی صاحب استاذ المشائخ ہیں، دہلی کے عربی کالج میں پرنسپل تھے، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور دیگر اکابرین دیوبند کے استاذ، مفتی صدر الدین صاحب اور شاہ عبدالغنی صاحب کے معاصرین میں سے تھے، عربی فارسی اور اردو کے بہترین ادیب وشاعر تھے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا سلسلۂ نسب اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا نسب ایک ہی ہے، دونوں حضرات آپس میں ہم زلف بھی ہیں اور ہم عمر بھی، دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا قدس سرہٗ کے فیض تعلیم وتربیت نے بہت سے ممتاز علماء پیدا کئے جو آسمانِ علم وفضل کے آفتاب وماہتاب بن کر چمکے، جن میں مولانا عبداللہ انبیٹھوی، مولانا فتح محمد سہارنپوری، مولانا احمد حسن امروہی، مولانا فخر الحسن گنگوہی، مولانا حکیم منصور علی خان مرادآبادی، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا حافظ محمد احمد قاسمی اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمہم اللہ جیسے مشاہیر اور یگانۂ عصر علماء شامل ہیں۔ حضرت مولانا اور ان کے تلامذہ کے فیض تعلیم کو دیکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اس وقت ہندوپاک، بنگلہ دیش، افغانستان اور وسطِ ایشیاء میں جس قدر علماء موجود ہیں ان کی بڑی تعداد اسی خوانِ علم کی زلہ ربا ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب علاوہ ہر فن میں ماہر ہونے کے بہت بڑے صاحبِ نسبت اور شیخ کامل بھی تھے، انہوں نے شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی سے سلوک ومعرفت کے مقامات طے کئے تھے، اکثر جذب وکیفیت کی حالت طاری رہتی تھی، دنیوی علائق کی جانب مطلق توجہ نہ تھی، اپنے زمانہ میں مجذوب وسالک مشہور تھے۔

ہمارے شیخ ومربی حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی اپنے استاذ ومربی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ کے اکثر اقوال واحوال، حقائق ومعارف نہایت لطف لے کر بیان فرمایا کرتے تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ حلقۂ درس کیا ہوتا تھا حلقۂ توجہ ہوتا تھا، یہ حال تھا کہ تفسیر کا

سبق ہورہا ہے، آیات کا مطلب بیان فرمارہے ہیں اور آنکھوں سے زاروقطار آنسو جاری ہیں۔

حضرت فرماتے تھے کہ باوجودیکہ مزاج میں جلال اور جذب کا غلبہ تھا اور اس کے رعب واثر کا یہ عالم تھا کہ لوگ بات کرتے ہوئے گھبراتے تھے مگر آپ ہر شخص سے نہایت اخلاق وتواضع کے ساتھ پیش آتے تھے، اپنے بزرگوں کی طرح مزاج میں بڑا استغناء تھا جس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک صاحب نے جن کو مولانا کے مزاج میں بڑا دخل تھا، عرض کیا کہ فلاں نواب صاحب کی بڑی خواہش ہے کہ ایک مرتبہ آپ ان کے یہاں تشریف لے جائیں، مولانا نے فرمایا:

> ہم نے سنا ہے کہ جو مولوی نواب کے یہاں جاتا ہے نواب صاحب ان کو سو روپے دیتے ہیں، ہمیں وہ خود بلارہے ہیں اسلئے شاید دوسو روپے دے دیں، ارے میاں سو دوسو روپے ہمارے گے دن کے، ہم وہاں جاکر مولویت کے نام پر دھبہّ نہ لگائیں گے۔

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب جامع علومِ معقول ومنقول، فاضل عالم ہونے کے علاوہ سالک ومجذوب بھی تھے، نہایت خوش وضع، خوش خلق اور خوش گفتار تھے، بڑے صاحبِ کمال ومکاشفات تھے، جس زمانہ میں ملکہ کی تاجپوشی کا جلسہ ہوا مولانا دہلی میں مقیم تھے اور دن میں اکثر غائب رہتے تھے، جب کسی نے دریافت کیا تو فرمایا کہ:

> مجھے حکم ہوا ہے کہ نواحِ دہلی میں جس جگہ تمہارا قدم جائیگا وہ جگہ آباد کردی جائے گی اسلئے میں شہر کے اطراف میں گشت کیا کرتا ہوں تاکہ ویران شدہ مقامات پھر سے آباد ہوجائیں۔

چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ جن جن مقامات پر حضرت مولانا پھرتے تھے وہ جگہ نئی دہلی کے نام سے آباد ہوئی۔ ایک مرتبہ چھتہ مسجد میں یہ ذکر چھڑا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں ایسا زبردست تسلط حاصل کرلیا ہے کہ ان کا اکھڑنا آسان نہیں رہا، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اس مجلس میں موجود تھے، چونک کر بولے کیا کہا؟

> رات کو اُن کی حکومت ہوگی اور دن کو اِن کی۔ ہندوستان بغیر جنگ کے صف کی طرح پلٹ جائے گا۔
>
> کون کہہ سکتا ہے کہ ۱۴، ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی شب میں ایسا ہی نہیں ہوا۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ نے اپنی حیات میں دو حج کئے۔ پہلا حج حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ کی معیت میں کیا گیا، حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور

حضرت حاجی محمد عابد دیوبندی بھی ساتھ تھے، دوسری مرتبہ بھی علماء کی ایک بڑی جماعت کی معیت رہی ۔حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی، حضرت مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا حکیم ضیاء الدین رامپوری اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی وغیرہ حضرات کے علاوہ اس مقدس قافلے میں تقریباً سو (۱۰۰) افراد تھے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی شعروشاعری سے بھی ذوق رکھتے تھے، مولانا کا کلام اردو فارسی میں بیاضِ یعقوبی میں درج ہے۔اشعار میں قدرتِ کلام کے ساتھ سوز وگداز اور درد واثر پایا جاتا ہے۔تصانیف میں کئی رسالے ان کی یادگار ہیں۔سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی اگرچہ بہت مختصر سوانح حیات ہے مگر زبان وبیان اور حالات وواقعات کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے، اسی طرح سے مکتوباتِ یعقوبی جو مولانا کے خطوط ہیں اور طریقت وسلوک کے بارے میں بہترین دستور العمل ہیں۔ بیاضِ یعقوبی، سفرحج کے حالات، کتبِ احادیث کی اسانید، منظومات اور عملیات پر مشتمل ہے۔

الغرض حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ دارالعلوم کے سب سے پہلے شیخ الحدیث تھے، اس وقت یہ منصب صدر مدرس کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔آپ ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم میں تشریف لائے اور تقریباً اٹھارہ سال دارالعلوم دیوبند میں اسی منصبِ جلیلہ پر فائز رہے۔دارالعلوم کی عظمت وشہرت میں حضرت مولانا قدس سرہٗ کے علم وفضل کا بڑا حصہ ہے۔وفات سے کچھ روز قبل اپنے وطن نانوتہ تشریف لے گئے تھے اور ۳ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ کو بمرض فالج داعیٔ اجل کو لبیک کہا اناللّٰہ واناالیہ راجعون۔حق تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔آمین

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

دارالعلوم دیوبند کی داغ بیل ان علمائے ربانیین نے ڈالی تھی جو سراپا خلوص وللّٰہیت تھے، ان کا دل ودماغ ملتِ اسلامیہ کے شاندار مستقبل کے لئے بے چین تھا۔انہوں نے اپنے کو اشاعتِ دین اور ترویج علومِ دینیہ کے لئے وقف کردیا تھا۔رب العالمین نے دارالعلوم اور اس کی خدمت کو

مقبولیت عطا فرمائی اور اس نے ملک اور بیرونِ ملک کی دینی، علمی، اخلاقی اور اصلاحی جو خدماتِ عظیمہ انجام دی ہیں وہ کبھی بھلائی نہیں جاسکتی ہیں، یہاں سے ہزاروں علماء اور صوفیاء پیدا ہوئے جن میں بہترین محدثین، فقہاء، مصنّفین اور مبلغین کا جم غفیر بھی ہے اور رشد وہدایت اور تزکیۂ باطن کرنے والوں کی ایک لمبی جماعت بھی ہے، بلکہ ان میں وہ لوگ بھی بڑی تعداد میں ہیں جنھوں نے ملک کی آزادی اور یہاں کے باشندوں کی اصلاح کے لئے بے مثال قربانیاں پیش کی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بعد حضرت سید احمد شہید، حضرت شاہ اسماعیل شہید، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہم اللہ نے اسلامی روح کی حفاظت کی اور اسلامی تحریک کو آگے بڑھانے کی کامیاب کوشش فرمائی۔ حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی نے اعتقادی اور معاشرتی اصلاح کی زبردست جدوجہد کی، انہوں نے اسلامی مسائل کو عقلی دلائل سے مستحکم کیا، تباہ کن رسم ورواج کی مخالفت کی، ان اکابر نے اسلامی عقائد، سماجی رسوم، دینی تعلیم وتربیت اور سیاسی جدوجہد کے گوناگوں مقاصد بروئے کار لانے کے لئے دینی مدارس کے قیام کو ضروری قرار دیا، اس سلسلے میں سب سے پہلے دارالعلوم دیو بند منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا، اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم کی تحریک کو شرفِ قبول عطا فرمایا ملک کے طول وعرض میں ہر طرف سے لوگوں نے اسکی آواز پر لبیک کہا، اوہام ورسوم اور شرک وبدعت کے جو گھرے بادل ہندوستان کی فضاؤں میں چھائے ہوئے تھے رفتہ رفتہ چھٹنے شروع ہوگئے اور ان کی جگہ کتاب وسنت کے احکام پر عمل کیا جانے لگا۔

دارالعلوم کا قیام جن مقاصد کے لئے عمل میں لایا گیا ان میں قرآن مجید، تفسیر، حدیث، عقائد وکلام اور ان علوم کے متعلقہ ضروری اور مفید فنونِ عالیہ کی تعلیم دینا اور مسلمانوں کو مکمل طور پر اسلامی معلومات بہم پہنچانا، رشد وہدایت اور تبلیغ کے ذریعے اسلام کی خدمت انجام دینا اور اعمال واخلاق کی اصلاح وتربیت کرنا شامل ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانئ دارالعلوم کے وصال کے بعد دارالعلوم کے سرپرست ثانی قطب الارشاد حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ' نے قاسمی طرزِ فکر کے ساتھ دارالعلوم کی تعلیمات میں فقہی رنگ بھرا جس سے اصول پسندی کے ساتھ فروعِ فقہیّہ اور جزئیاتی تربیت کا توام بھی پیدا ہوا اور اس طرح فقہ اور فقہاء کے سرمایہ کا بھی اس میراث میں اضافہ

ہوگیا۔ حضرت مولانا گنگوہی کو علم حدیث، فقہ اور تصوف سے بہت زیادہ شغف رہا، ہزار ہا انسانوں نے حضرت سے استفادہ کیا، حضرت نے علماء وفقہاء کی تربیت فرمائی اور انہیں دین کے بارے میں اتنا راسخ اور مستحکم بنا دیا کہ ان افراد پر کوئی بھی فتنہ اثر انداز نہ ہوسکا۔

حضرت اپنے وقت کے امامِ ملت، قطبِ عالم، نمونہ علم وعمل، رشد وہدایت کا مرکز، عظیم مصلح، مربیٔ اخلاق اور قومی وملکی امور میں مسلمہ قائد تسلیم کیے گئے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے دوش بدوش قائدانہ حصہ لیا تھا اور نو ماہ تک اسیر فرنگ رہے تھے، جن لوگوں نے ان سیاسی اور جہادی خدمات پر پردہ ڈالنا چاہا ہے خواہ اپنی لاعلمی اور بے خبری کی بناء پر یا اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے ان کی مصلحت اندیشی لا یعبأ بہ اور باخبر لوگوں کے نزدیک لغو ہے۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی لکھتے ہیں کہ:

”۱۸۵۷ء میں خانقاہ قدوسی سے مردانہ وار نکل کر انگریزوں کے خلاف صف آراء ہوگئے اور اپنے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور دوسرے رفقاء کے ساتھ شاملی کے معرکۂ جہاد میں شامل ہوکر خوب دادِ شجاعت دی۔ جب میدانِ جنگ میں حضرت حافظ ضامن شہید ہوکر گرے تو آپ ان کی نعش اٹھا کر قریب کی مسجد میں لے گئے اور پاس بیٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت شروع کردی، معرکۂ شاملی کے بعد گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا اور ان کو گرفتار کرکے سہارنپور کی جیل میں بھیج دیا گیا پھر وہاں سے مظفر نگر منتقل کردیا گیا، چھ ماہ جیل میں گزارے، وہاں بہت سے قیدی آپ کے معتقد ہوگئے اور جیل خانہ میں جماعت کے ساتھ نماز ہونے لگی۔

رہائی کے بعد گنگوہ میں آپ نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع فرمایا، ۱۲۹۹ھ میں تیسرے حج کے بعد آپ نے یہ التزام کیا کہ ایک سال کے اندر اندر پوری صحاحِ ستہ ختم کردیتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ صبح سے بارہ بجے تک طلباء کو پڑھاتے تھے، آپ کے درس کی شہرت سن سن کر طلبائے حدیث دور دور سے آتے تھے، کبھی کبھی ان کی تعداد ستر اسّی تک پہنچ جاتی تھی جن میں ہند وبیرونِ ہند کے طلباء شامل ہوتے تھے۔ طلباء کے ساتھ نہایت محبت وشفقت سے پیش آتے تھے، درس کی تقریر ایسی ہوتی تھی کہ ایک عامی بھی سمجھ لیتا تھا۔

آپ کے درسِ حدیث میں ایک خاص خوبی یہ بھی تھی کہ حدیث کے معمول کو سن کر اس پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا تھا، جامع ترمذی کی درسی تقریر الکوکب الدری شائع ہو چکی ہے جو مختصر ہونے کے باوجود ترمذی کی نہایت جامع شرح ہے۔ ۱۳۱۳ھ تک آپ کا درس جاری رہا، تین سو سے زائد حضرات نے آپ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی، درسِ حدیث میں آپ کے آخری شاگرد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے والد ماجد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی تھے، آخر میں نزول الماء کی وجہ سے درس بند ہو گیا تھا مگر ارشاد و تلقین اور فتویٰ کا سلسلہ برابر جاری رہا، ذکر اللہ کی تحریص وترغیب پر بڑی توجہ تھی، جو لوگ خدمت میں حاضر ہوتے رغبتِ آخرت کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لے کر جاتے تھے، اتباعِ سنت کا نہایت احترام فرماتے تھے۔

۱۲۹۷ھ میں حضرت نانوتوی کی وفات کے بعد دارالعلوم دیوبند کے سرپرست ہوئے، مشکل حالات میں دارالعلوم کی گتھیوں کو سلجھا دینا ان کی بڑی خصوصیت تھی۔ ۱۳۱۴ھ میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کی سرپرستی بھی قبول فرمالی تھی، فقہ وتصوف میں تقریباً چودہ کتابیں تصنیف فرمائیں۔

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ کی خدمت میں رہ کر بیعت کا شرف حاصل کیا اس سلسلہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے سوانح عمری مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی میں لکھا ہے کہ:

> جناب مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولوی محمد قاسم صاحب سے اسی زمانے سے ہم سبقی اور دوستی رہی ہے، آخر میں حدیث جناب شاہ عبدالغنی صاحب کی خدمت میں پڑھی اور اسی زمانے میں دونوں صاحبوں نے جناب قبلہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہٗ سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا۔

چنانچہ انہوں نے بڑی تیز رفتاری سے سلوک کی منزلیں طے کرلیں اور صرف چالیس دن کی قلیل مدت میں خلافت سے سرفراز ہوگئے اور گنگوہ واپس آکر حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے حجرے کو اپنی قیام گاہ بنایا، اس دوران میں مطب ذریعۂ معاش رہا، ہزاروں افراد کی اصلاح فرمائی اور بڑے بڑے نامور علماء ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔ اس طرح سے ان کے تلامذہ اور خلفاء کا ایک وسیع حلقہ بن گیا جن میں سے کئی حضرات تو رشد وہدایت کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور پھر ساری عمر اصلاح وتربیتِ مخلوقِ خدا میں مصروف رہے۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ' حضرت گنگوہی قدس سرہ' کے بارے میں فرماتے تھے کہ:

قطب عالم حضرت مولانا گنگوہی علم وفضل میں یگانۂ روزگار ہونے کے ساتھ زہد وتقویٰ اور سادگی وتواضع اور فنائیت میں بھی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ایک مرتبہ حضرت گنگوہی حدیث کا سبق پڑھارہے تھے کہ بارش آگئی،سب طلباء کتابیں لے کراندر کو بھاگے مگر مولانا گنگوہی سب طلباء کی جوتیاں جمع کررہے تھے کہ اٹھا کر چلیں،لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو کٹ کررہ گئے۔

حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ حضرت گنگوہی کی صحبت میں یہ اثر تھا کہ کیسی ہی پریشانی یا وساوس کی کثرت کیوں نہ ہو جونہی آپ کی صحبت میں بیٹھے قلب میں ایک خاص قسم کا سکون اور جمعیت حاصل ہوئی ،جس سے سب کدورتیں رفع ہوگئیں اور آپ کے کل مریدوں میں عقائد کی اصلاح ،دین کی پختگی،خصوصاً حب فی اللہ وبغض فی اللہ بدرجہ کمال مشاہدہ کیا جاتا ہے،یہ سب برکت حضرت گنگوہی کی صحبت کی ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ' نے حضرت گنگوہی کے فقہ کے مقامِ بلند کی بناء پر ان کو ابوحنیفۂ عصر کا لقب دیا تھا اور وہ اپنے عہد میں اسی لقب سے معروف تھے۔اسی طرح استاذ المکرّم امام العصر علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ' جیسے بلند پایہ عالم ومحقق جو علامہ شامی کو فقیہ النفس کا مرتبہ دینے کے لئے تیار نہ تھے حضرت گنگوہی کو فقیہ النفس فرمایا کرتے تھے۔ بہر حال حضرت کے مقام ومرتبہ اور علم وفضل کا کیا ٹھکانا؟

حضرت نے ۸-۹ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ بروز جمعہ اذان کے بعد ۷۸ سال کی عمر میں رحلت فرمائی،حضرت نانوتوی کی وفات کے بعد دارالعلوم دیوبند میں یہ سب سے بڑا حادثہ تھا،حق تعالیٰ حضرت کے درجات بلند فرمائیں۔

حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

جن قدسی صفات بزرگوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی ان میں ایک مبارک نام حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدس سرہ' کا بھی ہے،آپ ابتداء ہی سے تاسیس مدرسہ میں حضرت مولانا

محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کے دست و بازو رہے ہیں اور بناءِ مدرسہ کے بعد بھی اس کی ذمہ دار مجلس کے رکن رکین کی حیثیت سے دارالعلوم کے تمام امور میں عملاً شریک ومعاون رہے ہیں۔ آپ نے بھی دہلی کالج میں حضرت مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی قدس سرہٗ سے تعلیم پائی تھی، اردو فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے، متعدد نظمیں قصیدے اور مرثیے وغیرہ ان کے ذوقِ شاعری کے آئینہ دار ہیں۔ دیوبند میں ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۳ء) میں ایک زبردست پلیگ پھیلا تھا اس پلیگ کی تباہ کاریوں کو انہوں نے فارسی زبان میں نظم کیا ہے، اس نظم کا تاریخی نام ''قصہ غم دیوبند ۱۳۰۱ھ'' ہے۔ دیوبند کے حالات میں یہ تاریخی دستاویز ہے۔

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کو مادۂ تاریخ کے نکالنے میں بھی بڑا کمال حاصل تھا، دارالعلوم کی روئیدادوں میں ان کی بہت سی نظمیں اور تاریخی قطعات درج ہیں، محکمہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز تھے۔ بریلی، بجنور اور سہارنپور وغیرہ اضلاع میں تعینات رہے۔ ۱۸۵۷ء میں بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے اس ہنگامے میں جب مولانا محمد احسن نانوتوی کو بریلی چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا تو اپنے بعض معاملات انہیں کے سپرد کئے تھے۔

حضرت الاستاذ مولانا سید اصغر حسین صاحب قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ خاقانیٔ ہند حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ نے دہلی کالج میں حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے سامنے زانوئے تلمیذ طے کیا، جہاں سے ملک کے مشاہیر آسمانِ علم پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکے، وہ دارالعلوم دیوبند کے قدیم رکن اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ کے معاون تھے۔ فارسی ادب میں خصوصیت سے مہارت رکھتے تھے اور ایک زبردست شاعر تھے، انہوں نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانیٔ دارالعلوم کے بارے میں ایک دلگداز طویل مرثیہ نظم فرمایا تھا، ان کی خاندانی شرافت اور علمی لیاقت کے باعث حکومتِ ہند نے انہیں ڈپٹی مدارس کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کیا تھا۔ انہوں نے ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۲۵ھ تک بیالیس سال دارالعلوم دیوبند کی مخلصانہ بے لوث خدمات انجام دیں اور عمر کے آخری لمحوں تک دارالعلوم کے بانی حضرت نانوتوی کی تحریک میں مصروف رہے، دارالعلوم کے صدقہ جاریہ کے سلسلے میں جن حضرات اکابر کو اجر وثواب سے نوازا جائے گا ان میں

حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی بھی ہوں گے۔ انشاء اللہ

بہر حال حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں شمار کئے جاتے ہیں اور ہمارے اسلافِ کرام میں سے ہیں، انہوں نے ۳؍جمادی الاول ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۵جون ۱۹۰۷ءکو بروز ہفتہ بوقت ظہر انتقال فرمایا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون. انہوں نے اپنے بعد اپنے فرزندوں میں سے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند وشیخ الاسلام پاکستان جیسے مشاہیر اور یگانۂ روزگار علماء چھوڑے۔ ندوۃ المصنّفین دہلی کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی بھی انہی کے پوتے ہیں، حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے اخلافِ رشید نے عظیم دینی وعلمی خدمات انجام دی ہیں جن کا سلسلہ بحمد اللہ اب تک جاری وساری ہے۔

حضرت مولانا سید احمد حسن امروہی رحمۃ اللہ علیہ

آپ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے اور جلیل القدر محدث تھے، آپ جامع مسجد امروہہ کے مدرسہ میں جسے حضرت نانوتوی نے قائم فرمایا تھا ایک طویل عرصہ تک بحیثیت صدر المدرسین فائز رہے اور آخر عمر تک درسِ حدیث میں منہمک رہے۔ آپ علومِ قاسمیہ کے امین تھے اور ان کی ترویج میں عمر بھر نمایاں حصہ لیتے رہے، اپنی مخصوص صلاحیتوں کے لحاظ سے آپ علومِ قاسمیہ کی مجسم تصویر اور بالفاظِ دیگر حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے مثیل شمار کئے جاتے تھے۔ آپ کا فیضانِ علمی دور دور تک پہنچا اور سینکڑوں طالب علم آپ کے درس سے عالم وفاضل بن کر نکلے، عالم بے مثل حضرت مولانا عبد الرحمٰن خان صاحب خورجوی، مفسر شہیر حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن امروہوی اور اس قسم کے دوسرے اور بھی بہت سے ماہرین علم وفضل آپ کے تلامیذ ہیں جن سے علم دین پھیلا اور ایمان وعرفان کا رنگ دلوں میں جما۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ اپنے اس جلیل القدر تلمیذ سے بے حد شفقت فرماتے تھے بلکہ آپ کا اس قدر احترام فرماتے کہ ہمیشہ میر صاحب کہہ کر پکارتے تھے، حضرت

نانوتوی قدس سرہ' کو آپ سے اتنا تعلق تھا کہ کئی مرتبہ اپنے اس عزیز شاگرد کی وجہ سے امروہہ بھی تشریف لے گئے تھے، آپ نے مدرسہ امروہہ کے علاوہ اپنے استاذِ محترم کے دارالعلوم دیوبند میں بھی درس دیا ہے، آپ کا درس نہایت جامع، شستہ اور پر مغز ہوتا تھا اور تقریر وتحریر میں اپنے استاذِ مکرم کا مکمل نمونہ دکھائی دیتے تھے۔ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہ' فرماتے ہیں کہ:

حضرت محدث امروہی کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے تمام علوم وکمالات کا آئینہ دار اور نمونہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

حضرت قاسم العلوم والمعارف مولانا نانوتوی ارشاد فرماتے تھے کہ ان کا ذہن چاندی ہے اور میرا ذہن سونا ہے اور مزاج کے اعتبار سے وہ مجھ سے زیادہ قریب ہیں۔

اس ارشاد کے بعد حضرت محدث امروہی کے فضل وکمال کیلئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

آپ نے حضرت نانوتوی کے ہمراہ متعدد مناظروں میں بھی شرکت فرمائی تھی اور مناظرہ میں بھی اپنے استاذِ محترم کی طرح ید طولیٰ رکھتے تھے اور قاسمی رنگ غالب رہتا تھا۔

ضلع بجنور میں آریوں کے ساتھ مناظرہ ہوا جس میں حضرت مولانا احمد حسن صاحب محدث امروہوی اور حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری نے جو تقریر فرمائی تھی ''افاداتِ احمدیہ'' میں یہ تقریر دعوتِ اسلام کے عنوان سے شائع ہوئی ہے، اس میں توحید ورسالت، مقصودِ زندگی، سیرتِ رسول اور سیرتِ صحابہ رضی اللہ عنہم پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس تقریر میں بھی حضرت نانوتوی کا مناظرانہ رنگ جھلک رہا ہے، تقریر کا ایسا اثر تھا کہ مجمع میں بعض نو مسلموں نے تقریر سن کر کہا کہ اگر کسی تقریر پر ایمان لے آنا چاہئے تو یہ تقریر ایسی ہی تھی۔

الغرض آپ نے شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ' سے بیعت وخلافت حاصل کی تھی اور سلوک وتصوف میں بھی اعلیٰ مقام حاصل تھا، ایک مرتبہ آپ نے اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ' کی خدمت میں اپنا سلام اور حاضر نہ ہونے کی معذوری کہلا کر بھیجی تو حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ:

ہماری یہ ٹوپی ان کو دے دینا اور یہ کہنا کہ جو کام تم امروہہ میں رہ کر انجام دے رہے ہو وہ یہاں کی حاضری سے بہتر ہے۔

الغرض آپ نے ساری زندگی درس وتدریس اور تبلیغ واصلاح میں گزاری اور بالآخر ۲۸، ۲۹ر ربیع الاول ۱۳۳۰ھ کی درمیانی شب میں بمرض طاعون آپ کا انتقال ہوا۔ والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب نے نمازِ جنازہ پڑھائی، جامع مسجد امروہہ کے صحن کے جنوبی گوشے میں دفن کیا گیا، انتقال سے کچھ دیر پہلے لیٹے لیٹے وعظ فرمایا، جب روح نے قفسِ عنصری سے پرواز کی تو یہ کلمات زبان پر جاری تھے۔ **سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم.**

حضرت مولانا امروہی نے جو مدرسہ جامع مسجد امروہہ میں قائم فرمایا تھا وہ اب تک جاری ہے اور آپ کا صدقہ جاریہ ہے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس سرہ العزیز

صدارتِ تدریس دارالعلوم کا اہم ترین اور ذمہ دارانہ عہدہ شمار کیا گیا ہے، جس پر وہ ہستی فائز تھی جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس سرہٗ کے نام نامی واسم گرامی سے معروف ہے۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

آفتاب کو ممکن ہے کہ کچھ لوگ نہ پہچانتے ہوں لیکن علمی دائرہ کا کون فرد ہوگا جو اس یگانۂ روزگار ہستی اور اسکے فیوض و برکات سے واقف نہ ہو، علمی میدان میں عارف باللہ، عملی میدان میں مجاہدِ اعظم، اخلاقی میدان میں فنافی اللہ، سیاسی میدان میں زعیم مخلص، عقلی میدان میں فرزانۂ فرید، شعروادب کے میدان میں ادیب بے مثال، طریقت کے میدان میں شیخ کامل، دارالعلوم کو اگر آسمان فرض کیا جائے تو آسمان کا سورج، اپنے وقت میں شیخ الہند کی ذات بابرکات تھی، جس سے شیخ الہند کے انفاسِ طیبہ عیاں ہیں۔

اسیر مالٹا نامی کتاب الگ چھپ چکی ہے، شیخ الہند کے صبر وجہاد، بغض فی اللہ اور حب فی اللہ کی داستانِ حیات نمایاں ہے۔ تلامذہ کی تعداد ہزاروں کی الگ ہے جو اُن کے علم وفضل کا اشتہار رہے، متوسلین ہزاروں کی تعداد میں الگ ہیں جو اُن کی شانِ تربیت کا اعلان ہیں، خود ان کی تصانیف الگ

ہیں جوان کے مدرک فکر کو نمایاں کر رہی ہیں، ملک و سیاست کی کھلی بساط پر ان کے مجاہدانہ کارنامے، قید و بند اور تحملِ شدائد و مصائب کی داستانیں الگ ہیں جوان کے جوشِ عمل کا کھلا تعارف ہیں، اس لئے وہ کونسا دائرۂ علم و عمل رہ جاتا ہے جسے اچھوتا سمجھ کر سپردِ قلم کیا جائے، بجز اس کے کہ ان کا نام نامی لے دیا جانا ہی سارے کمالات کا تذکرہ ہو جاتا ہے۔ سورج کا نام لے دینا ہی روشنی و گرمی کا تذکرہ ہے، نام لے کر اس کی روشنی و گرمی کا تعارف کرانا اس پر اور اس کے کاموں پر گویا خفاء و تستّر کا عیب لگانا ہے، جس سے وہ بری ہے۔ آفتاب کے کاموں کی دلیل محض اس کا نام لے دیا جانا ہے۔

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

حضرت ممدوح کی ہمتِ ظاہری و باطنی سے علم و اخلاق کے کتنے پیکر تیار ہوئے اور عالمِ اسلامی میں ان کے آثارِ صالح کس حد تک پھیلے، نیز آپ کی ذات سے دارالعلوم اور جماعتِ دارالعلوم کے علمی و اخلاقی مسلک کا کس حد تک شیوع و فروغ ہوا، نہ اس کے لئے یہ سطریں کفایت کر سکتی ہیں اور نہ یہ اس تحریر کا موضوع ہی ہے، مقصد صرف تذکار و یادگار اور اس حیلہ سے نام نامی اور اسم گرامی کا زبان و قلم پر لے آنا ہے۔

آپ نے دارالعلوم میں ۱۲۹۰ھ میں تعلیم سے فراغت حاصل کی اور اپنے استاذ حضرت نانوتوی کی حیات ہی میں ۱۲۹۱ھ میں دارالعلوم کے مدرس چہارم مقرر ہوئے۔ ۱۲۹۷ھ میں جبکہ حضرت نانوتوی کی وفات ہوئی فرطِ غم سے درس و تدریس کا سلسلہ ترک فرما دیا اور فرمایا کہ اب پڑھنے پڑھانے کا لطف نہیں، گھاس کھود کر زندگی بسر کر لیں گے اور یادِ استاد میں عمر گزار دیں گے، لیکن حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی شیخ التفسیر، حضرت علامہ مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا محمد میاں منصور انصاری مہاجر کابل، حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کے کہنے اور دوسرے اکابر کے سمجھانے پر راضی ہوئے اور پھر سلسلۂ تعلیم جاری فرمایا۔ ۱۳۰۸ھ میں آپ عہدۂ صدارتِ تدریس پر لئے گئے اور آپ کو حضرت گنگوہی نے اس مقدس عہدہ کے لئے چنا اور آپ کے فیوض سے علمی حلقے مستفید ہونے شروع ہوئے۔ آپ کی ظاہری و باطنی برکات سے دارالعلوم دیوبند کا احاطہ چالیس برس تک جگمگاتا رہا اور اس عرصہ میں ہزار ہا علماء اس شیخ کامل کے حلقۂ درس سے آفتاب و ماہتاب بن کر نکلے۔

اگر یہ مثل صحیح ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور بلاشبہ صحیح ہے تو یگانۂ دہر علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ، علامہ مفتی کفایت اللہ صدر جمعیۃ علمائے ہند، حضرت اقدس مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ' صدر المدرسین دار العلوم دیوبند، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی شیخ التفسیر، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا محمد میاں منصور انصاری مہاجر کابل، حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی زید فضلہ صدر المدرسین دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند زید مجدہ' جیسے سینکڑوں فضلاء واتقیاء کو سامنے لے آنا شیخ الہند کو سامنے کر لینا ہے، یعنی ان بزرگوں کے علمی وعملی کارنامے شیخ الہند کے تعارف کی حدِ تام ہیں، جس کے ایک ایک مقدمہ کے آئینے میں شیخ الہند کی تصویر نظر آتی ہے۔

شیخ الہند کے ان تلامذہ میں حقیقت یہ ہے ایک فرد امت کے برابر امۃ قانتۃ ثابت ہوا ہے بلاشبہ ان علمی ستاروں کی چمک دمک میں شیخ الہند کا علمی وعملی نور روشن نظر آتا ہے اس لئے ان علمی، عملی، اخلاقی، حسی اور اعیانی شہادتوں کے ہوتے ہوئے کونسا واقعہ رہ جاتا ہے کہ ان چند سطور میں کچھ لکھ کر ان مشاہد چیزوں کی اہمیت گھٹائی جائے یا ان معیاری داستانوں کو ان میں کھپا دیا جائے۔

مالٹا سے تشریف آوری کے بعد میرے والد نے حضرت سے فرمایا کہ حضرت ان دونوں بچوں (محمد طیب اور محمد طاہر) کو بیعت فرمالیجئے۔ فرمایا بھائی حافظ جی میں تو ان سے بیعتِ جہاد لونگا، والد صاحب نے فرمایا آپ میری طرف سے ان کے سر کٹوا دیجئے اس میں مجھ سے کیا پوچھنا ہے، آپ جانیں اور آپ کی اولاد جانے۔ اور پھر فرمایا کہ لوگ مجھے کہتے ہیں کہ یہ بڑا ہوشیار ہے دو بزرگوں (حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی) کے دو ہی صاحبزادے ہیں (مولانا مسعود احمد گنگوہی اور حافظ احمد صاحب) اس نے دونوں پر پہلے ہی سے قبضہ جما رکھا ہے، اب اگر ان بچوں کو بھی بیعت کر لیا تو کہیں گے کہ دیکھو اس نے آگے کو بھی قبضہ رکھنے کو داغ بیل ڈال دی ہے۔

بہر حال اس قسم کی مزاحی باتیں جانبین سے ہوتی رہیں، یہ مجلس ختم ہوگئی، دو دن کے بعد اچانک خود ہی دار العلوم میں تشریف لاکر مجھے اور طاہر مرحوم کو بلایا، ہمارے ذہن میں بھی نہیں رہا تھا کہ ہمیں بیعت بھی ہونا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت کیوں یاد فرمایا ہے؟ فرمایا مرید بھی کرنا ہے،

اس وقت ندامت سی ہوئی کہ اس کے لئے ہمیں خود حاضر ہونا تھا لیکن یہاں قصہ برعکس ہو رہا ہے۔

بہر حال یہ اپنے چھوٹوں پر شفقت اور مہربانہ تربیت کا بے مثال نمونہ تھا جو اس ذاتِ ستودہ صفات میں حق تعالیٰ نے ودیعت فرمایا تھا اور نیک نصیب افراد کو اس سے برسہا برس استفادہ کا موقع ملتا رہا۔ رحمه الله رحمة واسعة.

اس سے اندازہ کیجئے کہ جس مقدس ادارہ کے ذمہ دار ایسے مقدس اور برگزیدہ افراد ہوں، ان کے علمی اور عملی نظام کی خوبیوں کا کیا پوچھنا، اور جس ادارے کے مربی ومعلم اس انداز کے ہوں اس کے فیض یافتہ اور مستفیدوں کے درجات کا کیا کہنا۔

اولٰئك اباءی فجئنی بمثلهم اذا جمعتنا یا جریر المجامع

یہ ہمارے اسلاف ہیں تو بھی انکے مثل لا، اے جریر جب تو کسی مجمع میں ہمارے مقابلہ میں آئے۔

اس رفعتِ شان پر بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ گویا نفس کا کوئی تقاضا باقی ہی نہیں رہا تھا، یا اس کے پورا ہونے کی کوئی صورت نہیں رہ گئی تھی، یا اسے پامال کرنے کی فکر ہر وقت دامن گیر رہتی تھی۔ اس زمانہ میں اکثر مساجد میں کسیر بچھادی جاتی تھی جو نرم بھی ہوتی تھی اور گرم بھی، یہ گھاس تالابوں میں پیدا ہوتی ہے، جب سوکھ جاتی ہے تو لوگ اسے بچھانے کے لئے لے آتے تھے، اسے دیہات کا قالین یا نرم گدہ سمجھنا چاہئے۔ حضرت شیخ الہند کی مسجد میں بھی سردیوں میں برابر اس کا فرش ہوتا تھا، موسم سرما آنے پر ایک دن خود ہی طلبہ سے فرمایا کہ آؤ بھئی مسجد کے لئے کسیر لے آویں، چار طلبہ کے ساتھ ہو لئے، انہیں حضرت اپنے باغ میں لے گئے، وسطِ باغ میں تالاب بھی تھا اور اس پر کسیر بکثرت پیدا ہوتی تھی، چنانچہ کسیر کاٹی گئی، خود حضرت بھی درانتی سے کاٹنے میں شریک رہے، کاٹ کر جمع شدہ ذخیرہ کے پانچ گٹھر بنائے، طلبہ نے عرض کیا کہ حضرت پانچ گٹھریاں کیوں بنائی گئی ہیں ہم تو چار ہیں، فرمایا اور میرا حصہ کہاں گیا؟ یہ کہہ کر چار بڑی بڑی گٹھریاں تو طلبہ کے سروں پر رکھوائیں اور ایک اپنے سر پر رکھی، ہر چند طلباء بضد ہوئے کہ حضرت اس ذخیرہ کی چار گٹھریاں کردی جائیں ہم کافی ہیں، کچھ زیادہ بوجھ نہیں، مگر حضرت نے نہ مانا، چار گٹھریاں طلبہ کے سروں پر اور ایک اپنے سر پر رکھ کر یہ قافلہ چلا۔ شہر میں آیا اور بازار کے ایک حصہ میں سے گذرا، ان طلبہ کو تو ممکن ہے کہ سر پر گھاس

رکھ کر بازار میں سے گذرنے پر کچھ عار آرہا ہو لیکن حضرت کی بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ گویا اپنے کو اس بوجھ اٹھانے کا اہل اور مستحق سمجھ کر شہر سے گذر رہے تھے، دیہات والے بھی اب جسے پسند نہیں کرتے موصوف کے یہاں وہ بوجھ ایک معمولی بات تھی۔

میرے خسر مولوی محمود صاحب رام پوری فرماتے تھے کہ وہ دیوبند میں طالب علمی کے زمانہ میں چھوٹی مسجد میں رہا کرتے تھے، جس میں حضرت مفتیٔ اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کا قیام تھا، اس زمانہ میں طلبہ میں چارپائی کا دستور نہ تھا، سادگی اور تواضع سے عموماً طلبہ زمین پر لیٹتے تھے۔ مولوی صاحب باوجود رئیس گھرانہ کا ایک فرد ہونے کے عام طلبہ کی طرح فرشِ زمین پر ہی اپنے حجرہ میں لیٹا کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند کا موصوف سے اور رام پور کے اس گھرانے سے بہت گہرا اور مخلصانہ تعلق تھا اور مولوی محمود صاحب مرحوم سے یوں بھی خصوصیت زیادہ تھی، ایک دن حضرت شیخ الہند چھوٹی مسجد میں تشریف لائے اور مولوی محمود صاحب کے حجرہ پر گذر ہوا، یہ زمین پر فرش بچھائے لیٹے تھے، فرمایا محمود! تیرے پاس چارپائی نہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت چارپائی تو نہیں ہے، مجھے زمین پر لیٹنے کی عادت ہوگئی ہے، اس سے بہت متاثر ہوئے مگر فرمایا کچھ نہیں، اگلے دن دوپہر کا وقت تھا گرمی شدید تھی، لو چل رہی تھی کہ مولوی صاحب نے کھڑکی سے دیکھا، حضرت اپنے کندھے پر ایک چارپائی لئے خود تشریف لا رہے ہیں، وزنی چارپائی ہے مگر اسے سر پر اٹھا رکھا ہے۔

مولوی صاحب صورتِ حال دیکھتے ہی حجرے سے نکل ننگے سر اور ننگے پیر حضرت کی طرف دوڑے، حضرت انہیں بھاگتا ہوا دیکھ کر وہیں سڑک پر کھڑے ہوگئے اور چارپائی زمین پر رکھ دی، جب قریب پہنچے تو ایک خاص انداز سے فرمایا جناب یہ لے جاؤ اپنی چارپائی مجھ سے نہیں اٹھتی، میں بھی شیخ زادہ ہوں مجھ سے یہ چارپائیاں نہیں گھسیٹی جاتیں۔ یہ فرما کر پیٹھ پھیر لی اور گھر روانہ ہوگئے، مولوی صاحب کچھ کہنے ہی نہ پائے اور چارپائی اٹھا کر حجرے میں لے آئے، گویا انہیں کوئی کلمۂ معذرت بھی نہیں کہنے دیا کہ وہ معنیً ثناءِ حسن ہو جاتی۔

اللہ اللہ کیا ٹھکانا ہے اس بے نفسی کا اور کیا ٹھکانا ہے اس شفقت کا اپنے چھوٹوں پر، اور کیا ہے مدحِ خلق سے اس استغناء کا، اور کیا ٹھکانا ہے اس ذکاء و دانش اور معاملات میں حسن اسلوب کا۔

حضرت نانوتوی کی وفات کے بعد حضرت شیخ الہند کی عادت تھی کہ ہر جمعرات کو حضرت گنگوہی کے پاس حاضری کے لئے گنگوہ کا سفر پیدل کرتے تھے، جمعرات کو چھٹی کا گھنٹہ بجتا، اسی وقت سبق سے اٹھ کر گنگوہ کا راستہ لیتے، گنگوہ دیوبند سے ۲۲ کوس یعنی ۳۰ میل ہے، حضرت اذانِ عصر پر چلتے اور عشاء گنگوہ پڑھ لیتے تھے۔ جمعہ کا پورا دن حضرت گنگوہی کی خدمت میں گزار کر اذانِ عصر کے قریب گنگوہ سے واپس ہوتے اور عشاء دیوبند میں پڑھ لیتے تھے۔ برسہا برس یہ معمول رہا، سردی ہو یا گرمی یہ معمول قضا نہ ہوتا تھا۔

مولوی محمود صاحب کا بیان ہے کہ ایک دن ہم دو تین طلباء نے اصرار کیا کہ حضرت ہم بھی ساتھ چلیں گے، فرمایا اچھا، مگر اس دن حضرت نے ان طلباء کی رعایت سے پیدل سفر کرنے کی بجائے ارادہ کیا کہ سفر سواری پر ہو، تو کمہار کا ایک ٹٹو کرایہ پر لے لیا اور ارادہ یہ کیا کہ دو تین طلباء اترتے چڑھتے چلے جائیں گے، چنانچہ کمہار ٹٹو لے کر دار العلوم کے دروازے پر آ گیا، حضرت حسبِ معمول اذانِ عصر کے قریب درس سے اٹھے، یہ طلباء بھی حاضر تھے تو حضرت نے فرمایا کہ بھائی میاں محمود پہلے تم سوار ہو پھر باری باری ہم بھی سوار ہوتے رہیں گے، انہوں نے حضرت کے سوار ہونے پر اصرار کیا تو حضرت نے نہ مانا اور زبردستی مولوی محمود صاحب کو سوار کر دیا دو طلبہ اور خود حضرت پیچھے پیچھے پیدل روانہ ہوئے بلکہ ایک قمچی لیکر ٹٹو کر ہنکانا بھی اپنے ذمہ لے لیا۔

مولوی محمود صاحب فرماتے تھے کہ میں سخت ضیق میں تھا کہ حضرت تو پیچھے پیچھے پیدل ہیں اور میں سوار ہوں مگر مجبور تھا حکم یہی تھا، دو چار میل چل کر یہ ٹٹو سے اتر گئے تو حضرت نے زبردستی دوسرے طالب علم کو بٹھا دیا اور خود ٹٹو ہانکتے جا رہے ہیں، چار پانچ میل بعد دوسرے طالب علم کو چڑھا دیا۔ غرض تیس میل کا سفر پورا طے ہو گیا مگر خود نہیں چڑھے باری باری ان طلباء کو بٹھاتے رہے، اس وقت معلوم ہوا کہ یہ ٹٹو اپنے لئے کرایہ پر نہیں لیا تھا بلکہ ان طلبہ کے لئے شفقتاً لیا گیا تھا۔ جمعہ کو واپسی ہوئی تو طلبہ گھبرائے کہ اب پھر وہی معاملہ ہوگا کہ ہم ٹٹو پر سوار ہونگے اور حضرت پیدل چلیں گے، باہم مشورہ ہوا کہ آخر کیا صورت اختیار کی جائے کہ ہم پیدل چلیں اور حضرت کو ٹٹو پر سوار کر دیں۔

مولوی محمود صاحب فرماتے تھے کہ میں نے کہا ترکیب تو میں کر دوں گا کہ حضرت پورے راستہ

ٹٹو سے نہ اتر سکیں مگر ایک دفعہ سوار کر دینا ہے۔ چنانچہ جب گنگوہ سے روانگی ہوئی تو حسبِ معمول طلبہ پر زور دیا کہ سوار ہو مگر یہ لوگ ایکا کر چکے تھے عرض کیا کہ حضرت آتے ہوئے ہم سوار رہے اب واپسی میں یہ نہیں ہوگا، حضرت سوار ہوں خواہ پھر اتر لیں مگر ابتداء حضرت ہی کے سوار ہونے سے ہوگی۔

جب یہ سب اکٹھے ہو کر بضد ہوئے تو آخر حضرت نے قبول فرمالیا اور ٹٹو پر سوار ہو گئے۔ طلبہ نے چپکے سے مولوی محمود سے کہا کہ تم اب وہ موعودہ ترکیب کرو کہ حضرت دیوبند تک ٹٹو سے نہ اترنے پائیں، چنانچہ مولوی صاحب نے وہ مؤثر نسخہ استعمال کیا کہ جب حضرت سوار ہو گئے تو انہوں نے ٹٹو کے برابر میں آکر حضرت نانوتوی، حضرت حاجی امداد اللہ، حضرت حافظ شہید وغیرہ اکابر کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ حضرت کی عادت تھی کہ ان بزرگوں کا ذکر چھڑتے ہی ان میں محو ہو جاتے تھے اور پھر اِدھر اُدھر کی کچھ خبر نہیں رہتی تھی۔

ان حضرات کا ذکر چھڑتے ہی جو حضرت نے ان بزرگوں کے واقعات بیان کرنے شروع کئے تو حضرت کو نہ راستہ کی خبر رہی نہ ان طلبہ کی، پورے چھتیس میل کا سفر طے ہو گیا، ندی آگئی جو دیوبند سے تین چار میل کے فاصلہ پر ہے۔ ندی دیکھتے ہی حضرت نے گھبرا کر فرمایا کہ او ہو! ندی آگئی اور یہ کہہ کر ٹٹو سے کود کر اترے۔ فرمایا بھائی میں نے تم سب کا حق مار لیا لو جلدی سے تم سوار ہو، طلبہ نے ہر چند حضرت کے بیٹھنے کا اصرار کیا مگر حضرت تہیہ فرما چکے تھے کسی کی نہیں سنی، باری باری ان لوگوں کو بٹھلایا، شہر میں داخل ہوئے تو پھر اسی شان سے کہ طلبہ سوار ہیں اور حضرت پیدل ہیں، قمچی ہاتھ میں ہے اور ٹٹو ہانک رہے ہیں جس سے طلبہ بچنا چاہتے تھے بالآخر وہی چیز پھر سامنے آکر رہی۔ سبحان اللہ بے نفسی اور شفقت کی انتہا ہے۔

حضرتِ اقدس کو اس بے نفسی کے عالم میں کسی بھی ایسے کام سے عار نہ تھا جو بظاہر علماء کی شان کے خلاف سمجھا جاتا ہے، عار تو جب آئے کہ خلافِ شان کیا جائے اور جو شان ہی مٹا چکا ہو اس کے خلافِ شان کا سوال ہی کیا پیدا ہو سکتا تھا، میرے رشتہ اور خطبہ کا جب سوال آیا حضرت کی ہی رائے تھی کہ رشتہ رام پور میں مولوی محمود صاحب مرحوم کی لڑکی سے بھیجا جائے، حضرت کا اس گھرانے سے گہرا تعلق تھا اور چونکہ حضرت مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب (مولوی محمود احمد صاحب مرحوم کے تایا

تھے حضرت حافظ ضامن صاحب شہید کے خلیفہ مجاز اور بڑے قوی النسبت اکابر میں سے تھے) اس تعلق سے رامپور کے گھرانے سے روحانی رشتہ بھی تھا، دوسرے یہ کہ حضرت گنگوہی کو بھی رامپور کا گھرانہ بہت عزیز تھا، گھر کے سے تعلقات تھے۔ بہرحال چند در چند روابط تھے جس سے اس خاندان اور گھرانے سے گنگوہ، دیوبند اور تھانہ بھون کے نسبی اور روحانی کئی طرح کے رشتے اور خصوصی تعلقات تھے، اس لئے حضرت شیخ الہند کا اصرار تھا کہ طیب کا رشتہ رام پور کے اس خاندان میں مولوی محمود صاحب کی لڑکی سے بھیجا جائے۔

جب والد صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور یہ سب بزرگ اس رائے پر متفق ہو گئے تو حضرت ہی نے بڑی امنگ اور جوشِ مسرت سے فرمایا کہ بھائی یہ رشتہ میں لے کر جاؤں گا، چنانچہ یہ پیغام خود ہی لے کر رامپور تشریف لے گئے اور وہاں جا کر فرمایا کہ میں اس وقت حضرت نانوتوی کے گھرانے کے ایک ڈوم اور حجام کی حیثیت سے رشتہ کا پیامی بن کر آیا ہوں۔ اللہ اکبر! کیا ٹھکانا ہے اس بے نفسی اور نسبت کی عظمت واحترام اور تعلقات کے نبھانے اور انہیں مستحکم کرنے کے جذبات کا، یہی چیز تھی جس نے شیخ الہند کو شیخ الہند بنایا اور عالمگیر مقتدائی کا منصب عطا فرمایا۔

افسوس یہ ہے کہ جب نکاح کا وقت آیا تو حضرت مالٹا کے اسیر ہو چکے تھے، رامپور میں بسلسلہ براءت سارے اکابر حضرت تھانوی، حضرت رائے پوری اور دیوبند اور سہارن پور کے تمام اکابر ومشائخ جمع تھے مگر حضرت نہ تھے، میرا نکاح حضرت تھانوی نے پڑھایا اور حضرت شیخ کی عدم موجودگی سب محسوس کرتے رہے۔

حضرت نانوتوی کے والد ماجد شیخ اسد علی صاحب مرحوم جب مرضِ وفات میں مبتلا ہوئے تو علاج کے لئے دیوبند لائے گئے، قیام حضرت شیخ الہند کے مکان پر تھا، دستوں کا مرض تھا، بعض اوقات دستوں کی کثرت سے کپڑے بھی آلودہ ہو جاتے اور انہیں دھونا پڑتا تھا۔ حضرت نانوتوی کے خدام نے کپڑوں کا دھونا اپنے ذمہ لینا چاہا مگر حضرت اجازت نہیں دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ میرا حق ہے، اسے تلف مت کرو۔ چنانچہ خود کپڑے دھوتے تھے۔

اسی دوران میں ایک دفعہ دست چار پائی پر خطا ہو گیا اس وقت حضرت نانوتوی بھی یہاں موجود

نہ تھے، حضرت شیخ الہند موجود تھے اور صورت ایسی ہوگئی کہ نجاست اٹھانے کے لئے ظرف بھی نہ تھا۔ حضرت شیخ الہند نے بے تکلف ساری نجاست اپنے ہاتھوں اور ہتھیلیوں میں لے لی اور سمیٹنی شروع کردی، تمام ہاتھ گندگی میں آلودہ ہی نہ تھے بلکہ ہاتھوں میں نجاست لبریزی کے ساتھ بھری ہوئی تھی۔ حضرت نانوتوی پہنچ گئے اور دیکھا کہ حضرت شیخ الہند کے دونوں ہاتھ نجاست اور مواد سے بھرپور ہیں اور وہ اسے سمیٹ سمیٹ کر بار بار باہر جاتے ہیں اور پھینک پھینک کر آتے ہیں۔اس پر حضرت نانوتوی بہت متاثر ہوئے اور وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ دعاء کے لئے اٹھائے اور عرض کیا کہ خداوندا! محمود کے ہاتھوں کی لاج رکھ لے اور اس خاص وقت میں جو جو بھی اپنے اس محبوب تلمیذ کے لئے مانگ سکتے تھے ہاتھ اٹھائے ہوئے مانگتے رہے۔اس قبولیت اور دل سے نکلی ہوئی دعاؤں نے کیا کچھ اثر نہ دکھایا ہوگا، اور یہ وہی مولوی محمود حسن تھے کہ ہند کے شیخ اور عالمگیر زعیم بنے جن کی فراست وجواں مردی اور جوشِ جہاد کے چرچے ہند اور بیرونِ ہند میں تھے۔

امیر امان اللہ نے افغانستان کی پارلیمنٹ میں کہا تھا کہ محمود حسن ایک نور ہے جس کی روشنی میں ہم بہت کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ جمال پاشا گورنر حجاز نے حضرت کے مختصر سے جثہ کو دیکھ کر کہا تھا کہ ان مختصر ہڈیوں میں کس قدر دین اور سیاست بھری ہوئی ہے۔ برطانیہ کے ایک ذمہ دار (سر جیمس مسٹن گورنر یوپی) نے کہا تھا کہ اگر محمود حسن کو جلا کر راکھ کر دیا جائے تو اس کی راکھ بھی انگریزوں سے کترا کر اڑے گی۔

یہ تو حکمرانوں اور سلاطین کے مقولے ہیں جن سے حضرتِ اقدس کی سیاسی بصیرت، جوشِ عمل اور بغض فی اللہ ظاہر ہوتا ہے اور ادھر حضرت گنگوہی نے جو حضرت شیخ کے مربی تھے، فرمایا کہ محمود حسن علم کا کٹھلا ہے، اس جوشِ جہاد اور غیر معمولی بغض فی اللہ پر احتیاط وتدین کا یہ عالم تھا کہ تحریک خلافت کے دوران جب ترکِ موالات کے بارہ میں حضرت سے استفتاء کیا گیا تو اپنے محبوب ترین شاگردوں (حضرت مولانا حسین احمد مدنی صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی) کو بلا کر فرمایا کہ بھائی یہ استفتاء آیا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کا جواب آپ لکھ دیں کیونکہ حکمِ خداوندی یہ ہے کہ:

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَاَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی.

اور تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل وانصاف کے خلاف کچھ کہو، عدل کرو کہ وہی تقویٰ کے قریب تر ہے۔

اور مجھے انگریزوں سے جس درجہ عداوت وبغض ہے اس کے ہوتے ہوئے مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہیں ہے، کہیں میں ان کے بارہ میں خلافِ انصاف کوئی بات نہ لکھ جاؤں۔ جو حضرات دشمنوں کے بارہ میں بھی یہ احتیاط وتدین اور رعایتِ حدود فرمائیں ان کا تقویٰ وتقدس دوستوں اور حق کے بارہ میں کیا کچھ نہ ہوگا؟

بہر حال یہ تھے شیخ الہند اور یہ تھا ان کا ایمان وتقویٰ اور علم وفضل اور ورع واحتیاط، یہ چند باتیں سامنے کی گذری ہوئی ہیں اس لئے زبانِ قلم پر آگئیں اور وہ بھی بطور تذکرۂ عقیدت ومحبت، ورنہ کہاں شیخ کی سوانح حیات اور رفیع حالات اور کہاں ہم جیسے ناکارہ۔

حضرت مولانا صدیق احمد انبیٹھوی

آپ بھی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے اور دارالعلوم دیوبند میں عرصۂ دراز تک رہ کر تعلیم حاصل کی اور پھر دارالعلوم ہی میں عرصۂ دراز تک درس بھی دیا، دارالعلوم سے مالیر کوٹلہ تشریف لے گئے اور وہاں ریاست کی طرف سے عہدۂ افتاء پر فائز ہوئے۔ مشاہیر اہل افتاء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ عمر کا آخری حصہ تمام مالیر کوٹلہ میں عہدۂ افتاء پر ہی گذرا، وہیں ۲۸ رصفر ۱۳۴۴ھ شبِ جمعہ کو آپ کی وفات ہوئی۔ مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم بھی آپ کے شاگردوں میں سے تھے، آپ صاحبِ بیعت وارشاد بزرگوں میں سے تھے جن سے ایک بڑے حلقے نے تربیتِ باطنی حاصل کی۔

خواجہ فیروز الدین مرحوم اکاؤنٹینٹ جنرل ریاست کپورتھلہ آپ کے مخصوص متوسلین میں سے تھے، جو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے ہیں۔ احقر نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی وفات کے بعد کچھ دنوں آپ سے بھی تربیتِ باطنی حاصل کی ہے، آپ علومِ نقلیہ وعقلیہ میں مہارتِ

تامہ رکھتے تھے اور آپ کی تدریس میں ایک خاص برکت تھی جو محسوس ہوا کرتی تھی۔ دارالعلوم کے درجاتِ ابتدائیہ کے ممتحن تھے، صاحبِ اسرار ومعارف تھے اور اکثر وبیشتر آپ کی تشریف آوری دیوبند کے موقع پر اساتذہ وطلباء آپ کے حلقہ میں بیٹھ کر مستقبل کے بارے میں باتیں پوچھتے تھے اور آپ بطور پیشین گوئی کچھ نہ کچھ فرمادیا کرتے تھے اور معاصرین میں صاحبِ اسرار ومعارف سمجھے جاتے تھے۔آپ نے حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ' سے سلوک ومعرفت کے مقامات طے کئے تھے حضرت گنگوہی نے اپنے ایک مکتوبِ گرامی میں لکھا ہے کہ:

طریق سلوک میں اصل مقصود احسان ہے، سووہ بفضلہٖ تعالیٰ حاصل ہے۔

اس مکتوب سے آپ کے روحانی مقام کی طرف اشارہ ہوتا ہے بالآخر حضرت گنگوہی سے اجازتِ بیعت حاصل ہوئی اور سلوک میں مقامِ عالیہ پر فائز ہوئے۔

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ

آپ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے اکابرین میں سے ہیں، آپ کا سلسلۂ نسب قطب الارشاد حضرت گنگوہی قدس سرہ' سے ملتا ہوا حضرت ابوایوب انصاری پر منتہی ہوتا ہے، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ' آپ کے حقیقی ماموں تھے جو دارالعلوم کے اولین صدر المدرسین تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے تکمیل علوم کے بعد آپ مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں تدریس پر مامور ہوئے، اس زمانے میں بھوپال میں مولوی جمال الدین صاحب مدارالمہام تھے، ان کی خواہش تھی کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو ریاست میں گراں قدر مشاہرے پر جگہ دیں مگر انہوں نے دارالعلوم کو چھوڑنا پسند نہیں فرمایا، بعد میں مدارالمہام صاحب کے اصرار پر آپ کو وہاں بھیج دیا گیا مگر آپ کا بھوپال میں دل نہیں لگا اور چند ماہ کے بعد آپ حج کے لئے چلے گئے، واپسی کے بعد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے ان کو بہاول پور بھیج دیا۔ ۱۲۹۷ھ میں انہوں نے دوبارہ حج کا ارادہ فرمایا، اس موقع پر حضرت گنگوہی قدس سرہ' نے جن سے آپ کو شرفِ بیعت حاصل تھا، حضرت حاجی صاحب مہاجر مکی قدس سرہ' کو لکھا کہ مولوی خلیل احمد حاضر خدمت

ہو رہے ہیں آپ ان کی حالت پر مطلع ہو کر مسرور ہوں گے۔

حضرت حاجی صاحب نے جب آپ کی باطنی حالت دیکھی تو بہت خوش ہوئے اور سر سے دستار اُتار کر آپ کے سر پر رکھ دی اور اسی کے ساتھ اپنی جانب سے تحریری خلافت عطا فرمائی، بعد میں اس اجازت نامہ پر حضرت گنگوہی نے بھی دستخط فرمائے۔ حج سے واپسی کے بعد حضرت گنگوہی نے ان کو مدرسہ مصباح العلوم بریلی کا صدر مدرس مقرر فرمایا۔ ۱۳۰۸ھ میں آپ کو دارالعلوم دیوبند میں مدرس مقرر کیا گیا، ۱۳۱۴ھ میں یہاں سے بحیثیت صدر مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور تشریف لے گئے۔ ۱۳۲۵ھ میں ان کو مظاہر العلوم کا ناظم منتخب کیا گیا اور آخری عمر میں ۱۳۴۴ھ میں بہ قصدِ ہجرت مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے۔

آپ کو اگر چہ تمام علومِ متداولہ میں مہارتِ تامہ حاصل تھی لیکن حدیث سے بہت زیادہ شغف تھا، اسی شغف کے سبب آپ نے ابوداؤد کی شرح فرمائی جو بذل المجہود کے نام سے پانچ جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔ بذل المجہود علم حدیث میں آپ کا عظیم الشان کارنامہ ہے، اس کے علاوہ بھی آپ نے کئی کتابیں تصنیف فرمائیں، بذل المجہود کا آغاز ۱۳۳۵ھ میں سہارن پور میں ہوا تھا اور ۱۳۴۵ھ میں مدینہ منورہ میں اختتام ہوا اور اس کے ساتھ آپ کی عمر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا اور ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ کو بمرضِ فالج مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے جوار میں آسودۂ خواب ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث صاحب فرماتے ہیں کہ:

آپ ۱۲۶۹ھ میں اپنے ننہال قصبہ نانوتہ ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کی حقیقی بہن اور استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی صاحب کی صاحبزادی تھیں، آپ کے نانا مولانا مملوک علی نے بہ نفس نفیس آپ کو بسم اللہ پڑھا کر قاعدہ شروع کرایا تھا، آپ فطرۃً ذکی وذہین تھے، ۱۲۸۳ھ قیامِ دارالعلوم دیوبند کے بعد آپ اپنے ماموں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں پہنچ کر تعلیم وتربیت حاصل کرتے رہے، دارالعلوم کے قیام کے چھ ماہ بعد جب سہارنپور شہر میں مدرسہ مظاہر العلوم کا افتتاح ہوا اور مولانا محمد

مظہر صاحب نانوتوی صدر مدرس تجویز ہوئے تو آپ مظاہر العلوم تشریف لائے اگر چہ آپ اپنے ماموں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے زیر سایہ بہتر نظم وضبط کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہے تھے مگر قدرت کو منظور تھا کہ جس ذاتِ گرامی کے ہاتھوں مظاہر العلوم کو منازلِ ترقی طے کرنا ہے وہ اپنی تعلیم کے سلسلہ میں مظاہر العلوم ہی کا مرہونِ منت اور احسان مند ہو، علاوہ ازیں باوجودیکہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے آپ کی قرابت تھی مگر دیوبند میں آپ کا دل نہ لگا اور آخر کار مظاہر العلوم میں آکر قلبی سکون واطمینان سے اپنے مقصد کے حصول کے لئے مشغول رہے اور حدیث وتفسیر اور فقہ کی اکثر کتب حضرت مولانا محمد مظہر صاحب قدس سرہٗ سے پڑھیں۔

۱۲۸۸ھ میں آپ نے درسِ نظامی سے فراغت پائی، پھر پہلے حج کے موقع پر مکہ مکرمہ میں مولانا الشیخ احمد وعلان مفتی شافعیہ سے بھی اجازتِ حدیث حاصل کی اور مدینہ منورہ میں حضرت شاہ عبدالغنی مہاجر المجددی النقشبندی سے اجازتِ حدیث حاصل کی۔

۱۳۴۴ھ میں آپ بطور صدر مدرس مظاہر العلوم منتخب ہوئے اور آپ نے اپنے استاذِ مکرم حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کے لگائے ہوئے باغیچے کو تمام تر موانع کے باوجود اس جانفشانی اور تندہی سے سینچا کہ جس کا اظہار مظاہر العلوم کا ہر طاق ومحراب، ہر درودیوار اور عظیم منتخب اور کمیاب کتب سے بھرپور خزانۂ علمی کتب خانہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہے۔

درسیاتِ نظامی اور علومِ ادبیات کی تکمیل کے بعد آپ کی فطرتِ سلیمہ اس معرفتِ الٰہیہ کی جستجو میں تھی جو قال کو حال اور علم کو سراپا عمل بنا دیتی ہے، چنانچہ اس مقصود کے حصول کے لئے آپ کی نظرِ انتخاب قطبِ عالم امامِ ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ پر پڑی، حضرت گنگوہی کی طرف کشش اور جذبہ کے لئے یہ چیز بھی سبب ہوئی کہ آپ کے استاذ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب قدس سرہٗ کا تمام تر کمالاتِ قدسیہ اور تبحر علمی کے باوجود نیز عمر میں بھی بڑے ہونے کے باوجود عقیدتمندانہ حاضر خدمت ہوا کرتے تھے، چنانچہ آپ نے مقصد عظیم کے حصول کے لئے اپنے ماموں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی سے سفارشی خط حضرت گنگوہی کے نام لکھوا دیا کیونکہ حضرت گنگوہی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا استاذ زادہ ہونے کی بناء پر زیادہ احترام فرمایا

کرتے تھے، آپ وہ خط لے کر آستانہ رشیدیہ پر حاضر ہوئے۔ حضرت گنگوہی قدس سرہ کی طبع غیور چونکہ اس بات پر جمی ہوئی تھی کہ جب تک طالب کے دل میں سچی طلب نہ ہواس وقت تک رسمی بیعت بے سود ہے، اسی لئے استاذ زادہ کا خط پڑھ کر اس طرح رکھدیا کہ جیسے کوئی بات ہی نہیں ہے، اور فرمایا کہ میاں خلیل تم تو خود پیرزادے ہو، تمہیں مرید ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ مگر آپ نے اپنی خداداد ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواباً عرض کیا کہ:

حضرت! کیسی پیرزادگی، میں تو اس دربار کے کتوں کے برابر بھی نہیں ہوں، میں بیعت کا حاجت مند ہی نہیں بلکہ سراپا احتیاج ہوں۔ حضرت والا چھاتی سے لگائیے یا دھکے دیجئے، میں تو حضرت والا کا غلام بن چکا۔

اِدھر آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے اُدھر حضرت اقدس گنگوہی نے فرمایا بس بس بہت اچھا اور فوراً بیعت فرمالیا۔ چنانچہ اس کے بعد آپ ایک لطیف روح کے ساتھ آستانۂ رشیدیہ سے واپس ہوئے، اوقاتِ درس وتدریس کے علاوہ ذکر واذکار اور اپنے مولا کے ساتھ راز ونیاز میں مشغول رہا کرتے، ادائیگیٔ معمولات میں آپ جس عزیمت واستقامت کی طبیعت رکھتے تھے اس کی نظیر شاید مشکل سے ہی مل سکے گی۔ سفر ہو یا حضر، بیٹی یا بیٹے کے انتقال کا وقت یا کوئی اور حادثۂ جانکاہ، آپ کے معمولات میں کبھی کمی نہ آتی تھی۔ بہتّر سال کی عمر تک تمام جسمانی کمزوریوں کے باوجود تراویح میں قرآن پاک خود سناتے رہے، اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں کہ آپ نے راہِ سلوک کو کس ترتیب سے طے کیا، شیخ کی طرف سے کیا تعلیم ہوئی اور راہِ طریقت کے سفر میں کیا کیا مناظر پیش آئے، البتہ آپ نے صرف ایک مرتبہ فرمایا:

"مجھے نہ زیادہ واردات پیش آئے اور نہ آخر تک میں سمجھا کہ نسبتِ سلسلہ کیا چیز ہے، بس ایک حالت تھی جو گذر رہی تھی۔"

حتیٰ کہ جب آپ دوسرے حج کیلئے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے تو حضرت گنگوہی نے اپنے پیرومرشد حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی قدس سرہ کی خدمتِ اقدس میں تحریر فرمایا:

مولوی خلیل احمد حاضر خدمت ہو رہے ہیں۔ حضرت ان کی حالت پر مطلع ہو کر مسرور ہوں گے۔

چنانچہ حضرت حاجی صاحب آپ کی باطنی کیفیت کے مشاہدہ سے نہایت خوش ہوئے اور چھاتی

سے لگالیا اور اپنی دستار مبارک آپ کے سر پر رکھ دی اور حضرت گنگوہی کے نام مبارک باد کا خط اور آپ کے نام خلافت نامہ مزین بمہر آپ کو عطا فرمایا آپ نے یہ گرامی نامے حضرت گنگوہی کی خدمت میں پیش کیے تو حضرت نے فرمایا:

''مبارک ہو یہ تو اعلیٰ حضرت کا عطیہ ہے۔''

آپ نے جواب میں فرمایا کہ:

''بندہ تو اس لائق کہاں یہ تو حضور کی بندہ نوازی ہے اور میرے لئے تو وہی مبارک ہے جو آنحضرت کی طرف سے عطا ہو۔''

چنانچہ حضرت گنگوہی نے بھی خلافت نامہ پر دستخط فرما کر مع دستار آپ کے حوالے فرمادیا، آپ کے مقامِ روحانی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں فرمایا تھا کہ:

''تم میرے سلسلے کے فخر ہو، مجھے تم سے بہت خوشی اور مسرت ہے۔''

بہرحال آپ کا سلسلہ بہت مقبول ہوا اور آپ نہایت اعلیٰ مقام پر فائز رہے۔ حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی، حضرت مولانا محمد عبداللہ گنگوہی، حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی، حضرت مولانا فیض الحسن گنگوہی، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت حافظ فخر الدین احمد، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی اور حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی جیسی فضائل وکمالات کی حامل ہستیاں آپ کے خلفاء وتلامذہ میں شامل ہیں۔ یہ احقر ناکارہ بھی آپ کا ادنیٰ خادم ہے۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب ابن قاسمؒ

دارالعلوم دیوبند میں دو عہدے ہمیشہ ذمہ دارانہ، وقیع اور اہم سمجھے جاتے ہیں، عہدۂ اہتمام اور عہدۂ صدارتِ تدریس، اور جس دور میں بھی ان عہدوں پر ان کے مناسبِ حال شخصیتیں جمع ہوگئی ہیں وہی دارالعلوم کی اعلیٰ ترقی کا دور سمجھا گیا ہے۔ اس ادارہ کا ایک دور تو اس کا قرنِ اول ہے جس کی منہاج کی قدر وقیمت وہی کچھ جانتے ہیں جنہوں نے اس دور کو دیکھا ہے یا دیکھنے والوں سے سنا ہے، یعنی بانیانِ دارالعلوم کا زمانۂ خیر وبرکت، اسکے بارے میں نے اپنے بزرگوں اور بالخصوص

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی سے سنا ہے کہ دارالعلوم پر ایک زمانہ وہ گذرا ہے کہ جس میں مہتمم سے لیکر دربان تک سب صاحبِ نسبت بزرگ اور ذاکر وشاغل لوگ تھے، لیکن اس دور کے دیکھنے والے آج موجود نہیں ہیں اس لئے اس دور کی برکات باطنی طور پر جس قدر بھی اس ادارہ میں مؤثر اور کارفرما ہوں وہ ہیں، اور بلاشبہ قطعی ہیں، اور آج بھی اس درسگاہ کے لئے روحِ رواں کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن ظاہری طور پر آج اس دور کی شخصیات اور شخصی خصوصیات کا وجود نہیں رہا۔

دوسرا دور اس کا ہو بہو نمونہ اس کا قرنِ ثانی ہے، اس میں بھی وہ پہلے دور کی عینی اور شخصی خصوصیات کتنی بھی کم ہوگئی ہوں لیکن نوعیت بدستورِ سابق قائم اور کارفرما رہی، اس دور میں بھی صرف اونچے عہدہ دار ہی نہیں بلکہ ماتحت عملہ کے لوگ بھی تقدیس اور برگزیدگی کی جیتی جاگتی تصویریں تھیں۔ میری ابتدائی طالب علمی اور کم عمری کا دور تھا، دفاتر دارالعلوم کے محافظِ شب حاجی عبداللہ صاحب پڑھے لکھے تو نہ تھے مگر صاحبِ نسبت بزرگوں میں سے تھے، نسب کے لحاظ سے دیوبند کے سادات کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، دفتر محاسبی اور کتب خانہ کی شب کی نگرانی ان ہی سے متعلق تھی، اس زمانہ میں دفتر محاسبی احاطہ مولسری میں درسگاہ نودرہ سے ملحق بہ جانب جنوب تھا، جو آج قراءت کی درسگاہ بنا ہوا ہے، حاجی صاحب مرحوم شب کو اس دفتر کے دروازہ سے ملا کر اپنی چارپائی بچھائے بیٹھے رہتے تھے، ذکر وشغل کا معمول کبھی قضا نہ ہوتا تھا، نمازِ فجر کی اذان کے لئے گھنٹہ بجانا انہی سے متعلق تھا، ان کا یہ ایک دوامی معمول تھا کہ جب گھنٹہ بجانے کے لئے مونگری اٹھاتے تو پہلی ضرب پر کہتے بسم اللہ دوسری ضرب پر کہتے لا آلہ الا اللہ اور تیسری ضرب پر آواز بلند کر کے کہتے بول بے گھنٹے اللہ اکبر اور چوتھی ضرب پر ذرا لہرا کر یہ شعر پڑھا کرتے۔

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں بلبلیں
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گی

یہ واقعہ ہے کہ اس سہانے اور پُرسکون وقت میں جو بھی ان کی یہ دردناک آواز اور ضربیں سن لیتا تھا وہ بے روئے نہیں رہتا تھا، لامحالہ اس کی آنکھوں سے دو چار آنسو ٹپک پڑتے تھے اور قلب پر ذکر اللہ کی کھلی تاثیر محسوس ہونے لگتی تھی۔

اسی دور میں دارالعلوم کے دربان حاجی محمد اسحاق صاحب، جو قصبہ منگلور کے باشندے اور قاضی محمد اسماعیل صاحب منگلوری کے عزیزوں سے اور خاندانِ سادات سے تعلق رکھتے تھے، چہرہ وجیہ، نہایت سرخ سپید، نورانی سفید داڑھی، خط بھرا ہوا، یہ واقعہ ہے کہ ان کی صورت دیکھ کر ایمان تازہ ہوتا تھا اور دور سے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ انسانی صورت میں کوئی فرشتہ چلا آرہا ہے، دارالعلوم میں ہر آنے والے صادر کی مڈبھیڑ پہلے ان سے ہوتی تھی اور آنے والے پر ان کی پاکیزہ نورانی صورت پھر اخلاقِ حسنہ سے بھرپور ان کی بات چیت سے یہ اثر پڑتا تھا کہ گویا اس کے گناہ دھل رہے ہیں اور وہ ایک قدسی فضاء میں آکر خود بھی قدسی صفت بن گیا ہے۔ اس پر شب بیداری کا معمول دوامی تھا حتیٰ کہ طلبہ میں سے جو لوگ ان سے یہ کہتے کہ ہمیں شب کے دو بجے یا تین بجے اٹھادیا جائے تو ٹھیک اسی وقت ان کے حجروں پر جا کر انہیں جگا دیتے اور اگر کوئی طالب علم نیند میں بھرا ہوا ان پر جھنجھلاتا اور نیند کے غلبہ میں ان سے کچھ سخت سست کہہ جاتا تو اس سے اور بھی زیادہ پیار اور محبت کا برتاؤ کرتے، یہاں تک کہ اس کی خوشامد کر کے اسے شب بیداری پر آمادہ کرتے اور نصیحتیں فرماتے۔

آپ اندازہ لگائیے کہ جس ادارہ کے دربان اور نگرانِ دفاتر اور بالفاظِ دیگر خادموں کے تقدس و پاکیزگیٔ نفس کا یہ عالم ہو، اس کے اونچے ذمہ داروں کے تقدس و برگزیدگی کی نوعیت کیا ہوگی، جبکہ ماتحت عملہ عموماً اپنے ذمہ داروں ہی کے اثرات سے متاثر اور انہی کے ڈالے ہوئے نقشِ قدم پر چلنے کا عادی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس دور میں مذکورہ دو عہدے اہتمام اور صدر مدرسی جو ہمیشہ ماتحت عہدے داروں پر علمی و عملی حیثیت سے اثر انداز رہتے چلے آتے ہیں، ایسی ہی منتخب شخصیتوں سے پُر تھے جن کے زیر اثر دربانوں اور دفتری نگرانوں کو بھی مقدس بننے میں دیر نہیں لگتی تھی۔

اہتمام کے عہدہ پر حضرت مولانا الحاج حافظ محمد احمد صاحب ابن حضرت اقدس قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانیٔ دارالعلوم دیوبند فائز تھے اور صدارتِ تدریس کے عہدے پر حضرت سیدنا و مرشدنا شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس سرہ فائز تھے، یہ دونوں ہستیاں اپنی اپنی نوعیت میں بے نظیر اور اپنے اپنے دائرۂ فضل و کمال میں اپنی مثال آپ تھیں۔

ان کے حسنِ انتخاب کی سب سے بڑی دلیل تو یہی ہے کہ ان عہدوں کے لئے ان ہستیوں کا انتخاب وتقرر حضرت قطب العالم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے مقدس ہاتھوں عمل میں آیا تھا، جن کی نگاہِ انتخاب صرف عقل وتجربہ اور فراست ہی پر مبنی نہیں تھی بلکہ الہامی بھی تھی، چنانچہ ان دونوں عہدوں کے فرائض ومناصب اور کاموں میں اسی حسنِ انتخاب کا کھلا ہوا اثر نمایاں رہا۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب المعروف بہ حافظ صاحبؒ علاوہ اپنی ذاتی خصوصیات کے اپنے نسب کے لحاظ سے بھی سربلند اور جماعتِ دارالعلوم میں واجب الاحترام سمجھے جاتے تھے، آپ حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانیٔ دارالعلوم کے صاحبزادے تھے، حضرت نانوتوی کا نکاح دیوبند کے رئیس شیخ کرامت حسین صاحب عثمانی کی بڑی صاحبزادی سے ہوا، ابتداءً حضرت نانوتوی کے یہاں کئی صاحبزادیاں پیدا ہوئیں، حضرت کے والد ماجد شیخ اسد علی مرحوم کولڑکے کی بڑی تمنا تھی، پانچ چھ لڑکیوں کے بعد ۱۲۷۹ھ میں پہلے صاحبزادے حضرت مولانا محمد احمد صاحب پیدا ہوئے، جب دادا کولڑکے کے تولد کی اطلاع دی گئی تو خوشی میں گیہوں کی کوٹھی کا منہ کھلوادیا اور غرباءِ قصبہ (نانوتہ) میں کافی خیرات تقسیم کی اور خوشی منائی۔

تعلیم وتربیت

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب کی عمر جب مکتب نشینی کے قابل ہوئی تو قصبہ رام پور کے جو نانوتہ سے پانچ میل کے فاصلہ پر بجانب سہارنپور ایک قصبہ ہے، ایک جید حافظ نور محمد صاحب کے پاس پڑھنے بٹھادیا، نویں سال آپ نے قرآن مجید حفظ کرلیا۔

حضرت نانوتوی کے حقیقی ماموں زاد بھائی مفتی یٰسین صاحب (جن کو حضرت نانوتوی سے خاص محبت تھی اور وہی حضرت کے کاروبار اور حضرت کے کثیر التعداد مہمانوں کی ضیافت ومدارات کے ذمہ دار تھے) کی صاحبزادی سے نویں سال کی عمر میں حضرت حافظ صاحب کا نکاح کردیا، لیکن رخصتی نہیں کی گئی کیونکہ حضرت حافظ صاحب کی عمر نو سال کی تھی اور ان کی اہلیہ کی عمر سات سال تھی، نکاح کے بعد ہی تحصیل علوم کے لئے بیرونی مدارس میں روانہ فرمادیا، گلاؤٹھی ضلع بلند شہر میں خود حضرت نانوتوی نے مدرسہ قائم کیا تھا وہاں حضرت کے متوسلین اور خدام کی ایک بڑی تعداد موجود تھی،

حضرت کے بڑے داماد مولانا محمد عبداللہ صاحب انبیٹھوی (جو بعد میں علی گڑھ مسلم علی یونیورسٹی کے ناظم دینیات ہوئے) اسی مدرسہ میں تھے، ابتدائی تعلیم کے لئے حضرت نے اپنے صاحبزادے کو اسی مدرسہ میں روانہ فرمایا، اس کے بعد اونچی تعلیم کے لئے پھر حضرت حافظ صاحب کو مراد آباد کے مدرسہ قاسم العلوم مسجد شاہی میں بھیجا، یہ مدرسہ بھی حضرت ہی نے قائم فرمایا تھا، اس زمانہ میں اس مدرسہ کے صدر مدرس حضرت نانوتوی کے شاگرد رشید وخلیفہ خاص حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہی تھے، جنہیں حضرت نانوتوی کے بعد ان کا قائم مقام سمجھا جاتا تھا۔ حافظ صاحب نے فنون کی متعدد کتابیں حضرت امروہی سے اسی مدرسہ شاہی میں رہ کر پڑھیں۔

اسی دوران حضرت نانوتوی کو اپنے صاحبزادے کو خود ہی تعلیم دینے کا خیال پیدا ہوا اور آپ نے مراد آباد سے حافظ صاحب کو دیوبند بلالیا، حضرت حافظ صاحب مراد آباد سے رخصت ہو رہے تھے تو (حسبِ روایت حضرت حافظ صاحب) وہ منظر عجیب وغریب تھا کہ مراد آباد کے مدرسین اور بالخصوص حضرت امروہی صاحب اسٹیشن تک پہنچے اور زار زار روتے ہوئے صاحبزادے سے فرمایا کہ ہم لوگ آپ کا کوئی حق ادا نہیں کر سکے ہیں، اگر حضرت ہم خدام کے بارہ میں آپ سے کچھ پوچھیں تو آپ خدا کے لئے کلمۂ خیر فرمادیں، جس پر حضرت حافظ صاحب نے باچشم نم ہو کر فرمایا کہ آپ کیا فرمارہے ہیں، مجھے گھر سے زیادہ آپ حضرات نے راحت پہنچائی، اولاد کی طرح میری ہر طرح کی ناز برداری کی، اگر میں حضرت سے آپ حضرات کی نسبت کلمۂ خیر کہوں گا تو وہ خلافِ واقع محض آپ کی دلداری کے لئے نہ ہوگا بلکہ حقیقتِ واقعہ ظاہر کرنے کے لئے ہوگا۔

چنانچہ یہی ہوا کہ حضرت اقدس نے صاحبزادہ کو تنہائی میں لے جاکر دریافت کیا کہ مراد آباد کے لوگوں نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ عرض کیا کہ انتہائی راحت اور انتہائی ناز برداری کے ساتھ مجھے رکھا، فرمایا الحمدللہ مجھے ان حضرات سے یہی توقع تھی۔

لیکن حضرت کی وفات کا زمانہ قریب آچکا تھا، سفر حج کی تیاریاں تھیں اور اسی سفر میں مرضِ وفات شروع ہوا، اس لئے جس خصوصی تعلیم کے لے صاحبزادہ کو بلایا تھا وہ نہ ہو سکی اور حضرت حافظ صاحب نے مدرسہ دیوبند میں اپنی بقیہ تعلیم پوری کی، متعدد کتابیں اور بالخصوص معقولات وعربیت کی

اونچی کتابیں حضرت شیخ الہندؒ سے پڑھیں اور سب سے آخر میں دورۂ حدیث گنگوہ پہنچ کر حضرت گنگوہی کے حلقۂ درس میں پورا کیا اور وہیں سے سندِ حدیث حاصل کی۔

۱۲۹۷ھ میں حضرت مولانا نانوتوی کی وفات ہوگئی تو حضرت حافظ صاحب تھانہ بھون کے عربی مدرسہ میں جو حضرت نانوتوی کا ہی قائم فرمودہ تھا تشریف لے گئے اور عرصہ تک وہاں پڑھاتے رہے، وہاں سے پھر دیوبند بلائے گئے اور ۱۳۰۳ھ میں دارالعلوم دیوبند میں مدرسِ ششم مقرر کئے گئے، عموماً تمام فنون کا درس دیتے تھے لیکن خصوصیت سے مشکوٰۃ شریف، مختصر المعانی، جلالین شریف، میر زاہد رسالہ وغیرہ کتابوں کا درس زیادہ مشہور تھا جس کی طرف طلبہ جوق در جوق شوق سے رجوع کرتے تھے۔

عہدۂ اہتمام پر تقرر

مدرسہ دیوبند کا اہتمام حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب قدس سرہٗ کے دستِ حق پرست میں تھا اور حضرت اقدس مولانا نانوتوی قدس سرہٗ کی حیات میں وہی مہتمم رہے، حضرت کے وصال کے بعد بھی عرصۂ دراز تک اہتمام کے فرائض سرانجام دیتے رہے، ان کے تقدس اور اخلاقِ بزرگانہ کی وجہ سے تمام کارکنانِ دارالعلوم ان پر متفق تھے اور نظم اجتماعی اجماعی طور پر چل رہا تھا۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب ممدوح نے جب مکہ مکرمہ کی طرف ہجرت فرمائی تو بعد کے دو اہتماموں کے بعد جو بہت قلیل مدت رہے بالآخر ۱۳۱۳ھ میں حضرت گنگوہی (جو اس دور میں دارالعلوم کے سرپرست اور پوری جماعتِ دیوبند کے سید الطائفہ تھے) دیوبند تشریف لائے دارالعلوم میں قیام فرمایا، باہر سے بعض ذی وجاہت افراد جیسے نواب محمود علی خان صاحب رئیس چھتاری وغیرہ کو بھی دعوت دی اور اہتمام کی باگ ڈور حضرت حافظ صاحب کے سپرد فرمائی، جس سے بعض اختلافات جو قصبہ اور مدرسہ کے درمیان پیدا ہوگئے تھے بے اثر ہوگئے اور چند سال کے بعد کلیتاً منعدم ہوگئے اور دارالعلوم کی جانب میں یکجہتی اور قوت پیدا ہوگئی۔

حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ نزاعات کے ختم ہونے کی اس کے سوا کوئی صورت میرے دل میں نہیں آتی کہ اہتمام حافظ احمد کے سپرد کر دیا جائے اور میں نے اس معاملہ کو گیارہ مرتبہ حق تعالیٰ کے

سامنے پیش کیا ہر دفعہ مجھے یہی جواب ملا کہ مدرسہ دیوبند کی ترقی حافظ احمد کے ہاتھ پر مقدر ہے، اس پر مخالفت کا زور گھٹ گیا اور یہ حضرات بھی مخالفت سے مایوس یا مطمئن ہو کر یکسو ہو گئے۔ یہ روایت مجھ سے مولوی محمود صاحب مرحوم رام پوری نے بیان فرمائی بالآخر حضرت گنگوہی کے اس الہامی مقولہ کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔

حضرت حافظ صاحب نے اپنے طبعی جوہروں کے ساتھ دارالعلوم کا اہتمام پوری قوت و وجاہت اور جرأت و استقلال کے ساتھ چلایا جن کے نمایاں اثرات تاریخ دارالعلوم میں محفوظ ہیں اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دارالعلوم کا ترقیاتی دور حضرت ممدوح ہی کا چالیس سالہ دورِ اہتمام ہے، اس دور میں جماعتِ دیوبند کے تمام اکابر علماء حتیٰ کہ حافظ صاحب کے اساتذہ بھی ان کی نسبت کی وجہ سے ان کے سامنے جھکتے تھے، حضرت شیخ الہندؒ باوجودیکہ حضرت ممدوح کے استاد بھی تھے اور حافظ صاحب کا قلب بھی ان کی استادی کی عظمت سے بھرپور تھا، لیکن مجھے یاد ہے کہ جب کبھی حضرت حافظ صاحب اپنی صاحبزادگی اور مخدوم زادگی کے رنگ میں ہوتے اور شیخ الہند آجاتے تو اِدھر سے ناز اور اُدھر سے نیاز قابل دید ہوتا تھا۔

بعض اوقات تو نہایت نیاز مندی سے حافظ صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ لیتے اور پاؤں تک پکڑ لیتے تھے۔ مولوی عزیز احمد صاحب نگینوی مرحوم نے بیان کیا ہے کہ حضرت شیخ الہند فرمایا کرتے تھے کہ حافظ احمد کا میرے دل میں اتنا احترام ہے کہ اگر وہ پاخانہ کی کوئی ٹوکری اٹھانے کو بھی مجھ سے کہیں تو میں اس کی تعمیل کو اپنی عزت سمجھوں گا۔

حضرت شیخ الہند حضرت حافظ صاحب کے سامنے استاد ہوتے ہوئے بھی ان کی صاحبزادگی کے سبب اسی طرح مؤدب اور نیاز مندانہ بیٹھتے تھے کہ آج مشائخ کے سامنے ان کے مرید و متوسلین بھی وہ شانِ نیاز اختیار نہیں کر سکتے۔ یہ معمولی بات تھی کہ جب حضرت حافظ صاحب شیخ الہندؒ کے مکان پر تشریف لے جاتے اور حضرت شیخ صحنِ مکان میں چارپائی پر بیٹھے ہوئے ہوتے، دروازہ کے سامنے کی سڑک کی لمبی مسافت سے جہاں حافظ صاحب آتے ہوئے حضرت شیخ الہند کو نظر پڑ جاتے تھے تو حضرت چارپائی چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اس وقت تک کھڑے رہتے تھے

جب تک کہ حافظ صاحب مکان میں پہنچ کر اپنی جگہ بیٹھ نہ جائیں اور ان کے بٹھانے کی صورت یہ ہوتی تھی کہ حضرت شیخ کرسی منگواتے، اسے اپنے سرہانے بچھاتے، جب حضرت حافظ صاحب اس پر بیٹھ جاتے تب حضرت چارپائی پر بیٹھ جاتے تھے۔

حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب مدظلہ حال صدر المدرسین دارالعلوم نے فرمایا کہ میں بھی ان کرسی لانے والے لوگوں میں سے ہوں اور میں نے بھی حضرت شیخ الہند کے ایماء پر کرسی لاکر حضرت حافظ صاحب کے لئے بچھائی ہے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اپنی تقریر میں ذکر فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے مالٹا سے آنے کے بعد حضرت کی مردانہ نشست کے سامنے کے کمرے میں بند کواڑ کھول کر میں اچانک اندر گھسا تو یہ منظر دیکھا کہ دونوں مخدوم زادے ابن قاسم حضرت حافظ اور ابن رشید حضرت حکیم مسعود احمد صاحب گنگوہی تخت پر ہیں اور حضرت شیخ الہند تخت سے نیچے ان دونوں کے سامنے مؤدب بیٹھے ہیں اور رو رہے ہیں اور ہاتھ جوڑے ہوئے انتہائی نیازمندی سے کہہ رہے ہیں کہ میں نے آپ دونوں کا کوئی حق واجب ادا نہیں کیا، اب میرے مرنے کا وقت ہے اور دونوں بزرگوں (حضرت قاسم اور حضرت گنگوہی) کو منہ دکھانا ہے تو میں انہیں ان کے صاحبزادوں کے بارے میں کیا جواب دوں گا، تم دونوں کوئی کلمہ تسلی کا میرے لئے کہہ دو کہ میں وہی کلمہ ان بزرگوں کے سامنے کہہ دوں اور قیامت کے دن یہ بزرگ خود تم سے کچھ پوچھیں تو تم بھی کلمۂ خیر کہنا کہ یہ ناکارہ خادم ہمارا خادم ہی رہا اور ہم سے الگ نہیں ہوا۔

اللہ اکبر! دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حضرت حافظ صاحب تو حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور حضرت حکیم صاحب شیخ الہند کے مرید ہیں، لیکن شاگرد اور مرید کے آگے ہاتھ جوڑے ہوئے کون بیٹھے ہیں؟ پیر اور استاد! اس سے حضرت شیخ الہند کی اس قلبی عظمت کی حد تک ان کی نسبتوں کی بھی عظمت تھی۔ غرض اِدھر سے ناز تھا اور اُدھر سے نیاز تھا، اس چیز نے پوری جماعت کو ان کے سامنے جھکا دیا تھا، جس سے حضرت قاسم و رشید کے بعد بھی جماعت میں مرکزیت قائم رہی اور اب دلوں میں آئینی طور پر مرکزِ جماعت حضرت حافظ صاحب تصور کئے جانے لگے جس کا ظہور اندرونی اور بیرونی

معاملات میں نمایاں رہتا تھا۔

مولانا مبارک علی صاحب نائب مہتمم دارالعلوم کا بیان ہے کہ اگر کسی معاملہ میں حضرت شیخ الہند اور دوسرے اکابر کا باہم اختلافِ رائے ہوتا تو حضرت بے شک آخری فیصلہ حضرت حافظ صاحب پر چھوڑ دیتے اور حافظ صاحب نے اس بارہ میں جونہی ایک لفظ کہہ دیا تو حضرت شیخ الہند فوراً اُدھر جھک جاتے تھے اور بطوع ورغبت اسے تسلیم فرمالیتے، خواہ ان کی رائے کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، اور اس طرح اختلاف ختم ہوجاتا۔

عظمت ووقار

غرض حضرت شیخ الہند اس شفقت کے ساتھ جو نیاز مندی کے رنگ میں ہوتی تھی حضرت حافظ صاحب کی پشت پناہی فرماتے اور وجاہت وجرأت ان کی کام کرتی تھی، اس کے دیکھنے والے ابھی تک موجود ہیں کہ احاطہ دارالعلوم میں قدم رکھتے تو اساتذہ وتلامذہ میں ایک قسم کا سناٹا محسوس ہوتا اور طلبہ کا تو یہ عالم ہوتا تھا کہ جو جہاں ہوتا وہیں کھڑا کا کھڑا رہ جاتا۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب نے فرمایا کہ دور سے اُنہیں آتا ہوا دیکھ کر طلباء باہر ہوتے تو حجروں میں گھس جاتے تھے۔

حضرت حافظ صاحب چلتے تو عموماً نیچی نگاہ کر کے چلتے تھے، چال میں وقار اور متانت ہوتی تھی، ان کے سامنے پہنچ کر ایک ہیبت محسوس ہوتی تھی، صاف گوئی اور ظاہر وباطن کی یکسانی معروف وممتاز تھی، ہر ایک سے بات نہایت صاف، بے لاگ اور بے جھجک فرماتے تھے، سریع الغضب تھے، غصہ آتا تو ایک دم آتا اور ایک دم بات کھری کھری فرماتے تھے اور دوسرے کی صفائی پیش کر دینے پر اس مجلس میں ایک دَم فرو ہوجاتا اور اس مغضوب پر بے حد مہربان ہوجاتے اور غیر معمولی شفقت فرماتے۔

غرض طلبہ اور مدرسین سب پر ان کی وجاہت کے اثرات تھے جس کو چار چاند حضرت شیخ الہند کے نیاز مندانہ رنگ کی باطنی توجہات وتصرفات اور معنوی قوتِ ہمت نے اور اُدھر حضرت گنگوہی کی سرپرستی اور روحانی اعانت نے لگائے، تا آنکہ اس دور میں مدرسہ دارالعلوم بنا اور اس نے مالی اور علمی حیثیت سے نمایاں ترقیاں کیں۔ عمارت کی وسعت، شعبہ جات کا پھیلاؤ، شاندار اجتماعات، ملک

میں دارالعلوم کی عمومی روشناسی، قوم اور حکومت دونوں کا اس سے تاثر وغیرہ اسی دور کی پیداوار ہیں جس سے دارالعلوم ہمہ جہتی ترقی کرتا ہی چلا گیا۔

کام کے بڑھ جانے پر حضرت حافظ صاحب کی نگاہِ انتخاب اپنی نیابت کے لئے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب پر پڑی، حبیبِ دوراں مانے ہوئے مدبر، زیرک، عالم ربانی، ادیب اور بافراست بزرگ تھے، ان کے تدبر نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا، اب تدبیر وسیاست ان کی تھی، وجاہت وجرأت اور قوت حافظ صاحب کی، اور ہمت باطنی اور پشت پناہی حضرت شیخ الہند کی تھی، ان تینوں سروں کے جڑنے سے دارالعلوم نے وہ ترقی کی کہ وہ زمین سے اٹھ کر آسمان تک پہنچ گیا۔

حضرت حافظ صاحب ہی کے دورِ اہتمام میں دارالحدیث کی عظیم الشان عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اور حضرت ممدوح کی طرف سے جونہی اس عمارت کی تجویز کا اعلان شائع کیا گیا ویسے ہی بارش کی طرح چندہ گویا آسمان سے برسنا شروع ہوگیا، پھر طلباء کی کثرت ہوئی، تنگیٔ مکان کی وجہ سے ایک عظیم الشان دارالاقامہ (دارالجدید) کی بنیاد ڈالی گئی اور اس کے وسط میں مقدس دارالحدیث کی سر بفلک عمارت کے لئے بنیادیں کھودی گئیں، جس کے بھرنے میں تمام اساتذہ وطلباء اور اکابرِ دارالعلوم نے مزدوروں کی طرح کام کیا، لیکن ان دونوں عمارتوں کی تکمیل حضرت ممدوح کے دور میں نہ ہوسکی جو بعد کے دورِ اہتمام میں مقدر تھی۔

یادگار جلسۂ دستار بندی

دارالعلوم کا یادگار عظیم الشان جلسۂ دستار بندی جس میں تقریباً ایک لاکھ آدمیوں نے شرکت کی اور اس کی عظمت وشان کے عجیب وغریب واقعات ہیں جو ایک مستقل روداد میں شائع ہوچکے ہیں، حضرت حافظ صاحب کے دورِ اہتمام میں ہوا جس میں تقریباً ایک ہزار فضلائے دارلعلوم دیوبند کی دستار بندی ہوئی، اسی جلسہ میں حضرت حافظ صاحب نے ترقیاتِ دارالعلوم پر مشتمل ایک جامع مانع تحریر پڑھی تھی جس کا عنوان ''زریں ماضی ومستقبل'' تھا، یہ زریں ماضی ان کے ابتدائی دورِ اہتمام اور اس سے پہلے کے دورِ اہتمام کی تھی اور زریں مستقبل خود انکے دورِ اہتمام کا انتہائی حصہ تھا، جس کا ظہور اس تحریر کے بعد ہوا، اور ان ہی مرقوم پیش بندیوں کے مطابق ہوا جو اس تحریر میں پیش کی گئیں تھیں۔

دار العلوم کی ترقی کے لئے جدوجہد

حضرت حافظ صاحب نے ترقیاتِ دار العلوم کے سلسلہ میں بڑے بڑے سفر کئے اور دار العلوم کے دوامی چندے مقرر کرائے، قابل تذکرہ اور یادگار سفر بہاول پور، بھوپال اور حیدرآباد دکن کے تھے، سر آصف جاہ کے دورِ صدارت میں بعہدِ اہتمام حضرت مولانا رفیع الدین صاحب دار العلوم دیوبند کی امداد حیدرآباد دکن سے ابتداءً صرف سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئی تھی، حضرت مرحوم نے ایک سفر کیا تو سو کے ڈھائی سو ہوئے اور چند سال بعد دوسرا سفر کیا تو ڈھائی سو کے پانچ سو ہوئے اور چند سال کے بعد پھر سفر کیا تو پانچ سو کے ہزار روپے ماہوار ہو گئے، جو انقلاب ۱۹۴۷ء تک برابر جاری رہے۔ صدر جمہوریہ ہند کے جدید دستور کے تحت ایسی مذہبی امدادوں کی راہیں مسدود ہو گئیں۔

آج کے دور میں سو، اڑھائی سو، پانچ سو اور ہزار کی مقدار ممکن ہے کہ حقیر دکھائی دے جبکہ روپیہ ڈھائی آنہ کا رہ گیا، لیکن یہ اس زمانہ کے سو اور ہزار ہیں جبکہ روپیہ آج کی نسبت آٹھ گنا تھا اور ہزار کے معنی آج کے آٹھ ہزار کے تھے، اندازہ کیا جائے کہ اس کی کیا قدر و قیمت تھی اور اس کے لانے والے کس عظمت کی نگاہ سے دیکھے گئے ہوں گے۔

یہ اس سے واضح ہے کہ حضرت حافظ صاحب جب بھی سفر دکن سے کامیاب ہو کر واپس آئے تو احاطۂ دار العلوم میں خیر مقدم اور مبارک باد کے عظیم الشان جلسے منعقد ہوئے، نظم اور نثر میں کارکنانِ دار العلوم تشکر و امتنان کا ہدیہ پیش کرتے اور انتہائی قدر دانی کے ساتھ امداد کے ان اضافوں کو سر آنکھوں پر رکھتے تھے۔ دکن کی امداد کے ایک ہزار روپیہ ماہوار تک آجانے پر جب حضرت حافظ صاحب دکن سے دیوبند واپس ہوئے تو درسگاہ نودرہ میں ایک عظیم الشان جلسۂ خیر مقدم منعقد ہوا اور اس میں حضرت علامہ مولانا انور شاہ صاحب نے عربی میں اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے اردو میں تہنیت و تبریک کے بلیغ قصیدے پڑھے، اس موقع پر میں نے بھی ایک اردو قصیدہ لکھ کر سنایا تھا۔

چنانچہ سابقہ رودادوں میں ان جلسوں کے تذکرے موجود ہیں، آپ کے زمانۂ اہتمام میں دو مرتبہ صوبہ یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر دار العلوم میں آئے، پہلی مرتبہ سر لاؤ گن لاٹوش اور دوسری مرتبہ سر جیمس مسٹن اور ہر دو دفعہ میں ان ذمہ دارانِ حکومت کو حضرت حافظ صاحب نے پورے حوصلے کے

ساتھ بلا کر دارالعلوم کے اہم مرحلے طے کئے، پہلی مرتبہ گورنر کے آنے سے وہ نزاعات ختم ہو گئے جو مخالفین دارالعلوم نے دارالعلوم کے خلاف کھڑے کر دیئے تھے اور جس سے دارالعلوم کی عافیت تنگ ہو گئی تھی حتیٰ کہ مقدمہ بازیوں کی نوبت آ گئی تھی اور دارالعلوم کے ذمہ داروں کو عدالتوں میں کھینچے کھینچے پھرنے کے سامان کر دیئے گئے تھے، اور دوسری دفعہ میں دارالحدیث مجوزہ اور فی الوقت موجودہ عمارت کے نیچے جو گندہ نالہ بہہ رہا تھا جس کی وجہ سے نہ یہ عظیم عمارت ہی بن سکتی تھی اور نہ دارالعلوم کی آب وہوا درست رہ سکتی تھی، اٹھوا دیا اور دارالعلوم کو اپنی تعمیر اور عمارتی ترقیات کے لئے وسیع میدان ہاتھ آ گیا، چنانچہ اب اسی زمین اور اس کے ملحقہ قطعات میں دارالعلوم کی جدید عمارت بڑھتی جا رہی ہے۔

یہ واقعات اور ان جیسے بہت سے واقعات جو روداد ہائے دارالعلوم میں محفوظ ہیں، اس کے شاہد عدل ہیں کہ حضرت حافظ صاحب کی خداداد وجاہت کا اثر حکام پر بھی پڑتا تھا اور اس سے دارالعلوم کے مشکل مہمات کو آسانی سے حل کر لیتے تھے۔

غرض شیخ الہند آپ کے پشت پناہ تھے اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب آپ کے دانشمند مشیر اور وزیر باتدبیر تھے، اور اس طرح ظاہری وباطنی تقویت کے ساتھ حضرت حافظ صاحب کی ذاتی وجاہت اور ہمت وجرأت بڑے بڑے مشکل مرحلے انجام کو پہنچا رہی تھی۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں تدبیریں تو ہزاروں کر لوں گا مگر حافظ صاحب کی سی وجاہت کہاں سے لاؤں گا؟ اس لئے جس موقع پر ان کا ترکش تدبیر کے تیروں سے خالی ہو جاتا تھا اور ضرورت پڑتی تھی کہ اب وجاہت ورعب اور حکم سے کام لیا جائے تو وہاں حضرت حافظ صاحب کو آگے کر دیتے تھے اور ان کی ہیبت وہ مشکل مرحلہ منٹوں میں حل کر دیتی تھی۔

حضرت مولانا ابراہیم صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کا بیان ہے (اور میں نے دوسرے بزرگوں سے بھی یہ واقعہ سنا ہے) کہ حضرت شیخ الہند کی مستمر عادتِ شریف رمضان شریف میں تراویح مدرسہ میں ادا کرنے کی تھی، چنانچہ سالہا سال تک میں بھی اپنے بچپن میں یہ معمول دیکھتا رہا، مالٹا کی روانگی سے چند سال قبل حضرت نے بعض اعزہ کی فرمائش واصرار پر دولت خانہ ہی پر

تراویح پڑھنے کا ارادہ فرمایا اور مدرسہ کی طرف سے غلط رائے قائم ہو جانے کا اندیشہ تھا اسلئے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے حضرت حافظ صاحب سے فرمایا کہ اس گتھی کو آپ ہی حل فرمائیں گے اور اس کی تدبیر یہی ہے کہ آپ حضرت سے صرف اتنا پوچھ لیں کہ حضرت آپ تراویح امسال کہاں پڑھیں گے، چنانچہ حافظ صاحب وہاں تشریف لے گئے اور حضرت سے پوچھا حضرت نے اپنی عادت کے مطابق لجاجت آمیز لہجہ میں فرمایا کہ بھائی حافظ جی میں اب کمزور ہو گیا ہوں، رات کو مدرسہ آنا جانا کچھ دشوار سا ہو گیا ہے، اس پر حافظ صاحب نے فرمایا کہ میں تو صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ آپ تراویح کہاں پڑھیں گے؟ آپ جہاں بھی پڑھیں ہمیں بھی وہیں پڑھنا ہے، آپ کو چھوڑنا نہیں، اس پر پھر سماجت کے لہجہ میں فرمایا کہ نہیں تم تراویح مدرسہ ہی میں پڑھو مجھے یہیں مکان پر رہنے دو، اس پر حافظ صاحب نے ذرا غصہ اور مایوسی آمیز لہجہ میں فرمایا کہ بہت اچھا اور اٹھ کر چلے گئے۔ حافظ صاحب تیس چالیس قدم ہی چلے ہوں گے کہ حضرت اٹھے، کمرہ میں سے اپنی لاٹھی اٹھائی اور حافظ صاحب کے مکان کی طرف روانہ ہوئے۔ حافظ صاحب گھر میں جا چکے تھے، جا کر آواز دی تو حضرت حافظ صاحب کی والدہ ماجدہ خود دروازہ پر تشریف لائیں، جن کا حضرت شیخ الہند انتہائی احترام فرماتے تھے، حضرت حافظ صاحب کی والدہ ماجدہ نے فرمایا کہ محمود حسن! حضرت قاسم کے کیا کئی بیٹے ہیں کہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو پکڑنا ہے؟ تمہیں شرم کرنا چاہئے، اس پر حضرت شیخ الہندؒ نے بہت عاجزی سے فرمایا کہ قصور معاف کر دیجئے میں تراویح ساتھ ہی پڑھوں گا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ کتب خانہ دارالعلوم میں تقسیم اسباق کا سلسلہ جاری تھا، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب صحیح مسلم حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کو دینا چاہتے تھے، وہ مانتے نہ تھے اور اس طرح یہ سبق کسی ایسے مدرس کے پاس جا رہا تھا جس کے پاس نہ جانا چاہئے تھا، جب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی تفہیم کوئی اثر نہ دکھا سکی تو انہوں نے چپکے سے حضرت حافظ صاحب کے پاس آدمی بھیج دیا کہ وہ بھی کتب خانہ میں تشریف لے آویں اور واقعہ کی صورت حال ان سے کہلا دی۔ حضرت ممدوح اچانک حلقۂ مدرسین میں تشریف لے آئے، صحیح مسلم کا ذکر آیا تو فرمایا مولانا شبیر

صاحب یہ کتاب اپنے نام لکھو، انہوں نے کچھ عذر بیان کرنا چاہا، فرمایا پہلے سبق لکھو پھر بولو، انہوں نے آخر کار سبق لکھ دیا اور یہ سبق شروع کر دیا۔

محاسن واوصاف

حضرت حافظ صاحب کی بعض اور بھی خصوصیات ممتاز اور معروف تھیں، ان میں سب سے زیادہ نمایاں ان کے ظاہر وباطن کی یکسانی تھی اور اپنی فطری ساخت کے لحاظ سے اس پر قدرت ہی نہیں رکھتے تھے کہ دل میں کچھ رکھیں اور ظاہر کچھ کریں، یا مکنوناتِ قلب میں بطور تدبیر ہی کچھ کھولیں اور کچھ چھپالیں، ان کی ہر قلبی کیفیت رنج ہو یا خوشی فوراً چہرہ پر نمایاں ہو جاتی تھی، جس کو وہ فطرۃً چھپا ہی نہ سکتے تھے، کسی سے خوش ہوتے تو ظاہر وباطن خوش، رنجیدہ ہوتے تو ظاہر وباطن رنجیدہ، خلقۃً طبیعت بے لوث تھی، اخلاص اور اعتماد علی اللہ کا مادہ نمایاں رہتا تھا۔

ان کے طریقِ اہتمام میں بھی رسمی تدبیر یا جوڑ توڑ یا مصلحت اندیشیوں اور دفع الوقتیوں کا نشان نہ تھا، معاملہ دوٹوک صاف صاف اور کھلا ہوا ہوتا تھا، جس سے دوست ودشمن یکساں مطمئن رہتے تھے اور اس کے ساتھ جرأت وحوصلہ ہمہ وقتی تھا۔

نزاعات کے زمانہ میں جبکہ قصبہ دیوبند کے بعض بزرگوں کا دارالعلوم سے اختلاف شدت سے جاری تھا، مجلس شوریٰ کا جلسہ منعقد ہوا، کسی نے آ کر کہا کہ چھتہؔ کی مسجد کے اس حجرہ پر بھی مخالف حضرات نے قبضہ کر لیا ہے جو حضرت نانوتوی کی جائے رہائش اور مدرسہ کے تصرف میں تھا اور اس پر تالا ڈال دیا گیا ہے، اربابِ مجلس میں تشویش کے ساتھ بحالِ قبضہ کی تدابیر پر غور کیا جانے لگا، مخالفین کی قوت کے پیش نظر اس سے مایوسی نظر آتی تھی کہ بلا قوت کے قبضہ کیا جا سکے اور قوت مفقود تھی بلکہ مادی قوت زیادہ تر فریق مخالف کے ہاتھ میں تھی، اس غور وفکر کے دوران حضرت حافظ صاحب مجلس سے اٹھے اور اہل مجلس سے فرمایا کہ میں ابھی حاضر ہوا، اور سیدھے مسجد چھتہ پہنچے جبکہ صحن مسجد مخالف جماعت سے بھرا ہوا تھا، کافی خطرہ کا سامان تھا اور اس وقت کی نوعیت یہ تھی کہ جان اور آبرو دونوں ہی خطرات میں گھری ہوئی تھیں، حافظ صاحب نے اسی مجمع میں بآوازِ بلند خطاب کرتے ہوئے مجمع کے صدر نشیں سے کہا کہ حجرہ کی کنجیاں دلوایئے، مجمع پر سکوت چھا گیا، منٹ بھر کے بعد وہ بزرگ اٹھے اور

حجرہ کے تالے میں کنجیاں ڈال کر اپنی جگہ آبیٹھے، حضرت حافظ صاحب نے تالا لگا کر کنجی جیب میں رکھی اور مجلس شوریٰ میں لاکر پیش کر دی کہ حجرہ پر قبضہ لے آیا ہوں، یہ کنجی حاضر ہے۔ اربابِ مجلس اس جرأت پر حیران رہ گئے اور کہا کہ اگر آپ اطلاع کر کے جاتے تو ہم کبھی نہ جانے دیتے۔

اسی طرح جرأت مندانہ اقدام کے سلسلہ میں نزاعات کے مواقع پر طلبہ کی حمایت اور پشت پناہی کرتے ہوئے ایک ایک طالب علم کے لئے سینہ سپر ہو کر پورے پورے مجامع کے سامنے تنہا آجاتے تھے، کسی کا خوف یا رعب نہیں مانتے تھے۔ اکثر ایسے مواقع پر یہ جملہ فرماتے کہ کیا تم نے ان کو (طلبہ کو) لاوارث سمجھا ہے جسے ان کے سامنے آنا ہو تو سر پر توا باندھ کر آئے، طلبہ کو جہاں بسلسلہ تربیت جزئی امور پر روک ٹوک کرتے اور ڈانٹتے تھے، زدوکوب کر دیتے تھے، وہیں بے حد شفیق اور مہربان بھی تھے۔ اگر کوئی طالب علم کچھ زیادہ بیمار ہو جاتا تو گھنٹوں اس کے بالین پر بیٹھے ہوئے اسے تسلی دیتے رہتے، اس کے علاج کا اہتمام فرماتے اور بعض دفعہ اس کی تکلیف سے دل گیر ہوتے اور روتے، گھر آکر بے چینی سے فرماتے کہ آج ہمارا فلاں طالب علم بیمار ہے، منہ میں کھانا نہیں چلتا، اگر کسی طالب علم کا انتقال ہو جاتا تو اس کے حجرہ کے سامنے چارپائی بچھا کر گھنٹوں بیٹھے رہتے اور اس وقت تک نہ اٹھتے جب تک اس کا جنازہ تیار ہو کر حجرہ سے چل نہ پڑتا، اسی لئے اس دور کے طلبہ ان پر فریفتہ اور ان کے ثناخواں نظر آتے تھے، نظم میں یکسوئی اور قوت میں ہمہ گیری تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت حافظ صاحب اپنی نسبت، ذاتی وجاہت، جرأت وہمت اور علم واخلاص کی بناء پر دارالعلوم کے کامیاب ترین سربراہ اور اس کی ترقیات کا محور ومرکز تھے اور پوری جماعتِ دارالعلوم ان نسبتوں کے سبب ان سے وابستہ اور ان کے سامنے جھکتی تھی۔

درس وتدریس

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب ممدوح علاوہ نسبتِ قاسمی کے نسبتِ طریقت میں بھی اپنی خصوصیات رکھتے تھے۔ آپ رئیس الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے بیعت اور ان کے خلیفہ مجاز بھی تھے۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا جس کے ایک شاہد مولانا مبارک علی صاحب نائب مہتمم بھی ہیں کہ حضرت حافظ صاحب کی نسبتِ صلوٰتیہ اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اس بنا پر حضرت

حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے انہیں مجازِ بیعت فرمایا۔ بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی تھا مگر بہت کم، توجہ زیادہ تر نظمِ دارالعلوم پر یا پھر حلقۂ درس کی طرف مائل تھی۔ وعظ وتقریر نہایت مؤثر اور درس نہایت دلنشیں ہوتا تھا۔ پورے زمانۂ اہتمام میں حضرت ممدوح نے درس کا مشغلہ کبھی ترک نہیں فرمایا۔ مجھے یاد ہے کہ ابتدائی دور میں درس اکثر دارالاہتمام (دارالمشورہ) میں دیتے تھے، پھر مسجد میں درس دینے لگے تھے۔ میرے دورہ کے سال میں درس اسی درسگاہ میں دیا جس میں عام دروسِ حدیث ہوتے تھے یعنی درسگاہ بالائی جانب شمالی جس میں آج دفتر تعلیمات ہے۔

احقر نے مشکوٰۃ شریف اور صحیح مسلم شریف ان ہی سے پڑھی ہیں، بلکہ ان دو سالوں میں یہ کتابیں حضرت ممدوح نے میری ہی وجہ سے لیں ورنہ کئی سال سے بوجہ ضعف ونقاہت درس کا سلسلہ بند تھا۔ درسِ مشکوٰۃ مسجد مدرسہ میں ہوا اور درسِ مسلم درسگاہِ حدیث میں، تفہیم اس درجہ دلنشیں تھی کہ میں نے اس دور میں یہ اندازِ تفہیم دوسرے درسوں میں نہیں دیکھا۔ یہ ایک عام بات تھی اور خود مجھ پر گذری ہوئی بات ہے کہ درسِ حدیث میں جو تقریر بھی کسی معرکتہ الآراء حدیث پر فرماتے وہ باوجود مفصل ہونے کے اس درجہ دلنشیں ہوتی اور ان کے اندازِ تفہیم سے اس قدر دل میں اتر جاتی کہ اگر طالب علم بھلانے کا قصد بھی کرتا تب بھی وہ شاید بھول نہیں سکتا تھا۔

تقریر نہایت مرتب، مبادی اور مقدمات پر مشتمل، نتائج سے لبریز اور ساتھ ہی قلبی تاثرات سے بھرپور ہوتی تھی، جو زبان وکلام کے راستے سے دل میں اثرات پیدا کرتی اور بیٹھ جاتی تھی۔ مشکوٰۃ شریف میں جب کتاب الجنائز آئی اور عام برزخ کے حوادث وواقعات کی روایتیں گذریں تو حضرت ممدوح نے ایسے تاثر اور درد آمیز شوق کے ساتھ ان پر کلام فرمایا کہ گویا عالمِ برزخ ہماری نگاہوں کے سامنے تھا اور اس وقت دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کے شوق کا ایک ایسا غلبہ قلوب میں محسوس ہوتا تھا کہ گویا ہم دنیا میں ہیں ہی نہیں۔

درس کا ایک خاص انداز یہ بھی تھا جو اور کسی درس میں نظر نہیں آیا کہ افعالِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو روایتیں کسی ہیئتِ عمل پر مشتمل ہوتی تھیں انہیں علمی طور پر سمجھا کر پھر ان کی ہیئتِ عمل بنا کر کے بھی دکھلاتے تھے، صفتِ رکوع کی حدیث آئی تو درس ہی میں رکوع کر کے دکھلایا۔ سجدہ کی آئی تو سجدہ

کر کے دکھلایا۔عقدِ انامل کی آئی تو انگلیوں سے عقود باندھ کر دکھلائے۔ رنّۃ النیان کی حدیث آئی تو اس رفیق کی آواز بنا کر سنائی اور فرماتے کہ میں نے حدیث کے درس کے وقت یونہی کرتے ہوئے دیکھا تھا، اور فرماتے تھے کہ اگر اساتذۂ حدیث اور محدثین ہیئاتِ عمل یونہی کر کے دکھلانے کا معمول نہ رکھتے تو آج کسی شرعی عمل کی کوئی مطلوبہ ہیئت تم لوگ محض الفاظِ کتاب سے متعین نہیں کر سکتے تھے۔ حدیث پڑھاتے وقت عظمتِ حدیث کے ساتھ ساتھ اپنے اساتذہ وشیوخ کے انتساب کی عظمت وحرمت نہ صرف قول ہی سے فرماتے بلکہ صورت سے بھی اسے نمایاں کرنے کی سعی فرماتے تھے۔

جس سال حضرت حافظ صاحب کے یہاں مشکوٰۃ شریف کے درس میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی اور مولانا محمد مبارک علی صاحب نائب مہتمم دارالعلوم بھی شریک تھے، اس سال مشکوٰۃ شریف خاص اہتمام سے پڑھائی اور ختم میں بھی خاص اہتمام اختیار فرمایا۔ ختم کے دن حضرت ممدوح حضرت گنگوہیؒ کا وہ جبہ پہن کر درس کے لئے تشریف لائے جو حضرت نے انہیں بطور سند وتبریک عطا فرمایا تھا، مولانا مبارک علی صاحب کا بیان ہے کہ اس دن چہرہ سے غیر معمولی وقار وتمکنت نمایاں تھا۔ اس سال حضرت ممدوح کا درس دارالمشورہ میں ہوا تھا اور غیر معمولی انداز کا تھا، نیز ان ہی کا بیان ہے کہ درس میں تقریر نہایت جم کر فرماتے جو علمی وقار وعظمت لئے ہوتی۔ حدیث کے معرکۃ الآراء مسائل پر جامع کلام فرماتے جو حقائق پر مشتمل ہوتا تھا۔

مولانا مبارک علی صاحب نے فرمایا کہ ایک دن ایک معرکۃ الآراء مسئلہ پر پورے چار گھنٹے تقریر فرمائی جو بے نظیر حقائق ومعارف پر مشتمل تھی اور تمام طلبہ محوِ حیرت اور مستغرق تھے، اس کے ساتھ اپنے والد ماجد حضرت اقدس مولانا نانوتوی قدس سرہ' کی کتب پر غیر معمولی نظر تھی اور حدیث وتفسیر میں حضرت اقدس کی تقریریں مناسبِ موقع ذکر فرماتے تھے، جس سے اس مسئلہ کا تحقیقی پہلو سامنے آ کر مسئلہ اپنی حقیقت سمیت روشن ہو جاتا تھا اور قاسمی حکمت سے خود بخود مناسبت پیدا ہو جاتی تھی۔ حضرت نانوتوی کے تلامذہ کے بعد حضرت اقدس کی حکمت پر سب سے زیادہ حاوی تین شخصیتیں تھیں ایک حضرت والد ماجد حضرت حافظ صاحب دوسرے مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور ان کے بعد تیسرے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ۔ اول الذکر کے حفظ کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی مسئلہ کے

بارے میں پوچھا جاتا کہ حضرت کی کتاب میں یہ مسئلہ کہاں ملے گا تو بے تکلف ان سب کتابوں کے نام معہ صفحہ وورق بتلا دیتے جہاں مسئلہ مذکورہ ہوتا تھا۔

بہر حال درس میں وہ عالی مضامین نقل فرماتے جس سے حدیث منقول معقول نظر آنے لگتی تھی اور پورا دین عقلی محسوس ہونے لگتا تھا۔ درس میں یہ انداز نہایت متین اور متواضعانہ ہوتا تھا اور وہ طبعی جلال یا تیزی یکسر مبدل بہ شفقت ہو جاتی تھی جو عام حالت میں ایک طبعی انداز تھا۔ بہر حال علمی لائن میں تفہیم بے نظیر، قول کے دائرہ میں تاثیر ممتاز، تحقیق عالی اور تبیین واضح تر تھی جس نے ان کے درس کو مقبول بنا دیا تھا۔ اگر یہ اہتمام کے جھگڑے ان کے سر نہ ہوتے تو اس وقت ان کی یہ علمی خصوصیت زیادہ سے زیادہ نمایاں اور مؤثر ثابت ہوتی اور اس میدان میں ان کی امتیازی شہرت ہوتی، لیکن یہ بھی ان ہی اکابر کا کمال تھا کہ انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ علمی میدان میں بھی پیچھے نہ رہتے تھے جو کمالِ استعداد کی دلیل ہے۔ ان تمام علمی و عملی مشغولیتوں کے ساتھ ذکر وفکر کے اشغال بھی پابندی کے ساتھ جاری رکھتے تھے، اسی کی تاثیر تھی جو کلام میں نمایاں ہوتی تھی۔

حضرت حافظ صاحب کی ایک خاص صفت اعتماد علی اللہ ممتاز تھی، کسی بھی موقع پر کیسا بھی حادثہ اور اشکال پیش آتا تو کبھی ہراساں نہ ہوتے، بلکہ اسی وقت قلب کی توجہ حق تعالیٰ کی طرف پھیر دیتے اور غیر اللہ سے یکدم اتنے بیگانہ ہو جاتے کہ گویا اس سے انہیں کبھی کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔

میری والدہ صاحبہ نے مجھے یہ واقعہ سنایا کہ ایک شب حضرت ممدوح کو انہوں نے دیکھا کہ سوتے سے جاگ گئے ہیں اور بہت ہی مضمحل اور ضعیف حالت میں ہیں، میں نے سبب پوچھا تو فرمایا مجھے ابھی قلب کا شدید دورہ پڑا جس سے میں سمجھا کہ شاید میرا وقتِ اخیر آچکا ہے۔ اس پر میری والدہ نے کہا کہ پھر مجھے آواز دے کر جگا کیوں نہ لیا۔ فرمایا معاذ اللہ! ایسے وقت میں میں تمہیں جگاتا یا اپنے اللہ کو یاد کرتا، میں نے تو اس آن سارے تعلقات سے قلب کو فارغ کر کے صرف حق تعالیٰ کی طرف توجہ کی اور دعاء واستغفار میں مشغول ہو گیا۔

مرضِ وفات

مولانا محمد علی صاحب حیدر آبادی نے فرمایا کہ اخیر سفر حیدر آباد میں جو سفر آخرت بھی تھا، جب

حضرت ممدوح بحالت مرض حیدر آباد میں تھے اور ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ حالت غیر ہوتی جا رہی ہے تو میں نے عرض کیا کہ حضرت اجازت ہو تو تار دے کر طیب وطاہر کو دیو بند سے بلالوں؟ چیں بجبیں ہو کر فرمایا استغفر اللہ! یہ طیب وطاہر کو بلانے کا وقت ہے یا اللہ کی طرف رجوع کرنے کا ہے اب میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔ نیز مولانا مرحوم نے فرمایا کہ پھر اس مرضِ وفات میں جب بقصد دیو بند روانگی ہوگئی، سیکنڈ کلاس میں ہم چار پانچ آدمی حضرت ممدوح کے رفیق سفر تھے تو استنجاء سے فارغ ہو کر فرمایا کہ مجھے وضو کرادو۔ لیٹے لیٹے وضو سے فارغ ہوئے فرمایا کہ میرے کپڑوں پر کوئی دھبہ کسی ناپاکی کا تو نہیں ہے؟ ناپاکی سے ملائکہ علیہم السلام کو سخت نفرت ہے اور انہیں اذیت ہوتی ہے۔ عرض کیا گیا کہ کپڑے سب پاک ہیں آپ اطمینان فرمائیں۔ اسی پر فرمایا الحمد للہ، اور پھر فرمایا اچھا اب حضرت تھانوی کو میری طرف سے ایک خط لکھو، چنانچہ میں (مولانا محمد علی مرحوم) خط لکھنے بیٹھ گیا اور جو لکھاتے رہے لکھتا رہا۔ اس میں اپنے عجیب وغریب قلبی حالات کا تذکرہ فرمایا، آخری جملہ یہ تھا کہ:

''الحمد للہ میرا قلب ذکر سے غافل نہیں اور اس میں حق تعالیٰ کی ہر تقدیر پر بخوشدلی راضی ہوں۔''

یقین محکم

بہر حال ان کے قلب کی ایک خاص حالت تھی کہ جب کوئی حادثہ پیش آتا تو ہر تعلق اور علاقہ کو چھوڑ کر بلکہ اس سے بیگانۂ محض بن کر صرف حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے اور اس پر قلبی گہرائیوں سے پورا بھروسہ کر کے ہر غیر سے اجنبیٔ محض اور ایسے بے واسطہ ہو جاتے جیسے ان لوگوں سے انہیں کبھی کوئی معمولی واسطہ بھی نہ تھا۔ کچھ ایسے ہی احوال ان کی بیماری میں مشاہدہ کئے جاتے تھے۔ جب بیمار ہوئے تو بعض اوقات تو معمولی سی بیماری اور تکلیف پر بہت زیادہ کراہ اور ہائے ہائے اور اظہارِ درد و تکلیف ہوتا تھا اور بعض دفعہ بڑے بڑے شدید مرضوں کے حملے ہوئے اور ساکتِ محض رہتے۔ عرصہ کے بعد پتہ چلتا کہ فلاں بیماری شدید آئی تھی جو چلی بھی گئی ہے۔ اور کبھی دوا کا اہتمام فرماتے ورنہ عام حالات میں دوا بالکل نہیں کرتے تھے۔

ایک دن معمولی سی بیماری میں کراہنے کا سلسلہ جاری تھا تو میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ

غیر معمولی طور پر یہ کراہنا کہیں توکل ورضا بالقضاء کے منافی تو نہیں؟ تو ہنس کر فرمایا نالائق ہمیں نصیحت کرنے کے لئے بیٹھا ہے اور پھر فرمایا بیٹھ جاؤ اور فرمایا کہ میں نے اپنے تین بزرگوں کو صرف دیکھا ہی نہیں بلکہ برتا ہے۔ میرے پیرومرشد حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ، میرے والد ماجد حضرت نانوتویؒ اور میرے سرپرست اور مربی حضرت گنگوہیؒ، بیماری کے معاملہ میں ان تینوں کے تین حال تھے۔

حضرت حاجی صاحبؒ کا حال تو یہ تھا کہ معمولی سی بیماری بھی آجاتی تو کول کراہ سے مکان سر پر اٹھا لیتے، بعض خدام نے عرض کیا کہ حضرت یہ عبدیت کے منافی تو نہیں؟ فرمایا کہ کیا میں اپنے اللہ کے سامنے بہادر بنوں؟ کہ آپ کا ہر ابتلاء اور امتحان برداشت کرنے کی مجھ میں طاقت ہے اور میں ہر آزمائش کو اٹھا سکتا ہوں۔ فرمایا کہ بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ معمولی سے معمولی ابتلاء میں بھی اپنا ضعف اور عجز، بے چارگی آدمی ظاہر کردے اور عرض کردے کہ یا اللہ میں تو بہت کمزور اور ضعیف بندہ ہوں مجھ میں تیری آزمائش اٹھانے کی طاقت کہاں۔ یہی عبدیت ہے۔

حضرت والد ماجد مولانا نانوتویؒ کا یہ حال تھا کہ بڑی سے بڑی بیماری آجاتی تو کسی کو پتہ نہ دیتے۔ اس قدر ضبط وتحمل ہوتا تھا کہ کسی کو بیماری کا احساس بھی نہیں ہوسکتا تھا، مہینوں میں اتفاقیہ اگر ضمن کلام میں حضرت ہی کی زبان سے کبھی اظہار ہوگیا تو پتہ چل جاتا تھا کہ کسی شدید مرض کا حملہ ہوا تھا۔

عرض کیا گیا کہ ظاہر ہوجاتا تو کچھ نہ کچھ تدارک اور دفعِ مرض کی تدبیر ہوسکتی تھی۔ فرمایا حق تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی آئے اسے تسلیم ورضا کے ساتھ قبول کرنا چاہئے اور گردن جھکا دینی چاہئے کہ ''ہر چہ از دوست می رسد اوراست'' یہ عبدیت اور فنا ہے کہ کچھ بھی ہو آدمی اف نہ کرے اور معاملہ حق تعالیٰ کے سپرد کردے جو کچھ کہے ان سے کہے۔ اِنَّمَآ اَشْكُوْ بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ.

جب طبیبِ مطلق وہ ہے اور بیمار اور اس کی بیماری کا خبیرِ مطلق بھی وہی ہے تو وہی بندہ کی مصلحت سے واقف ہے، اس لئے تفویض مطلق پر عمل کرنا اور تسلیم ورضا کا شیوہ اختیار کرنا ہی مقامِ عبدیت ہے۔

اور فرمایا کہ حضرت گنگوہیؒ کا حال بیماری میں یہ تھا کہ نہ تو کولتے نہ کراہتے، نہ ساکت رہتے بلکہ علاج کی طرف زیادہ توجہ ہوتی اور اہتمام ہوتا کہ طبیب کو بلاؤ اور دوا کا انتظام کرو اور پرہیز یہ ہونا چاہئے اور غذا فلانی ہونی چاہئے، اور فرماتے کہ بیماری میں علاج کا اہتمام سنت ہے اور سنت کی پیروی ہی مقامِ عبدیت ہے کہ آدمی اپنا طبعی جذبہ چھوڑ کر شریعت کے اوامر کی پیروی کرے اور مقامِ طبیعت سے ہجرت کر کے وطن شریعت میں جا بسے کہ یہی بندگی اور یہی مقامِ عبدیت کا تقاضا ہے۔

غرض بندگی اور عبدیت کے مختلف چولے نکلے۔ یہی بندگی اور عبدیت ایک جگہ اظہارِ ضعف وبے چارگی کے چولے میں نمایاں ہوئی اور ایک جگہ تفویض اور تسلیم ورضا کی شکل میں ظاہر ہوئی اور ایک جگہ اتباعِ سنت اور پیروی ٔشریعت کی صورت میں کھلی اور تینوں رنگ بلاشبہ اپنی اپنی جہت سے عبدیت ہی کے ہیں۔

حضرت حافظ صاحب نے یہ تین واقعے سنا کر فرمایا کہ جب میں بیمار ہوتا ہوں تو کبھی تو حضرت پیرومرشد کے حال کی پیروی کرتا ہوں کبھی اپنے حضرت قبلہ والد ماجد کے حال کی اور کبھی اپنے مربی استاذ حضرت گنگوہیؒ کے حال کی، اور یہ تینوں حال چونکہ عبدیت کے ہیں اس لئے میں کسی حال کی بھی پیروی میں عبدیت ورضا بالقضاء سے الگ نہیں ہوتا۔

یہ کیفیات ان ہی قلوب پر طاری ہوسکتی ہیں جنہوں نے محنتیں کر کے اخلاص للہ کا مقام پیدا کیا ہو، اور پوری دنیا کو آخرت کا وسیلہ یقین کر کے مقامِ رفیع پر پہنچ چکے ہوں۔ وہ اسی کا اثر تھا کہ باوجودیکہ حق تعالیٰ نے دنیوی لحاظ سے سب کچھ دیا تھا، جان بھی اور مال بھی اور مال کے سلسلہ میں جائیداد باغ مکانات سب ہی کچھ تھے اور آخر میں حیدرآباد کی عدالتِ عالیہ کے مفتی کی حیثیت سے ایک ہزار روپے ماہوار مشاہرہ بھی تھا، اڑھائی سو روپیہ ماہوار سرکاری منصب بھی تھا جو بہت پہلے سے حیدرآباد سے جاری تھا، لیکن روپیہ پیسہ سے لگاؤ کبھی نہیں ہوا، نئے سکوں میں جب یہ چوڑی دُونی جو چوکور اور گول کونوں کی ہے چلی اور اس کے ساتھ نئی اکنی گول اور جھالردار کناروں کی چلی تو ان کے چلن سے بہت کافی عرصہ کے بعد ایک دن کسی کے ہاتھ میں نئی دُونی اِکنی دیکھ کر فرمایا کہ کیا یہ سکہ ہے اور کیا یہ ہندوستان ہی میں چلتا ہے؟ اس پر ہم سب ہنسنے لگے تو انہیں اس ہنسی پر حیرت ہوئی، جیب

میں کبھی نہیں رکھتے تھے اور نہ عام حالات میں پیسہ کو چھوتے تھے۔

دارالعلوم کی تنخواہ نہ کبھی خود وصول کی نہ انہیں یہ پتہ رہتا تھا کہ کتنی تنخواہ ہے یا زمین یا باغ کی کتنی آمدنی ہے، کس طرح ہے اور کون لاتا ہے۔

سخاوت اور فراخ دلی کی مثال تھی، مہمانداری اور مہمان نوازی میں شغف تھا۔ روزانہ دو چار دس مہمان دستر خوان پر ہوتے تھے جس دن کوئی مہمان نہ ہوتا تو مدرسہ کی چھٹی ہونے پر دروازۂ مدرسہ پر کچھ دیر رک جاتے اور اساتذہ میں سے جو گذرتا اسے گھر ساتھ لے آتے اور کھانے میں شریک فرماتے۔ مولانا عبید اللہ سندھی اور حضرت قبلہ مولانا العلام محمد انور شاہ قدس سرہ' کو دس سال تک اپنے سے جدا نہیں ہونے دیا۔ اپنے ساتھ ہی کھانا کھلاتے۔ اخلاص اور اعتماد علی اللہ میں راسخ القدم تھے اور دوسری ممتاز اخلاقی قوتیں آپ کی شیوہ ہوگئی تھیں۔

تربیت کی ایک خاص شان تھی جو انتظامی رنگ میں نمایاں ہوتی تھی، آنکھ کی گھور سے بہت کام لیتے تھے جس کا اثر قلوب پر پڑتا تھا۔ جزئی جزئی منکرات میں طلبہ پر روک ٹوک فرماتے تھے اور بعض اوقات درسگاہ نودرہ کے سامنے صحن دارالعلوم میں ایسے طلبہ کو زدوکوب کراتے اور پھر فہمائش ونصیحت فرماتے۔

اکابر واسلاف کا ذکر

مجلس میں زید عمرو بکر کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ اکابر واسلاف کے واقعات بکثرت بیان فرمایا کرتے تھے اور ان کی سیرت وسوانح محفوظ بھی بہت تھی۔ مجلس زیادہ تر بیانِ احوال وبیانِ مسائل ودلائل سے معمور ہوتی تھی۔ رمضان شریف میں تراویح کے بعد کی مجلس ایک یادگار مجلس ہوا کرتی تھی جس میں حضرت ممدوح، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ اور دوسرے اساتذہ وطلبہ شریک ہوتے تھے، اور اس میں ایمان تازہ کرنے والی باتیں ہوا کرتی تھیں مجھے جس قدر بھی اکابر کے واقعات محفوظ ہیں زیادہ تر انہیں مجالس کی شرکت کا نتیجہ ہیں، مجلسیں کبھی کبھی درسگاہ نودرہ کے سامنے صحن میں اور کبھی احاطہ مسجد میں منعقد ہوا کرتی تھیں جبکہ مسجد مدرسہ زیرِ تعمیر تھی اور آخر میں دارالمشورہ میں ہونے لگی تھیں۔

دارالعلوم کا کام اسی طرح حسنِ نظام سے چل رہا تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کی روانگیٔ حج اور اسی دوران اسارتِ مالٹا کا مرحلہ پیش آ گیا جس میں پانچ سال کی مدت صرف ہوگئی اور واپسی پر پانچ چھ ماہ حیات رہ کر حضرت نے داعی اجل کو لبیک کہا اور واصل بحق ہوئے، تو یہیں سے دارالعلوم کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا، اور اب دارالعلوم کی قوت کا مدار و مرکز تنہا حضرت حافظ صاحب ٹھہر گئے اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ان کے حبیبِ خاص اور ان کے مخلص معاون ہوئے۔ صدارتِ تدریس پر علامۂ دہر، فریدِ عصر، یگانۂ زمانہ، عالم بے بدل، فاضل بے مثل، محدثِ وقت، حافظِ حدیث حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ متمکن ہوئے، جو ان دونوں بزرگوں کے شاگرد اور طبقہ تلامذہ میں سے تھے۔ حضرت شیخ الہند نے حضرت حافظ صاحب کی غیر معمولی توقیر باوجود خود استاد ہونے کے ان کی مخدوم زادگی کی عظمت کی بنا پر کرتے تھے اور حضرت شاہ صاحب ان کی توقیر و تکریم علاوہ اس صاحبزادگی کی عظمت کے خود اپنا استاد ہونے کی حیثیت سے بھی کرتے۔

ادھر حضرت حافظ صاحبؒ ان کے علم و فضل، تقویٰ و تقدس، حفظ و فہم اور وجاہت و عزت کی بنا پر باوجود شاہ صاحب کے شاگرد ہونے کے استادوں جیسی توقیر سے پیش آتے۔ اس لئے دارالعلوم کی ترقیات میں بجائے کسی کمی کے اور اضافہ ہوا اور اس کے حلقۂ اثر کی ہمہ گیر روز افزوں ہوتی رہی۔ حضرت شاہ صاحب ان کی اطاعت کو اپنا فخر سمجھتے تھے اور وہ شاہ صاحب کی موجودگیٔ دارالعلوم پر فخر کرتے اور ان کو وقعت کی نگاہوں دیکھتے تھے۔ اسی قلبی یگانگت سے دارالعلوم کی عظمت وشان دنیا کی نگاہوں میں پہلے سے بھی زیادہ ہوگئی۔

حضرت شاہ صاحبؒ سے تعلق

حضرت حافظ صاحبؒ کا شغف حضرت شاہ صاحب سے اس درجہ بڑھا کہ دارالعلوم کی ترقی کی خاطر حضرت شاہ صاحب کو دس سال تک اپنا مہمان رکھا اور ان کے کھانے کا بار دارالعلوم پر ڈالنا گوارا نہیں فرمایا۔ ان کی ضروریات کی رعایت فرماتے حتیٰ کہ آخر میں حضرت شاہ صاحب کی شادی بھی خود ہی کی اور ان کی اہلیہ محترمہ کو بحیثیت دلہن اپنے یہاں اتارا، ولیمہ کیا اور گھر پر رکھا۔

اس باہمی اعتماد، باہمی توقیر و عظمت اور آپس کے خوشگوار تر تعلقات نے دارالعلوم کو بہت آگے

بڑھا دیا، اور اب اس کے اثرات علمی حلقوں سے گذر کر حکام اور والیانِ ملک پر بھی پڑنے لگے۔ نواب صاحب بہاول پور نے حضرت حافظ صاحب کو مدعو کیا اور آپ ایک وفد کی صورت میں بہاول پور تشریف لے گئے۔ ریاست نے دارالعلوم کی کافی خدمت کی اور حضرت ممدوح کو نواب صاحب کے دربار سے خلعت عطا ہوا۔ دارالعلوم کی سالانہ امداد بھی جاری ہوئی اور حضرت حافظ صاحب کو دوبارہ خلعت عطا ہوا۔ جو عرب کا بنا ہوا تھا۔ یہ واقعہ حضرت گنگوہیؒ کی حیات کے زمانہ کا ہے۔

اس کے بعد نواب ڈھاکہ نواب سلیم اللہ خاں صاحب نے ڈھاکہ میں دارالعلوم کا ایک وفد مدعو کیا۔ حضرت حافظ صاحب نے اس کے افراد کی تعیین فرمائی۔ اس میں حضرت تھانویؒ، حضرت مولانا مرتضیٰ صاحبؒ، حضرت مدنیؒ (حسن اتفاق سے اس وقت مدینہ طیبہ سے آئے ہوئے تھے اور دارالعلوم میں مقیم تھے) اور بھی متعدد بزرگ تھے۔ وفد کا کچھ قیام کلکتہ رہا اور وہاں کی فضا علم سے سیراب ہوتی رہی، پھر ڈھاکہ پہنچا۔ نواب سلیم اللہ خاں نے ان اکابر کی بہت کچھ آؤ بھگت کی اور ان کے علمی و عملی فیوض سے استفادہ کیا۔

اسی طرح والئی بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم نے حضرت حافظ صاحب کو دعوت دی اور دارالعلوم کی کافی مدد کی۔ ڈھائی سو روپے ماہوار مستقل امداد بھی بھوپال سے جاری ہوئی۔

مسٹر مانٹیگو وزیر ہند جب انگلستان سے ہندوستان آئے تو حضرت حافظ صاحب نے مسلمانوں کے پرسنل لاء کے تحفظ اور اس کے اجراء کے سلسلہ میں ایک وفد کے ساتھ ان سے دہلی جا کر ملاقات کی اور محکمہ قضاء قائم کرنے پر زور دیا۔ اس وفد نے دیوبند کے متعدد فضلاء ساتھ لئے اور آخر کار اس کا اثر حکومت نے قبول کرتے ہوئے یادداشت مانگی جسے آپ نے پیش فرمایا اور معاملہ عرصہ تک چلتا رہا۔

قیامِ حیدر آباد

آخر کار ۱۳۴۰ھ میں حضرت حافظ صاحب کو ان کی وجاہت و شہرت اور مقبولیت کی بناء پر نظام دکن کی عدالتِ عالیہ کا مفتی مقرر فرمایا اور ایک ہزار روپیہ آپ کی تنخواہ اور وہ بھی اس طرح کہ ڈھائی سو روپیہ ماہوار جو بہت پہلے آپ کا وظیفہ سرکار سے جاری تھا اور ملازمت کے بعد جبکہ تنخواہ جاری ہو گئی تھی، حسبِ معمول دکن بند ہو جانا چاہئے تھا، لیکن حضور نظام نے ان قوانین سے آپ کو مستثنیٰ کرتے

ہوئے یہ وظیفہ بھی بدستور جاری رکھا۔ آپ کے لئے دو گھوڑوں، ایک نہایت ہی شاندار لینڈ سرکاری طور پر مقرر ہوئی جس پر باوردی چوبدار اور سائیس ساتھ دیئے۔ تمام درباروں اور نذر وغیرہ کی پیشکش سے آپ کو مستثنیٰ قرار دیا، حتیٰ کی عدالتِ عالیہ کے اجلاس کی حاضری سے بھی مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے قیام گاہ پر ہی اجلاس کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

حضرت حافظ صاحب کے متعدد مرید ومتوسل حیدرآباد میں موجود تھے، انہوں نے آپ کی خدمت کو سرمایۂ سعادت سمجھتے ہوئے یہ گوارا نہیں کیا کہ آپ کسی سرکاری کوٹھی میں محبّین سے الگ رہ کر قیام فرمائیں۔ اس لئے حضرت حافظ صاحب کے ایک ہونہار مرید جن کو آپ مثل اولاد جانتے تھے نواب عبدالباسط خاں مرحوم نے اپنی عظیم الشان حویلی حضرت مرحوم کے لئے خالی کر دی جس میں قیام گاہ، مہمان خانہ، کتب خانہ اور اجلاس کا ہال مہیا تھا۔ چار برس کامل آپ نے حیدرآباد میں قیام فرمایا اور مسندِ افتاء کو رونق بخشی اور برسوں کے بڑے بڑے الجھے ہوئے مقدمات کے شرعی طور پر فیصلے فرمائے۔ آپ کے علمی معین حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ مدرس دارالعلوم دیوبند رہے، مفتیٔ عدالت عالیہ ہونے کے ساتھ آپ دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم بھی رہے اور ضروری امور کی امسلہ رجسٹری کے ذریعہ حیدرآباد بھیجی جاتی تھیں جن کے فیصلے آپ وہاں سے کر کے بھیجتے تھے۔

مجلس شوریٰ نے آپ کی شخصیت ہی کی وجہ سے صدارتِ اہتمام کا عہدہ قائم کیا اور آپ کو صدر قرار دے کر مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو بنایا نیز دیوبند پہنچ کر یہاں جتنا قیام ہوتا تو حیدرآباد عدالتِ عالیہ کی مسلیں رجسٹری سے یہاں پہنچتی تھیں اور فیصلہ لکھ کر حضرت ممدوح حیدرآباد روانہ فرماتے۔ اکثر فیصلوں کی خوش قلم نقلیں مولانا اشتیاق احمد صاحب صدر الکاتبین شعبہ کتابت دارالعلوم دیوبند تحریر فرماتے تھے۔ حاصل یہ کہ آپ دارالعلوم اور عدالتِ عالیہ دکن کی ذمہ داریاں بیک وقت نبھاتے تھے اور حکومتِ دکن اور ذمہ دارانِ دارالعلوم آپ کے خواہاں تھے۔ حضرت ممدوح نے اس چار سال میں اور پھر دیوبند سے واپس آنے کے بعد دارالعلوم سے تنخواہ نہیں لی اور ایثار سے کام لیا۔

اس زمانہ میں قیام دکن میں دکنی فضلائے دارالعلوم دیوبند کے لئے آپ کی ذات گرامی مرکز

بن گئی اور وہ مہمانداری کی روایت جو دیوبند میں تھی وہاں بھی بدستور اسی آب وتاب کے ساتھ قائم رہی۔ ہر وقت فضلاء کا اجتماع رہتا۔

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم صدر دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، مولانا محمد علی صاحب مرحوم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی، مولانا عبدالمجید صاحب ناظم صبغۃ الاسلام دکن اور دوسرے ملکی وغیر ملکی فضلاء کا جمگھٹا لگا رہتا اور یہ سب احباب اسی طرح سے جمع رہتے تھے جیسے ایک شفیق باپ کے زیر سایہ اس کے محبوب فرزند جمع ہوں، یہ گھڑیاں نہایت سرور وخوشی اور سکون کے ساتھ کٹ رہی تھیں کہ حضرت حافظ صاحب کو ضعفِ پیری کے سبب کچھ مزمن امراض لاحق ہوئے اور ضعف واضمحلال بڑھنے لگا اور دکن کی آب وہوا ان امراض میں سازگار نہ رہی تو اہل دیوبند، اکابرِ دارالعلوم اور اہل خاندان کے اصرار پر آپ نے حضور نظام سے خدماتِ افتاء سے سبکدوشی کی درخواست کی، کئی ماہ تک حضور نظام نے منظوری نہیں دی لیکن جب حضرتِ مرحوم نے اپنا ضعف اور نقاہت مشاہدہ کرایا اور ملاقات کر کے ناتوانی اور کمزوری کی تفصیلات ذکر کیں تو تاسف کے ساتھ درخواست قبول فرمائی اور ایک ہزار کا نصف مبلغ پانچ سو روپیہ ماہوار آپ کی پنشن فرمائی جو تا حیات جاری رہی۔

دیوبند پہنچ کر بھی مرض میں کمی نہ ہوئی طبیعت ناتواں ہو چکی تھی۔ ضعف بڑھتا گیا حتیٰ کہ دارالعلوم میں آمد ورفت بھی گاہ بگاہ ہی رہ گئی، اکثر اوقات بستر علالت پر ہی گذرنے لگے اپنی جگہ حیدرآباد دکن کے عہدۂ افتاء کے لئے آپ نے اپنے حبیب ترین رفیق اور نائب مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کا نام نامی پیش فرمایا جو حضور نظام نے قبول فرمالیا اور مولانا مرحوم سات سو روپیہ ماہوار پر حیدرآباد تشریف لے گئے، لیکن کل سات ماہ ہی قیام رہا اسی دوران میں دارالعلوم میں کچھ نزاع رونما ہوئے جن کی تفصیل دارالعلوم کی رودادوں میں موجود ہے اور اس کے بعد دارالعلوم کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

دارالعلوم کے عہدۂ صدارتِ تدریس پر حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ متمکن ہوئے، ان ہی نزاعات سے کافی عرصہ قبل حضرت اقدس مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری قدس سرہٗ نے حضرت حافظ صاحب کو نیاز مندانہ دعوت دی، حضرت مرحوم رائے پور تشریف لے گئے،

حضرت رائے پوری نے غیر معمولی اورخرقِ عادت تکریم کی حتیٰ کہ تخلیہ میں حضرت حافظ صاحبؒ کے پاؤں پکڑ لئے اورآب دیدہ ہوکر فرمایا:

میں اس کہنے پر مامور کیا گیا ہوں کہ حق تعالیٰ نے آپ کی ترقیٔ درجات کے لئے بدگویوں کی بدگوئی کا راستہ تجویز فرمایا ہے، وہ جو پیش آنے والا ہے آپ دل تنگ نہ کریں۔

حضرت مرحوم نے نہایت بشاشت سے فرمایا کہ میں حق تعالیٰ کی ہر تقدیر پر دل سے راضی اور شاکر ہوں۔فرمایا الحمدللہ چنانچہ ایسے فتنے رونما ہوئے جن میں یہ تقدیر پوری ہوگئی۔

وفات

۱۳۴۶ھ میں ان اکابر کی روانگیٔ دارالبقاء کا سلسلہ شروع ہوگیا۔حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری نے اس سلسلہ میں پہل کی۔اسی دورِ رحلت وانتقال میں حضرت حافظ صاحبؒ نے بھی اپنی وجاہتِ زندگی کا دورہ پورا کردیا اور ۳/ جمادی الاول ۱۳۴۷ھ کو دارالعلوم ہی کی خدمات کے سلسلہ میں دارالعلوم پر نثار ہوگئے۔

وفات کی صورتِ حال یہ ہوئی کہ حضرت مرحوم نے حضور نظام کو دارالعلوم آنے کی دعوت دینے کے لئے حیدرآباد دکن کا سفر کیا اور اکابرِ دارالعلوم کے مشورہ سے آپ دیوبند سے دکن روانہ ہوئے۔ نواب عبدالباسط خان صاحب مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔حضور نظام سے ملاقات ہوئی، ابھی مقصد کے بارے میں سلسلۂ گفتگو کا ایک ملاقات سے آغاز ہی ہوا تھا کہ بواسیر کا دورہ شدید ہوا۔خون بکثرت آیا اور طبیعت اتنی نڈھال ہوگئی کہ لوگ زندگی سے مایوس ہوگئے، تمام مقامی احباب وخدام کا مشورہ یہی طے پایا کہ اب جلد سے جلد آپ کو دیوبند پہنچایا جائے، چنانچہ سیکنڈ کلاس کا ایک پورا کمرہ ریزرو کرایا گیا، یہ چار خدام واحباب ساتھ ہوئے۔میر احمد علی صاحبؒ، مولانا محمد علی صاحبؒ، حافظ محمود احمد صاحبؒ اور حافظ شریف احمد گنگوہی صاحب (حال مدرس حفظ القرآن دارالعلوم دیوبند)، ریل گاڑی روانہ ہوئی، جب حیدرآباد سے تقریباً اسّی میل پہنچی اور نظام آباد اسٹیشن قریب آیا تو رفقاء میں سے مولوی محمد علی صاحب سے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کو (جو اس وقت دارالعلوم کے سرپرست تھے) خط لکھوایا۔اس میں یہ جملہ خصوصیت سے قلمبند کرایا جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ:

الحمدللہ میرا قلب غافل نہیں بلکہ ذاکر ہے اور میں اللہ تعالیٰ کی ہر تقدیر پر دل سے راضی ہوں۔

خط لکھ کر قضائے حاجت سے فراغت پائی اور اپنی سیٹ پر سیدھے لیٹ کر مولانا محمد علی صاحب سے فرمایا کہ چادر ہر طرف سے درست کر دو اور یہ دیکھو کہ میرے کپڑوں پر نجاست وغیرہ کا اثر تو نہیں ہے کیونکہ ملائکہ علیہم السلام کو بدبو سے اذیت ہوتی ہے۔ خادموں نے عرض کیا کہ حضرت کپڑے بالکل صاف ہیں۔ اس کے بعد عقدِ انامل پر تسبیح اور ذکر اللہ شروع ہوا۔ ۲۹ کے عدد پر عقدِ انامل تھا کہ اللہ کے لفظ کے ساتھ روح پرواز کر گئی رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ قبضِ روح کے وقت سب خدام نے ایک تیز قسم کی آسمانی رنگ کی چمک محسوس کی جس نے سب کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا، یہ چمک آنی تھی جوں ہی ختم ہوئی تو قبضِ روح ہو چکا تھا۔

نظام آباد کے اسٹیشن پر لاش اُتاری گئی، شہر میں یہ خبر بھی بجلی کی طرح پھیل گئی۔ ہزارہا لوگ نام سن کر جمع ہونے شروع ہو گئے۔ مسجد اسٹیشن میں غسل دیا گیا، جنازہ تیار ہوا اور ہزاروں مسلمانوں نے نمازِ جنازہ ادا کی۔ حیدر آباد حضور نظام کو اور متعلقین کو تار دیئے گئے۔ وہاں سے نظام کا تار پہنچا کہ مولانا کا جنازہ حیدر آباد لاؤ۔ اسی وقت تابوت بنایا گیا، کئی من صندل کے برادہ میں تکفین شدہ لاش ڈھانپی گئی اور تابوت بند کر دیا گیا، ایک لاری پر تابوت رکھ کر اگلے دن حیدر آباد پہنچایا گیا۔ شہر میں خبر دوڑ گئی اور جوق در جوق لوگوں کا ہجوم شروع ہو گیا۔ ہزاروں انسانوں نے نمازِ جنازہ پڑھی، متعدد نمازیں ہوئیں۔ حضور نظام نے خود اپنے مصارف پر اپنے مخصوص تیار کردہ قبرستان موسومہ ''خطۂ صالحین'' میں ۴/ جمادی الاول ۱۳۴۷ھ کو دفن کرایا۔ حق تعالیٰ درجات بلند فرمائیں۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان عثمانیؒ

آپ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے باضابطہ مفتی بلکہ دارالعلوم میں دارالافتاء کا نقطۂ آغاز ہیں۔ دارالعلوم میں دارالافتاء کی منضبط صورت آپ ہی کے وجود باجود سے معرضِ وجود میں آئی۔ آپ عارف باللہ، صاحبِ درس وتدریس، صاحبِ بیعت وارشاد اور مربیٔ اخلاق بزرگ تھے۔ آپ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندی قدس سرہٗ کے خلیفہ مجاز تھے جو حضرت مولانا شاہ

عبدالغنی صاحب محدث دہلویؒ کے ارشد خلفاء میں سے تھے۔

آپ سے دارالعلوم کے حلقوں نے ظاہری و باطنی فیوضات و برکات کافی حد تک حاصل کیے۔ افتاء کی خدمت کے ساتھ ساتھ حدیث، فقہ اور تفسیر کے اونچے اسباق بھی آپ پڑھاتے تھے۔ جلالین شریف میں احقر ناکارہ کو بھی حضرت مفتی اعظمؒ ہی سے تلمذ حاصل ہے۔ آپ کا بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی کافی پھیلا۔ آپ ہی کے خلیفہ اعظم حضرت مولانا قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھیؒ تھے جن کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنیؒ ہیں، جن سے عرب اور افریقہ میں نقشبندیہ طریق کا کافی شیوع ہوا اور سینکڑوں کی اصلاح ہوئی، ساؤتھ افریقہ اور ایسٹ افریقہ کے لوگ جب حج کے لئے حاضر ہوتے تو اکثر و بیشتر مولانا بدرِ عالم صاحبؒ کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو کر جاتے۔

حضرت مفتی اعظم قدس سرہٗ کی تعلیم و تربیت اکابرِ دیوبند کی آغوش میں ہوئی اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ سے بیشتر کتابیں پڑھیں، آپ کے والد ماجد حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی قدس سرہٗ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کے قریبی احباب اور دوستوں میں سے تھے۔ اپنے زمانہ کے بڑے عالم وفاضل اور دارالعلوم کے بانیوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ آپکے متعلق روئیداد دارالعلوم میں لکھا ہے کہ:

دارالعلوم دیوبند کی شہرت و مقبولیت چونکہ عام تھی اس وجہ سے دور دراز کے مقامات سے استفتاء بکثرت آتے تھے اور صدر المدرسین دارالعلوم کو کارِ تعلیم سے اس قدر فرصت نہیں ہوتی تھی کہ بلا حرجِ تعلیم ان کے جوابات دے سکیں، اور دارالعلوم جس مقصد کے لئے قائم ہوا تھا اس کی بناء پر اس کے فرائض میں یہ بات بھی داخل تھی کہ بعنوان افتاء بھی عوام کی خدمت کی جائے گی۔ اس لئے ابتدائی سالوں میں اساتذۂ دارالعلوم بالخصوص عارف باللہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ حسبِ ضرورت و مواقع فتاویٰ تحریر کرتے رہے۔ لیکن کام کی ذمہ داری کی نوعیت واہمیت نے اس بات پر مجبور کر دیا کہ کسی صاحبِ شخصیت کو باقاعدہ مفتی نامزد کر کے دارالافتاء کو مستقل حیثیت میں قائم کیا جائے۔ لہٰذا ۱۳۱۰ھ میں قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ سرپرست

دارالعلوم دیوبند نے حضرت مفتی صاحب کو اس عظیم منصب اور اہم ذمہ داری کے لئے منتخب فرمایا۔ پھر اس وقت سے ۱۳۴۶ھ یعنی ۳۶ سال تک بدستور بحیثیت مفتی دارالعلوم دیوبند بلکہ مفتیٔ اعظم ہند خدمتِ افتاء انجام دیتے رہے۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ اٹھارہ سال تک افتاء کی نقل نویسی نہ ہوئی اور ۱۳۲۹ھ سے طلباء نے نقل شروع کی۔ پھر ۱۳۳۳ھ میں مولانا قاضی مسعود احمد صاحب کا تقرر ہوا جو آپ کے معاون کی حیثیت سے ہوا۔ اس وقت سے رجسٹر میں مستفتی کے سوالات اور ان کے جوابات کی نقل موجود ہے۔ جن کی تعداد مجموعی طور پر اڑتیس ہزار سے زائد بنتی ہے، علاوہ ازیں کچھ ایسے حضرات بھی ہوں گے جن کے فتاویٰ عجلت کی وجہ سے رجسٹر میں درج نہ ہوئے ہوں۔ نیز ایک مستفتی کئی کئی سوالات ایک کاغذ میں لکھتے ہیں۔ اگر اوسطاً تین سوالات مان لئے جائیں تو فتاویٰ کی مجموعی تعداد تقریباً سوا لاکھ ہوتی ہے اور یہ تعداد بھی ان فتاویٰ کی ہے جو رجسٹر میں درج ہوئے، اس سے پہلے کی جب کہ نقل افتاء کا انتظام نہیں تھا اتنی ہی تعداد فرض کر لی جائے تو اس طرح حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے فتوے کم وبیش ڈھائی تین لاکھ ہوتے ہیں۔ ان فتاویٰ کا یہ بے نظیر مجموعہ اور مسائل فقہیہ کا یہ بے مثال ذخیرہ عام نظروں سے اوجھل تھا اس لئے سب سے پہلے آپ کے علمی جانشین اور تلمیذ رشید مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے آپ کے فتاویٰ بنام ''عزیز الفتاویٰ'' شائع کئے جو بہت مختصر اور غالباً ایک دو سال کے فتاویٰ کا مجموعہ تھا، پھر مہتمم دارالعلوم دیوبند نے آپ کے تمام فتاویٰ کو جدید ترتیب سے شائع کرنے کا پروگرام بنایا اور اس کے لئے مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب کو مامور کیا۔ انہوں نے غیر معمولی جانفشانی وتندہی سے ترتیبِ فتاویٰ کا کام حسنِ اسلوب سے انجام دیا جس کی نو دس جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور ابھی کام جاری ہے۔

بہر حال حضرت مفتی صاحبؒ کا علمی وفقہی مقام بہت بلند ہے۔ جس کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے، آپ کو فنِ افتاء میں اس قدر مہارت تھی کہ مشکل ترین سوالات پر بھی برجستہ فتاویٰ تحریر فرما دیتے تھے۔ آپ نے چالیس سال کے قریب دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کی خدماتِ جلیلہ انجام دیں۔ یوں تو فتاویٰ ہر زمانہ میں لکھے گئے ہیں مگر فتاویٰ نویسی کا کمال جو حضرت مفتیؒ کو حاصل تھا۔ یہ کمال

جماعتِ دیو بند میں صرف چند شخصیات کے حصہ میں آیا ہے، ایک حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور دوسرے حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، تیسرے حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور چوتھے مفتی محمد شفیع صاحب ہیں۔آپ کے فتاویٰ پر حضرت گنگوہی اور حضرت حکیم الامت تھانویؒ اور حضرت علامہ انور شاہ صاحب جیسے یگانۂ روزگار علماء کو اعتماد تھا اور یہ حضرات آپ کی علمی وفقہی شان کے معترف تھے۔

باوجود تبحر علمی اور عظیم الشان فقیہ ہونے کے سادگی وتواضع اور انکساری کا پیکر تھے۔مزاج میں بے حد سادگی تھی، تواضع کا یہ عالم تھا کہ باوجود تلامذہ اور خدام کی موجودگی کے اپنے گھر کا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، بلکہ اپنے پڑوسیوں کا سودا سلف بھی بازار سے خرید کر جھولی میں لایا کرتے تھے۔ زہد وتقویٰ میں بھی کمال درجہ حاصل تھا یہاں تک کہ نماز وضو کے مسائل بھی کتاب دیکھ کر بتلاتے تھے فرماتے تھے کہ یہ طریق اس وجہ سے اختیار کرتا ہوں کہ کہیں مجھ سے سہو نہ ہو جائے اور مسئلہ دھوکہ میں غلط نہ بتادوں، کتاب دیکھ کر بتانے میں ذمہ داری میرے اوپر سے اُٹھ جاتی ہے اور کتاب والے پر ذمہ داری آجاتی ہے۔

آپ ظاہر وباطنی اشکالات اور شکوک وشبہات میں ہمیشہ حضرت گنگوہیؒ کی طرف رجوع فرماتے تھے اور ان کے قول کو قولِ فیصل جانتے تھے۔افتاء کے ساتھ درس کا شغل آخر تک رہا اور حدیث وفقہ اور تفسیر کے اسباق مستقل آپ کے ہاں ہوتے تھے۔بڑے بڑے علماء، فقہاء نے آپ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا ہے اور سینکڑوں نے آپ سے اصلاح وتربیت حاصل کی ہے۔

حضرت استاذ مکرم علامہ انور شاہ صاحبؒ کے ساتھ آپ بھی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل چلے گئے تھے جہاں بخاری شریف کا درس دیتے رہے۔وہاں طبیعت علیل ہوگئی تو دیو بند واپس آگئے اور علاج معالجہ کراتے رہے مگر افاقہ نہ ہوا اور وقتِ موعود آپہنچا۔ ۱۷؍جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ (۱۹۲۸ء) کو شب میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ ۱۰؍بجے دن میں نماز جنازہ حضرت مولانا اصغر حسین صاحبؒ نے پڑھائی اور گیارہ بجے آپ دار العلوم کے قبرستان میں سپردِ خاک کئے گئے۔حق تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائیں، آپ کی اولاد میں حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیو بند اور مولانا قاری جلیل الرحمٰن استاذ تجوید دار العلوم قابل فخر فرزند ہیں اور جید علماء میں شمار ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ

آپ حضرت مفتی عزیز الرحمٰنؒ اور شیخ الاسلام پاکستان علامہ شبیر احمد عثمانی کے حقیقی بھائی تھے۔حق تعالیٰ نے آپ کو دین کا خاص فہم عطا فرمایا تھا۔آپ کی دانش وتدبیر مشہورِ زمانہ تھی۔ادبیات کے ماہر تھے۔عربی نظم ونثر دونوں پر کمالِ قدرت رکھتے تھے۔دارالعلوم کے نظم ونسق نے آپ کے تدبیر ودانش سے عظیم استفادہ کیا۔آپ کی اس دانش وبینش اور عظیم علمی شخصیت کی بناء پر حکومتِ حیدرآباد کا عہدۂ افتاء حضرت والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے بعد آپ ہی کو تفویض کیا گیا تھا۔آپ کا حلم،تواضع،مروت اور تحمل مشہورِ زمانہ تھا۔

آپ حضرت گنگوہیؒ کے متوسل اور طریقت کے معمولات کے نہایت پابند تھے۔وفات کے دن مجھ سے حسرت کے ساتھ فرمایا کہ ''میرا بارہ ہزار اسم ذات افسوس کہ آج پورا نہیں ہوسکا۔'' شب بیدار اور ہمہ وقت مشغولِ کار رہتے تھے۔ان کی مجلس پُر شکوہ اور مورثِ طمانینت ہوتی تھی،کئی عربی قصیدے اور کئی مفید ترین تصانیف آپ کا ترکہ ہے جو امت کو ملا،ان میں ''اشاعتِ اسلام'' ایک معرکۃ الآراء تصنیف ہے جو مقبولِ خواص وعوام ہے۔

۱۳۲۵ھ میں والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کی مصروفیتوں اور اسفار کے باعث نیز دارالعلوم کو ترقی دینے کے سلسلے میں ایک ایسے لائق اور منتظم شخص کی مجلس شوریٰ کو ضرورت پیش آئی جو انتظامی امور اور ترقی کی تجاویز میں حضرت حافظ صاحبؒ کا ہاتھ بٹا سکے،اس کے لئے مجلس کے نزدیک آپ سے زیادہ موزوں کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا۔چنانچہ انکار کے باوجود آپ کو مجبور کرکے نیابتِ اہتمام کا منصب سپرد کردیا گیا۔دارالعلوم کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس کو حضرت مولانا جیسا کام کرنے والا مدبر شخص اور متبحر عالم،بیدار مغز منتظم اور مخلص ہاتھ آگیا،اہتمام کے کاموں میں ان کو اس قدر شغف تھا کہ شب وروز کا بیشتر حصہ اسی میں صرف ہوتا تھا،حتیٰ کہ ان کی سکونت بھی دارالعلوم کے دارالاہتمام ہی میں تھی اور اسی میں وفات ہوئی۔

انہوں نے دارالعلوم کے شعبۂ انتظام وانصرام کو اتنا منظّم اور مستحکم کردیا تھا کہ جب حکومتِ

آصفیہ کی جانب سے نواب صدر یار جنگ بہادر دارالعلوم کے حسابات کی تنقیح کے لئے دیو بند آئے تو ان کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایک ایک اور دو دو آنے تک کے حسابات کے کاغذات اور رسیدیں باضابطہ طور پر فائل میں موجود تھیں۔ نواب صدر یار جنگ بہادر کا بیان ہے کہ کوئی کاغذ ایسا نہ تھا جو مانگا گیا ہو اور فوراً پیش نہ کر دیا گیا ہو۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے عہدِ اہتمام کی ترقی بلحاظ تدبیر و تنظیم درحقیقت آپ ہی کی رفاقت کا نتیجہ سمجھی جاتی ہے، آپ ہمیشہ ان کے دستِ راست، معتمد علیہ اور نائب رہے۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قدس سرہ‘ کی شخصیت ہر حیثیت سے یگانۂ روزگار تسلیم کی جاتی تھی۔ عام خیال ہے کہ اگر آپ کو ملکی سیاست میں بھی اتنا ہی شغف ہوتا جیسا کہ دارالعلوم کے ساتھ تھا تو آپ ہندوستان کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر ثابت ہوتے۔

مطالعے کی کثرت نے آپ کو نہایت وسیع المعلومات بنا دیا تھا۔ حضرت استاذ المکرّم علامہ انور شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ:

”اگر مجھ پر کسی کے علم کا اثر پڑتا ہے تو وہ مولانا حبیب الرحمٰن ہیں۔“

آپ نہایت نحیف الجثہ تھے، خوراک حیرت انگیز طور پر کم تھی مگر ضعف اور کمزوری کے باوجود بے پناہ ہمت کے مالک تھے۔ حضرت والد ماجد صاحبؒ کے انتقال کے ٹھیک چودہ ماہ بعد ۴/رجب المرجب ۱۳۴۸ھ (مطابق ۱۹۲۹ء) کی شب میں اس جہانِ فانی سے رحلت فرمائی اور ہمیشہ کے لئے دارالعلوم کو اپنا مداح چھوڑ گئے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

”اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی قدس سرہ‘ کو انتظامی صلاحیت اور سیاسی سوجھ بوجھ اس قدر غیر معمولی عطا فرمائی تھی کہ درحقیقت وہ وزیر بننے کے لائق انسان تھے۔ دارالعلوم پر سخت سے سخت وقت آئے، بڑی بڑی یورشیں آئیں لیکن میں نے اس بندۂ خدا کو کبھی ہراساں یا پریشان نہیں دیکھا۔ سنگین سے سنگین حالات میں بھی ان کے اطمینان وخود اعتمادی میں کبھی فرق نہیں آتا دیکھا۔ ایک مرتبہ دارالعلوم کی انتظامیہ کے خلاف ایک شدید طوفان کھڑا ہوا جس میں بعض لوگ حضرت مولانا کی جان تک کے دشمن ہوگئے، ان حالات میں بھی حضرت مولانا کھلی چھت پر تن تنہا سوتے تھے۔

میں نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضرت ایسے حالات میں آپ کا اس طرح سونا مناسب معلوم نہیں ہوتا، آپ کم از کم کمرے کے اندر ہی سوجایا کریں، لیکن مولانا نے بڑی بے نیازی سے ہنس کر فرمایا ''میں تو اسی باپ (یعنی سیدنا عثمان غنی) کا بیٹا ہوں جس کے جنازے کو چار آدمی اٹھانے والے بھی میسر نہ آئے اور جسے رات کے اندھیرے میں بقیع کی نذر کیا گیا، لہٰذا مجھے موت کی کیا پرواہ ہوسکتی ہے۔''

حق تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائیں۔ آمین

امام العصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ

حضرت الاستاذ الاکبر علامہ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ' شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی مبارک ہستی نہ کسی تعارف کی محتاج ہے نہ کسی تاریخ کی دستِ نگر، ان کی حقیقی تاریخ ایک پیروں چلتی تاریخ ہے جو ان کے تلامذہ اور مآثرِ علمی کی صورت میں ہمہ وقت دائر وسائر، نمایاں اور چشم دید رہتی ہے۔ اس امتِ مرحومہ میں لاکھوں علماء وفضلاء پیدا ہوئے اور اپنے نورانی آثار دنیا کے لئے چھوڑ گئے لیکن ایسی ہستیاں معدودے چند ہیں جن کا فیض عالمگیر اور محبوبیت عام قلوب کی امانت ہو، اور جن کے علم کے ساتھ ساتھ عمل سے بھی امت نے استفادہ کیا ہو۔

حضرت امام العصر علامہ انور شاہ صاحبؒ کی ہستی انہیں مبارک اور معدودے چند ہستیوں میں سے ایک ممتاز ہستی ہے جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں اور صدیوں کو علم وفضل سے رنگین کر جاتی ہیں۔ حضرتؒ کا علم اگر متقدمین کی یاد تازہ کرتا تھا تو ان کا عمل صالحین کو زندہ کیے ہوئے تھا اور اسوۂ سلف کے لئے نمونہ ساز تھا۔ علم، حافظہ، تقویٰ وطہارت اور زہد وقناعت مثالی تھی۔ علمی حیثیت سے ہم تلامذہ انہیں چلتا پھرتا کتب خانہ کہا کرتے تھے اور عملی حیثیت جو ہمہ جہت اتباعِ سنت کے نور سے ڈھلی ہوئی تھی، اکثر وبیشتر ان کے عمل ہی سے مسائل معلوم کر لیتے تھے اور مسئلہ وہی نکلتا جو ان کا عمل ہوتا تھا۔ ان کے روشن چہرہ پر ایمان کی چمک اس طرح نمایاں تھی کہ غیر مسلم بھی دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ اگر اسلام مجسم صورت میں آتا وہ علامہ انور شاہ کی صورت میں ہوتا۔ ہمارے شیخ ومربی حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ' فرماتے تھے کہ:

''ہمارے زمانے میں مولانا انور شاہ صاحب کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے۔''

آج سے ستر اسّی سال قبل جبکہ حضرت الاستاذ قبلہ شاہ صاحبؒ جواں عمر تھے، مظفر نگر کے ایک جلسۂ مناظرہ میں جو مسلمانوں اور آریوں کے درمیان ہوا تھا، حضرت علامہ مرحوم بھی دارالعلوم دیوبند کی طرف سے اپنے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ‘ کے ساتھ شرکتِ جلسہ کے لئے تشریف فرماتے، تو آریہ مبلغ نے کھلے لفظوں میں کہا تھا اگر کسی کی صورت دیکھ کر اسلام قبول کیا جاتا تو آج بھی مولانا انور شاہ کی صورت دیکھ کر مسلمان ہو جانا چاہئے تھا، جن کے چہرے پر ہی اسلام برستا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

درسِ حدیث کے لئے جب حضرت شاہ صاحبؒ اپنے قیام کے کمرے سے درسگاہ کی طرف چلتے ہوئے نظر آتے تو ہم لوگوں میں ایک دوسرے کو آمد کی اطلاع دینے کے لئے بے ساختہ جو کلمہ زبان زَد تھا وہ یہ تھا کہ ”جاء الشیخ الثقۃ الامین“ جو درحقیقت ان کے ظاہری وباطنی کمالات کی وجہ سے خود بخود قلوب میں وضع ہو گیا تھا۔

درس میں اس وقار سے بیٹھتے جیسے کوئی پُر رعب وہیبت بادشاہ اپنی رعایا کے سامنے تخت نشین ہو، کلام نہایت باعظمت، متین اور علمی مواد سے لبریز ہوتا اور نقل ورواۃ کی قسم سے جو بھی دعویٰ فرماتے اسی وقت کتبِ متعلقہ کھول کر اس کی عبارت سامنے کر دیتے۔ کتبِ حدیث کا ڈھیر خصوصیت سے سامنے رکھا ہوا ہوتا تھا۔ درس میں تبحر اور تفقہ دونوں یکساں چلتے تھے۔ درسِ حدیث فقط فنِ حدیث تک محدود نہ تھا بلکہ جمیع علوم وفنون کے حقائق پر مشتمل تھا۔

میں خود حضرتؒ کی تقریر قلمبند کرتا تھا، اپنی کاپی کو طوالتِ عنوانات سے بچانے کے لئے تقریباً سات کالموں میں تقسیم کر رکھا تھا اور ہر کالم پر عنوانات کے عنوان دیئے ہوئے تھے۔ جیسے فنِ صرف ونحو، فن معانی وبلاغت، فن تفسیر وحدیث، فن فقہ واصول فقہ، فن منطق وفلسفہ، فن ہیئت وریاضی اور فن تاریخ وغیرہ، کیونکہ اہم مسائل میں ان فنون کے مسائل تقریباً ہر روز آتے تھے جو مسئلہ جس فن کا ہوتا میں اسی کالم میں اس کا اندراج کر لیتا اور درس سے اُٹھ کر یہ معلوم ہوتا کہ ہم لوگ صرف حدیث ہی پڑھ کر نہیں آئے ہیں بلکہ جمیع فنونِ متداولہ کا درس لے کر آرہے ہیں۔

لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

روئداد دارالعلوم میں حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ:

’’حضرت شاہ صاحبؒ کشمیر کے ایک ممتاز علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔آپ کے والد بزرگوار مولانا سید معظم شاہ صاحب ایک جید عالم دین اور عارفِ کامل تھے۔حضرت شاہ صاحب بچپن ہی سے غیر معمولی ذہانت وذکاوت اور بے مثل قوتِ حافظہ کے مالک تھے۔آپ ۱۳۱۰ھ (۱۸۸۴ء) میں دیوبند تشریف لائے۔حضرت شیخ الہندؒ مسندِ صدارت پر متمکن تھے۔استاذ نے شاگرد کو اور شاگرد نے استاذ کو پہلی ہی ملاقات میں پہچان لیا۔تفسیر وحدیث کی کتابیں شروع کیں اور چند ہی سال میں دارالعلوم میں شہرت ومقبولیت کے ساتھ ایک امتیازی شان حاصل کرلی۔

۱۳۱۴ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوکر آپ حضرت گنگوہی قدس سرہ‘ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سندِ حدیث کے علاوہ باطنی فیوض سے بھی مستفیض ہوئے اور خلافت حاصل کی۔دارالعلوم سے فراغت کے بعد آپ نے مدرسہ امینیہ دہلی میں فرائض تدریس انجام دیئے، پھر حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے اور ۱۳۲۷ھ سے دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس کی خدمت انجام دینے لگے اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے خصوصی مہمان کی حیثیت سے رہے۔۱۳۳۳ھ (۱۹۱۵ء) کے اواخر میں جب حضرت شیخ الہندؒ نے سفرِ حجاز کا قصد کیا تو اپنی جانشینی کا فخر حضرت شاہ صاحبؒ کو بخشا۔

دارالعلوم کی مسندِ صدارتِ حدیث پر تقریباً ۱۲ سال تک آپ جلوہ افروز رہے۔۱۳۴۶ھ (۱۹۲۷ء) کے اوائل میں اہتمامِ دارالعلوم سے بعض اختلافات کے باعث آپ فرائض صدارت سے دست کش ہوکر جنوبی ہند کے مدرسہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تشریف لے گئے اور ۱۳۱۵ھ (۱۹۳۲ء) تک وہاں درسِ حدیث کا مشغلہ جاری رہا۔قدرت کی جانب سے آپ کو حافظہ ایسا عدیم النظیر بخشا گیا تھا کہ ایک مرتبہ دیکھی ہوئی کتاب کے مضامین ومطالب تو درکنار عبارتیں تک مع صفحات وسطور کے یاد رہتیں اور دورانِ تقریر بے تکلف حوالے دیتے چلے جاتے تھے۔اسی کے ساتھ مطالعے کا اس قدر شوق تھا کہ جو علوم کے خزانے ان کے دامن جستجو کی وسعتوں کو مطمئن اور تشنگی علم کو سیراب نہ کرسکتے تھے۔کثرتِ مطالعہ اور قوتِ حافظہ کے باعث گویا ایک متحرک ومتکلم کتب خانہ

تھے۔ صحاحِ ستہ کے علاوہ حدیث کی اکثر کتابیں تقریباً برنوکِ زبان تھیں۔

تحقیق طلب مسائل میں جن کی جستجو اور تحقیق میں عمریں گذر جاتی ہیں سائل کے استفسار پر چند لمحوں میں اس قدر جامعیت کے ساتھ جواب دیتے تھے کہ اس موضوع پر سائل کو نہ تو شبہ باقی رہتا تھا اور نہ کتاب دیکھنے کی ضرورت، پھر مزید لطف یہ کہ کتابوں کے ناموں کے ساتھ صفحات وسطور تک کا حوالہ بھی بتلا دیا جاتا تھا۔ وہ ہر ایک علم وفن پر اس طرح برجستگی کے ساتھ تقریر فرماتے تھے کہ گویا ان کو یہ تمام علوم مستحضر ہیں اور ابھی ابھی ان کا مطالعہ کیا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے علمی ذوق کا طبیعت پر اس قدر غلبہ تھا کہ عرصہ تک نکاح اور متاہلانہ زندگی سے گھبراتے رہے مگر بالآخر بزرگوں کے شدید اصرار سے ۴۳ سال کی عمر میں متاہلانہ زندگی اختیار فرمائی تھی اور اس کے بعد تنخواہ لینے لگے تھے۔ ڈابھیل میں چند سال قیام فرمانے کے بعد آخر میں امراض کی شدت سے مجبور ہو کر دیوبند جس کو آپ نے اپنا وطنِ اقامت بنالیا تھا چلے آئے اور یہیں ۳ رصفر المظفر ۱۳۵۲ھ (۱۹۳۳ء) کو تقریباً ۶۰ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ مزار مبارک عیدگاہ دیوبند کے قریب ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے دورِ صدارتِ تدریس میں ہزار سے زائد طلبا کو درسِ حدیث پڑھایا جن میں ممتاز تلامذہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا سید بدر عالم میرٹھیؒ، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ، مولانا شبیر علی تھانویؒ، مولانا عبدالرحمٰن کاملپوریؒ، مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا محمد انوریؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا محمد میاں دیوبندیؒ اور مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانوی وغیرہ۔

مختصر یہ کہ حضرت شاہ صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین اور حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ تمام علومِ معقولات ومنقولات میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور قوتِ حافظہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ کئی مشہور محققانہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کا درسِ حدیث اپنے دور کا

مشہور درس تھا جو ایک خاص امتیازی طرز لئے ہوئے تھا۔آپ کے تبحر علمی نے درسِ حدیث کو جامع علوم وفنون بنادیا تھا اور آپ کے درس نے نقل وروایت کی راہ سے آنے والے فتنوں کے لئے آنے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔

آج بھی نمایاں اور ممتاز علماء اور صاحبِ طرز فضلاء زیادہ تر آپ ہی کے تلامذہ ہیں جو ہندوپاک میں علمی مسندوں کو آراستہ کئے ہوئے ہیں۔آپ کے یہاں ردِقادیانیت کا خاص اہتمام تھا اور اس فتنہ کو اعظم الفتن شمار کرتے تھے۔اس سلسلہ میں کئی معرکۃ الآراء کتابیں خود بھی تصنیف فرمائیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے تلامذہ سے بھی لکھوائیں۔اس بارے میں بڑے شغف کے ساتھ لکھنے والوں کو علمی مدد دیتے تھے۔حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ ،حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور حضرت مولانا سید بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنیؒ نے خصوصیت سے حضرت شاہ صاحبؒ کی ردِقادیانیت تحریک میں عملی حصہ لیا اور تحریر وتقریر کے ذریعہ اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے سرگرمی سے کام کرتے رہے۔

الغرض حضرت شاہ صاحبؒ کی آخری زندگی تردیدِ قادیانیت میں صرف ہوئی اور اُنہیں کامل شغف اس فتنہ کبریٰ کے استیصال سے رہا۔جس سے حضرت شاہ صاحب مرحوم کا بغض فی اللہ نمایاں ہوجاتا ہے جو محبتِ حضرت خاتم الانبیاء والمرسلین کا ایک واضح نشان اور ورثۂ انبیاء کی کھلی دلیل ہے۔ حضرتؒ کے اس سلسلہ کے مضامین ومقالات جن کا تعلق تردیدِ قادیانیت سے ہے خصوصاً مقدمہ بہاول پور میں انہوں نے کئی روز مسلسل ردِقادیانیت اور قادیانیوں کے کفر کے اثبات میں جونہایت پُرمغز اور علمی بیانات کے اہم اقتباسات حضرت شاہ صاحبؒ کے صاحبزادے مولانا سید انظر شاہ صاحب نے اپنی تالیف ''نقش دوام'' میں جمع کر دیئے ہیں،جن سے قادیانیت کے متعلق اکابرِ دارالعلوم دیوبند کا نقطۂ نظر مدلل طور پر سامنے آگیا ہے اور ساتھ ہی متعلقہ علوم اور اصول ومقاصدِ دین بھی واشگاف ہوگئے ہیں۔

حضرت مولانا حافظ محمد یٰسین دیوبندیؒ

آپ قصبہ دیوبند کے عثمانی شیوخ میں علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے ہم عصر تھے اور آپ کو دارالعلوم کا قرنِ اول نصیب ہوا جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کا دور تھا۔ آپ نے ان حضراتِ قدسی صفات کے فیوض وبرکات سے بہت استفادہ کیا۔ آپ نے انہیں بزرگوں کی آغوش میں آنکھ کھولی اور انہیں کے سائے میں پرورش پائی۔ انہی بابرکت اکابر علماء کی خدمت میں رہ کر تعلیم وتربیت پائی اور پھر فراغتِ تعلیم کے بعد انہیں حضرات کی شفقتوں اور عنایتوں کے سایۂ رحمت میں دارالعلوم کی تعلیمی خدمات میں مشغول ہوگئے۔ آپ کو حضرت مولانا گنگوہیؒ کی خدمت ومحبت اور حضرت مولانا یعقوبؒ کی تعلیمات کا گہرا رنگ حق تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا اور یہی ان کی زندگی کا اصل خلاصہ تھا۔

دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا نے چالیس برس سے زیادہ تدریسی خدمات انجام دیں، فارسی کی انتہائی کتابوں کا درس آپ نہایت شوق اور جانفشانی اور کامل تحقیق سے پڑھاتے تھے، اس درس میں علاوہ اہل شہر اور دیگر طلباء کے بعض عربی تعلیم یافتہ اور فارغ التحصیل علماء بھی شریک ہوتے تھے اور عالمانہ بحث واشکال پیش کرتے تھے۔ اس طرز پر سکندر نامہ اور قصائدِ عرفی وبدر چاہ وسہ نثر ظہوری وغیرہ کا درس ایک نہایت شاندار درس ہوتا تھا اور پوری بحث وتحقیق سے تعلیم ہوتی تھی۔ آپ نہایت شفقت اور دل سوزی سے مضامین ومطالب بیان فرما کر پوری طرح طلباء کے ذہن نشین کرادیتے تھے۔ حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب قدس سرہ کی ایک نمایاں خصوصیت تھی، اثرِ صحبت اور برکت یہ بھی تھی کہ طلباء کے قلب میں ابتداء سے حق تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور بزرگانِ دین کی عقیدت جاگزیں ہوجاتی تھی۔ جس کا پائیدار اثر اس کی دینی ودنیوی اصلاحِ حال کے لئے آخری زمانہ تک مفید ہوتا تھا اور حضرت مولانا کی پابندیٔ شریعت اور آدابِ طریقت اور ادائے اعمال وعبادات مستفیدین کے لئے ایک بہترین نمونہ پیش نظر رہتا تھا۔

حضرتؒ کی نہایت قابل قدر اور بے مثل تعلیم واصلاح کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا۔

دیوبند میں تعلیم یافتہ لوگوں میں ایسے بہت کم لوگ ہوں گے جو حضرتؒ کے حلقۂ درس میں مستفیض نہ ہوں۔ دارالعلوم دیوبند میں مصروفیتِ تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ کو کتب بینی اور تصنیف وتالیف کا بھی کسی قدر شغل ضرور رہتا تھا۔ اس دوران رسائل واخبارات میں اپنے دینی واصلاحی مضامین اکثر شائع کراتے تھے اور بعض نظریاتِ باطلہ کا بھی زبردست رد فرمایا کرتے تھے۔

دینی رغبت وشوق نے آپ کو زمانۂ طالب علمی ہی سے بیعت وارشاد اور باقاعدہ ذکر واشغال کے لئے بے قرار رکھا تھا، لیکن شفیق اور ناصح اساتذہ کی تفہیم اس میں عجلت کرنے سے مانع تھی۔ اس لئے تحصیل علم کے بعد اس کا موقع اور وقت آیا، اس زمانہ میں قطب الارشاد حضرت مولانا گنگوہیؒ کو حق تعالیٰ نے اہل علم کا مرجع بنا کر رکھا تھا اور متوسلین دارالعلوم پر حضرتؒ کی خاص شفقت مبذول تھی۔ آپ نے حضرتؒ کے ہاتھ پر بیعت اور ان کی تعلیمات اور فیض صحبت سے خصوصی استفادہ کیا، آپ کو حضرت گنگوہیؒ سے عشق کی حد تک محبت وعقیدت تھی اور انہیں کے ارشادات وہدایات کے مطابق زندگی بسر کی اور سلوک وتصوف کے منازل طے کئے۔ ماہ صفر ۱۳۵۵ھ میں رحلت فرمائی۔ حق تعالیٰ درجاتِ عالیہ عطا فرمائے آمین۔

حضرت مولانا حکیم عبدالوہاب غازی پوریؒ

آپ دہلی کے مشہور طبیب، حضرت گنگوہیؒ قدس سرہٗ کے عاشق ومرید اور علومِ دینیہ کے ماہر تھے۔ نابینائی کی حالت میں تحصیل علم کی اور مہارتِ تامہ پیدا کی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہٗ کے تلامذہ میں سے تھے۔ انہیں کی طالب علمی کے زمانہ میں یورپ کا ایک سیاح دارالعلوم دیوبند دیکھنے آیا تو اس نے واپس ہو کر یورپ کے اخبارات میں دارالعلوم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ دارالعلوم میں پہنچ کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب میں نے دیکھا کہ ایک نابینا طالب علم اپنے ساتھیوں کو اقلیدس کا تکرار کرا رہا تھا اور اقلیدس کی مشکل شکلیں سامنے کے طالب علم کی کمر پر انگلی سے کھینچ کھینچ کر اسے سمجھا رہا تھا۔ یہ طالب علم یہی حضرت مولانا حکیم عبدالوہاب صاحبؒ تھے۔ بعد تعلیم حضرت مولانا گنگوہیؒ سے بیعت کی اور حضرتؒ کی صحبت سے مستفید ہو کر باطنی کمال پیدا کیا

خود مجھ سے ایک دفعہ ذکر فرمایا کہ:

''جب میں نے طب پڑھنے کے بعد حضرت گنگوہیؒ سے عرض کیا کہ ذریعۂ معاش کے طور پر میں نے طب پڑھ لی ہے لیکن اطباء مریض کا چہرہ مہرہ دیکھ کر قارورہ دیکھ کر اور دوسرے مشاہدوں سے مرض کی تشخیص کرتے ہیں لیکن میں نابینا ان تمام مشاہدات سے معذور ہوں اور چاہتا ہوں کہ معاش اس فن طب سے پیدا کروں۔ اس لئے میرے حق میں دعا فرما دیجئے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں نباضی کی مہارت عطا فرمائیں گے اور تم نبض دیکھ کر وہ تمام باتیں معلوم کرو گے جو دوسرے اطباء مشاہدوں سے معلوم کرتے ہیں۔''

یہ قصہ سنا کر فرمایا کہ الحمدللہ میں اپنے شیخ گنگوہیؒ کی اس کرامت کا روزانہ مشاہدہ کرتا ہوں اور نبض پر ہاتھ رکھتے ہی مجھ پر مرض اور مریض کے احوال کی تمام نوعتیں منکشف ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ان کی نبض شناسی کی مہارت اس درجہ میں پہنچ چکی تھی کہ باپ یا بھائی کی نبض دیکھ کر بیٹے اور دوسرے بھائی کے احوالِ مرض بتا دیا کرتے تھے۔ باوجود علمی استحضار کے شغل آخر تک طب ومطب ہی کا غالب رہا اور اسی میں پوری عمر گزار دی۔ لوگ شفائے بدن کے ساتھ ان کے تقویٰ ومہارت اور معمولات کی پابندی اور پختگی سے شفائے روح بھی حاصل کرتے تھے۔

ایک مدت تک آپ نظام دکن کے معالج خصوصی رہے۔ آخر کار ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ میں دہلی میں وفات پائی۔ وصیت کے مطابق ان کا جنازہ دہلی سے گنگوہ لے جایا گیا اور اپنے شیخ حضرت گنگوہیؒ کے مزار کے قریب مدفون ہوئے۔ حق تعالیٰ درجاتِ عالیہ نصیب فرمائیں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

حکیم الامت مجدد الملّت حضرت اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ' کی شخصیت اور ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ حضرتؒ کی ذات والا صفات یگانۂ روزگار اور ''آفتاب آمد دلیل آفتاب'' کی مصداق ہے۔

حضرت تھانوی بطور تحدیثِ نعمت فرمایا کرتے تھے کہ:

مجھ کو چونکہ سخت سے سخت حالات پیش آچکے ہیں اس لئے احوالِ باطنی کا ایسا تجربہ ہو گیا ہے کہ

کسی سالک کی کتنی ہی الجھی ہوئی حالت ہو اور وہ کیسی ہی باطنی پریشانی میں مبتلا ہو، بحمد اللہ مجھ کو اس کے معالجہ کے باب میں ذرا بھی تردد لاحق نہیں ہوتا اور بفضلہٖ تعالیٰ ایسی ایسی تدبیریں ذہن میں آجاتی ہیں کہ ان کے استعمال سے وہ نہایت سہولت اور سرعت کے ساتھ اس حالت سے نکل جاتا ہے، بالخصوص داعیہ وخطرات کی تشخیص ماہیت اور تجویز علاج میں تو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ایسی بصیرت عطا فرمادی ہے کہ آج کل کم لوگوں کو ہوگی، ولا فخر۔

تربیتِ خاص

چونکہ حضرت تھانوی کو بھی حق تعالیٰ نے اس منصبِ جلیلہ پر قائم فرمانا تھا اس لئے آپ کی تربیتِ خاص کے خصوصی اسباب پیدا کئے گئے۔ آپ کا ایک بزرگ کی دعاء اور برکتِ بشارت سے وجود میں آنا، صالحین کی طرح بچپن گذارنا، غزالی ورازیٔ وقت اساتذہ سے تعلیم پانا، زمانۂ طالب علمی میں وعظ وتبلیغ کی مشق فرمانا، اکابر صالحین کا غائبانہ آپ کو مرکزِ توجہ بنانا، بزرگانِ دین سے فیوضِ ظاہری وباطنی حاصل کرنا، شیخ العرب والعجم سے روحانی تربیت پانا، قبض وبست کی دشوار گزار وادی سے بخیر وخوبی پار ہوجانا، تحریر وتقریر جذب وتاثیر کا پیدا ہونا اور عند اللہ وعند الناس مقبول ومحبوب ہونا اس بات کی بین دلیل تھی کہ قدرت کو ان سے مہتم بالشان کام لینا ہے۔

حضرت اقدس حکیم الامت تھانویؒ شریعت وطریقت کے مجمع البحرین، جامع علم وعرفان اور دینی بصیرت وفقاہت، تقویٰ وطہارت کے درجۂ کمال پر فائز تھے۔ حضرتؒ والا کے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کو دیکھ کر اسلافِ کرام کی یاد تازہ ہوجاتی تھی۔ حضرت والا تھانوی قدس سرہ' بجا طور پر سلفِ صالحین کے علوم وفیوض کے امین اور وارث تھے۔ حضرتؒ کی کیمیا اثر صحبت اور بابرکت تعلیمات سے ہزارہا بندگانِ خدا کو یقین ومعرفت کی لازوال دولت میسر آئی اور بہت سے تشنگانِ معرفت کو اس چشمۂ عرفاں سے سیرابی وشادابی ہوئی۔

معاملات ومعاشرت، سیاست، عقائد وعبادات غرض کہ دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں حضرت والا قدس سرہ' کی گراں قدر تجدیدی خدمات موجود نہ ہوں اور دین کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کے بارہ میں ہدایات نہ دی ہوں۔ ہر شعبہ میں آپ کی تصانیف موجود ہیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ،

تصوف وسلوک، قراءت، منطق وفلسفہ وغیرہ تمام علوم وفنون میں حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی مجددانہ اور حکیمانہ تحقیقات عصر حاضر کا بے مثال منفردانہ مصلحانہ عظیم الشان کارنامہ ہے۔

حضرتِ والا حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کی ذکاوت وذہانت کے آثار بچپن ہی سے نمایاں تھے۔ حضرتؒ نے ۱۲۹۹ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی تھی اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے حضرتِ والا زیادہ مستفید ہوئے ہیں۔ پھر حضرت والا ۱۳۰۱ھ میں مدرسہ فیض عام کانپور میں صدر مدرس مقرر رہوئے اور پھر مدرسہ جامع العلوم کی مسندِ صدارت کو زینت بخشی۔

کانپور میں حضرتِ والا کے درسِ حدیث کی شہرت سن کر دور دراز سے طلباء کھنچے چلے آتے تھے۔ ۱۳۱۴ھ میں اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی قدس سرہٗ کی خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں توکلاً علی اللہ قیام فرمایا جہاں تادمِ واپسیں ۴۷ سال تک تبلیغ دین، تزکیۂ نفس اور تصنیف وتالیف کی ایسی شاندار اور گراں قدر خدمات انجام دیں جس کی مثال اس دور کی کسی دوسری شخصیت میں نہیں ملتی۔ علم نہایت وسیع اور گہرا تھا جس کا ثبوت حضرتؒ کی تصانیف کا ہر ہر صفحہ دے سکتا ہے، حضرتؒ کی تصانیف ومواعظ سے لاکھوں افراد کو علمی وروحانی فیض پہنچا۔ اس کے ساتھ ساتھ بیعت وارشاد کی راہ سے عوام وخواص کا جتنا بڑا حلقہ حضرت والا سے مستفیض ہوا اس کی مثال بھی کم ہی ملے گی۔ حضرت حکیم الامت کی رفعت وبلندی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہندوپاک کے بڑے بڑے صاحبِ علم وفضل اور اہل کمال وتقویٰ حضرتؒ کے حلقۂ بیعت میں شامل تھے۔ حضرت والا کی ذات اقدس علم وحکمت اور معرفت وطریقت کا ایک ایسا سرچشمہ تھی جس سے نصف صدی تک برصغیر کے مسلمان سیراب وشاداب ہوتے رہے۔ دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں حضرت والا کی عظیم خدمات تقریری وتحریری صورت میں نمایاں نہ ہوں۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے الفاظ میں اصلاحِ امت کی کوشش میں علمی وعملی زندگی کے ہر گوشے پر حضرتؒ کی نظر تھی۔ بچوں سے لے کر بوڑھوں تک، عورتوں سے لے کر مردوں تک، جاہلوں سے لے کر عالموں تک، عامیوں سے لے صوفیوں تک، درویشوں سے لے کر زاہدوں تک، غریبوں سے لے کر امیروں تک ان کی نظر مصروفِ اصلاح وتربیت رہی۔

پیدائش، شادی بیاہ، غمی اور خوشی اور دوسری تقریبوں پر اور اجتماعوں تک کے احوال پر ان کی نظر پڑی اور شریعت کے معیار پر جانچ کر ہر ایک کھرا کھوٹا الگ الگ کیا۔ رسوم و بدعات اور مفاسد کے ہر روڑے اور پتھر کو ہٹا کر صراطِ مستقیم کی راہ دکھائی۔ تبلیغ، تعلیم، سیاست، معاشرت، اخلاق وعبادات اور عقائد میں دین خالص کے معیار سے جہاں کوتاہی نظر آئی اس کی اصلاح کی۔ فقہ کے نئے نئے مسائل اور مسلمانوں کی نئی نئی ضرورتوں کے متعلق اپنے نزدیک پورا سامان مہیا کر دیا اور خصوصیت کے ساتھ احسان وسلوک جس کا مشہور نام ''تصوف'' ہے، کی تجدید فرمائی۔ ان کے سامنے دین کی صحیح تمثال تھی، اسی کے مطابق مسلمانوں کی موجودہ زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں نقائص تھے ان کے درست کرنے میں عمر بھر مشغول رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی اس میں صرف کر دی کہ مسلمانوں کی تصویرِ حیات کو اس شعبہ کے مطابق بنا دیں جو دین حق کے مرقع میں نظر آتی ہے۔

میری زندگی کی ساخت و پرداخت میں بھی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ' کا بہت بڑا حصہ ہے۔ احقر کی عمر کا ایک بڑا حصہ حضرت والا کے ہاں آتے جاتے گذرا۔ مسائل دینیہ میں ان کی فقہ سنجی، بیدار مغزی، حکیمانہ تنقیحات، معاشرتی معاملات میں غیر معمولی ضبط ونظم ان کا وسیع وعمیق علم ان کی سینکڑوں تصانیف، ان کی محبت و برکت اور حکیمانہ اندازِ تربیت نے زندگی کے بہت بڑے بڑے سبق سکھائے۔ حضرت کو اللہ رب العزت نے مرجع خلائق بنایا تھا، آج بھی ان کی تصانیف اور ان کے خلفائے کرام شریعت وطریقت کے میدان میں ایسی ایسی خدمات انجام دے رہے ہیں، کہ اس دور میں حرام وحلال کا اور جائز وناجائز کا اہتمام کم ہی ملتا ہے جتنا کہ حضرتؒ کے یہاں تھا۔

حضرت کے والد مرحوم کے انتقال کے بعد جائداد ملی اس کے متعلق حضرت نے سرکاری کاغذات ودستاویزات کی از سر نو تحقیقات فرمائی اور اپنے شہر اور دوسرے شہر کے رہنے والے جس شخص کے متعلق ذرا سا بھی معلوم ہوا کہ اس کا ذرا سا بھی کوئی حق اس جائداد میں ہے پورے اہتمام کے ساتھ اس کا حق اسے پہنچا دیا۔ غرضیکہ حضرت نے والا اپنی تحریر، تعلیم وتبلیغ سے لاکھوں مسلمانوں کو علمی وعملی فیض پہنچایا اور ہزاروں مسلمانوں کی باطنی اصلاح فرمائی۔ حضرت والا اور ان کے تلامذہ وخلفاء ملک کے ہر خطے میں پھیلے اور ہندوستان کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا کہ سفر کر کے وعظ وتبلیغ نہ فرمایا

ہو، تصنیف وتالیف کے ذریعے ہر علم وفن میں حضرتؒ نے ہزار سے زائد تصانیف ورثے میں چھوڑیں اور اصلاح وتربیت کا کام اپنے خلفاء ومتوسلین کے حوالے کر کے ۱۶/رجب المرجب ۱۳۶۲ھ کی شب میں تھانہ بھون میں اس جہانِ فانی کو خیر باد کہا اور حافظ ضامن تھانوی شہیدؒ کے مزار کے قریب انہیں کے باغ میں جسے انہوں نے خانقاہ امدادیہ کے نام سے وقف کر دیا تھا محو آرام ہوئے۔ حق تعالیٰ حضرتؒ کے درجات بلند فرمائے آمین۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ

آپ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ آپ سابق ناظم جمعیۃ الانصار تھے اور سکھ مت سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ غیر معمولی ذکاوت وذہانت اور حافظہ کے مالک تھے۔ دماغ منطقی طور پر سیاسی تھا، سیاست میں گہری نظر تھی۔ ابتداءً طبعی اور علمی انداز میں بعد میں مشاہداتی انداز میں، یورپ اور ایشیاء کے بہت سے انقلابات آپ کے سامنے گذرے، اس لئے سیاسی اسکیموں کی ساخت وپرداخت میں آپ کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ آپ نے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رومال میں سرگرم حصہ لیا، افغانستان کی آزادی کی اسکیم آپ ہی نے مرتب کرائی تھی۔ ۲۵ سال تک جلاوطن رہے، واپس تشریف لا کر فلسفہ ولی اللّٰہی سے ملک کو روشناس کرایا۔ ''سندھ ساگر اکاڈیمی'' اور محمد قاسم ولی اللّٰہی سوسائٹی قائم کی جس نے حضرت نانوتویؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے علوم کی کافی خدمت کی۔

افغانستان میں آپ نے انڈین نیشنل کانگریس کی ایک باضابطہ شاخ قائم کر کے افغانستان کے حق میں ہندوستان کی ہمدردیاں حاصل کیں۔ آپ کانگریس میں شرکت کے حامی تھے مگر انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ من حیث القوم۔

دارالعلوم میں آپ نے جمعیۃ الانصار قائم کی جس کے بڑے بڑے دو اجلاس مرادآباد اور میرٹھ میں ہوئے اور اس کے حلقۂ اثر میں وسعت اور قوت پیدا ہوئی۔ آپ دارالعلوم کو ایک علمی انداز سے ملی تنظیم بنانا چاہتے تھے جس کا نقشِ اول جمعیۃ الانصار کا قیام تھا، اسی دوران دارالعلوم کے بعض

اساتذہ سے آپ کا بعض علمی مسائل میں شدید اختلاف رونما ہو گیا جس کے سبب سے آپ کو دیوبند چھوڑنا پڑا۔ حضرت شیخ الہند نے آپ کو دہلی بھیج دیا وہاں سے آپ نے نظارۃ المعارف القرآنیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کے سرپرستوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے علاوہ حکیم اجمل خان دہلوی مرحوم اور نواب وقار الملک جیسی مقتدر شخصیتیں شامل تھیں۔

پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور ریاست بہاول پور کے قصبہ دین پور میں آپ نے زندگی کے آخری لمحات بسر کئے۔ آپ عہدِ حاضر میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے فلسفہ کے سب سے بڑے داعی اور علمبردار تھے۔ قرآن وحدیث، فقہ وتصوف سے متعلق علوم میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے جو تجدید فرمائی تھی آپ اس کے شارح تھے۔ ہر چند ان کے بعض افکار ونظریات سے اہل علم وفضل کو اختلاف بھی رہا ہے مگر اختلافِ رائے کے باوجود ان کی علمی فضیلت اور سیاسی سوجھ بوجھ کے سب ہی قائل تھے۔ آپ نے ۲۱/اگست ۱۹۴۴ء (۱۳۶۳ھ) کو دین پور میں وفات پائی۔ افسوس کہ جس ملک کی آزادی کے لئے انہیں ۲۵ سال ہندوستان سے جلاوطن رہ کر مصائب وآلام کی زندگی گزارنی پڑی اس ملک کو اپنی زندگی میں آزاد نہ دیکھ سکے۔

حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحب دیوبندیؒ

آپ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز اساتذہ میں سے تھے۔ آپ نے ۱۳۲۰ھ میں علومِ دینیہ سے فراغت حاصل کی اور ۱۳۲۱ھ میں جونپور کے مدرسہ میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ پھر اپنے استاذ گرامی حضرت شیخ الہند قدس سرہ' کی طلبی پر دارالعلوم میں تشریف لائے اور تدریس وتعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ساتھ ہی ''القاسم'' کے مدیر بھی تھے۔ ابوداؤد شریف کا درس آپ کا مشہور تھا اور برصغیر میں ہزاروں افراد ایسے ہیں جنہوں نے آپ سے ابوداؤد کا درسِ حدیث پڑھا ہے۔

آپ علومِ قرآن وحدیث کے بہت بڑے ماہر اور جملہ علوم وفنون کے کامل محقق تھے، آپ کا درس نہایت مختصر مگر جامع ہوتا تھا۔ درسی تقریر ایسی ہوتی تھی کہ حدیث کا مفہوم دل میں اتر جائے اور تمام شبہات خود بخود کافور ہو جائیں۔ آپ نہایت متواضع، منکسر المزاج اور خوش اخلاق تھے۔ اتباعِ

سنت کے مجسم پیکر اور حق وصداقت کے علمبردار تھے۔کم گوئی اور سادگی وانکساری آپ کی بڑی صفت تھی اور پابندیٔ اوقات میں آپ کی ذات ضرب المثل کا درجہ رکھتی تھی۔۱۳۵۴ھ میں آپ کی جواں سال صاحبزادی کا انتقال ہوگیا تو آپ نے نہایت صبر وشکر کے ساتھ انا للہ...... پڑھا اور نمازِ فجر پڑھ کر تجہیز وتکفین کا کام اپنے صاحبزادے کے سپرد کر کے دارالعلوم میں سبق پڑھایا اور سبق کے بعد طلباء سے مرحومہ کے لئے دعائے مغفرت کرائی اور جنازہ تیار ہونے پر شریکِ جنازہ ہو گئے اور جنازے کی نماز حضرت مولانا سید احمد صاحب مدنیؒ سے پڑھوائی۔

آپ کا بیعت وسلوک کا تعلق حضرت شاہ عبداللہ عرف میاں جی منے شاہ صاحبؒ سے تھا جو اپنے زمانہ کے کاملین میں سے ہیں۔حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں کہ جس وقت دارالعلوم کی بنیاد میں پہلی اینٹ رکھنے کا مسئلہ آیا تو میں نے کہا کہ پہلی اینٹ وہ رکھے گا جس کے دل میں کبھی گناہ کا ارادہ بھی نہ ہوا ہو، اور فوراً ہی میں نے حضرت منے شاہ صاحبؒ کا نام پیش کر دیا جس کو سب نے پسند کیا۔

حضرت نانوتویؒ فرماتے تھے کہ حضرت شاہ صاحبؒ پر اس قدر استغراق رہتا تھا کہ عزیزوں کی شناخت بھی نہ کر پاتے تھے۔چنانچہ حضرتؒ کے ایک داماد اللہ بندہ تھے جب وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے پاس ملنے آتے تو حضرت شاہ صاحبؒ دریافت فرماتے کہ بھائی کون ہو تم؟ آپ کے داماد کہتے کہ حضرت! میں اللہ بندہ ہوں، حضرت فرماتے کہ ''اللہ کے بندے تو سب ہی ہیں تم اپنا نام بتاؤ'' وہ کہتے حضرت! میں آپ کا داماد ہوں میرا نام اللہ کا بندہ ہی ہے۔

بہرحال حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ نے سلوک کی منازل ان ہی بزرگ کی صحبت میں رہ کر طے کی ہیں، پھر اجازتِ بیعت حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی طرف سے عطا ہوئی، بعدازاں ۱۳۱۰ھ میں حضرت منے شاہ صاحبؒ نے بھی اپنے وصال سے ایک دن قبل آپ کو اجازتِ بیعت اور خلافت عنایت فرمائی تھی، آپ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں تین حج کئے لیکن ہمیشہ اپنی آمد وروانگی صیغۂ راز میں رکھتے تھے۔ساری عمر درس وتدریس اور تبلیغ واصلاح میں بسر کی اور کئی تصانیف ''فتاویٰ محمدی، دستِ غیب، اذان اور اقامت، حیاتِ خضر، فقہ الحدیث اور حیات شیخ الہندؒ

آپ کے علمی مقام کی دلیل ہیں۔۲۲/محرم الحرام ۱۳۶۴ھ میں آپ نے وصال فرمایا حق تعالیٰ درجات بلند فرمائے۔آمین۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ

آپ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے ممتاز فضلاء میں سے ہیں اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہ' سے سلوک کی تکمیل کی ہے۔ان کے بڑے بھائی حضرت مولانا یحییٰ صاحب کاندھلویؒ آپ کو اپنے ساتھ گنگوہ بھی لے گئے تھے، جہاں حضرت گنگوہیؒ سے آپ نے شرفِ بیعت بھی حاصل کیا اور آٹھ نو برس اپنے بھائی کے ساتھ گنگوہ میں قیام کر کے تعلیم وتربیت حاصل کرتے رہے۔۱۳۲۶ھ میں حضرت شیخ الہندؒ کے درس میں شرکت کے لئے دیوبند پہنچے اور ترمذی وبخاری شریف کی سماعت کی۔

۱۳۳۴ھ میں حج بیت اللہ کیا اور پھر اپنے بڑے بھائی کی وفات کے بعد بستی نظام الدین دہلی میں مستقل قیام پذیر ہوئے اور توکلاً علی اللہ دعوت وتبلیغ کا آغاز فرمایا۔ساتھ ہی آپ نے شب وروز محنت کر کے علاقے میں بہت سے مکتب قائم کئے اور گشت کے ذریعے عمومی دعوت وتبلیغ کا منصوبہ بنایا جو آہستہ آہستہ نہایت کامیابی سے پھیلنے لگا اور چند برسوں میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے خلوص کی برکت سے ایسی کامیاب عطا فرمائی کہ تبلیغی جماعتیں مختلف علاقوں اور شہروں میں بھیجی جانے لگیں اور پھر پورے برصغیر میں اصلاح وتبلیغ کا کام بڑی باقاعدگی سے ہونے لگا۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں کہ:

> ''حضرت مولانا محمد الیاسؒ نے نہایت خاموشی کے ساتھ صرف اپنے مخلصانہ سادہ طریق اور صحیح اصولِ دعوت کے ذریعے پچیس برس کی انتھک محنت میں میواتیوں کو ان خالص اور مخلص مسلمانوں کی صورت میں بدل دیا جن کے ظاہر وباطن پر خاندانی مسلمانوں کو بھی رشک آتا ہے۔''

بہر حال آپ آخر عمر تک انتھک کوششوں کے ذریعے جس دعوت کو لے کر اٹھے تھے اس میں کامیاب ہوئے اور ہزاروں ایسے افراد پیدا کر دیئے جو آپ کے بعد آپ کی دعوت کو آپ کے نشانِ

راہ پر چلا سکیں۔

آپ نہایت متواضع، منکسر المزاج اور بہت ضعیف ونحیف تھے۔متبع سنت اور زہد وتقویٰ کا مجسمہ تھے۔آپ نے ۱۳۶۴ھ میں وفات پائی۔آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف صاحب مرحوم امیر جماعت بنے اور پورے انہاک اور محنت سے اپنے والدِ مکرم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تبلیغی واصلاحی خدمات انجام دیتے رہے۔

حضرت مولانا محمد میاں صاحب منصور انصاریؒ

آپ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے نواسے تھے، حضرت شیخ الہند کے خاص معتمد تلمیذ رشید تھے۔ابتداءً حضرت شیخ الہندؒ کے علمی کاموں میں شریک ہوتے رہے اور اخلاقی استفادہ کیا، پھر حضرت کے سیاسی منصوبوں میں شریک ہوئے اور آخر کار حضرتؒ کے امین اور راز دار رفقاء میں شمار ہوئے۔ریشمی خطوط کو حجاز سے لے کر آپ ہی روانہ ہوئے تھے اور برطانوی حکام کی انتہائی کوشش کے باوجود ان کے قبضہ میں نہ آسکے اور بمبئی سے پشاور تک مخفی سفر کیا۔ ہندوستان کی سرحد پار کر کے افغانستان میں داخل ہوگئے اور ریشمی خط اپنے موقع پر پہنچا دیا۔

کابل کا انقلاب آپ کے سامنے ہوا۔بچہ سقہ کی چند روزہ حکومت میں آپ کو کابل سے بھی جلاوطن کر دیئے جانے کا آرڈر دیا گیا اور آپ کسی نہ کسی طرح کابل سے روپوشی کے ساتھ روس کی سرحد میں داخل ہوگئے۔اس عرصہ میں افغانستان میں انقلاب ہوگیا اور جنرل نادر شاہ حکمراں ہوگئے۔انہوں نے مولانا کو عقیدت کے ساتھ پھر بلایا اور روسی سفارت خانہ میں بحیثیت نائب سفیر آپ کو روس بھیجا گیا، وہاں سے واپسی پر مستقلاً آپ کابل میں مقیم ہوئے۔۱۳۵۸ھ میں مجھے آپ نے بحیثیت مہتمم دارالعلوم دعوت دی اور مجلس شوریٰ نے اس دعوت کو بکمال خوشی قبول کرتے ہوئے مجھے بطور نمائندہ دارالعلوم افغانستان بھیجا تاکہ میں امیر نادر شاہ کی وفات پر تعزیت اور موجودہ بادشاہ افغانستان امیر ظاہر شاہ کی تخت نشینی پر تہنیت پیش کروں۔

افغانستان میں آپ کا علمی اور سیاسی وقار قوم اور حکومت یکساں طور پر مانتی تھی۔مولانا ابوالکلام

آزاد مرحوم کا جذبہ اور فیصلہ یہ تھا کہ ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی وہ مولانا منصور کو ہندوستان لائیں گے لیکن آزادئ ہند سے چند ماہ پیشتر ۱۱ر جنوری ۱۹۴۶ء (مطابق ۴ر صفر ۱۳۶۵ھ) کو مولانا کا وصال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا حامد الانصار غازی سابق ایڈیٹر اخبار ''مدینہ بجنور'' جو ہندوستان کی صحافت میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں، وہ انہیں مولانا منصور انصاری کے بڑے صاجزادے ہیں۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ

آپ دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز فضلاء میں سے تھے اور حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد علیہ تلامذہ میں سے تھے۔ غیر معمولی ذہانت وذکاوت کے حامل تھے۔ علم مستحضر تھا اور بڑا منقح علم تھا۔ علومِ عقلیہ سے خاص ذوق تھا، منطق وفلسفہ اور علم کلام میں غیر معمولی دسترس تھی۔ حکمتِ قاسمیہ کے بہترین شاعر تھے۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد مسجد فتح پوری دہلی کے مدرسہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے تدریس علوم میں مشغول ہوئے۔ پھر دارالعلوم میں بحیثیت استاذ حدیث بلائے گئے۔ اونچے طبقہ کے اساتذہ میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔

پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں ایک عرصہ تک شیخ التفسیر کی حیثیت سے کام کیا اور اپنے آخری دور میں چند سال دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم بھی رہے۔ صحیح مسلم کی بہترین شرح متکلمانہ انداز سے لکھی اور حکمتِ قاسمیہ کو اس میں نمایاں رکھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے تفسیری فوائد جو حضرت نے ترجمہ کے ساتھ شروع فرمائے تھے آپ نے پایۂ تکمیل کو پہنچائے۔ بے مثال خطیب تھے اور خطابت میں قاسمی علوم بکثرت بیان فرماتے تھے۔ تحریر وتقریر میں ان ہی علوم کا غلبہ تھا۔

سیاسی شعور اونچے درجہ کا تھا۔ ملکی معاملات کے اتار چڑھاؤ کا پورا نقشہ ذہن کے سامنے رہتا تھا اور اس بارے میں بچی تلی رائے قائم کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رومال میں شریک رہے۔ جمعیۃ علمائے دیوبند کے کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیا، آخر میں مسلم لیگ کی تحریک میں شامل ہو گئے اور جمعیۃ علمائے اسلام کی بنیاد ڈالی، جمعیۃ علمائے اسلام کے ارکان علمائے کرام نے تحریک

پاکستان میں عملی حصہ لیا اور سرحد وسلہٹ ریفرنڈم میں اہم کردار ادا کیا۔ تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستان پہنچ کر ترکِ وطن کر دیا اور پاکستانی پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کی جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا، قراردادِ مقاصد پاس کرائی، وہاں کی قوم نے آپ کو ''شیخ الاسلام پاکستان'' کے لقب سے یاد کیا۔

حق تعالیٰ نے حضرت علامہ کو علم وفضل کا ایک وافر حصہ عطا فرمایا تھا، لیکن اس کے ساتھ عجز وانکساری اور بزرگوں کا ادب واحترام ان کے خاص اوصاف ہیں۔ اہل علم کے قدرداں اور خلوص کا مجسمہ تھے اور نہایت صاف وشفاف قلب کے مالک تھے۔ غرباء ومساکین سے نہایت شفقت ومحبت اور اخلاقِ کریمانہ کا برتاؤ فرماتے تھے اخلاقی طور پر آپ میں ایک خاص وصف یہ تھا جو بہت ہی اونچا تھا کہ ظاہر وباطن میں یکسانیت تھی، وہ اپنے قلبی جذبات کو چھپانے یا ان کے برخلاف اظہار پر قدرت نہ رکھتے تھے۔ اگر کسی سے خوش ہیں تو ظاہر وباطن خوش اور کسی سے ناراض ہیں تو علانیہ اس کا اظہار ان کے چہرہ سے ہو جاتا تھا اور کہہ بھی دیتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے معاملات میں اگر ذمہ داروں سے انہیں کوئی گرانی پیش آتی اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند جو ان کے بڑے بھائی بھی تھے، سے رنجش ہو جاتی تو اکثر روٹھ کر بیٹھ جاتے یا سفر میں چلے جاتے۔ انہیں منانے اور راضی کر کے لانے کے لئے اکثر میں مامور ہوتا تھا کیونکہ آپ مجھ پر شفقت زیادہ فرماتے تھے۔

ایک دفعہ خفا ہو کر تھانہ بھون تشریف لے گئے تو یہ احقر وہاں گیا اور راضی کر کے لے آیا۔ ایک دفعہ ناخوش ہو کر گھر بیٹھ رہے اور مدرسہ میں آنا جانا ترک کر دیا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ نے طے فرمایا کہ تو ہی جا کر لا سکتا ہے۔ میں حاضر ہوا اور عرض معروض کی تو راضی ہو گئے اور دارالعلوم میں چلے آئے۔ طبیعت اس قدر صاف تھی کہ جس وقت بھی بات ان کے ذہن میں آ جاتی تھی تو اسی لمحے گرانی رفع ہو کر حقیقتاً بشاشت چہرہ پر نمودار ہو جاتی اور ایسے خوش اور متفرح ہو جاتے کہ گویا گرانی تھی ہی نہیں۔ ایک عالم دین کے لئے یہ وصف ایک عظیم مقام ہے کہ اس کا ظاہر وباطن یکساں ہو اور بہ تکلف نہیں بلکہ تصنع وبناوٹ سے اس کی قلبی رفتار خالی ہو۔

حضرت علامہ کا ایک وصف یہ بھی میں نے بارہا دیکھا کہ ان کے بڑوں نے اگر بھری مجلس میں بھی انہیں تہدید آمیز لہجے سے کوئی بات کہی تو کبھی اف نہیں کرتے تھے۔ اگر بات ان کے نزدیک قابل تسلیم نہ ہوتی تب بھی اپنے اکابر کے حقوق کی رعایت روا فرماتے تھے۔ قلبی جذبات کو بالکل صفائی سے کہہ ڈالتے تھے خواہ وہ اپنی بھی کمزوری ہو۔

ایک بار ناخوش ہو کر گھر بیٹھ گئے۔ میں حسب معمول منانے کے لئے گیا تو غصے کے لہجے میں فرمایا، بھائی حبیب نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہے جو اس طرح مجھ سے قطع نظر کر لی، تو سن لو کہ اس قطع نظر کرنے پر میرے دل میں دو طرح کے جذبات پیدا ہوئے ایک جذبہ نفسانیت سے اور ایک للّٰہیت سے، نفسانیت سے تو یہ کہ اگر انہوں نے مجھے مردہ سمجھ لیا ہے تو انہیں میں اپنی زندگی میں باور کراؤں اور اس کا یہ طریقہ ہوتا جو انہیں میری زندگی سمجھوا دیتا، اور دوسرا جذبہ للّٰہیت سے پیدا ہوا وہ یہ کہ میں دیوبند سے کہیں باہر جا کر صحیح مسلم کی شرح لکھنے میں لگ جاؤں۔ میری طرف سے کچھ بھی ہوتا رہے نہ میں یہاں رہوں گا نہ یہ روز روز کی کوفت اٹھانا پڑے گی۔

میں نے کہا کہ حضرت! ان دونوں جذبوں میں سے کون سے کو آپ نے ترجیح دی ہے۔ فرمایا، للّٰہیت والے جذبے کو۔ میں نے کہا الحمد للہ، مگر میں نے پھر کہا کہ حضرت! آپ کے لئے تو اس میں بلاشبہ اجر ہے اور یہ نیت یقیناً پاک ہے مگر اس پر تو دھیان دیجئے کہ کیا اس قسم کی چھوٹی چھوٹی طبعی ناگواریوں سے جماعتی کام کا ترک کر دیا جانا مناسب ہوگا جبکہ کاموں کا دارومدار آپ ہی جیسے حضرات کے اوپر ہے؟ اگر اسی طرح کل کو جماعت کے دوسرے بزرگ بھی ایسی ہی وقتی اور ہنگامی ناگواریوں کے سبب جو کبھی نہ کبھی آپ کی طرف سے ان کو بھی پیش آجاتی ہیں، یہی فیصلے کر لیں کہ ہمیں کام چھوڑ دینا چاہئے تو فرمائیے کہ یہ کام آخر کس طرح چلے گا اور کون سنبھالے گا۔ میرے نزدیک تو آپ نے یہ اپنے کو یکسو کرنے کا فیصلہ نہیں فرمایا بلکہ اس جماعتی کام کو ختم کر دینے کا فیصلہ فرمایا ہے، کیا یہ مناسب ہے؟

بس اتنا سن کر ایک دم چہرے پر بشاشت آگئی اور فرمایا ہاں یہ تو نے صحیح کہا، بس اب میں نے دوسرا جذبہ بھی دل سے نکال دیا اور کل سے دارالعلوم پہنچ کر کام کروں گا۔

چنانچہ علی الصباح حسبِ وعدہ تشریف لے گئے اور ایسے انداز سے آئے کہ گویا کوئی بات پیش ہی نہیں آئی تھی۔ یہ درحقیقت وہی ظاہر و باطن کی یکسانیت، قلب کی صفائی اور حق پسندی کا اثر تھا کہ دل میں کبھی کچھ نہیں رکھتے تھے۔

بہرحال علم کے ساتھ حق تعالیٰ نے یہ خاص وصف عطا فرمایا تھا جس نے ان کی بڑائی دلوں میں بٹھادی تھی۔ قلبی طور پر استغناء اور ناز کی کیفیت کا غلبہ زیادہ تھا، کام کے سلسلہ میں جب تک دوسروں کی طرف سے طلب اور کافی طلب ظاہر نہ ہوتی تھی متوجہ نہیں ہوتے تھے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتیٔ اعظم پاکستان جو میرے رفیق قدیم ہیں اور حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہٗ کے معتمد علیہ تلامذہ اور رفقائے کار میں سے ہیں، فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ علم و فضل کے پہاڑ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت سے اوصاف سے نوازا تھا، عرصۂ دراز تک آپ دارالعلوم دیوبند میں درسِ حدیث کی خدمت انجام دیتے رہے اور آخر میں دارالعلوم کے صدر مہتمم کی حیثیت سے کام کیا اور دارالعلوم نے نمایاں ترقی کی۔

تفسیر عثمانی، صحیح مسلم کی شرح فتح الملہم آپ کی شہرۂ آفاق تصانیف ہیں جو آپ کے علمی کمال کی دلیل ہیں۔ حضرت علامہ نے صحیح مسلم پر اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''فتح الملہم'' جب تالیف فرمائی تو اس کا مسودہ حرمین شریفین لے کر گئے تھے، وہاں روضۂ اقدس کے سامنے بیٹھ کر مسجد نبوی میں اس کی ورق گردانی کی اور پھر روضۂ اقدس پر بھی اور حرم مکہ میں ملتزم پر بھی مسودہ سر پر رکھ کر حضرت علامہ نے دعاء کی تھی کہ یہ مسودہ احقر نے بے سروسامانی کے عالم میں مرتب کیا ہے ''یا اللہ اس کو قبول فرمالیجئے اور اس کی اشاعت کا انتظام فرمادیجئے۔''

اس کے بعد جب حرمین شریفین سے واپس آئے تو نظام حیدرآباد دکن کی طرف سے پیشکش کی گئی کہ ہم اس کتاب کو اپنے اہتمام سے شائع کرائیں گے۔ چنانچہ وہ نظام حیدرآباد کے مصارف پر بڑی آب وتاب کے ساتھ شائع ہوئی اور اس عظیم الشان تالیف نے پوری علمی دنیا سے اپنا لوہا منوالیا۔

الغرض حضرت علامہ مرحوم بغداد الجدید (بہاول پور) میں وزیر تعلیمات کی دعوت پر تشریف

لے گئے اور بغرضِ تبدیلیٔ آب ہوا کچھ روز وہاں قیام فرمایا مگر قیام کو ابھی تین ہی دن گذرے تھے کہ وقتِ موعود آ پہنچا اور ۱۳؍ دسمبر ۱۹۴۹ء یوم شنبہ آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور ہمیں داغِ مفارقت دے کر راہگیر عالمِ جاودانی ہوگئے۔ یہ خبر مسلمانانِ ہندو پاک عموماً اور متوسلین دارالعلوم دیوبند کے حلقوں میں خصوصاً انتہائی رنج وغم کے ساتھ سنی گئی۔

دارالعلوم کی فضا رنج وغم میں ڈوب گئی اور تمام دفاتر بند کر دیئے گئے۔ علی الصباح نمازِ فجر کے بعد مسجد دارالعلوم میں حضرت علامہ کے سانحۂ ارتحال کا تذکرہ کر کے کلمہ شریف اور قرآن کریم ختم کیا گیا، جس میں تمام اساتذہ، طلباء اور کارکنانِ دارالعلوم نے شرکت کی، پھر بعد نمازِ ظہر تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا جس میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نے اپنے تعزیتی کلمات میں ارشاد فرمایا کہ:

”حضرت علامہ عثمانیؒ کی شخصیت بے مثال تھی، علم وفضل میں آپ کا پایہ بلند تھا اور ہندوستان کے چیدہ علماء میں سے تھے۔ ہم میں سیاسی اختلافات ضرور پیدا ہوئے مگر وہ اپنی جگہ ہیں، حضرت علامہ مرحوم کے علم وفضل اور بلند پایہ شخصیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یقیناً ان کی یہ دائمی مفارقت ہم سب کے لئے باعثِ صدرنج وملال ہے۔ حضرت علامہ مرحوم نے دارالعلوم میں تعلیم پائی اور حضرت شیخ الہندؒ اور بہت سے اکابر دارالعلوم سے انہیں نسبتی تعلق تھا اور تقریر وتحریر کا خداداد ملکہ حضرت مولانا مرحوم کا حصہ تھا اور بہت سی خوبیوں کے حامل تھے۔“

حضرت مولانا مدنی کی تقریر کے بعد احقر نے ایک مفصل تقریر کی جس میں شیخ الاسلام علامہ مرحوم کی علمی، دینی اور سیاسی خدمات وخصوصیات پر روشنی ڈالی اور بتلایا کہ جماعتِ علماء میں حضرت علامہ مرحوم نہ صرف ایک بہترین عالم وفاضل ہی تھے بلکہ ایک صاحب الرائے مفکر بھی تھے۔ آپ کا فہم وفراست اور فقہِ نفس بے نظیر تھا، آپ اس علمی ذوق کے امین تھے جو اکابرِ دارالعلوم سے بطور وراثت آپ کو ملا تھا۔ حضرت قاسم العلوم والخیرات بانیٔ دارالعلوم کے مخصوص علوم پر آپ کی گہری نظر تھی اور درسوں میں ان کے علوم کی بہترین تفہیم کے ساتھ تقریر فرماتے تھے۔ علوم میں نظر نہایت گہری اور عمیق تھی۔ علمی لائنوں میں آپ کو درس وتدریس اور مختلف مدارس مدرسہ فتح پوری دہلی، دارالعلوم دیوبند اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے ہزار ہا طلباء کو یکے بعد دیگرے افادہ ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔

تصنیفی لائنوں میں آپ کی متعدد تصانیف اور قرآن حکیم کی تفسیر بصورت فوائد اور مسلم شریف کی عربی شرح یادگارِ زمانہ رہیں گی، جو پوری دنیائے اسلام میں نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی ہیں۔ سیاسی لائنوں میں آپ نے تقسیم ملک سے پہلے اپنی مدبرانہ سیاسی قابلیت سے ریاستِ حیدرآباد کو ایسے وقت میں بعض مہلک مذہبی فتنوں سے بچانے کی سعی جمیل فرمائی جبکہ اس کے معاملات بہت زیادہ خطرہ میں تھے۔ آزادیٔ ملک کی جدوجہد میں آپ نے کافی حصہ لیا اور آپ کی فصیح و بلیغ تقریروں سے لاکھوں باشندگانِ وطن آزادیٔ وطن کی حقیقت سے آگاہ ہوئے۔

تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستان کو اپنا مستقل وطن بنالیا اور کراچی میں مقیم رہ کر پاکستان کی بہت سی دینی و علمی خدمات انجام دیں۔ پاکستان کے اربابِ حکومت پر آپ کی علمی اور سیاسی خدمات کا خاص اثر تھا اور وہاں کی گورنمنٹ کے ہائی کمان میں آپ کو عالمانہ اور مفکرانہ حیثیت سے خاص عظمت حاصل تھی۔ آپ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے رکن اور مذہبی قانون کمیٹی کے صدر تھے۔ بلاشبہ وہاں کی حکومت نے آپ کے ساتھ حیات اور ممات میں وہ معاملہ کیا جو ایک قدرشناس حکومت کو اپنے مخلص خیرخواہ اور ملک کے ایک ممتاز عالم دین کے ساتھ کرنا چاہئے۔

علامہ مرحوم کی ان چند فضیلتوں اور پھر ان مخصوص نسبتوں سے کہ اولاً آپ دارالعلوم کے مایۂ ناز فرزند تھے، پھر اس کے قابل قدر مدرس بنے اور آخرکار ادارہ کے صدر مہتمم ہوئے، ان کے حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم بطور ادائے حق نہیں بلکہ بطور ادائے قرض ان کے لئے دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کریں اور نہ صرف آج ہی بلکہ آئندہ بھی برابر کرتے رہیں۔

علماء وطلباء کے بھرے مجمع نے دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کے لئے ہاتھ اٹھا کر اور کافی حد تک خشوع وخضوع کے ساتھ دعاء فرمائی اور بڑے رنج والم میں ڈوبی ہوئی یہ مجلس برخاست ہوئی، دفاتر بند کردیئے گئے اور حضرتؒ کے ایصالِ ثواب کیلئے ایک دن کی تعطیل کی گئی۔ احقر مہتمم دارالعلوم اور جماعت کی جانب سے تعزیت کے تار حضرت علامہ مرحوم کے اہل بیت اور پاکستان کے گورنر جنرل اور وزیراعظم اور ایسوسی ایشن پریس پاکستان کو روانہ کئے گئے جن کی عبارت حسبِ ذیل ہے:

”شیخ الاسلامِ پاکستان علامہ شبیر احمد عثمانی کی وفات نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلامی کا ایک شدید

حادثہ ہے، میں خود اور تمام جماعت دار العلوم دیوبند آپ کے اور تمام ملتِ اسلامیہ پاکستان کے غم میں شریک ہیں اور تعزیت پیش کرتے ہیں۔ دار العلوم میں تعطیل کی گئی اور ختم قرآن اور دعاء کرائی گئی ہے۔''

حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن چاند پوریؒ

آپ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ صدر المدرسین دار العلوم دیوبند کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ۱۳۰۴ھ میں دار العلوم سے فارغ التحصیل ہوئے۔ ذکی، طباع اور تیز فہم علماء میں سے تھے۔ ظرافت مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آپ کی وعظ وتقریر بڑی مشہور ومعروف تھی۔ زبردست مناظر تھے۔ مبتدعین اور قادیانیوں کو تا بہ دروازہ آپ ہی نے پہنچایا۔ عرصۂ دراز تک دربھنگہ اور مراد آباد وغیرہ میں صدارتِ تدریس کے فرائض انجام دیئے اور آخر میں دار العلوم دیوبند کے عہدۂ نظامتِ تعلیم اور پھر نظامتِ تبلیغ پر فائز ہوئے۔ دار العلوم میں درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ آپ کی نمایاں اور غیر معمولی خطابت نے ملک کے گوشہ گوشہ کو مستفیض کیا۔

آپ کو ردِ بدعات اور ردِ قادیانیت سے خاص شغف تھا اور اس سلسلہ میں آپ کی بہت سی قابل قدر تصانیف ہیں جو طبع ہو چکی ہیں اور اپنے موضوعات پر قابلِ قدر مباحث سے معمور ہیں۔ تصنیف وتالیف کے ساتھ مطالعۂ کتب اور نوادر ومخطوطات جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ ایک بڑا کتب خانہ جو تقریباً آٹھ ہزار قیمتی مخطوطات پر مشتمل تھا، یادگار چھوڑا ہے، جسے ان کے صاحبزادے محمد انور نے دار العلوم دیوبند میں منتقل کر دیا ہے۔

آپ کو حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ سے شرفِ بیعت حاصل تھا۔ آخر عمر میں حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہ' کی طرف رجوع کیا اور مجازِ بیعت ہوئے۔ یکم رمضان المبارک ۱۳۵۰ھ کو دار العلوم سے سبکدوش ہو کر وطن مالوف چاند پور ضلع بجنور میں قیام فرمایا اور وہیں ربیع الآخر ۱۳۷۱ھ (دسمبر ۱۹۵۱ء) میں رحلت فرمائی۔ حق تعالیٰ درجاتِ عالیہ نصیب فرمائیں، آمین۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ

آپ مدرسہ امینیہ دہلی کے محدث، ہندوستان کے مفتیٔ اعظم اور اپنے زمانہ کے مشہور و مسلم فقیہ و مفتی تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ نکتہ رس علماء میں سے تھے۔ تدریس و افتاء کے ساتھ سیاسی لائن میں بھی نمایاں کام انجام دیا۔ آپ ہی جمعیۃ علماء کے سب سے پہلے صدر ہوئے اور عرصۂ دراز تک صدر رہے۔ جمعیۃ علماء اور کانگریس کی تحریکوں میں قائدانہ حصہ لیا۔ کئی مرتبہ جیل گئے۔ آپ کا علم و فہم علماء میں تسلیم شدہ تھا۔ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ جیسی مردم شناس ہستی نے فرمایا کہ:

''میں مفتی کفایت اللہ کے تدبر اور مولوی حسین احمد کے جوشِ عمل کا معتقد ہوں۔''

مجموعی حیثیت سے آپ فقیہ، محدث، مفتی، مجاہد اور نکتہ سنج علمائے دیوبند میں سے تھے۔ آپ کے فتاویٰ کو ''کفایت المفتی'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا جا رہا ہے جس کی چھ جلدیں تو منظر عام پر آ چکی ہیں۔ دوسری تصانیف میں ''تعلیم الاسلام'' آپ کی بہت مشہور تصنیف ہے اور ہند و بیرونِ ہند کے مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ جب میں زنجبار گیا تو دیکھا کہ وہاں کے مدارس میں بھی ''تعلیم الاسلام'' نصابِ تعلیم میں شامل ہے۔

آپ ۱۳۵۵ھ سے ۱۳۷۲ھ تک دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے۔ آخر میں ملک کے تباہ کن حالات نے آپ کو بہت زیادہ افسردہ کر دیا تھا۔ چند ماہ کی طویل علالت کے بعد ۱۳/ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ کو شب میں عازمِ ملکِ بقاء ہو گئے۔ دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اراکین نے آپ کی وفات پر گہرے رنج والم کا اظہار کیا اور آپ کے ایصالِ ثواب کا بھی اہتمام کیا۔ حق تعالیٰ درجات بلند فرمائیں۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے قابل فخر عالم و فاضل اور شبلی نعمانی مرحوم کے جانشین حضرت

مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ مجاز تھے۔حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے اپنے فیض علمی وروحانی سے ایک عالم کو مستفید کیا، لاکھوں گمراہ انسانوں کو دیندار، متقی اور پرہیز گار بنایا اور سلوک وتصوف کے ذریعے ایسی اصلاحِ عقائد واعمال کی کہ حیرانی ہوتی ہے۔گذشتہ صدی میں ہندوستان کے کسی بھی شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد اُن سے بے نیاز نہیں رہے۔ہندوستان کے دو بڑے تعلیمی ادارے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دارالعلوم ندوہ کے اکثر وبیشتر عمائدین حضرت حکیم الامت تھانویؒ اور دوسرے اکابرِ دیوبند سے مستفیض ہوئے،ان میں علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالباری ندویؒ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جو حضرت حکیم الامت تھانویؒ سے فیض یاب ہوئے۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے بھی باقاعدہ ممبر رہے اور احقر سے خصوصی شفقت ومحبت بھی فرماتے رہے، ان کا علم وفیض اور زہد وتقویٰ مثالی تھا۔ انہوں نے زندگی بھر علم کی شمعیں جلائے رکھیں اور ہندوپاک میں ان کی خدماتِ جلیلہ قابل قدر ہیں،جنہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے بعد ان کی ذاتِ گرامی پاکستانی قوم کے لئے سرمایۂ افتخار ونازش تھی۔۲۲رنومبر ۱۹۵۳ءکو کراچی میں رحلت فرمائی اور وہیں شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ کے برابر اسلامیہ کالج میں محو آرام ہیں۔دارالعلوم دیوبند میں ان کی وفات کی خبر سن کر ختم قرآن اور خصوصی دعائے مغفرت کا اہتمام کیا گیا اور تمام اساتذہ وطلباء نے ان کی وفات کو عالم اسلام کا عظیم سانحہ قرار دیا،حق تعالیٰ درجات بلند فرمائیں۔

حضرت مولانا اعزاز علی امروہیؒ

آپ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے تھے۔۱۳۲۱ھ میں دارالعلوم سے فراغت کے بعد حضرت شیخ الہند قدس سرہ‘ نے آپ کو مدرسہ نعمانیہ بھاگلپور (بہار) کے لئے منتخب فرمایا، جہاں سات سال آپ درس دیتے رہے، پھر شاہ جہاں پور تشریف لائے اور ایک مسجد میں افضل المدارس کے نام سے مدرسہ قائم کیا جس میں حجۃ اللہ البالغہ پڑھاتے رہے۔۱۳۳۰ھ میں آپ کا تقرر دارالعلوم دیوبند میں ہوا۔یہاں علم وادب کے اکثر اسباق آپ کے پاس رہتے تھے اور شیخ الادب

کے لقب سے معروف ہوئے۔

۱۳۴۰ء میں والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کا ریاست حیدرآباد کے مفتیٔ اعظم کے عہدے پر انتخاب عمل میں آیا تو اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے آپ کو اپنی معیت میں لے گئے۔ وہاں ایک سال قیام رہا۔ حضرت والد محترم کے ساتھ ہی آپ دیوبند واپس تشریف لائے۔ آپ کو مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثانی قدس سرہ کے بعد صدر مفتی دارالعلوم کے عہدے پر فائز کیا گیا اور اس کے بعد آخر عمر تک دارالعلوم ہی میں آپ کا قیام رہا۔

فقہ وادب آپ کا خاص فن تھا، مگر آپ نے آخری دور میں کئی سال ترمذی اور تفسیر کی بلند پایہ کتابیں بھی پڑھائیں۔ حضرت مولانا مدنیؒ کی عدم موجودگی میں متعدد مرتبہ بخاری شریف کے پڑھانے کا بھی آپ کو موقع ملا۔ غرض کہ علم فقہ، علم حدیث، علم ادب، علم تفسیر وغیرہ ہر فن کی کتابوں پر آپ کو عبور حاصل تھا۔ آپ بے نفس اور تواضع میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور اخلاق واوصاف میں اسلاف کا نمونہ تھے۔ انتظامی امور میں بھی آپ کی اہلیت مسلّم تھی اور وقتاً فوقتاً ادارۂ اہتمام میں بھی آپ کی انتظامی صلاحیتوں سے استفادہ کیا گیا۔ ۱۳۷۲ھ آپ نے دارِفانی سے رحلت فرمائی۔ حق تعالیٰ درجاتِ عالیہ نصیب فرمائے، آمین۔

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

آپ دارالعلوم دیوبند کے مشاہیر فضلاء میں سے تھے۔ آپ نے ۱۳۳۲ھ میں دورۂ حدیث میں شریک رہ کر دارالعلوم سے کتبِ حدیث کی سند حاصل کی۔ دارالعلوم میں حضرت شیخ الہندؒ، حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ اور حضرت علامہ شبیر احمد عثانیؒ اور دیگر اساتذہ کے علمی اور روحانی فیضان وتربیت سے انکی زندگی کا رخ معقولات کی بجائے تفسیر وحدیث اور سلوک ومعرفت میں تبدیل ہوگیا اور فکر ونظر کی وہ تمام بنیادیں متزلزل ہوگئیں جو خاندانی تعلیم اور گردوپیش نے ان کے گرد چنی تھیں۔

آپ صاحبِ طرز مصنف نیز ذہن وذکاء اور طباعی میں منفرد تھے۔ تحصیل علوم سے فراغت کے بعد دارالعلوم کے آرگن رسالہ "القاسم" کے ایڈیٹر اور رئیس التحریر منتخب کئے گئے اور عرصۂ دراز تک

قلمی خدمات سے ہندوستان کے علمی حلقوں کو مستفید کرتے رہے۔اس زمانے میں آپ نے اپنے علمی اور تحقیقی مضامین اور والہانہ طرزِ نگارش سے علمی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کرلیا تھا۔سوانح ابوذر غفاریؓ اور کائناتِ روحانی دونوں کتابیں ان کے اس دور کی یادگار ہیں۔اس کے بعد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کی سفارش پر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے پروفیسر مقرر ہوئے۔اس دوران بہت سی مفید اور علمی تصانیف آپکے قلم سے نکلیں۔جن میں ''النبی الخاتم، الدین القیم، تدوین حدیث، ہزار سال پہلے، نظامِ تعلیم وتربیت اور تدوین قرآن'' وغیرہ آپ کی مخصوص علمی اور مشہور تصانیف ہیں۔

آپ نے تقریباً پچیس سال تک حیدرآباد میں علمی خدمات انجام دی ہیں۔اس زمانے میں آپ کے درس وتربیت سے جامعہ عثمانیہ کے بہت سے طلباء میں دینداری پیدا ہوئی اور تلامذہ میں بہت سے نامور اہل قلم پیدا ہوئے اور آپ کے سینکڑوں مقالات ملک کے بلند پایہ رسائل میں شائع ہوئے جو آپ کے کمالِ علم کی دلیل ہیں۔آپ کا جو والہانہ اسلوب تحریر میں پایا جاتا تھا وہی والہانہ رنگ تقریر میں بھی تھا۔آپ اپنے علم وفضل، معلومات، کثرتِ مطالعہ، دقتِ نظر، نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی میں نادرۂ روزگار تھے۔آپ کی کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت'' اپنے موضوع میں معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے اور مقبولِ خواص وعوام ہے۔

اخیر میں احقر کی فرمائش پر آپ نے ''سوانح قاسمی'' تین جلدوں میں مرتب کی جو آپ کی تصانیف میں ایک شاہکار تصنیف ہے۔اس کے بارے میں جب احقر نے آپ سے فرمائش کی تو بہت خوشی اور امنگ سے اسے قبول کرتے ہوئے لکھا کہ ''میری علمی زندگی کی ابتدا ''القاسم'' ہی سے ہوئی تھی اور شاید انتہا بھی ''القاسم'' یعنی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ ہی پر ہوگی۔''

چنانچہ یہی ہوا کہ سوانح قاسمی کی چوتھی جلد آپ نے شروع کی، پانچ صفحے لکھنے پائے تھے کہ عمر فانی نے جواب دے دیا اور ''القاسم'' پر انتہا ہوگئی۔آپ کی تقریر وخطابت نہایت عالمانہ، ادیبانہ اور پر جوش ہوتی تھی۔دقیقہ سنج اور نکتہ رس علماء میں آپ کا شمار ہوتا تھا اور ہندوستان کے مشاہیر علماء میں آپ کی ممتاز حیثیت مانی جاتی تھی۔آخر میں جامعہ عثمانیہ سے وظیفہ یاب ہوکر اپنے وطن گیلانی میں

مقیم ہو گئے اور وہیں طویل علالت کے بعد ۲۵؍شوال المکرّم ۱۳۷۵ھ (۵ جون ۱۹۵۶ء) کو رحلت فرمائی۔ حق تعالیٰ درجاتِ عالیہ نصیب فرمائیں۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ

آپ کا خاندان اپنے علم وعمل کے لحاظ سے پنجاب میں مرجعِ خواص وعوام رہا ہے۔ آپ نے ۱۳۳۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحبؒ اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور دوسرے اکابر اساتذہ سے دورۂ حدیث کی کتب پڑھ کر سندِ فراغت حاصل کی۔ ۱۳۳۸ھ میں تحریکِ خلافت کے جلسوں میں شرکت کرنے لگے۔ اس زمانے میں امرتسر میں جلیاں والا باغ کا مشہور خونی واقعہ پیش آیا، جس نے آپ کے جذبۂ حریت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور آپ مجلس احرار میں شامل ہو گئے اور پھر باقاعدہ سیاسی تحریکات میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے اور کئی بار گرفتار ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد آپ لاہور چلے گئے پھر وہاں سے دہلی آکر مستقل طور پر دہلی میں مقیم ہو گئے اور عمر کے آخری سال یہیں گزارے۔ اس دوران آپ فرقہ وارانہ اتحاد کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ مشرقی پنجاب میں مساجد اور اسلامی اوقاف کی واگزاری کی کوششوں میں لگے رہے۔ ساتھ ہی مظلوموں اور ضرورت مندوں کی خدمت میں بھی مصروف رہے۔ بالآخر چونسٹھ سال کی عمر میں ۱۱؍صفر ۱۳۷۶ھ میں دہلی میں وفات پائی اور جامع مسجد شاہ جہانی کے حلقۂ قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

آپ دارالعلوم دیوبند کے پانچویں صدر المدرسین تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ علم وفضل کے ساتھ غیر معمولی مقبولیت رکھتے تھے۔ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ‘ کے خلفائے مجازین میں سے تھے۔ علم سے فراغت کے بعد اپنے والد مرحوم کے ساتھ ۱۳۱۶ھ میں مدینہ طیبہ پہنچے اور اٹھارہ سال مدینہ منورہ میں رہ کر مختلف علوم وفنون اور بالخصوص حدیث شریف کا

درس دیا۔زندگی کمالِ زہدوقناعت کی تھی، جوکمالِ صبروتحمل سے اس مدت میں بسر ہوئی۔

مدینہ منورہ میں قیام کے دوران ۱۳۱۸ھ میں ہندوستان تشریف لائے پھر ۱۳۲۰ھ میں واپس تشریف لے گئے، بعدازاں ۱۳۲۷ھ میں دارالعلوم میں بحیثیت مدرس آپ کا تقرر ہوا۔ ۱۳۲۹ھ تک درس دیا پھراسی سال مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ ۱۳۳۱ھ میں پھر ہندوستان واپس تشریف لائے اوراسی سال مدینہ پاک واپس تشریف لے گئے۔ ۱۳۳۵ھ میں حضرت شیخ الہندؒ کے ہمراہ حجاز ہی میں اسیر کرکے مالٹا بھیج دیئے گئے۔ ۱۳۳۸ھ میں مالٹا سے رہا ہوکر حضرت شیخ الہندؒ کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے اوراسی سال اکابر کے حکم پر جامعہ اسلامیہ امروہہ میں صدارتِ تدریس کی خدمات انجام دیں۔ پھر ۱۳۳۹ھ میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں صدر مدرس رہے، مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جامعہ اسلامیہ سلہٹ میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوگیا۔ سلہٹ میں آپ ۱۳۴۵ھ تک قیام پذیر رہے۔ حضرت الاستاذ علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے ڈابھیل تشریف لے جانے پر آپ شوال ۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس بنائے گئے۔

آپ بڑے درجہ کے محدث تھے۔ حدیث کے مشہور اسکالر تھے۔ آپ کا درسِ حدیث بہت مقبول تھا۔ کئی تصانیف فرمائیں جو سیاست وتصوف پر ہیں۔ ۱۳۴۵ھ سے ۱۳۷۷ھ تک بتیس برس آپ دارالعلوم میں صدر مدرس اور ناظم تعلیمات رہے۔ اس دوران میں ۴۴۸۳ طلباء نے آپ سے بخاری شریف اور ترمذی پڑھ کر دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔ آپ ان تعلیمی خدمات کے ساتھ ساتھ اپنی ہمتِ مردانہ سے سیاسی کام بھی پوری تندہی سے انجام دیتے رہے۔ اسی دوران آپ جمعیۃ علمائے ہند کے بار بار صدر بنائے گئے۔ آپ جمعیۃ علماء اور کانگریس کے قائدین میں سے تھے۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں آپ نے نمایاں حصہ لیا اور سردھڑ کی بازی لگادی۔ کئی مرتبہ جیل گئے اور آخر کار ملک کو آزاد کرایا۔

بہرحال مجموعی حیثیت سے آپ عالم فاضل، شیخ وقت، مجاہدِ جفاکش، جری اور اولوالعزم فضلائے دارالعلوم دیوبند میں سے تھے۔ آپ کا درسِ حدیث، مضامین اور جامعیت کے لحاظ سے دنیائے اسلام میں اپنی نوعیت کا منفرد درس ہوتا تھا۔ اوراسی لئے اس کی عظمت وشہرت اورکشش کی

بدولت سال بہ سال طلباء کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔

۱۲رجمادی الاول ۱۳۷۷ھ (۵ردسمبر ۱۹۵۷ء) کو آپ واصل بحق ہوئے۔انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ جنازہ دارالحدیث میں لاکر رکھا گیا اور مظاہر العلوم سہارن پور کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔قبرستان قاسمی میں سپردِ خاک کئے گئے۔ حق تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائیں،آمین۔

حضرت مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ

حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے تلمیذِ رشید اور حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے اجل خلفاء میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔علومِ ظاہرہ وباطنہ کے جامع اور معقولات ومنقولات کے امام تھے۔ایک شیخ کامل، رشد وہدایت کا سرچشمہ تھے،دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد امرتسر میں تقسیم ملک تک علمی وتدریسی خدمات انجام دیں۔پھر لاہور سے جامعہ اشرفیہ کے نام پر ایک عظیم دینی درسگاہ قائم فرمائی جہاں سے ہزاروں طالبانِ علم فیضیاب ہوکر اطرافِ ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور علم دین کی خدمت میں مصروف ہیں۔

میں طویل سفر سے واپس دیوبند آیا تو اچانک حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ کے حادثہ فاجعہ انتقالِ پُر ملال کا حال معلوم ہوکر دل پر ایک چوٹ اور بجلی سی گری۔انہوں نے ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ میں کراچی میں رحلت فرمائی اور سوسائٹی کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی تھی۔حضرت مفتی صاحبؒ دین کا ایک عظیم ستون تھے جو گر پڑا، وہ مینارۂ رشد وہدایت تھے جس کی روشنی ملک بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔آپ کا بدل فی زمانہ محال نہیں تو متعذّر اور مشکل ضرور ہے اور عادتاً ناممکن ہے۔

اس نواح میں میری حاضری جس کشش سے ہوتی تھی اب اس میں سستی آگئی۔یہی دوچار بزرگ تھے جن کی کشش ہر وقت حاضری کے لئے بے چین کرتی تھی۔افسوس صد افسوس! مگر کیا کیا جائے،اس مرحلہ پر سب ہی عاجز ودرماندہ ہیں اور سوائے صبر کے چارۂ کار نہیں ہے۔حق تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؒ کے صاحبزادگان کو ان کا صحیح اور سچا جانشین بنائے اور حضرت کو بلند مقامات عطا

فرمائے، آمین۔

حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

حضرت شاہ صاحبؒ کی زندگی ایک بے مثال خطیب کی زندگی ہے۔ جس پر قوم کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ معرکۃ الآراء خطابت اور شعلہ بیانی ان کی ایک ایسی زبردست خصوصیت رہی ہے جس میں وہ اپنے معاصرین میں ہمیشہ منفرد اور ممتاز رہے ہیں۔ اور اس خداداد جوہر کے ساتھ انہوں نے اسلام اور اس کے مسلکِ حق کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں جس خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ پہنچایا ہے وہ انہی کا حق تھا۔ یہ جوہر اور قرآنی اعجاز بیانی کا پرتو ان کے قلب پر حق تعالیٰ نے خاص طور پر ڈالا تھا جس سے انہوں نے حق ہی کا کام کیا اور حق ہی کے راستے کی ہمیشہ دعوت دیتے رہے۔

جہاں تک ان کے بیانات سے مجھے استفادہ کا موقع ملا ہے، محسوس ہوتا تھا کہ قرآن ان کے سامنے کھلا ہوا ہے اور وہ اس کے بلیغ اور معجز جملوں کی مجسم شرح وتفسیر بنے ہوئے ہیں۔ سحر بیانی سے مجمع کو باندھ کر رکھ دینا گویا ان کا اختیاری فعل ہوتا تھا کہ جب چاہیں اسے کھول دیں اور جب چاہیں باندھے رکھیں۔ پھر یہ ان کے بیان کی بلاغت وسلاست کی خوبی تھی کہ مسلم وغیر مسلم یکساں طور پر ان سے مستفید ہوتے تھے اور دست وپابستہ ہوجاتے تھے۔

مجلس احرار کے ذریعے انہوں نے ملک وقوم کی جو عظیم خدمات ایک طویل مدت تک انجام دیں برصغیر ہندوپاک کا گوشہ گوشہ ان پر گواہ ہے، تحریکِ آزادئ ہندوپاک کی تاریخ میں انہیں ایک بلند مقام اور عظیم خصوصیت حاصل ہے۔ اسی دور میں رائیں الگ الگ تھیں اور ایک کی رائے کا دوسرا پابند نہ تھا لیکن ان کے ذہنی جوہروں کی خوبیوں کے معترف ان کے مخالف بھی تھے اور ان سے متاثر بھی ہوتے تھے۔ کبھی سفروں میں اتفاقی طور پر ساتھ ہوا، محسوس ہوتا تھا کہ وہ مقناطیس کی حیثیت سے ہیں اور لوگ بمنزلہ لوہا اور پیتل کے ہیں جو کھنچ کھنچ کر ان سے چسپاں ہورہے ہیں۔ آپ نے ۱۳۸۱ھ میں وفات پائی ہے۔ حق تعالیٰ درجات بلند فرمائے، آمین۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

آپ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔اعلیٰ ترین علمی استعداد کے مالک،غایت درجہ کے ذکی الطباع فضلاء میں سے تھے۔ابتداءً دارالعلوم میں مدرس کی حیثیت سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھائیں پھر دارالعلوم کی طرف سے مدراس بھیجے گئے اور وہاں درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا۔پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرس رہے۔تصنیف وتالیف کی مخصوص صلاحیتیں رکھتے تھے۔متعدد اعلیٰ ترین کتابوں کے مصنف تھے۔ہندوستان کے بڑے بلند پایہ مقرر وخطیب تھے۔بہترین سیاست داں تھے۔

ندوۃ المصنّفین دہلی کے مخصوص کارپردازوں میں سے تھے۔جمعیۃ علمائے ہند اور کانگریس کے صفِ اول کے لیڈروں میں سے تھے۔کئی بار جیل گئے۔طویل عرصہ تک جمعیۃ علمائے ہند کے ناظم اعلیٰ رہے۔۱۹۴۷ء کے انقلابی ہنگاموں میں اپنی جان پر کھیل کر ہزاروں کی جانیں بچائیں۔پارلیمنٹِ ہند بھی انہیں مانتی تھی اور ان کے اثرات قبول کرتی تھی۔

غرض ان کی شخصیت ایک جامع مؤثر شخصیت تھی،جس کا ہندوستان کے تمام علمی اور سیاسی طبقات پر اثر تھا۔آپ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور اس کے کاموں میں دخیل تھے۔علاوہ ازیں کئی دوسرے مدارس اور تنظیموں کے رکن رکین بھی تھے۔مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ممبر رہے اور دیگر کئی ادارے آپ کو اپنا سرپرست ورکن بنائے ہوئے تھے۔

یکم ربیع الاول ۱۳۸۲ھ کو اس مجاہد ملت نے نئی دہلی وفات پائی اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مشہور قبرستان مہندیوں میں ان کی ابدی آرام گاہ ہے۔حق تعالیٰ درجاتِ عالیہ نصیب فرمائیں، آمین۔

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ

آپ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہٗ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔حضرت

مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہ' آپ کے شیخ و مربی تھے۔آپ زندگی بھر یادِ حق اور خدمتِ شیخ میں مصروف رہے۔ہمیشہ صبر واستقامت کے ساتھ ذکر واذکار اور ریاضت ومجاہدہ میں مشغول رہتے اور ہر تکلیف و پریشانی کو بڑی خندہ پیشانی سے برداشت فرماتے رہے۔

آپ کے شیخ معظم حضرت رائے پوری قدس سرہ' آپ سے آخر دم تک راضی رہے اور بوقت وصال آپ ہی کو اپنا خلیفہ وجانشین بنایا اور رائے پور خانقاہ میں رہنے کی تلقین فرمائی۔اپنے شیخ کے بعد مسندِ ارشاد پر جلوہ افروز ہوئے اور پورے پینتالیس سال تک رونق تلقین وارشاد کا باعث بنے رہے۔اپنے عمل واخلاص سے شریعت وطریقت کو دنیا میں عام کیا اور اشاعت وترویج میں ہر ممکن کوشش کی۔سینکڑوں علماء کو روحانی منازل طے کرائیں اور لاکھوں مسلمانوں کو فسق وفجور اور رسومات وبدعات سے توبہ کرائی۔ہر قسم کے لوگ آپ کے اخلاق ومحبت سے متاثر ہوئے اور اصلاح وتربیت کرتے رہے۔آپ نہایت متواضع ،خوش اخلاق اور سادہ طبیعت تھے۔فنائیت کا اعلیٰ مقام حاصل تھا اور اپنے متوسلین کو بھی سادگی وفنائیت کی ہدایت فرمایا کرتے تھے۔

الغرض ساری زندگی طالبین حق کی اصلاح وفلاح میں مصروف رہنے کے بعد ۱۴ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ کو رحلت فرمائی اور ڈھڈیاں ضلع سرگودھا کی مسجد میں تدفین عمل میں آئی۔حق تعالیٰ درجات بلند نصیب فرمائیں۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ

حضرت مولانا لاہوریؒ کے انتقالِ پُر ملال کی اچانک اطلاع ملی تو دل ودماغ پر ایک بڑا دھچکا لگا اور دیر تک اناللہ...... کا ورد جاری رہا۔آپ علم وفضل ،اخلاص وتقویٰ اور سادگی وتواضع کا عظیم پیکر تھے۔آپ لاہور میں دیوبندی مسلک کا پہلا نمونہ تھے جنہوں نے نصف صدی تک قرنِ اول کے مسلمانوں کی یاد تازہ کی اور بے غرضی اور لگن کے ساتھ احیائے دین وشریعت اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے کام کیا۔آپ کی زندگی دینی وعلمی خدمات میں بسر ہوئی۔قرآن مجید کی تفسیر اور اس کی تعلیم وتدریس سے آپ کو خاص شغف تھا اور اس کا آپ کے ہاں بڑا اہتمام تھا۔

دارالعلوم دیوبند اور دوسرے مدارسِ عربیہ کے فارغ التحصیل طلباء بھی اسی غرض سے لاہور جاتے اور آپ کے درسِ قرآن سے مستفید ہوتے تھے۔آپ ایک عالم باعمل اور درویش صفت بزرگ تھے۔ان کی زندگی میں سادگی، خلوص اور تواضع نمایاں اوصاف دکھائی دیتے تھے۔آپ کی ذات مرجع خواص وعوام تھی۔تحریک خلافت اور جمعیۃ علمائے ہند میں شامل رہے۔تقسیم کے بعد شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے ساتھ مل کر کام کرنے کا ارادہ فرمایا اور جمعیۃ علمائے اسلام میں شامل ہوئے۔آپ کی روح کے ایصالِ ثواب کے لئے دارالعلوم میں قرآن خوانی کی گئی اور علماء وطلباء کے اجتماع میں آپ کے اوصاف وکمالات بیان کر کے دعائے مغفرت کی گئی۔حق تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور صاحبزادوں کو بھی صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

حضرت مولانا محمد سید بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنیؒ

حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ کی وفات کی خبر سن کر دل کو ازحد رنج وقلق ہوا۔آپ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے تھے اور حضرت امام العصر علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔میرے ساتھ ان کا بہت قریبی تعلق تھا۔وہ میرے خاص معاصرین میں سے تھے۔فراغتِ تحصیل کے بعد دارالعلوم دیوبند کے درجہ ابتدائی کے مدرس رہے۔فن حدیث میں خاص دلچسپی اور لگاؤ تھا۔فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد کئی بار حضرت شاہ صاحب کے یہاں ترمذی اور بخاری کی سماعت فرمائی۔آپ حضرت شاہ صاحب کے علوم کے خاص ترجمان تھے۔فیض الباری شرح بخاری آپ کی تالیفات کا شاہکار ہے۔حضرت مفتیٔ اعظم مولانا عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کے خلیفہ مجاز، حضرت مولانا قاری محمد اسحاق میرٹھیؒ سے بیعت اور ان ہی کے خلیفہ مجاز تھے۔آپ کا سلسلۂ رشد وہدایت الحمدللہ بہت وسیع ہوا۔تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستانی قومیت اختیار کی اور ٹنڈو الہ یار کے دارالعلوم الاسلامیہ میں بطور استاذِ حدیث اور ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور درسِ حدیث میں مشغول رہے۔

اس سے قبل قیامِ پاکستان تک دارالعلوم دیوبند اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تدریس کا سلسلہ

رہا۔ پھر پاکستان سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی اور آخر دم تک وہیں مقیم رہے اور مسجد نبوی میں درسِ حدیث کے چراغ جلاتے رہے۔ مسجد نبوی میں روضۂ رسولؐ کے سامنے تیرہ سال آپ نے علومِ قرآن وحدیث کی جو شمع روشن رکھی یہ بہت بڑی سعادت اور بہت بڑا اعزاز ہے۔

آپ کا سلسلۂ بیعت وارشاد خصوصیت سے افریقہ میں بہت پھیلا۔ بکثرت افریقی آپ سے بیعت ہوئے۔ زمانہ حج میں جو قافلے ایسٹ یا ساؤتھ افریقہ سے آتے تھے وہ اکثر وبیشتر آپ کے سلسلۂ بیعت میں داخل ہو کر واپس ہوتے تھے۔ آپ کی تصنیف وتالیف میں ''ترجمان السنۃ'' علم حدیث میں ایک شاہکار تصنیف ہے جس میں اکابرِ دارالعلوم اور بالخصوص حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحبؒ کے علوم کو جمع کر کے خود اپنے علم اور علمی مہارت کا ثبوت دیا ہے اس مبارک کتاب کی تین ضخیم جلدیں ندوۃ المصنّفین دہلی سے شائع ہوئی ہیں جو خواص وعوام میں مقبول ہیں۔

الغرض آپ ایک عظیم محدث ومفسر، قابل مدرس، فاضل مقرر اور نہایت مقبول وکامیاب مصنف تھے اور عربی کے ادیب وشاعر بھی تھے۔ صدق وصفا کا مجسمہ اور ورع وتقویٰ اور استغناء کے پیکر تھے اور ایک عارفِ کامل اور شیخ کامل تھے۔ خلوص وللّٰہیت میں اسلاف کی یادگار تھے اور اپنے علم وفضل اور زہد وتقویٰ میں بے نظیر تھے۔

۵/رجب المرجب ۱۳۵۸ھ کو شب جمعہ میں مدینہ منورہ میں رحلت فرمائی اور جنت البقیع میں امہات المومنین کے عین قدموں میں آخری آرام گاہ بنی۔

حق تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائیں، آمین۔

حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوریؒ

آپ حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ میں سے تھے اور عرصہ تک مظاہر العلوم کے صدر مدرس رہے تھے۔ اور حضرت مولانا حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کے خلیفۂ ارشد تھے۔ ایک متبحر عالم دین، ایک خدا شناس بزرگ اور محامد وفضائلِ انسانی کے جامع انسان تھے۔ طبیعت بہت سادہ، مزاج نرم، اور متانت وتمکنت فطری اور علم ووقار خداداد تھا۔

حدیث ،علم کلام، اصول و منطق ،رجوع الی الحق اور اپنے ساتھیوں سے بے حد خوش اخلاقی سے پیش آنا مولانا کی زندگی کا طرۂ امتیاز تھا۔حدیث سے خاص لگاؤ تھا اور تمام علوم وفنون کے جامع تھے۔حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ سے بھی فیضیاب ہوئے اور پھر پوری عمر شب و روز تدریسِ علوم کی خدمت میں مصروف رہے۔ مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسہ خیر المدارس ملتان اور دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار میں صدر مدرس کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔اس دوران ہزاروں طلبائے علم حدیث کو اپنے فیضِ علمی سے مالامال کیا۔ ۲۷ر شعبان ۱۳۵۸ھ کو انہوں نے رحلت فرمائی۔ہمیں پاکستان کے روابط و مراسلت کے بند ہونے کی وجہ سے اس حادثہ عظیمہ سے بے خبری رہی۔اب کوئی چار ماہ بعد پاکستان سے ڈاک موصول ہوئی تو مولانا کے انتقال کی اطلاع ہوئی اور ہم نے مولانا کے ایصالِ ثواب کے لئے قرآن خوانی کرائی اور ان کے فضائل ومناقب بیان کئے گئے اور خصوصی دعائے مغفرت کرائی گئی۔حق تعالیٰ حضرت مولانا کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ الٰہ آبادیؒ

آپ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز علماء اور شیوخ میں سے تھے۔حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے اجل خلفاء میں سے تھے۔آپ کا طرزِ اصلاح وتہذیبِ نفس ہو بہو حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی طرح تھا۔ پہلے اعظم گڑھ میں پھر شہر گورکھپور میں اور اس وقت الٰہ آباد شہر میں آپ نے اپنی خانقاہیں قائم فرمائی تھیں۔ بڑے بڑے ذی علم اور صاحبِ ثروت افراد کی اصلاح آپ کے ذریعے سے ہوئی تھی۔ ہزاروں بندگانِ خدا کو روحانی فیض پہنچا اور یہ خطہ آپ کے وجود مبارک کی روحانیت سے بہرہ اندوز ہوا۔آخر کے چند سال میں بمبئی بھی آمد ورفت رہی اور وہاں بھی مریدین ومتوسلین کا ایک حلقہ قائم ہو گیا اور کتنے لوگ مسلکِ صالح پر مستقیم ہو گئے۔

۲۲ر شعبان ۱۳۸۷ھ میں سفر حجاز کے دوران جہاز میں وفات پائی اور مسافر حجاز ربِ کعبہ کے حضور میں حاضر ہو گیا اور پھر بحر احمر کی آغوش میں آپ کو سپردِ آب کیا گیا۔آخر عمر میں وفورِ کیفیت کے

موقع پر مرزا غالب کا یہ شعر اکثر وردِ زبان رہتا تھا۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

غالبًا ایسے ہی موقعوں کے لئے کہا جاتا ہے کہ ''قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید'' ہزاروں بندگانِ خدا کو روحانی فیض پہنچانے کے علاوہ آپ نے متعدد تصانیف بھی لکھی ہیں جو ان کی یادگار ہیں۔

حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ

آپ دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین تھے۔ شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ آپ معقولات میں خصوصاً اور جمیع علوم میں عموماً فرد تسلیم کئے گئے۔ بہت سے اساتذۂ دارالعلوم اور دیگر مدارسِ دینیہ میں اکثریت کے ساتھ آپ ہی کے شاگرد رہے ہیں۔ درسِ حدیث میں آپ خاص امتیاز رکھتے تھے۔ مختلف مدارسِ دینیہ فتح پوری دہلی، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، مدرسہ ہاٹ ہزاری چاٹگام وغیرہ میں صدارتِ تدریس کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ پھر اہل شوریٰ نے آپ کو دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس کے عہدہ کے لئے منتخب کیا اور بہت اونچے طبقہ کے اساتذہ میں شمار ہوئے۔ ۱۳۷۷ھ میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی وفات کے بعد آپ دارالعلوم کے صدر مدرس اور ناظم تعلیمات اور مجلس شوریٰ کے ممبر بنائے گئے تھے۔ آپ کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے۔ طلباء آپ کے درس میں بڑے ذوق وشوق اور انہماک سے شریک ہوتے تھے اور آپ کے افاداتِ عالیہ سے مستفید ہونے کے متمنی رہتے تھے۔

درس میں اختصار کے ساتھ بڑی جامعیت کی شان تھی اور درس کا انداز نہایت باوقار تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ لطائف وظرائف، دقیقہ سنجی اور بالغ نظری سے اہم مسائل کو حل کرنے میں خاص ملکہ وکمال حاصل تھا۔ حضرت نانوتویؒ کے علوم پر گہری نظر تھی اور حضرت شیخ الہندؒ سے تلمذ کے علاوہ بیعت کا شرف بھی حاصل تھا۔ آپ نے کئی تصانیف ورسائل بھی تالیف فرمائے جو آپ کے علمی مقام کا ثبوت ہیں۔ آپ نے ۲۴ر رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور قبرستانِ قاسمی میں

آسودۂ خواب ہوئے۔حق تعالیٰ درجات بلند فرمائے،آمین۔

حضرت مولانا شبیر علی تھانویؒ

آپ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فاضل اور حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے حقیقی بھتیجے تھے۔آپ نے حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ سے علمی اور روحانی فیض حاصل کیا اور آخر میں ۱۳۳۰ھ میں دارالعلوم دیوبند سے علوم کی تکمیل کی۔مثنوی روم اپنے عمِ محترم حضرت حکیم الامت تھانویؒ سے سبقاً سبقاً پڑھی تھی۔تعلیم سے فراغت کے بعد تھانہ بھون میں حضرت حکیم الامتؒ کی تصانیف اور اشاعت کے لئے اشرف المطابع کے نام سے ایک پریس قائم کیا۔''التبلیغ'' اور ''النور'' کے نام سے ماہانہ رسالے جاری کئے اور ۱۳۶۷ھ تک خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون کے مہتمم رہے۔برصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہاں کتابوں کا کاروبار شروع کر دیا۔

''اعلاء لسنن''، جیسی شہرۂ آفاق کتاب کی ۱۸؍جلدیں آپ نے عربی ٹائپ میں شائع کیں اور اسی طرح تفسیر بیان القرآن اور بہشتی زیور کو نہایت اعلیٰ پیمانے پر طبع کرایا۔پاکستان میں تبلیغی جذبہ لے کر گئے تھے اور آخر تک تبلیغ واشاعت کے لئے کوشاں رہے۔

آپ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے اور احقر کے مشیر خاص بھی،اور قریبی احباب میں سے آپ سے نہایت مخلصانہ ومحبانہ تعلق رہا۔ہر دلعزیز،ملنسار،خوش اخلاق اور خوش وضع انسان تھے۔اپنے علم وفضل،تقویٰ وطہارت اور اوصاف وکمالات میں طبقۂ علماء میں بے نظیر شخصیت کے مالک تھے۔مدبر ومنتظم تھے اور فہم وفراست میں کمال حاصل تھا۔

۲۸؍رجب المرجب ۱۳۸۸ھ ۲۱؍نومبر ۱۹۶۸ء کو کراچی میں وفات پائی اور ناظم آباد کے قبرستان میں حضرت مولانا عبدالغنی پھول پوری کے پہلو میں دفن ہوئے،حق تعالیٰ درجاتِ عالیہ نصیب فرمائیں،آمین۔

حضرت مولانا عبدالغفور عباسی مہاجر مدنیؒ

آپ دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ اور آخری دورِ طالب علمی میں خصوصیت کے ساتھ حضرت مفتیٔ اعظم ہند مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ سے مستفید ہیں۔ نقشبندیہ سلسلہ کے ممتاز مشائخ میں سے تھے۔ اصل میں صوبہ سرحد کے باشندے تھے لیکن عرصۂ دراز سے مدینہ طیبہ میں مہاجر کی حیثیت سے مقیم تھے اور حجازی قومیت اختیار فرمالی تھی۔ آپ پر غلبہ باطنی ارشاد وہدایت کا تھا۔ سرحدی و پاکستانی لوگ بکثرت آپ کے سلسلۂ بیعت میں داخل ہوئے۔

مدینہ منورہ میں آپ کا مقامِ سکونت ایک مستقل خانقاہ کی حیثیت رکھتا تھا جس میں ہر وقت طالب علموں اور مستفیدین کا مجمع لگا رہتا تھا اور آپ حجاز میں ممتاز مشائخ میں شمار ہوتے تھے۔ اتباعِ سنت اور قاطعِ بدعت کے باعث آپ پورے مدینے میں ممتاز مقام کے حامل تھے۔ یکم ربیع الاول ۱۳۸۹ھ ۱۷ رمئی ۱۹۶۹ء کی صبح آپ نے رحلت فرمائی اور جنت البقیع میں سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عین قریب تدفین ہوئی۔ حق تعالیٰ مغفرت و درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ

آپ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے مخصوص خلفاء میں بلند مقام پر فائز تھے۔ ایک جید اور عالمِ دین اور شیخ العصر تھے۔ قدیم بزرگوں کی سادگی کے پیکر اور تواضع وانکساری کا مجسمہ تھے۔ خلوص وللّٰہیت میں سلفِ صالحین کی یادگار تھے۔ رشد وہدایت اور دینی فیضان کا منبع وسرچشمہ تھے۔ اپنے حسنِ اخلاق اور حسنِ تدبیر سے ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۲ء) میں اپنے شیخ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی زیر سرپرستی میں ایک دینی درسگاہ ''مدرسہ خیر المدارس'' کے نام سے جالندھر میں قائم فرمایا، جس نے اپنے حسنِ تعلیم اور حسنِ انتظام سے جالندھر میں مرکزیت پیدا کر لی اور اس خطۂ اراضی کو علومِ نبوت سے سیرابی وشادابی ہوئی۔

تقسیم ہند کے بعد آپ نے پاکستان ہجرت کی اور ملتان جیسے مرکزی شہر میں اسی مدرسہ خیر

المدارس کی تجدید کی۔ وہاں بھی یہ مدرسہ ایک دم اسی طرح مقبول ومعروف ہو گیا جتنا اس وقت تھا۔ یہ سب کچھ حضرت مولانا خیر محمد صاحب کی مقبولیت کا ثمرہ ہے اور دراصل حضرت مولانا کا حسنِ اخلاق، عمقِ علم اور اس پر حسنِ انسانیت واخلاق اس مدرسہ کی اساس ہے، اور اسی اساس پر خیر المدارس کی جدید عمارت قائم ہوئی اور اسی قدیم مقبولیت سے یہ نئی مقبولیت ظہور پذیر ہوئی اور آج الحمدللہ پاکستان میں یہ مدرسہ پنجاب کا علمی مرکز ہے اور حضرت مولانا کا عظیم صدقۂ جاریہ ہے۔

حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ ہمیشہ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ رہے اور احقر سے نہایت قریبی تعلق اور شفقت ومحبت کا معاملہ رہا۔ علم وفضل، زہد وتقویٰ اور دین ودیانت کی عالی صلاحیتیں ان میں بدرجہ اتم جمع تھیں۔ عظیم کارنامہ یہ بھی ہے کہ آپ نے پاکستان کے مدارسِ دینیہ کا وفاق بنام ''وفاق المدارس'' قائم فرمایا اور تمام مدارس کو ایک لڑی میں منسلک کر دیا۔ پھر حضرت مولانا ہی اس وفاق کے پہلے صدر تسلیم کئے گئے جس کو انہوں نے کمالِ دیانت وراست بازی اور اخلاص وصداقت سے انجام دیا۔ اس سے جہاں آپ کا علم وفضل ملک پر واضح ہوا وہیں کمالِ ذہن وذکاء بھی نمایاں ہوا۔ آج مدرسہ خیر المدارس پاکستان میں مرکزی حیثیت کے ساتھ کتاب وسنت اور فقہ فی الدین کی اشاعت میں امتیازی شان کا حامل ہے۔

افسوس ہے کہ آپ ۲۰ رشعبان ۱۳۹۰ھ کو ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی رحلت کی خبر سن کر دل پر ازحد صدمہ ہوا ہے۔ دل تو چاہتا ہے کہ حاضر ہو کر تعزیت پیش کروں مگر ایسا کرنا بہت مشکل ہے۔ پاکستان میں خاص طور پر دو چار بزرگوں پر ہی نظر پڑتی تھی اور ان ہی حضرات کی کشش ہر وقت حاضری کے لئے بے چین کرتی رہتی تھی، مگر یہ مخلصین ومحبّین سب رخصت ہوتے جا رہے ہیں۔ آثارِ قیامت ہیں۔ حق تعالیٰ ہماری حالت پر رحم فرمائے، حق تعالیٰ حضرت مولانا کو درجاتِ عالیہ نصیب فرمائے، اور صاحبزادوں کو ان کا سچا جانشین بنائے، اور ان کے چشمۂ فیض خیر المدارس کو ہمیشہ قائم ودائم اور سرسبز وشاداب رکھے آمین ثم آمین۔

حضرت مولانا رسول خان صاحب ہزارویؒ

آپ دارالعلوم دیوبند کے مشاہیر فضلاء میں سے تھے۔آپ نے ۱۳۲۳ھ میں دارالعلوم سے سندِ فراغت حاصل کی تھی۔کئی سال مدرسہ امدادالاسلام دارالعلوم میرٹھ میں تدریسی خدمات انجام دیں اور ۱۳۳۲ھ میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس بنائے گئے، یہاں آپ نے منطق وفلسفہ اور دوسرے علوم کے علاوہ درسِ حدیث بھی دیا ہے اور سینکڑوں مشاہیر علماء نے آپ سے علمی استفادہ کیا ہے۔بعدازاں آپ لاہور چلے گئے اور وہاں آخردم تک جامعہ اشرفیہ سے وابستہ رہے اور صدر مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

آپ معقولات ومنقولات کے امام مانے جاتے تھے۔میرے اساتذہ میں سے تھے۔علومِ عقلیہ ونقلیہ کو طالب علم کی استعداد کے مطابق اس طرح سمجھاتے کہ مسئلہ شاگرد کے ذہن نشین ہوجاتا تھا۔آپ کا درس تفہیم کے لحاظ سے ممتاز سمجھا جاتا تھا،تقریر کے وقت چہرے پر نور ووقار برستا تھا۔طرزِ بیان صاف اور مؤثر ہوتا تھا اور اب ایسے عمیق علم وفہم کے حامل اور علومِ دینیہ کے مبصر کہاں پیدا ہوں گے اور پیدا ہو بھی جائیں تو سابقین کی صحبت ومعیت سے جو ذہن اُن کا بنا تھا وہ کہاں سے لائیں گے۔میرے اساتذہ میں صرف وہی باقی رہ گئے تھے اور بے حد شفیق استاذ تھے،اب وہ بھی ۳ رمضان ۱۳۹۱ھ کو واصل بحق ہوگئے۔ان کے انتقالِ پُر ملال کا علم ہوکر دل کو انتہائی صدمہ پہنچا اور ایک دفعہ تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آگیا۔دارالعلوم میں اس سانحہ کی خبر سے اساتذہ وطلباء سب ہی متاثر ہوئے اور ختم شریف پڑھ کر ایصالِ ثواب کیا گیا۔دارالعلوم پر ان کا یہ حق ہے کیونکہ آپ ایک طویل عرصہ تک دارالعلوم کے احاطے میں فیض رساں رہے ہیں۔حق تعالیٰ ہمیں ان کے امثال سے نوازے اور حضرتِ مرحوم کو اعلیٰ علیّین میں مقاماتِ بلند عطا فرمائے۔آمین۔

حضرت مولانا فخرالدین احمد مرادآبادیؒ

حضرت مولانا فخرالدین احمد صاحبؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند موجودہ دور میں اونچے

درجے کے محدث تھے۔ آپ نے ۱۳۲۸ھ میں حضرت شیخ الہندؒ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سندِ فراغت حاصل کی اور دارالعلوم نے شوال ۱۳۲۹ھ میں آپ کو مدرسہ شاہی مرادآباد میں بھیج دیا۔ مرادآباد میں تقریباً ۴۸ سال قیام رہا۔ تقریباً نصف صدی کی اس طویل مدت میں ہزاروں طلبائے حدیث نے آپ سے اکتسابِ فیض کیا۔ آپ کا درسِ بخاری نہایت مضبوط اور مفصل ہوتا تھا جس میں حدیث کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث ہوتی تھی۔ ۱۳۷۷ھ میں مولانا مدنی قدس سرہٗ کی وفات کے بعد دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے دارالعلوم دیوبند کے منصبِ شیخ الحدیث کے لئے آپ کا انتخاب کیا اور آخر وقت تک اسی منصب پر فائز رہے۔ ۱۳۷۷ھ سے ۱۳۸۳ھ تک دارالعلوم میں آپ سے ۱۱۶۱ طلباء نے بخاری شریف پڑھی ہے۔

تعلیمی وتدریسی مشاغل کے علاوہ ملکی وملی سیاسیات سے بھی آپ کا تعلق تھا اور جمعیۃ علمائے ہند اور کانگریس کی تحریکوں میں برابر حصہ لیتے رہے۔ کئی بار جیل بھی گئے۔ حضرت مولانا مدنیؒ کے بعد آپ ہی جمعیۃ علمائے ہند کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ آخر کار کچھ عرصہ علیل رہ کر ۲۰ رصفر ۱۳۹۲ھ کو انتقال فرمایا اور مرادآباد میں تدفین ہوئی۔ حق تعالیٰ درجاتِ عالیہ نصیب فرمائے۔

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ

آپ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے تھے۔ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ کے مخصوص اور معتمد علیہ تلامذہ میں سے تھے۔ احقر کے خاص تعلیمی رفیق اور دورۂ حدیث کے ساتھی تھے۔ قوتِ حافظہ امتیازی تھا۔ علوم اور کتب کا استحضار تام تھا، اور اونچے درجات کے اربابِ تدریس میں سے تھے۔ علوم سے فراغت کے بعد بعض مدارس میں سلسلۂ تدریس سے منسلک رہ کر دارالعلوم دیوبند میں شیخ التفسیر کی حیثیت سے بلائے گئے اور کتبِ تفسیر کے ساتھ دورہ کی کتبِ حدیث بالخصوص ابوداؤد شریف اکثر وبیشتر آپ ہی کے درس میں رہتی تھی۔

اتباعِ سنت اور عظمتِ سلف کا خاص شغف تھا۔ علومِ شرعیہ اور ردِ مذاہبِ باطلہ میں بہت سی کتب کے بہترین مصنف تھے۔ تحقیقانہ انداز سے بحث کرتے تھے جس میں علمی مواد کافی ہوتا تھا۔

علمی تصانیف کے سلسلہ میں مشکوٰۃ المصابیح کی شرح التعلیق الصبیح شاہکار ہے جو پانچ جلدوں میں ہے۔ ممالکِ اسلامیہ کا سفر کئے ہوئے تھے اور بیروت جا کر آپ نے خود ہی شرح مشکوٰۃ طبع کرائی تھی۔ سیرۃ المصطفیٰ کے نام سے کئی جلدوں میں محققانہ سیرت لکھی جس میں آزاد خیال مصنفوں پر علمی انداز سے تنقید کی ہے اور ان کے بہت سے شکوک وشبہات کے مسکت جوابات دیئے ہیں۔ عربی ادب میں آپ خاص مہارت رکھتے تھے اور عربی اشعار بڑی برجستگی سے کہتے تھے۔ فارسی میں بھی آپ کی نظمیں ہیں۔

تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستانی قومیت اختیار کرلی اور آخر وقت تک جامعہ اشرفیہ لاہور کے شیخ الحدیث والتفسیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ ہر جمعہ کو آپ کے وعظ کی مجلس ہوتی رہی جس میں ہزاروں کا اجتماع ہوتا تھا۔ حق گوئی میں حکیمانہ انداز کے ساتھ یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور سچی بات بلا خوفِ لومۃ لائم برملا کہتے تھے۔ تقویٰ اور خشیت اللہ آپ پر نمایاں نظر آتا تھا اور مشاہیر علم وفضل میں آپ کی ذات ممتاز حیثیت رکھتی تھی۔

آپ نے ۷ر رجب المرجب ۱۳۹۴ھ کو رحلت فرمائی انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ جب ریڈیو سے سانحۂ ارتحال کی ہوشربا خبر کان میں پڑی کہ میرے دوست صادق، عالم باعمل، تقی ونقی حضرت مولانا محمد ادریس صاحبؒ لاہور میں خدا کو پیارے ہوگئے اور کل تک جنہیں ہم سلمہ اللہ اور دام ظلہٗ سے مخاطب کیا کرتے تھے آج انہیں رحمۃ اللہ علیہ کے جملہ سے یاد کررہے ہیں۔ ان کے لئے تو انشاء اللہ دورِ آخرت دورِ دنیا سے کہیں زیادہ راحت کا باعث ہوگا، رونا تو اپنا ہے کہ اس باکمال شخصیت سے محروم ہوگئے۔ میرے عزیزان یعنی حضرت مولانا کے صاحبزادگان ہی یتیم نہیں ہوئے بلکہ ہم سب اپنے کو یتیم محسوس کررہے ہیں۔

حضرت مولانا کاندھلوی مرحوم کا علم وفضل، ان کا عام افادہ، تحریر وتقریر، درس وتصنیف رہ رہ کر دل کو پگھلا رہا ہے اور اس وفورِ علم پر سادگی وبے نفسی، مسکنت وتواضع ان کا حصہ تھا اور صحیح معنوں میں اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَآءُ کے سچے مصداق تھے۔ سارا علمی حلقہ ان کی وجہ سے سوگوار ہے۔ دار العلوم میں خبر پہنچتے ہی سب میں غم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ دار العلوم میں درس بند کر کے ختم پڑھا

گیا اور جلسۂ تعزیت منعقد ہوا۔

احقر نے حضرت مولانا مرحوم کے احوالِ صادقہ اور علومِ فائقہ پر روشنی ڈالی اور عرض کیا کہ یہ صدمہ پورے دارالعلوم بلکہ پوری علمی جماعت کا ہے۔ مولانا کاندھلوی مرحوم دارالعلوم کے ایک قابل فخر مدرس تھے اور وہ آج یہاں ہوتے تو تدریس کے سب سے اونچے مقام پر ہوتے۔ ان کا تبحر علمی، مسلک میں پختگی اور رسوخ، ورع وتقویٰ، وسیع النظری اور علوم کا استحضار سب کے سامنے ہوتا، لیکن انہوں نے علمی لائنوں پر جو کام وہاں پاکستان میں کیا اسے ہم سب اپنا ہی کام سمجھتے ہیں۔

مولانا کے حادثہ کا دل پر بہت بڑا اثر ہوا، حقیقت یہ ہے کہ ایک علم کا خزانہ ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا۔ مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ کے وصال کے بعد دارالعلوم کی صدر مدرسی کا قصہ چھڑا، سب کی زبان پر یہ تھا کہ مولانا ادریس صاحبؒ یہاں ہوتے تو انتخابِ صدر مدرس کا سوال پیدا نہ ہوتا، وہ بنے بنائے صدر مدرس دارالعلوم ہوتے۔ بہرحال ان کا صدمہ وقتی نہیں ہے جب بھی علم وکمال اور زہد وتقویٰ کا ذکر آئے گا تو ان کا ذکر آنا قدرتی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اذا ذکر اللّٰہ ذکر وا وا ذکر الله کا سچا مصداق تھے۔

حق تعالیٰ انہیں وہاں بلند درجات عطا فرمائے اور ہم جیسے گنہگاروں کے لئے فرط اور اجر وذخر بنائے۔ آمین۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ

جید الاستعداد پرانے علماء ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں اور جو جگہ خالی ہوتی ہے وہ کبھی پُر نہیں ہوتی۔ اس دورِ انحطاط میں یہ بڑا حادثہ ہے کہ ابھی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ کا جدائی کا زخم تازہ تھا کہ ۲۳ ذیقعدہ ۱۳۹۴ھ (۸؍دسمبر ۱۹۷۴ء) کو ریڈیو پاکستان سے یہ اندوہناک خبر آئی کہ پاکستان میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ وفات پا گئے۔ اناللّٰه وانا الیه راجعون۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے سانحۂ ارتحال کی خبر معلوم ہو کر دارالعلوم دیوبند کے علمی ودینی حلقوں میں سبھی کو افسوس اور قلق ہوا کہ برصغیر میں علم وعرفان کی ایک شمع فروزاں گل ہو گئی۔ حضرت

مولانا عثمانیؒ جماعتِ دیوبند میں غالباً عمر کے لحاظ سے اس وقت سب سے بڑے تھے اور بزرگوں کی یادگار تھے۔ ان کا سانحۂ ارتحال علمی ودینی حلقوں کا ایسا زبردست نقصان ہے کہ جس کی تلافی کی بظاہر کوئی بھی صورت نظر نہیں آتی۔ حق تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے۔ آمین۔

حضرت مولانا عثمانی مرحوم برصغیر پاک وہند کے ممتاز علماء وفضلاء میں بلند مقام پر فائز تھے۔ اگرچہ آپ تھانوی مشہور تھے مگر آپ کا اصل وطن دیوبند ہے۔ محلّہ دیوان کے رہنے والے تھے۔ دیوان لطف اللہ کی اولاد میں سے تھے جو شاہجہاں کے عہد میں دیوان کے منصب جلیل پر فائز تھے۔ دارالعلوم کے قریب دیوان دروازہ اب تک ان کی یادگار موجود ہے۔

حضرت مولانا عثمانیؒ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے حقیقی بھانجے تھے۔ چونکہ بچپن سے ننھیال تھانہ بھون میں قیام رہا اس لئے دیوبندی کے بجائے تھانوی مشہور ہوگئے تھے اور دارالعلوم دیوبند والی موجودہ زمین جس پر دارالعلوم کی عمارت ہے آپ کے جدامجد حضرت شیخ نہال احمد صاحب عثمانی مرحوم نے مدرسے کے لئے وقف کی تھی۔

حضرت شیخ صاحب مرحوم بڑے دیندار اور رئیس تھے اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کے بہنوئی اور رفیق خاص تھے۔

حضرت مولانا عثمانی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہٗ کے مخصوص اور معتمد علیہ تلامذہ اور خلفاء میں سے تھے۔ حضرت سہارنپوریؒ سے حدیث کی تکمیل کی اور ۱۳۲۹ھ میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں مدرس مقرر ہوگئے۔ ۱۳۳۹ھ میں جب آپ حج سے واپس آئے تو حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے تھانہ بھون میں قیام کے لئے ارشاد فرمایا اور بیان القرآن کی تلخیص کا کام آپ کے سپرد کیا۔ بیان القرآن کا یہ خلاصہ تخلیص البیان کے نام سے قرآن شریف کے حاشیہ پر چھپ چکا ہے۔ حضرت حکیم الامت کو آپ کے علم وفضل پر بڑا اعتماد تھا اور صحیح معنوں میں آپ حضرت حکیم الامتؒ کے علمی جانشین اور ترجمان تھے۔ آپ نے حضرت حکیم الامت کے حکم سے ان ہی کی زیر نگرانی کئی عظیم کارنامے سرانجام دیئے اور کئی عظیم الشان تالیفات منظر عام پر آئیں۔

مذہبِ احناف کے متعلق حدیث کا مجموعہ تیار کرنے کا جب پروگرام بنا تو حضرت حکیم الامتؒ

نے اس اہم کام کے لئے مولانا عثمانیؒ کا انتخاب کیا اور آپ نے اس خدمت کو بحسن وخوبی پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ''اعلاء السنن'' کے نام سے بیس ضخیم جلدوں میں یہ عظیم الشان تالیف اہل علم میں مشہور ہے اور جن اصحابِ بصیرت نے آپ کی اس تالیف کا مطالعہ کیا ہے وہ گواہی دیں گے کہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے اس مجموعے کی تیاری میں کتنی محنت کی ہے اور کتنا عجیب وغریب حدیث کا ذخیرہ جمع فرمادیا ہے۔

حضرت حکیم الامتؒ کی خدمتِ اقدس میں جب آپ نے پہلی جلد مکمل کر کے پیش کی تو حضرت نے بیحد پسند فرمایا، پھر دوسری جلد مکمل کی اور وہ بھی حضرت کی خدمت میں پیش کی، حضرتؒ نے بے حد پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور اتنا خوش ہوئے کہ جو چادر اوڑھے ہوئے تھے وہ اتار کر مولانا عثمانی کو اڑھادی اور فرمایا:

''علمائے احناف پر امام ابوحنیفہ کا بارہ سو برس سے قرض چلا آرہا تھا، الحمدللہ آج ادا ہوگیا۔''

ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ مولانا ظفر احمد اس دور کے امام محمدؒ ہیں اور علومِ دین کے سرچشمہ ہیں اور اس طرح سے حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے حکم سے مولانا ظفر احمد صاحب کے قلم فیض رقم سے ''احکام القرآن'' کے ابتدائی دو حصے منصۂ شہود پر آئے جس کے بقایا حصے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی نے مکمل فرمائے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی حضرت مولانا عثمانی نے بہت سی تصانیف اور علمی مقالات لکھے ہیں جو آپ کے علمی کمال کی دلیل ہیں۔

بہرحال آپ اس تاریک دور میں علم وعمل، اخلاص وہمت، حسنِ سیرت وصورت اور علومِ ظاہر وباطن میں اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ آخر وقت تک درس وتدریس اور تحریر وتقریر کے ذریعے علم ومعرفت کی شمعیں جلاتے رہے۔ مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسہ اشرفیہ تھانہ بھون اور دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈوالہ یار سندھ کے علاوہ کئی اور دینی مدارس میں اپنے علم وعمل سے ہزاروں طالبانِ علم کو سیراب کیا۔

آپ عربی، اردو اور فارسی کے بہترین ادیب بھی تھے۔ عربی ادبی قوت بے مثال تھی۔ عربی زبان کے بڑے ماہر اور بے تکان وبے تکلف بولتے تھے، اس وقت علم حدیث وفقہ میں امامت کا

مرتبہ حاصل تھا۔اب ایسے جامع علوم اور عمیق علم وفہم کے حامل محدث کہاں پیدا ہوں گے۔آخر وقت میں دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈ والہ یار سندھ کے شیخ الحدیث رہے اور وفات سے چند روز قبل تک بخاری شریف کا درس دیتے رہے۔کراچی میں حضرت مولانا عبدالغنی پھولپوریؒ اور حضرت مولانا شبیر علی تھانویؒ کے برابر پاپوش نگر قبرستان میں آپ کا مزار مبارک ہے۔حق تعالیٰ اس مردِ حق کے علمی کارناموں اور خدماتِ جلیلہ کو قبول فرمائے اور درجاتِ عالیہ نصیب فرمائے، آمین۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ

مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز علماء وفضلاء میں سے تھے۔قوی الاستعداد اور استحضارِ علم کے ساتھ معروف فقہ وادب میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ میرا ان کا تعلق بھائیوں جیسا تھا اور تقریباً سارے ہی مبادیات تعلیم وتربیت میں ابتداءً انتہاءً ہم ساتھ ساتھ ہی رہے۔درجہ فارسی سے لے کر دورۂ حدیث اور کتبِ عالیہ میں رفاقت رہی، حتیٰ کہ سیر وتفریح میں رفاقت ہی رہتی تھی۔حج وغیرہ میں بھی اکٹھے شرکت ہوتی تھی۔جب حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ اسارتِ مالٹا سے رہا ہوکر وطن واپس تشریف لائے تو ہم اکٹھے ہی ان سے بیعت ہوئے اور پھر ان کے وصال کے بعد احقر ہی کی معیت میں حضرت اقدس حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کی طرف رجوع کیا اور حضرت مرشد تھانویؒ سے خلافت حاصل کی۔

تعلیمی فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ اور ذمہ داروں نے آپ کے علم واستعداد پر اعتماد کرتے ہوئے آپ کو دارالعلوم کا ابتدائی درجہ کا مدرس بنایا۔پھر آپ جلد ہی اپنی علمی قابلیت ولیاقت سے اعلیٰ مدرسین میں شامل ہوگئے۔پھر آپ کی استعداد کے کمال کی بناء پر آپ کو دارالعلوم دیوبند کا صدر مفتی قرار دے دیا گیا، گویا حضرت مفتیٔ اعظم مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ کا قائم مقام بنایا گیا، یہ سب آپ کی لیاقت اور قوتِ علمی کے آثار تھے۔آپ تعلیم ظاہر کے ساتھ تعلیم باطن میں بھی کمال کو پہنچے اور اسی لئے الحمدللہ آج آپ کے متوسلین وعقیدت مند بکثرت موجود ہیں اور مخلوقِ خدا کو بہت فائدہ پہنچ رہا ہے۔

آپ کو تصنیف کا ذوق بھی ابتداء سے تھا۔فقہ وحدیث اور مناظرہ میں نہایت مفید تصانیف کا ایک عظیم ذخیرہ موجود ہے جو آپ کے قلم سے نکلا اور خواص وعوام کے لئے نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔شعروشاعری کا ذوق بھی زمانہ طالب علمی سے تھا۔عربی فارسی اور اردو میں نہایت عمدہ قصائد مراثی اور واقعاتی نظمیں لکھی ہیں جن کا مجموعہ شائع بھی ہو چکا ہے۔آخری دور میں تفسیر معارف القرآن لکھی جو علم تفسیر میں ان کا عظیم کارنامہ ہے اور بقول مولانا ظفر احمد عثمانی قدس سرہٗ آپ نے اس تفسیر کو تالیف فرما کر علمائے کرام، مفسرین کرام اور پوری ملتِ اسلامیہ پر احسانِ عظیم فرمایا ہے۔

تقسیم ملک کے بعد جب آپ نے پاکستان قومیت اختیار فرمائی اور یہاں سے ہجرت فرما کر پاکستان تشریف لے گئے تو میں کسی مرنے والے لئے بھی اتنا کبھی نہ رویا تھا جتنا آپ کے فراق میں رویا تھا۔یہ حالت دیکھ کر سب گھر والے پریشان ہو گئے تھے کہ آخر کیا حادثہ پیش آ گیا جو اتنا گریہ طاری ہے، یہ سب تعلق کی بناء پر تھا کہ ابتدائے عہد سے ہم رفیق رہے تھے۔ان کا نام نامی سامنے آتے ہی اپنے باہمی تعلقات کی وہ پوری تاریخ ایک دم سامنے آ جاتی ہے، جس میں احقر اور حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک طویل عرصہ گزارا ہے۔

مفتی صاحبؒ کی جیسی معیت احقر کو شروع سے حاصل رہی ویسی کسی دوسرے ہم درس وہم سبق کے ساتھ نہیں رہی۔یہ رفاقت رسمی اور ظاہری نہ تھی بلکہ حقیقی اور معنوی تھی جس کی قدر وقیمت اس مخلصانہ تعلق سے بیش از بیش ترقی پذیر رہی اور جس کا تسلسل برسہا برس قائم رہا۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کے انتقالِ مکانی سے احقر کو جتنا ملال اور رنج پہنچا شاید کسی اور کے جانے سے طبیعت اتنی متاثر نہیں ہوئی حتیٰ کہ اپنے مکان پر بیٹھ کر بہت دیر آنسوؤں سے روتا رہا اور تب مفتی صاحبؒ کے فراق کا یہ سبب کھلا۔

ابتدائی تعلیم میں ہم دونوں ہم درس ورفیق رہے۔آپ کے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ فارسی کے مسلمہ استاذ اور قطبِ عالم حضرت گنگوہیؒ کے متوسلین میں سے تھے۔ان کے یہاں فارسی کی تعلیم ایک ساتھ ہوئی، پھر اس سے اوپر کی عربی تعلیم شروع ہوئی تو اس میں بھی وہی میرے مستقل رفیق درس تھے۔تعلیم جن اساتذہ سے پائی وہ مشترک ہی تھے۔اساتذہ کی غیر معمولی عنایات

وتوجہات میں بھی ہم دونوں شریک رہے۔

عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ، عالم ربانی حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ، محدثِ عصر حضرت الاستاذ الاکبر مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی شیخ الاسلام پاکستان، حضرت مولانا رسول خان صاحب، علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ جیسے اساطین علم خوش بختی سے ہمیں ملے۔ اس طرح آغازِ تعلیم سے لے کر تکمیل تک حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ تعلیمی وتدریسی رفاقت مسلسل رہی۔ یاد نہیں پڑتا کہ اس رفاقت ومعیت میں کبھی کوئی فکری وذہنی انقطاع رونما ہوا ہو۔ اگرچہ مفتی صاحبؒ کی علمی مصروفیات ومشاغل، علم میں سبقت ان کے کسی ہم درس ورفیق کے بس کی بات نہ تھی، وہ اس میدان میں سب سے آگے تھے۔ تعلیمی دور ختم ہو جانے پر بھی رفاقت اس شکل میں برقرار رہی کہ فراغت کے بعد دونوں ہی کو دارالعلوم کی خدمت انجام دینے کا ایک ساتھ ہی موقع ملا۔ احقر کا اولاً تدریس سے اور ثانیاً انتظامی امور سے تعلق ہوا اور مفتی صاحبؒ کا اولاً تدریس سے اور ثانیاً افتاء سے تعلق ہوا۔

پھر یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ مسترشدانہ تعلق میں بھی یہ اشتراک وتوافق سامنے آیا کہ ہم دونوں خانقاہ امدادیہ کے حاضر باش اور فیوضِ اشرفیہ کے خوشہ چیں بنے اور اس میں بھی معیت ورفاقت اس درجہ کی رہی کہ حضرت مرشد تھانوی نور اللہ مرقدہ' کی عنایات وافاضات ہم دونوں پر مسلسل مبذول رہی۔ حضرت مفتی صاحبؒ تو اپنی خداداد صلاحیتوں کی بناء پر مقامات طے کرتے چلے گئے، احقر دارالعلوم کی انتظامی ذمہ داریوں کے سبب اس راہِ سلوک میں اتنا تیز رو نہ بن سکا گو حضرت مرشد تھانویؒ یہ فرما کر تسلی بھی فرما دیا کرتے تھے کہ ان مشاغل میں نیت مجاہدے کی کر لی جائے تو اس میں وہی ثمرات مرتب ہوں گے جو ذکر وشغل پر ہوتے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ لیکن بہرحال وہ طبعی مشغلہ علمی ہمہ وقت بروئے کار نہ رہ سکا۔ تاہم حضرت مفتی صاحبؒ سے باطنی رفاقت ہمہ وقت میسر رہی جو ایک طویل مدت پر مشتمل ہے۔ وہ میرے صدیق حمیم ورفیق قدیم تھے۔

جب احقر کو نیابتِ اہتمام کے بعد اہتمام کی مرکزی اور بنیادی ذمہ داری اکابر کی طرف سے تفویض فرمائی گئی تو مفتی صاحبؒ اپنے رسوخ فی العلم اور تفقہ فی الدین کی بنا پر صدارتِ افتاء تک

جا پہنچے، جو دارالعلوم دیوبند کے ممتاز مناصب اور اعلیٰ ترین اعزاز میں شمار کیا جاتا ہے اور حضرت مفتی صاحبؒ جب یہاں سے پاکستان تشریف لے گئے تو وہاں بیٹھ کر بھی افتاء اور تفقہ پر جتنا کام تن تنہا انہوں نے کیا درحقیقت وہ ایک جماعت کا کام تھا جو تنہا ایک فرد نے انجام دیا تھا۔ حتیٰ کہ اپنی ان خدمات کی بدولت رائے عامہ نے آپ کو مفتیٔ اعظم پاکستان کا لقب عطا کیا جو یقیناً ان کے شایانِ شان تھا۔

میری جب کبھی بھی پاکستان حاضری ہوتی تو حضرت مفتی صاحبؒ ہمیشہ ملاقات سے پہل فرماتے اور اپنے قائم کردہ دارالعلوم میں لے جانا، علمی جلسے اور مجالس منعقد کرنا ایک لازمی بات تھی۔ خود ان جلسوں میں شریک رہتے اور مجھ پر تقریر کا اصرار فرما کر تقریر سنتے اور غیر معمولی طور پر محظوظ اور مسرور ہوتے تھے۔

یہ تو اپنے راست تعلق کی باتیں تھی جو سینے میں محفوظ اور سینے سے سفینے پر قلم برداشتہ آ گئیں۔ لیکن حضرت مفتی صاحبؒ کا مقام بزرگوں کی نگاہ میں کیا تھا اس کی نوعیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ کے اخیر عمر کے فتاویٰ کی ایک خاص تعداد ایسی تھی جن پر وہ نظر ثانی نہیں فرما سکے تھے ان کی وفات کے بعد شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہٗ نے ان کے فتاویٰ پر نظر ثانی کے لئے حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ ہی کا انتخاب کیا تھا۔ اس سے ان کی دقتِ نظر اور تفقہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی انہی خصوصیات نے ہم عمروں میں انہیں ایک ممتاز مقام عطا کیا تھا۔ ان کی زندگی کا آخری شاہکار تفسیر معارف القرآن ہے۔ یہ ایک ایسی عظیم و رفیع قرآنی خدمت ہے کہ اگر مفتی صاحبؒ صرف یہی ایک خدمت انجام دیتے تو ان کی عظمت و رفعت اور عند اللہ مقبولیت کے لئے کافی تھا کہ اس کے علاوہ ان کی علمی خدمت اپنی جگہ اتنی اہم اور نفع بخش ہے کہ عوام و خواص اس سے مستغنی نہیں رہ سکتے اور ہر اہل علم حضرت مفتی صاحبؒ کی علمی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے پر مجبور ہے۔

غرض دارالعلوم دیوبند کے مکمل ترجمان علمائے حق کی سچی نشانی اور خانقاہ تھانویؒ کے قابل فخر نمائندے تھے۔ ان کی وفات نہ صرف پاکستان کے صفِ اول کے علمائے دیوبند میں ایک زبردست

خلاء پیدا ہوگیا بلکہ خود دارالعلوم دیوبند کے لئے یہ ایک ایسا صدمہ ہے جس کو وہ بالخصوص ایسے مواقع پر شدت سے محسوس کرتا ہے جب کہ وہ اپنے اجلاسِ صد سالہ اور تقریبِ دستار بندی کے اہتمام میں مصروف ہے، جس میں مفتی صاحبؒ جیسی شخصیت کی شرکت اجلاس کو چار چاند لگا دیتی۔ حضرت مفتی صاحب کو بھی اجلاس کا بہت انتظار تھا اور بڑے شوق وجذبہ سے اس میں شرکت کے لئے آمادہ تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی جدائی کا قلق تو یقیناً مرتے دم تک رہے گا البتہ جو بات قابل رشک اور لائق اطمینان ہے وہ یہ کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے لائق اخلاف چھوڑے، بلاشبہ مولانا محمد تقی عثمانی اور مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی **واخوانهم سلمهم** حضرت مفتی صاحبؒ کے زندہ کارنامے ہیں جو **الولد سر لابیه** کے سچے مصداق ہیں، جنہیں مفتی صاحبؒ نے اپنی نسبتی جانشینی کے ساتھ علمی وراثت بھی بجا طور پر اس طرح منتقل فرمائی کہ انشاء اللہ حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمات کا شجر طوبیٰ زیادہ سے زیادہ برگ وبار لائے گا اور اربابِ علم وفضل اس کی گھنی چھاؤں سے برابر مستفید ہوتے رہیں گے۔

الغرض حضرت مفتی صاحبؒ کے سانحۂ ارتحال کی خبر مشتہر ہوتے ہی پورے دارالعلوم میں صدمہ کی ایک لہر دوڑ گئی اور دارالعلوم کے علمی حلقہ میں رنج وغم کے گہرے بادل چھا گئے۔ سب جمع ہوگئے اور فوراً کلمہ طیبہ اور قرآن کریم کا ختم کرا کر ایصالِ ثواب کرایا گیا اور احقر نے ان کی صفاتِ حمیدہ ظاہر کر کے غم میں ڈوبی ہوئی تقریر کی۔ پورا دارالعلوم تعزیت گاہ بن گیا تھا پھر دارالعلوم کو دو دن کی تعطیل دی گئی کہ طلبا اور اساتذہ ان ایام میں جس قدر بھی ممکن ہوا ایصالِ ثواب میں مشغول رہیں۔ احقر نے جو تقریر کی اس کے چند جملے یہ ہیں کہ:

''حضرت مفتی صاحبؒ پاکستان میں مسلکِ دیوبند کے عظیم داعی اور ترجمان تھے۔ دارالعلوم کے ایک قیمتی جوہر اور عظیم فرزند تھے۔ مفتی صاحبؒ اپنی ذاتی خوبیوں اور لیاقتوں کی بناء پر سارے ہی طبقۂ اہل علم کے معتمد اور مسلم تھے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اسلاف کا ذوق ان میں پوری طرح رچا بسا تھا، وہ ہر جزوی مسئلہ میں بزرگوں کے اتباع کو ضروری سمجھتے تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ اگرچہ آج ہم میں نہیں ہیں مگر ان کا علم اور ان کی دینی خدمات زندہ ہیں اور زندہ رہیں گی اور اس سے ان کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ آپ نے کراچی میں دارالعلوم کے نام

سے علومِ دینیہ کی ایک عظیم درسگاہ بھی قائم کی جو آج پاکستان میں مرکزی حیثیت کی ایک ممتاز تعلیم گاہ ہے۔گورنمنٹ پاکستان نے اسلامی قانون کی تدوین کے لئے علماء کی ایک کمیٹی بنائی تھی آپ اس کے ممبر رہے۔قرار داد مقاصد پاس کرانا شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت مفتی صاحبؒ کا عظیم کارنامہ ہے۔شیخ الاسلام کے بعد آپ ہی جمعیۃ علمائے اسلام کے قائد منتخب ہوئے اور آخر دم تک نظامِ اسلام کے لئے کوشاں رہے۔

آپ کی وفات کا صدمہ صرف ایک گھرانے کا نہیں بلکہ پورے دار العلوم اور سارے علمی حلقے کا ہے۔پھر بھی اس شدید غم میں وجہِ تسلی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ترکہ میں جہاں ایک بڑا علم چھوڑا جو اُن کی کثیر تصانیف میں محفوظ ہے، وہیں الحمدللہ قابل اولاد بھی چھوڑی جس سے بھرپور توقع ہے کہ ان کے آثار اور باقیاتِ صالحات کو من وعن باقی رکھیں گے، بالخصوص عزیزم مولانا محمد تقی سلمہ سے ہماری امیدیں زیادہ وابستہ ہیں۔اب انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ مفتی محمد شفیع ہیں۔حق تعالیٰ ہماری ان آرزوؤں کو پورا فرمائے اور حق تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔آمین۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت، علم وفضل اور خدمات پر جتنا کچھ عرض کیا جائے کم ہے۔دفعۃً ذہن پر جو یادوں کی پرچھائیاں آئیں مختصراً بیان کیں ورنہ مفتی صاحب کا تذکرہ لذیذ بود وحکایت دراز تو گفتن کا مصداق ہے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

حضرت مولانا اطہر علی بنگالیؒ

یہ معلوم ہو کر مزید صدمہ ہوا کہ جس رات حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا انتقال ہوا اسی رات اور اسی تاریخ ۱۱رشوال ۱۳۹۶ھ کو حضرت مولانا اطہر علی صاحب بھی ڈھاکہ میں وصال فرما گئے۔انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ۔حضرت مولانا اطہر علی صاحبؒ دار العلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے تھے اور حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کے خلیفۂ خاص تھے۔انہوں نے سابقہ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں قابل قدر علمی ودینی خدمات انجام دیں، وہ اس وقت بنگلہ دیش کے مشاہیر علماء میں بلند مقام پر فائز تھے۔علمی وسیاسی کارناموں کی وجہ سے بہت مشہور ومعروف بزرگ تھے۔

''جامعہ امدادیہ'' کے نام سے انہوں نے بنگلہ دیش میں ایک عظیم الشان دینی درسگاہ بھی قائم کی

تھی جو اپنی تعلیمی اور تعمیری لحاظ سے ایک ممتاز درسگاہ تھی اور ہزاروں طلباء نے وہاں سے استفادہ کیا۔آپ اپنے ادارے میں ہندو پاک کے جید علماء کو دعوت دیتے رہتے تھے۔احقر کی بھی کئی بار اُن کے یہاں حاضری ہوئی۔

نہایت متواضع ،مہمان نواز اور خوش اخلاق بزرگ تھے۔خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون کے فیض یافتہ تھے اور ساری زندگی اسی تھانوی طریقہ پر گزاری۔ایک جامع علمی شخصیت ہونے کے ساتھ ملکی وسیاسی کاموں میں بھی عملی حصہ لیتے رہے اور اعلائے کلمۃ الحق کی پاداش میں صعوبتیں بھی برداشت کیں اور ساری عمر اسلام کی تبلیغ اور اشاعت میں مصروف رہنے کے بعد مالکِ حقیقی سے جا ملے۔حق تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کی دینی خدمات کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ

آپ حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے مایۂ ناز شاگردوں میں سے تھے۔حضرت شاہ صاحب کے علوم کے امین تھے۔جن کی ذات سے حضرت کے علوم کی بہت زیادہ اشاعت ہوئی۔علمی دنیا میں آپ کا ایک خاص درجہ اور مقام ہے،ادبیت اور عربی فارسی کی ادبی قوت بے مثال تھی۔عربی زبان میں بے تکان اور بے تکلف بولتے تھے،جس میں برجستگی اور روانی ہوتی تھی۔عربی تحریر اور انشاء پردازی میں ایک بے نظیر صاحبِ طرز ادیب اور متعدد اعلیٰ کتب کے مصنف،ترمذی شریف کی نہایت ہی جامع اور بلیغ شرح لکھی جس میں محدثانہ اور فقیہانہ انداز سے کلام کیا گیا ہے،اس کی عربیت اور طرزِ ادا معیاری ہے اور ذخیرۂ معلومات بہت کافی ہے۔اس سے تبحر اور تفقہ دونوں نمایاں ہیں۔

آپ نے مصر،بیروت،شام،حجاز،عراق اور افغانستان وغیرہ کے سفر کئے۔مصر میں علمائے دیوبند کا سب سے پہلے آپ نے تعارف کرایا اور وہاں کے اخبارات ورسائل نے آپ کے بلیغ مضامین نہایت شوق وذوق سے شائع کئے جس سے مصر وشام میں آپ کی علمیت کا چرچا ہی نہیں ہوا بلکہ دھاک بیٹھ گئی اور معیاری علماء کی مجلسوں میں آپ کو نہایت توقیر واحترام کے ساتھ طلب کیا جانے لگا۔علامہ طنطاوی مصری صاحبِ تفسیر طنطاوی پر آپ نے مصنف کے روبرو نقد وتبصرہ کیا،جس

سے خود مصنف متاثر ہوئے اور بہت سی تنقیدات کو انصاف پسندی کے ساتھ انہوں نے قبول کیا اور یا استاذ کے الفاظ سے خطاب کیا۔

عربی میں بھی برجستگی اور یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ موتمر عالم اسلامی قاہرہ مصر میں رئیس وفد پاکستان کی حیثیت سے آپ کو بلایا گیا اور وہاں آپ نے مسلکِ علمائے دیوبند کے مطابق مسائل پر نقد وتبصرہ فرمایا۔ بعض مسائل کے متعلق آپ کے مقالہ کو بہت اہمیت دی گئی اور کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔

آپ نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت الاستاذ علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے زیرِ نگرانی کافی عرصہ تک تدریس کی خدمت انجام دی، پھر دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈوالہ یار میں درسِ حدیث دیتے رہے اور کراچی میں آپ نے اپنا ایک مثالی دارالعلوم قائم فرمایا اور اپنے اسلاف کے نقش قدم پر نیوٹاؤن کی عظیم مسجد میں ابتداءً زہد وقناعت اور بے سروسامانی کے ساتھ تعلیم دینی شروع کردی، فقر وفاقہ تک کو برداشت کیا مگر کارِ تعلیم وتدریس جاری رکھا۔

سنتِ الٰہیہ کے مطابق آخر میں لوگوں کا رجوع ہوا، اور آج یہ دارالعلوم کئی لاکھ کی عمارت ہے جس میں پندرہ بیس کے قریب اساتذہ کارِ تعلیم وتدریس میں مشغول ہیں۔ حدیث وفقہ میں آپ کی استعداد ولیاقت ممتاز حیثیت رکھتی ہے جسے ان کے ہم عصر بھی بطوع واعتراف تسلیم کرتے ہیں۔ آپ فضلائے دیوبند میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے اور ملک بھر میں معروف تھے۔ صوبہ سرحد آپ کا وطن تھا اور آخر وقت تک بحیثیت مہتمم وناظم اعلیٰ دارالعلوم نیوٹاؤن کراچی میں علمی ودینی خدمات میں مصروف رہے۔ ذی قعدہ ۱۳۹۷ھ میں آپ نے رحلت فرمائی۔

آپ کی رحلت کی دو حیثیتیں ہیں ایک تو نفسِ وصال کی جس کا تعلق حضرت مولانا مرحوم کی ذات سے ہے، دوسرے فراق کی جس کا تعلق حضرت مولانا کے پسماندگان سے ہے۔ جہاں تک پہلے کا تعلق ہے اس میں رنج وغم کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ حضرت مولاناؒ علم واخلاق پر بوجہ زہد وتقویٰ کے فائز المرام تھے، لہٰذا اللہ نے یقیناً بخشش کا بلکہ مراتبِ عالیہ کا معاملہ فرمایا ہوگا۔ اور جہاں تک دوسرے کا تعلق ہے وہ واقعی قابل رنج وغم ہے۔ مگر اس میں بھی بہ فحوائے قولِ خداوندی اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا وجہ تسلی کی نکل آسکتی ہے۔

امام محمد کی وفات کے بعد بعض عارفین نے پوچھا کہ آپ پر کیا گذری؟ پہلی بات تو یہ فرمائی کہ علماء سے سن رکھا تھا کہ موت بڑی چیز ہے، بڑی سخت چیز ہے، بڑے ہی دردِ قلب کی چیز ہے، مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں ہوا۔ میں تو فقہ کا ایک مسئلہ سوچ رہا تھا سوچتے سوچتے دنیا سے آخرت میں پہنچ گیا مجھے خبر نہیں کیا گذری۔ دوسرا جملہ فرمایا کہ حق تعالیٰ نے مجھے بخش دیا اور یہ فرمایا کہ اے محمد! اگر ہمیں بخشنا نہ ہوتا تو ہم اپنا علم کیوں تیرے سینے کے اندر ڈالتے۔ علم تو تقویٰ کی چیز ہے۔

تو یہی صورت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کے سینے میں علم ڈالا اور علم بھی ایک امتیازی درجہ کا، اپنے اساتذۂ کرام بالخصوص حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ کے علوم کی جتنی امانت مولانا بنوریؒ کے سینے میں تھی ان کے تلامذہ میں یہ نوعیت کسی کی نہ تھی، اور ان علوم پر جتنا افادہ انہوں نے پایا یہ بھی ایک امتیازی چیز ہے جو انہیں حاصل تھی۔ اتنا بڑا علم کتب وسنت کا جب ان کے دل میں اللہ نے ڈالا تو انشاء اللہ ثم انشاء اللہ یہ یقین ہے کہ مراتب بھی بلند ہوں گے اور وہ تو اونچے مقام پر پہنچے ہیں، ان کے حق میں کوئی رنج کی چیز نہیں ہے البتہ رنج وصدمہ تو پسماندوں کا ہے کہ جن سے ایک نعمت چھن گئی۔ اس واسطے رنج وصدمہ اپنے فراق کا ہے ان کے وصال کا نہیں ہے۔ حق تعالیٰ ہمیں صبر دے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

حضرت مولانا اسعد اللہ رامپوریؒ

آپ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپو کے ناظم اعلیٰ اور حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ' کے خلیفہ ارشد تھے۔ دار العلوم دیوبند کے بعد ہندوستان میں جس علمی ادارے نے عالمی شہرت حاصل کی وہ مدرسہ مظاہر العلوم ہے۔ ۱۳۷۴ھ میں آپ مظاہر العلوم کے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے اور آخر وقت تک اسی منصب پر فائز رہے۔ اس زمانہ میں مظاہر العلوم نے ہر لحاظ سے ترقی کی منازل طے کیں۔

آپ نے اپنی ساری زندگی درس وتدریس، تبلیغ وارشاد اور مدرسہ کی خدمت میں گزاری ہے۔ ہزاروں طالبانِ علم نے آپ سے استفادہ کیا اور ہزاروں نے اصلاح وتربیت حاصل کی۔ آپ اپنے وقت کے عظیم محدث ومفسر، فقیہ وادیب اور عارف تھے۔ نہایت متواضع، منکسر المزاج اور خندہ جبیں

تھے۔ عالمِ شباب میں ایک کامیاب مقرر اور مناظر ثابت ہوئے۔ آریوں، قادیانیوں اور دیگر باطل فرقوں کے ساتھ آپ نے کامیاب مناظرے ومباحثے ادا کئے اور اپنے حریفوں کو ہمیشہ شکست دی۔

شعروسخن سے بھی آپ کو خصوصی شغف تھا، اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں آپ برجستہ اور فی البدیہہ اشعار کہتے تھے۔ مزاج میں انبساط بھی خوب تھا۔ نہایت خوش اخلاق اور لطیف الروح تھے۔ بہت سی کتب کے مصنف تھے۔ تحریر وتقریر نہایت سلیس وشگفتہ تھی، اور اوراد ووظائف کے پورے طور پر پابند تھے اور تقویٰ وطہارت میں اسلاف کا نمونہ تھے۔ ۱۵؍رجب ۱۳۹۹ھ شب میں رحلت فرمائی اور حضرت مولانا حافظ عبداللطیف صاحبؒ کے قریب تدفین ہوئی۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہٗ کے دیرینہ رفیق اور معتمدِ خاص رہے۔ حق تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ

مولانا احتشام الحق تھانویؒ مرحوم دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز فضلاء میں سے تھے۔ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کے بھانجے تھے اور میرے عزیز بھی ہوتے تھے۔ اس لئے کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی حقیقی بہن دیوبند میں ہمارے ہی خاندان میں بیاہی تھیں جن سے مولانا سعید احمد عثمانیؒ اور مولانا ظفر احمد عثمانی پیدا ہوئے۔ یہ دونوں حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے بھانجے ہوتے تھے۔ اس طرح مولانا احتشام الحق مرحوم حضرت تھانویؒ کی علاتی بہن کے بطن سے تھے اس لئے ان سے عزیز داری کی صورت قائم تھی۔ جب وہ دارالعلوم دیوبند پڑھنے کے لئے آئے تو اتفاقاً کمرے سب گھر چکے تھے اور کوئی جگہ رہنے کے لئے مل نہیں رہی تھی تو میں نے دفتر اہتمام کے بالکل اوپر کمرہ جو دفتر اہتمام کا جزو تھا ان کے لئے خالی کرادیا اور انہیں وہاں رکھا۔ مولانا مرحوم کئی سال دارالعلوم میں مقیم رہے اور نہایت نیک نامی کے ساتھ زمانۂ طالب علمی پورا کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ دہلی چلے گئے۔ ان کے بڑے بھائی اعزاز الحق مرحوم دہلی ہی میں سرکاری ملازم کی حیثیت سے رہتے تھے۔ مولانا مرحوم بھی ان کے پاس مقیم تھے۔

قیامِ دہلی کے زمانے میں ان کا معمول تھا کہ تقریباً ہر دوسرے تیسرے ماہ مجھے دہلی بلاتے اور گریجویٹوں کو جمع کر کے مجھ سے تقریر کراتے اور بہت مسرور ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان تقسیم ہوا تو ان کے بھائی اور گریجویٹ طبقہ کے بکثرت افراد پاکستان چلے گئے۔ مولانا ممدوح بھی ان کے ساتھ پاکستان پہنچ گئے اور وہیں بس گئے لیکن میرے ساتھ وہ قدیم تعلق بدستور جاری رکھا۔

مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم کو قدرت نے ذکاوت وذہانت سے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا۔ علمی استعداد ان کی اپنی محنت کا ثمرہ تھا، اس لئے اس وہبی اور کسبی نعمت نے مل کر انہیں اونچا اٹھایا اور بہت جلد مقبولِ خواص وعوام بن گئے۔ درس وتدریس کا عرفی انداز میں مشغلہ تو نہیں رہا مگر وعظ وخطابت سے پاکستان کے باشندگان کو ان سے کافی نفع پہنچا۔ کراچی میں جیکب لائن کی جامع مسجد میں خطیب کی حیثیت سے ان کا فیضان عام ہوتا رہا اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ ان کے کلام اور اخلاق سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا۔

آخر میں سیاسی امور میں بھی لوگ ان کی قیادت تسلیم کرنے لگے جس سے مولانا ممدوح ایک زعیم کی حیثیت سے بھی نمایاں ہوئے اور مقبولیتِ عامہ پیدا کر لی اور بحیثیت فاضل دارالعلوم دیوبند ہونے کے ان کی خدمات پایۂ اعتبار وقبول کو پہنچتی رہیں۔

مولانا مرحوم بذلہ سنج اور لطیفہ گو بھی تھے، جو طبعی ذکاوت کا خاصہ ہوتا ہے۔ کراچی میں ایک صاحب اتفاق سے میرے سامنے آئے، اُنہیں بخار کی شکایت تھی، کہنے لگے کہ بخار آگیا ہے میں نے کہا، مبارک ہو ہم تو مسلم ہی تھے۔ آپ ماشاء اللہ مسلم ہونے کے ساتھ بخاری بھی ہو گئے اور یقیناً مولانا احتشام الحق سے بڑھ گئے۔ مولانا احتشام الحق برجستہ بولے کہ نہیں جناب، آپ اگر مسلم اور یہ بخاری ہیں تو میں الحمد للہ مسلم وبخاری ہونے کے ساتھ نسائی بھی ہیں، کیونکہ کبھی کبھی بخاری بھی ہو جاتا ہوں، اس لئے مجھ میں تین وصف ہیں۔

بہر حال علمی طور بذلہ سنج اور لطافت گو تھے۔ حضرت اقدس حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے مواعظ پر مولانا کی کافی نظر تھی اور کہا کرتے تھے کہ حضرت حکیم الامتؒ کے چالیس وعظ مجھے تقریباً

ازبر ہیں۔ بہرحال علمی استعداد، طبعی ذکاوت، حضرت اقدس حکیم الامت تھانویؒ کی نسبت اور ان کے مواعظ میں مہارت نے مل کر ان کی شخصیات کو اونچا کر دیا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے اجلاسِ صد سالہ کے سلسلہ میں دیوبند کے لئے روانہ ہوئے مگر ویزا ملنے میں دیر ہوگئی اس لئے اجلاس میں شریک نہ ہوسکے، ایک دن بعد پہنچے۔ اطلاع ہونے پر میں ملنے کے لئے چلا تو معلوم ہوا کہ پاسپورٹ کی انٹری کرانے سہارنپور چلے گئے ہیں۔ وہاں سے شب میں کسی وقت واپس ہوئے۔ ارادہ یہ تھا کہ صبح کو ان سے ملوں گا، معلوم ہوا کہ ابھی شب میں ناگل ڈیم ایکسپریس سے مدراس روانہ ہوگئے، ملاقات نہ ہوسکی جس کا افسوس رہا۔ طبعی طور پر خیال تھا کہ واپسی میں انہیں دیوبند آنے کے لئے لکھا جائے گا کہ اچانک مدراس پہنچ کر عالم آخرت کے لئے سدھار گئے اور جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

پاکستان ایک اچھے ذہین وذکی عالم سے محروم ہوگیا، یہ اہل مدراس کی خداترسی اور اخلاق کا جذبہ تھا کہ انہوں نے ہوائی جہاز کے ذریعہ نعش کے کراچی بھیجنے کا بندوبست کیا۔ جن سے ان کے پسماندہ اہل وعیال ان کی زیارت کر سکے اور اہل مدراس کے ممنون اور ان کے حق میں دعا گو ہوئے۔ پاکستان میں مولانا مرحوم دارالعلوم دیوبند کے ترجمان اور شیخ الاسلام علامہ عثمانی قدس سرہٗ کے علوم ومعارف کے امین رہے۔ ان کی وفات سے صرف پاکستان ہی نہیں پورے عالمِ اسلام کو نقصان ہوا ہے اور ہمیں بے حد رنج وقلق ہوا ہے۔ حق تعالیٰ مولانا کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے شیخ الحدیث کے منصبِ جلیل پر فائز رہے۔ آپ شریعت وطریقت کے جامع اور علم وعمل اور زہد وتقویٰ کے مینار تھے۔ انہوں نے اکابر علماء سے فیض حاصل کیا خصوصاً حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ سے آپ کا علمی وروحانی رشتہ بہت قریبی رہا۔ ان کے بعد حضرت حکیم الامت تھانویؒ، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ اور حضرت مولانا مدنیؒ کے علوم وفیوض سے بھی مالا مال ہوئے۔ پھر زندگی بھر درس

وتدریس، تبلیغ وارشاد اور اصلاح وتربیت میں مصروف رہے۔ بہت سی تصانیف اپنے قلم سے تالیف کیں۔ ہزاروں افراد نے آپ سے کسب فیض کیا۔

آپ کے یہاں اتباعِ سنت اور عظمتِ سلف کا خاص اہتمام تھا۔ ۱۳۸۸ھ سے مستقلاً مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے تھے۔ وہاں کے زمانۂ قیام میں امراض واعذار کی وجہ سے درس وتدریس کا سلسلہ تو قائم نہ فرما سکے البتہ سندِ حدیث کی اجازت لینے والوں کا سلسلہ جاری رہا۔ سینکڑوں علمائے عرب نے بھی آپ سے اجازتِ حدیث حاصل کی۔ یکم شعبان ۱۴۰۲ھ کی شب میں مدینہ منورہ میں رحلت فرمائی اور جنت البقیع میں ان کے شیخ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوریؒ کے پہلو میں تدفین ہوئی۔ حق تعالیٰ نے ان کی یہ آرزو پوری فرمادی کہ عمر کے آخری لمحات مدینۃ الرسولؐ میں بسر ہوں اور جنت البقیع میں اپنے شیخ کے قدموں میں مدفون ہوں۔ یہ ان کے لئے تو ان کی بہت بڑی سعادت ہے مگر ہمارے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ سب ہی بزرگ واکابر اور معاصر اٹھ چکے ہیں، حق تعالیٰ شانہٗ ہماری حالت پر رحم فرمائے اور ان کو درجاتِ عالیہ سے نوازے۔ آمین۔

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

آپ حضرت مفتیٔ اعظم مولانا الشیخ عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ کے فرزندِ رشید اور دارالعلوم دیوبند کے ہونہار فاضل ہیں۔ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ درسیات سے فراغت کے بعد دارالعلوم کے درس وتدریس کے سلسلے میں لئے گئے پھر دارالافتاء میں اپنے والد بزرگوار کی زیرِ تربیت افتاء نویسی کی مشق کی اور دارالعلوم میں بحیثیت نائب مفتی کام شروع کیا اور فتویٰ نویسی میں مہارت حاصل کی۔

ایک عرصہ تک حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ کی معیت میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر ایک عرصہ دراز تک کلکتہ میں مقیم رہے اور وہاں کے لوگوں کو علم دین سے مستفید کیا۔ اس کے بعد دہلی آکر ادارہ ندوۃ المصنّفین قائم کیا جو وقت کا ایک بہترین معیاری ادارہ ہے۔ جس نے اسلامی علوم وفنون کی بہت سی قابل قدر تصانیف ملک کے سامنے پیش کیں۔

آپ اس وقت دہلی کے مشاہیر اہل علم وفضل میں شمار کیے جاتے ہیں۔ بہت سے علمی اور دینی اداروں کے ممبر ہیں اور مرکزی حج کمیٹی کے صدر ہیں۔ گورنمنٹ ہند بھی آپ کی بات کا اثر لیتی ہے، قومی کاموں میں آپ کا خاص حصہ رہے۔ تحریکِ آزادیٔ ہند کے سپاہیوں میں سے ہیں۔ جمعیۃ علمائے ہند کے کاموں میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاریؒ کے دستِ راست رہے ہیں اور ان کے وصال کے بعد جمعیۃ علمائے ہند کے صدر منتخب ہوئے اور تادمِ تحریر اسی عہدہ پر فائز ہیں۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے مؤثر ممبروں میں سے ہیں۔ جری اور شیر دل مقرر ہیں۔ بیرونی ممالک میں بھی آپ کی آمد ورفت رہتی ہے۔

حال ہی میں آپ نے روس کے بعض دینی اداروں کی دعوت پر روس کا سفر کیا تھا۔ مجموعی حیثیت سے دارالعلوم کے ممتاز فضلاء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ (۱)

(۱) افسوس ہے کہ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن بھی تقریباً ایک سال صاحبِ فراش رہنے کے بعد ۲۱ مئی ۱۹۸۴ء (۱۴۰۴ھ) کو دہلی میں وفات پا گئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کو درجاتِ عالیہ نصیب فرمائے، آمین۔

سلسلہ تالیفات وافاداتِ حکیم الاسلامؒ
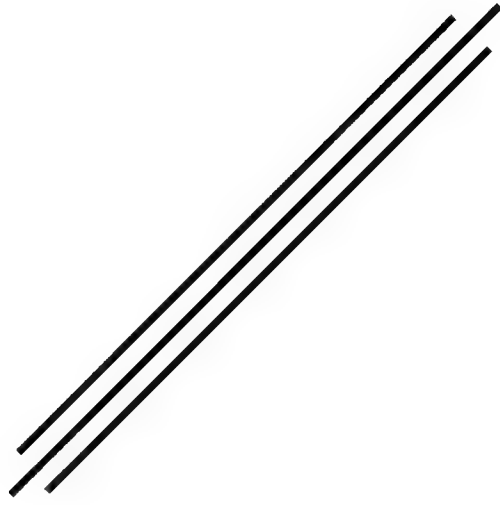
رفیقۂ حیات کی وفات پر

جذباتِ الم

• •

جذباتِ الم بروفات حسرت آیات

رفیقۂ حیات ام سالم حنیفہ خاتون (غفر اللہ لہا)

حرفِ آغاز

والدہ محترمہ مرحومہ کی وفات حسرت آیات خانوادۂ قاسمی کے لئے ایک ایسا زبردست حادثہ ہے جس کی خلش ہمارے دل زندگی بھر محسوس کرتے رہیں گے۔ آں مرحومہ خاندان کی ایک ایسی بزرگی ہستی تھیں جن کی ذات پر تمام چھوٹے بڑے مجتمع اور متفق تھے، ان کی ذاتی خصوصیات اور صلاحیتوں نے ہمیشہ پورے گھرانے کی شیرازہ بندی کئے رکھی اور وہ اپنی برکات کے ساتھ خاندان کی آبرو اور وقار تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے آں مرحومہ کو ذہانت وذکاوت، وقار وسنجیدگی، حلم ومروت، دینداری وضعداری، خلوص ومحبت، ہمدردی وغمخواری اور ایثار وقربانی کی عظیم صلاحیتوں سے نوازا تھا، جس کی وجہ سے سارے خاندان میں ان کی عزت ومحبت بے مثال تھی۔

اس کے ساتھ ہی آں مرحومہ کی دینی معلومات اور عبادت گزاری نیز پند ونصائح کے ذریعہ تبلیغی جذبہ نے تمام برادریوں میں ان کے عزت ووقار کو دوچند کر دیا تھا، اور آج جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں تو ہر دل ان کے لئے زار زار اور ہر آنکھ اشک بار ہے۔

آں محترمہ مرحومہ نے حضرت والد صاحب قبلہ مدظلہ' کے ہمراہ ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے بڑے شہروں کے علاوہ سعودی عرب، برما اور پاکستان کے متعدد سفر کئے اور ہر جگہ کی خواتین کے دلوں میں اپنے لئے ایک باعظمت تاثر چھوڑ کر آئیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جوں ہی ان کی وفات کی خبر اخبارات میں آئی ہر طرف سے اظہارِ رنج وغم اور ایصالِ ثواب کی خبریں اور تعزیتی خطوط موصول ہونے شروع ہو گئے۔

یہ حادثہ جہاں تمام اہل خاندان کے لئے عموماً باعثِ رنج والم ہے وہیں حضرت والد صاحب قبلہ کے لئے خاص طور پر انتہائی دل شکن اور غمناک ہے، جس کا اندازہ مرثیہ کے ان اشعار سے ہوسکتا ہے جو حضرت قبلہ نے اس سانحہ پر بے اختیار موزوں فرمائے اور ان کے ذریعہ اپنے دلی تاثرات کا اظہار فرمایا ہے۔ یہ اشعار چونکہ حضرت مخدوم کے حقیقی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں اس لئے ان میں جو دردِ دل پنہاں ہے وہ ہر پڑھنے والے کو متاثر کرتا ہے، نیز ان اشعار کے ذریعہ مخدومہ مرحومہ کے اوصاف اور طبعی خصوصیات بھی نمایاں ہوتی ہیں۔ چنانچہ اہل خاندان کی خواہش پر یہ اشعار آں مرحومہ کی ایک مختصر سی تاریخ کے ساتھ طبع کئے جارہے ہیں۔

چونکہ خود آں مرحومہ نے طبع رسا پائی تھی اور خانداں کے بعض اہم مواقع پر انھوں نے بھی کچھ اشعار موزوں کئے تھے اس لئے بطور یادگار وہ نظمیں بھی اس رسالہ میں شامل کردی گئی ہیں تاکہ یہ کتابچہ اہل خاندان میں اور آں مخدومہ سے مخلصانہ تعلق رکھنے والی دیگر خواتین میں تقسیم کردیا جائے، اور آں مرحومہ کی ایک یادگار و تذکار کے طور پر سب کے پاس رہے۔

آخر میں تمام قارئین سے ہماری مخلصانہ درخواست ہے کہ حسبِ توفیق مرحومہ محترمہ کے لئے دعائے مغفرت فرماتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری دعائیں قبول فرمائے اور آں مرحومہ کو اپنی جوارِ رحمتِ خاص میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

محمد سالم قاسمی، محمد اسلم قاسمی
محمد اعظم قاسمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حنیفہ خاتونؒ

احقر کی اہلیہ حنیفہ خاتون مرحومہ جن کا انتقال ۱۰ رمحرم الحرام ۱۳۹۴ھ مطابق ۳ رفروری ۱۹۷۴ء، یوم دوشنبہ بوقت ۱۱ بجے شب عاشوراء کو ہوا، مولانا حافظ محمود صاحب مرحوم رامپوری وزیر ریاست اندر گڈھ (راجپوتانہ) کی بیٹی، مولانا حافظ حکیم احمد صاحب مرحوم رئیس رامپور کی حقیقی بھتیجی اور حضرت اقدس مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب خلیفہ ارشد حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید کی پوتی ہوتی تھیں۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھیں اور انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ حضرت شیخ سالار بندگی تھے، جن کا مزار رامپور میں ہے۔

ادھر ننھیال میں حضرت شاہ صادق احمد صاحب انبہٹوی سجادہ نشین حضرت شاہ ابوالمعالی قدس سرہ' کی نواسی تھیں، حضرت شاہ ابوالمعالی کا خاندان انبہٹہ ضلع سہارنپور میں اہل علم وفضل اور اہل تصوف کا ممتاز خانوادہ رہا ہے، اسی خاندان کے چشم وچراغ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبہٹوی (معروف بہ حضرت سہارنپوری) حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبہٹوی اور حضرت مولانا شاہ ظہور احمد صاحب انبہٹوی، حضرت گنگوہی کے اجل خلفاء میں سے تھے، جن سے بہت سی قریبی قرابتیں قائم ہیں۔ حضرت اقدس مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نور اللہ مرقدہ' کا خاندان بھی رامپور کے اسی خانوادہ سے تعلق رکھتا تھا اور عزیز داریاں تھیں اس لئے حضرت گنگوہی کا خاص اور گہرا تعلق اس گھرانے سے تھا۔

مرحومہ حضرت شاہ منظور احمد صاحب گنگوہی خلیفہ حضرت گنگوہیؒ سے بیعت تھیں، جن سے خاندانی عزیز داری بھی تھی، ان چند در چند نسبتوں سے مرحومہ بہت سی خاندانی عظمتیں لئے ہوئے تھیں جن کے آثار ان میں نمایاں تھے۔

خود اپنی ذات سے بھی نہایت صالحہ، پابندِ اوقات اور اپنے معمولات پر مستقیم تھیں۔ میں ان

کے معمولات کو غبطہ کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا اور بسا اوقات ذہن میں یہ تصور بندھ جاتا تھا کہ شاید یہی خاتون میرے لئے بھی نجات کا ذریعہ بن جائیں۔ مرحومہ کو فرائض کی ادائیگی کا حد درجہ اہتمام تھا، گھر کے کیسے ہی اہم کام میں مصروف ہوں، اذان کی آواز سنتے ہی ہر کام سے بیگانہ وار اٹھ کر اول اوقات میں نماز ادا کئے بغیر مطمئن نہ ہوتی تھیں۔ ایک ہزار دانے کی تسبیح ہمیشہ ان کے سرہانے رہا کرتی تھی، نماز عشاء کے بعد ایک ہزار بار کلمہ طیبہ اور وقتِ خواب ادعیہ ماثورہ پڑھنے کا معمول تھا جو سفر اور حضر میں جاری رہتا تھا۔

نمازِ صبح کے بعد تلاوتِ قرآن کریم اور نماز ظہر کے بعد ادعیہ ماثورہ کے ایک حزب کا معمول تھا جو سفر اور حضر میں بغیر کسی شدید اور غیر اختیاری مجبوری کے ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ حج کا ایک خاص شغف دل میں تھا، میری معیت میں سات بار حج وزیارتِ روضۂ اقدس سے مشرف ہوئیں۔ حضرت مولانا محمد سلیم صاحب کیرانوی ثم المکی زید مجدہم مہتمم دارالعلوم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ سے عزیز داری تھی، مکہ میں قیام انھیں کے دولت خانہ پر ہوتا تھا، مولانا کے گھرانے کے ہر بچے اور بڑے کو ان سے ایک خاص انس اور علاقہ تھا، ہر سال حج کے موقع پر ادھر سے برابر یاد دہوتی اور یاد دہانی کی جاتی کہ ہم سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں، اسی علاقۂ خاص سے حضرت مولانا سلیم صاحب کا مقولہ تھا کہ:

''جو شخص یہ ثابت کردے کہ مکہ مکرمہ میں (مولانا) محمد طیب کا گھر نہیں ہے تو میں اسے ایک ہزار روپیہ انعام دینے کے لئے تیار ہوں۔''

بہر حال مولانا کا سارا گھرانہ ان سے حد درجہ مانوس تھا اور وہ ان سے مانوس تھیں، بالخصوص عزیز محترم مولوی محمد شمیم سلمہ ابن حضرت مولانا محمد سلیم صاحب تو خاص طور پر ان کی خاطر داری اور مدارات میں لگے رہتے تھے، اور ان سے مرحومہ کو خاص انس تھا، اور کہا کرتی تھیں کہ مجھے شمیمؔ پر ایسا ہی پیار آتا ہے جیسے سالمؔ پر ہے۔

حج ونماز اور اوقات کی پابندی کے ساتھ ان میں یہی شغف ادائے زکوٰۃ کا بھی تھا، پائی پائی کا حساب کر کے عموماً ماہ رمضان میں زکوٰۃ ادا کیا کرتی تھیں، شہر کے عزیزوں میں سے غرباء اور بالخصوص غریب بیواؤں کی فہرست ان کے سامنے رہتی تھی جن کی مالی مدد خاموشی کے ساتھ ہوتی رہتی تھی۔

رمضان شریف میں روزہ کے ساتھ تراویح کی جماعت اور ختم قرآن شریف کا خاص شغف تھا، گھر پر مردوں اور عورتوں کی مشترک جماعت ہوتی تھی، ان کے اصرار پر کبھی یہ احقر اور کبھی برخوردار مولوی محمد سالم سلمہ ایک پارہ یومیہ تراویح میں سناتے تھے، صرف یہی ایک رمضان (۱۳۹۳ھ کا) ایسا گذرا کہ وہ بوجہ مرضِ موت شریکِ تراویح نہیں ہوسکیں اور اس پر بے حد مغموم رہیں۔ بہرحال ادائے صلوٰۃ وصیام، اہتمامِ حج وزکوٰۃ اور ذکر واذکار کی ایک خاص لگن ان کے دل میں موجزن رہتی تھی۔

مرحومہ سے میرا رشتہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ لے کر رامپور پہنچے تھے، چونکہ حضرت شیخ الہند کا تعلق بھی اس خاندان سے گہرا تھا اور مولانا محمود صاحب رامپوری مرحوم حضرت کے خاص شاگرد تھے اور دوسرے علاقے بھی بزرگوں کی نسبت سے قوی تھے، ادھر حضرت کو میرا یہ رشتہ بہت زیادہ عزیز بھی تھا، اس لئے حضرت نے مولانا حکیم حافظ احمد سے فرمایا کہ بھائی اس وقت میں نائی کی حیثیت سے آپ کی بھتیجی کا رشتہ طیب سے لے کر آیا ہوں، رشتہ تین چار سال لگا رہا، نکاح طے پا گیا تو مقررہ تاریخ پر علماء اور صلحائے وقت سب ہی بارات میں شریک ہوئے، تقریباً سوسوا سو آدمی کی بارات تھی، حضرت تھانوی نے نکاح پڑھا۔

بارات کی واپسی ایک شب قیام کے بعد اگلے دن عصر کے بعد ہوئی اور رات کو تقریباً ایک بجے دیوبند پہنچنا ہوا، سردی کا زمانہ تھا، عشاء کے بعد دیوبند میں اس غیر معمولی تاخیر سے تشویش محسوس کی گئی، بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ مولانا محمود صاحب نے کافی اور بہت قیمتی جہیز دیا تھا جس کی شہرت تھی حتیٰ کہ علاوہ ہمہ قسم سامانوں کے دلہن کے لئے نفیس پالکی اور دولہا کے لئے گھوڑا بھی جہیز میں دیا تھا جو سر سے پیر تک چاندی کے زیور سے آراستہ تھا اور زین مخملی تھا جس پر زری کے کارچوب کا کام تھا، یہی نوعیت دوسرے قیمتی سامانوں کی بھی تھی، رات کا وقت، کچی سڑک اور درمیان میں دیہات کا قصہ، اس لئے دیوبند میں اس تاخیر سے تشویش محسوس کی گئی۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ شادی کے سلسلہ میں مقامی نظم کے ذمہ دار تھے، انھوں نے اس تشویش کا ذکر طلبہ سے کیا، جس پر ڈھائی تین سو طلبہ دیوبند سے رامپور کی سڑک پر روانہ ہوگئے۔ دیوبند سے چھ میل آگے پہنچ کر طلبہ کا مجمع بارات سے جاملا اور بارات کے ساتھ لوٹا،

طلبہ نے اپنی محبت وتعلق سے پالکی سے کہاروں کو ہٹا کر خود پالکی اپنے کندھوں پر اٹھائی اور نوبت بنوبت پالکی لے کر چلے۔

وہ سماں عجیب تھا کہ مختلف وطنوں کے طلبہ بنگالی پنجابی، آسامی، سرحدی اور گجراتی وغیرہ اپنی اپنی زبانوں میں گیت گاتے جاتے تھے اور پالکی اٹھائے چلے جارہے تھے، یہ مرحومہ کی خوش قسمتی تھی کہ رشتہ سرتاجِ علماء شیخ الہندؒ لے کر گئے، نکاح سرخیل علماء حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھا، بارات میں وقت کے تمام علماء، صلحاء اور اکابرِ وقت شریک ہوئے اور پالکی اٹھانے والے طلبائے علم دین تھے جو اپنے سروں پر مرحومہ کو لائے اور آخر کار جنازہ بھی جب اٹھا تو وہ بھی انہی طلباء وعلماء کے کندھوں پر اٹھا۔

۱۳۳۴ھ میں میرا نکاح ہوا جب کہ میری عمر بیس سال کی تھی اور مرحومہ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی، میری ولادت جمادی الثانی ۱۳۱۵ھ کی ہے، اس لئے مرحومہ کی ولادت کا سن ۱۳۱۷ھ نکلتا ہے، اور اس حساب سے انھوں نے اٹھتر سال کی عمر پائی جبکہ میں اس وقت (۱۳۹۴ھ میں) اسّی سال کی منزل میں ہوں، اس لئے ان کے ساتھ میری رفاقت ساٹھ سال رہی ہے، اس پوری مدت میں اہلیہ ہونے کے رشتہ سے میں ان سے اتنا متاثر نہیں تھا جتنا کہ ان کی ذاتی صلاحیت واستقامت اور جذبۂ اطاعت وراحت رسانی وغیرہ سے متاثر رہا۔

خدمت واطاعت میں مزاج شناسی اور نفسیات کی رعایت کا انھیں خاص ملکہ تھا، بات سن کر فوراً اس کی تہہ تک پہنچ جانا اور اصولی جواب دینا ان کا خاص رنگ تھا یہی ذہانت تھی کہ عمر کا ایک بڑا حصہ راجپوتانہ میں گزارنے کے سبب گجراتی زبان اور ہندی لکھنے پڑھنے کا خاص ملکہ پیدا کر لیا تھا، اکثر دارالعلوم کے ہندی اور گجراتی زبانوں کے خطوط میں انھیں سے پڑھوا تا اور ترجمہ کراتا تھا، گجرات کے سفروں میں بڑودہ، سورت، راندیر اور بمبئی وغیرہ میں وہ گجراتی عورتوں کی باتیں بے تکلف سمجھ کر ان سے گجراتی میں بات چیت کر لیتی تھیں۔

اسی طباعی کا اثر تھا کہ حجاز کے متعدد سفروں میں معمولی عربی سمجھنے اور ٹوٹی پھوٹی بول لینے میں انھیں تکلف نہیں ہوتا تھا، حجاز میں اکثر عرب اور مصری عورتوں سے ٹوٹی پھوٹی عربی میں گھنٹوں بات چیت کرتی رہتی تھیں، محض ذکاوتِ طبع سے عربی بول چال پر ایک گونہ قدرت حاصل کر لی تھی۔ جس

زمانہ میں موتمر عالم اسلامی مصر نے اپنے دو فاضل استاذ شیخ عبدالمنعم النمر اور شیخ عبدالعال العقباوی کو دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت استاذِ عربیت تین سال کیلئے بھیجا اور وہ مع اپنے اہل وعیال کے یہاں آکر مقیم ہوئے تو ان کی مستورات کا گہرا تعلق مرحومہ ہی سے رہا کیونکہ عربی بول چال میں ان کا کوئی بھی ہم زبان یہاں کی عورتوں میں مرحومہ کے سوا دوسرا نہ تھا، حتیٰ کہ دیوبند میں تقریبات کے مواقع پر جب مصری مستورات کو دعوت دی جاتی تھی تو ترجمانی کی ذمہ داری مرحومہ ہی کے سر رہتی تھی۔

طرزِ کلام شیریں ہونے کے علاوہ انتہائی بامحاورہ اور اردو زبان کی ضرب الامثال اور کہاوتوں پر مشتمل ہوتا تھا، اردو زبان کے بہت سے غیر معروف محاورات کا علم مجھے ان ہی کے ذریعہ ہوا۔ طرزِ کلام میں شگفتگی کے ساتھ ایک عرفانی کیفیت بھی رچی ہوئی ہوتی تھی جو ان کے ذکر اللہ کا اثر تھا، موزونیٔ طبع کے تحت کبھی کبھی اشعار بھی کہہ لیا کرتی تھیں، چنانچہ ۱۳۶۸ھ میں ان کا جب پہلا حج میرے ساتھ ہوا تو اپنے ذوق وشوق اور حج وزیارت کے ولولہ میں اپنے جذبات اور دعاء والتجا کے کلمات نظم کئے لیکن افسوس ہے کہ یہ نظم دستیاب نہیں ہوسکی۔

ان کی نظموں میں سے صرف دو نظمیں ہاتھ لگی ہیں جو اتفاق سے بچوں نے اپنی کاپیوں میں نقل کرلی تھیں، ایک میرے بہنوئی سید محمد محتشم مرحوم اور ان کے حقیقی بھائی سید محترم مرحوم کے واقعہ شہادت پر لکھی جو ۲ر ستمبر ۱۹۴۷ء میں پیش آیا۔

سید محمد محتشم مرحوم ان کے نندوئی بھی تھے اور سمدھی بھی، ان کے لڑکے اور میرے حقیقی بھانجے سید محمد احتشام کاظمی سلمہٗ سے مرحومہ نے اپنی چھوٹی لڑکی برخوردار حُمیرا خاتون سلمہا کا نکاح کیا تھا، اس لئے دونوں بھائیوں کی بیک دم شہادت پر بہت متاثر تھیں اور بطور مرثیہ چند اشعار نظم کئے جن کا عنوان انھوں نے خود ہی ’’تاثراتِ الم‘‘ تجویز کیا تھا۔

پھر ۱۳۹۰ھ میں اپنے سب سے چھوٹے لڑکے برخوردار محمد اعظم سلمہٗ حال لکچرر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی شادی کے موقعہ پر اس کا سہرا بھی انھوں نے نظم کیا اور اس وقت خاندان کے مرد اور عورتوں کے بھرے مجمع میں سنایا تھا، اور اس کا عنوان بھی خود ہی ’’ماَمتا کے پھول‘‘ تجویز کیا تھا۔ بطور تذکار ویادگار یہ دونوں نظمیں ایک غمی کی اور ایک شادی کی درجِ ذیل ہیں۔

تاثراتِ الم

بر شہادت سید محمد محتشم

و محمد محترم کاظمی (رحمہما اللہ تعالیٰ)

از: حنیفہ خاتون

محتشم اور محترم ذی احتشام واحترام — جنکی روشن اور درخشاں تھی جبیں ایمان کی
ماہِ رمضان ختم قرآں جود واحسان وعطا — برکت ان سب کی انھوں نے پہلے حرزِ جان (۱) کی
تب کراچی سے چلے اور ہو گئے دونوں شہید — تا کہ ہو تکمیل انکی جان کی اور ایمان کی
جاتے جاتے اک نیا اسکول قائم کر گئے (۲) — مسلموں کو شہر کے مشکل جو تھی آسان کی
عازمِ دارالحکومت (۳) جب ہوئے تھے سیدین — منتظر بیٹھی تھیں حوریں خلد میں مہمان کی
یہ کراچی کا سفر تھا یا بلا وموت کا — وہ زمیں تھی کربلا کی یا تھی پاکستان کی
واپسی پر ہر دو جانب تھی فضائے خوفناک — دونوں ملکوں کی تھی حالت کربلائی شان کی
پر بہ عزمِ آہنی باہمت ِخاراشگاف — ایک وعدے (۴) پر نہ کی پروا انھوں نے جان کی
خاکِ گجرولہ (۵) پہ بارانِ شہادت آگئی — آزمائش تھی کڑی ایمان کی اور جان کی

---

(۱) ۱۸؍رمضان ۱۳۶۶ھ (۲؍اگست ۱۹۴۷ء) کے ہونے والے پہلے جشن آزادیٔ پاکستان میں شرکت کی غرض سے روانہ ہوئے اور ۲؍ستمبر ۱۹۴۷ء کو واپسی کے دوران گڈھ مکٹیسر اور گجرولہ کے درمیان ۹؍بجے شب ریل میں دونوں بھائی شہید کئے گئے اور ۴؍ستمبر ۱۹۴۷ء کو گجرولہ ہی کی سرزمین میں دفن کئے گئے۔

(۲) مسلم ہائر سکنڈری اسکول انہی کی آخری یادگار ہے۔

(۳) کراچی (جو اس زمانہ میں پاکستان کا دارالحکومت تھا)۔

(۴) اہل وطن کو خطرہ تھا کہ کراچی نہ رک جائیں تو ان سے واپسیٔ وطن کا بخلوصِ دل وعدہ کر کے اور انھیں اطمینان دلا کر گئے تھے۔

(۵) کراچی سے واپسی ہوائی جہاز میں ہوئی، دہلی سے ہاپوڑ مراد آباد کی ریل اختیار کی جب کہا گیا کہ اس لائن پر فی الجملہ امن ہے، لیکن گجرولہ اسٹیشن کے قریب چلتی ریل میں چند غنڈوں نے انھیں بندوق کی گولی سے شہید کر دیا۔

ریل تھی اور خاکِ غربت، بے کسی اور بے بسی
جان دیدی پر نہیں چھوڑی سبیل احسان کی

ہم سفر (۱) کو دیکھ کر مقہور، خود بھی رک گئے
اور کیا ہوگی مثال اس سے بڑی احسان کی

انتہا ایثار کی تھی اور مروت کی تھی حد
جان کی پروانہ کی، قربانی دیدی جان کی

قوتِ بازو کے جوہر کیا دکھاتے سیدین
جب لعینوں نے انہیں مہلت نہ دی اک آن کی

ہم سفر کی جان کی خاطر مگر لڑتے رہے
پشت کی گولی مگر خواہاں تھی انکی جان کی

سرخ تن اور سرخ پوش ہوکر ہوئے آخر شہید
سرخرو بن کر ملی ان کو رضا رحمٰن کی

جان اک، قالب تھے دو وہ کس طرح ہوتے جدا
موت بھی آئی تو ملکر، اک نرالی شان کی

عمر بھر فرقت کے عنواں سے رہے نا آشنا
موت میں آخر یہ فرقت آتی کس عنوان کی

خوئے احساں کے الٰہی کس قدر دلدادہ تھے
اطلاعِ موت بھی تھی ہم زباں (۲) احسان کی

ان کو عزت کی ردا، اقبال کی دستار ہو
انکے شامل حال ہو رحمت مرے رحمٰن کی

خاکِ گجرولہ بہ فخرِ بیکراں گویا ہے آج
مجھ کو دولت مل گئی شہدائے پاکستان کی (۳)

حنیفہ خاتون
۱۹ رستمبر ۱۹۴۷ء

(۱) پہلا حملہ ان کے رفیق سفر ایک شاہ جہاں پوری نوجوان پر ہوا، اس پر بعض مسافروں نے ان سے کہا کہ جان بچانی ہو تو فوراً ریل سے کود جاؤ مگر مروت نے اجازت نہ دی کہ رفیق سفر کو اس حالت میں چھوڑ کر اپنی جان کی فکر کریں، اس کی مدافعت کی خاطر رک گئے، مدافعت کی اور غنڈوں پر غالب بھی رہے، مگر یہ دیکھ کر دوسرے غنڈے نے پشت سے گولی مار کر دونوں کو ہلاک کر دیا۔

(۲) شہادت کی اطلاع دیوبند میں سب سے پہلے منصرم احسان صاحب سکریٹری میونسپلٹی دیوبند کی زبان سے ہوئی ''زبانِ احسان'' سے اسی طرف اشارہ ہے۔

(۳) قاتلوں نے تو شہید کر کے لاشیں ریل سے باہر پھینک دیں مگر یہ ان شہیدوں کی خوش قسمتی تھی کہ یہ لاشیں گجرولہ اسٹیشن کے قریب گریں، مراد آباد پولیس نے پوسٹ مارٹم کے بعد ۴ ستمبر کو یہ لاشیں اہل گجرولہ کے سپرد کیں اور انھوں نے نمازِ جنازہ پڑھ کر وہیں قریب کے ایک باغ میں دفن کر دیا جس سے انہیں اس بے کسی میں (جو گھر کے رئیس اور پورے دیوبند کے لئے مفتاحِ خیر تھے) گور و کفن اور نمازِ جنازہ نصیب ہوگئی ورنہ اس دورِ بدامنی میں لاکھوں بندگانِ خدا بے گور و کفن چیل کوّوں کی نذر ہوگئے۔

ممتا کے پھول

رشحہ قلم حنیفہ خاتون (والدہ محمد اعظم سلمہٗ)

بتقریب شادی برخوردار موصوف، مورخہ ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ (۱۲ فروری ۱۹۷۱ء)

چاہتا تھا دل جسے سب کچھ وہی سہرے میں ہے
ہر تمنا کے لئے آسود گی سہرے میں ہے

دونوں جانب ایک ربطِ باہمی سہرے میں ہے
اک طرف چاند ایک جانب چاندنی سہرے میں ہے

دل کشی سہرے میں ہے، دل بستگی سہرے میں ہے
بات جو اعظم میاں میں ہے وہی سہرے میں ہے

بھائیوں کے دل کی ٹھنڈک، باپ کے دل کا سرور
چین بہنوں کا قرارِ مادری سہرے میں ہے

بھاوجوں کو دیکھئے ہیں کس قدر بس نونہال
کیونکہ ان سب کی محبت کی لڑی سہرے میں ہے

غازی صاحب کی نگاہِ شاعرانہ (۱) کو سلام
کہہ رہے ہیں آج میری شاعری سہرے میں ہے

سب بھتیجے، ہر بھتیجی خوش بخوش کیسے نہ ہوں
جب چچا کے ساتھ ہی ان کی چچی سہرے میں ہے

زندگی، نورِ مسرت، شوقِ دل، کیفِ نگاہ
فضل باری ہے تو کس شئے کی کمی سہرے میں ہے

(۱) اس پر اک خندۂ مسرت لگا اور غازی صاحب نے بہت زیادہ ہنستے ہوئے شعر کی داد دی اور مضمون کی تصدیق کی۔

ہر تمنا، ہر امید، ہر آرزو پوری ہوئی
آج وہ جذبِ مسرت آ گہی سہرے میں ہے

سہرا منجانب

والدۂ اعظم سلمہ

بتاریخ ۲۴؍ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ مطابق

۲۱؍فروری ۱۹۷۱ء

جدی طور پر چونکہ مرحومہ کے گھرانے میں طب اور مطب کے سلسلے قائم رہے اس لئے طبی مسائل میں بھی خاصا دخل تھا اور اپنے بچوں کی معمولی تکالیف کا علاج خود ہی کرتی تھیں، حتیٰ کہ بعض اوقات طبیب دارالعلوم جناب حکیم محمد عمر صاحب پرنسپل جامعہ طبیہ دارالعلوم کے نسخوں پر بھی تنقید کر دیتی تھیں اور بعض امور میں حکیم صاحب ممدوح ان کی تنقید کو قبول کر کے نسخوں میں ترمیم بھی کر دیا کرتے تھے۔

خانگی اور خاندانی معاملات میں ان کی رائے جچی تلی ہوتی تھی اور اکثر خاندان کی خواتین اپنے گھریلو معاملات میں انھیں کی رائے کو مدارِ کار ٹھہراتی تھیں۔

دیو بند کی ہر برادری کی خواتین ان سے مانوس اور وابستہ تھیں اور تقریباً روزانہ مغرب سے عشاء تک عورتوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، اولاد کی تربیت کا ایک خاص سلیقہ حق تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا، زبان سے زیادہ طرزِ عمل سے اولاد کو صحیح راہ پر ڈالتے رہنے کا خاص ملکہ تھا، اسی کا اثر تھا کہ ساری اولاد پسری اور دختری، داماد اور دلہنیں صرف ان سے ہی وابستہ اور ان پر شیفتہ اور ان کی مطیع نہ تھیں بلکہ باہم بھی آپس میں شیر و شکر اور ایک دوسرے سے محبت اور شگفتگی کے ساتھ وابستہ رہیں، جس کے اثرات الحمدللہ آج بھی بدستور قائم ہیں۔

عام طور سے ساس بہو کی ناچاقیاں دنیا میں ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن یہ ان

کے طرزِ معاشرت اور رہن سہن کے ڈھنگ کا اثر ہے کہ اس گھرانے کا ذہن اس کے تصور تک سے ناآشنا رہا جس کے آثار بدستور قائم اور الحمدللہ ترقی پذیر ہیں۔

حق تعالیٰ نے انھیں ہر حیثیت سے خوش نصیب بنایا تھا اور ان کی مقبولیت اپنے ہی وطن کی حد تک محدود نہیں تھی بلکہ بیرونی ممالک میں بھی جہاں جہاں ان کا جانا ہوا وہاں بھی وہی مقبولیت پیدا ہوتی رہی اور قائم رہی، ہندوستان کا کوئی قابل ذکر شہر ایسا نہیں ہے جہاں ان کا سفر میرے ساتھ نہ ہوا ہو اور انھیں مستقل دعوت نہ دی گئی ہو، اور جہاں بھی جانا ہوتا تھا وہاں کی خواتین ان کے اخلاق اور طرزِ سخن سے متاثر ہو کر ان کی گرویدہ ہو جاتی تھیں اور بار بار ان کو دعوت دیتی تھیں۔

بیرونی ممالک میں برما کے ایک سفر کے بعد حجاز اور پاکستان کے متعدد سفر ہوئے اور ہر جگہ کے متعارف طبقہ نسواں کی گرویدگی ان کے ساتھ رہی، پاکستان کا کوئی بڑا شہر ایسا نہیں رہا جس کا سفر انھوں نے نہ کیا ہو اور وہاں کی خواتین کا حلقہ ان کا مداح اور گرویدہ نہ ہو گیا ہو۔

برما میں مانڈلے اور مولمین وغیرہ میں خواتین کے مجمعوں نے غیر معمولی طور پر ان کا خیر مقدم اور اجتماعی طور پر استقبال کیا، ہوائی اڈوں پر آئیں اور انھیں سرآنکھوں پر بٹھایا، ان کی سیر وتفریح اور باتیں سننے کے لئے مستقل پروگرام بنائے، یہی صورت پاکستانی شہروں میں بھی رہی، زاہدان (ایران) سے دعوت آئی اور میرے ساتھ ان کا سفر متعین ہو گیا، پروگرام یہ تھا کہ ایران کے راستہ سے عراق ہو کر اور مقاماتِ متبرکہ کی زیارت کرتے ہوئے عمرہ کے لئے حجاز حاضری ہوگی، لیکن اسی زمانہ میں ان کے سفر آخرت کی تیاری شروع ہو گئی اور بوجہ مرضِ موت یہ سفر نہ ہو سکا۔

اولاد کی طرف سے بھی حق تعالیٰ نے انھیں خوش نصیب بنایا تھا۔ انھوں نے اپنی تین پشتیں اپنی زندگی میں پروان چڑھتے دیکھیں، بیٹے بیٹیاں، پوتے، نواسے اور ان کی اولادیں، انھوں نے خوشیوں اور مسرتوں کی فضائیں دیکھیں، خود اپنی ساری اولاد کی شادی بیاہ اور کافی حد تک اولاد کی اولاد کی تقریبات وغیرہ سے اپنی زندگی ہی میں فراغت پائی تھی اور یہ کم خوش نصیبی نہیں کہ ان کے انتقال تک ان کی اولاد اور اولاد در اولاد کا عدد ماشاءاللہ چوالیس تک پہنچا ہوا تھا، کثرھم اللّٰہ تعالیٰ وابقاھم۔ اور وہ سب سے ٹھنڈے سینے دنیا سے رخصت ہوئیں اور اولاد ساری مطیع اور

فرمانبردار چھوڑی۔

ان کا مرضِ موت انتقال سے تقریباً چھ سات ماہ پہلے رجب ۱۳۹۴ھ سے شروع ہوا، ابتداءً معمولی تکلیف معدہ کی رہی، احتباسِ ریاح کے سبب قلتِ اشتہاء سے مرض کا آغاز ہوا، رفتہ رفتہ معدے سے جگر نے اثر قبول کیا، ضعفِ جگر پیدا ہوا اور تین چار ماہ بعد اس میں ورمِ جگر کی صورت پیدا ہوگئی۔ پھر ورم نے تحجر کی صورت اختیار کرلی جس سے صلابتِ جگر کا آغاز ہوا اور اسی صلابت نے بالآخر انتقال سے ماہ ڈیڑھ ماہ قبل زخم کی صورت اختیار کرلی جو آخر کار جگر کا کینسر ثابت ہوا۔ مرض لاعلاج تھا تاہم معالجین کی تمامتر سعی یہ تھی کہ کرب اور بے چینی نہ ہو، چنانچہ اس حدتک علاج کامیاب رہا اور باوجود زخم کے اندرونی پھیلاؤ کے کوئی غیر معمولی کرب وبے چینی نہیں ہوئی اور جس حدتک ہوئی اسے مرحومہ نے صبر وتحمل سے انگیز کیا، کبھی کوئی کلمہ اظہارِ بے چینی کا ان کی زبان پر نہیں آیا۔ ابتداءِ مرض ہی سے وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی تھیں اور اس کا اظہار بھی ابتداءِ مرض ہی میں انھوں نے کردیا تھا کہ میں اس مرض سے جانبر نہ ہوں گی، یہ بھی کئی بار کہا کہ مجھے موت کا فکر نہیں وہ تو بہرحال آنی ہے فکر اس کا ہے کہ خالی ہاتھ ہوں، میں ہنس کر کہہ دیتا تھا کہ تمہارے ہاتھ کہاں خالی ہیں ہزار دانہ کی تسبیح سے تو ہر وقت تمہارا ہاتھ بھرا رہتا ہے۔

بہرحال یہ تکلیف بڑھتی رہی، ذیقعدہ اور ذی الحجہ میں اشتہاء بالکل ساقط ہوگئی، دو چار گھونٹ چائے کے سوا غذا کچھ نہ رہی جس سے ضعف کا بڑھنا قدرتی تھا، علاج کی دوڑ دھوپ کافی ہوئی، سہارنپور، دہلی، میرٹھ، بریلی لیجاکر یونانی اور ڈاکٹری، ہومیو پیتھک وغیرہ ہر قسم کے معالجے ہوتے رہے، بیرونی اطباء بھی بلائے جاتے رہے اور آخر کار مستقل علاج عزیز محترم مولوی حکیم محمد سعود سلمہ ابن حضرت محترم مولوی حکیم محمد مسعود صاحب گنگوہی کا رہا، مگر ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اس ضعف اور نقاہت میں آخر کے دو ماہ ذی قعدہ اور ذی الحجہ میں فرائض وواجبات کے سوا معمولات کی سکت باقی نہ رہی، ابتداءً نماز بیٹھ کر ادا ہوتی رہی، جب بیٹھنے کی بھی طاقت باقی نہ رہی تو لیٹ کر اشاروں سے ہوتی رہی اور اس میں مختلف اوقات میں جب غفلت طاری ہوتی تو غیر شعوری

اور غیر اختیاری طور پر بار بار نماز کی نیت باندھنے کے لئے ہاتھ اٹھتے اور گر جاتے، آٹھ اور نو محرم دو دن کلیتاً غشی طاری رہی یہاں تک کہ دس محرم ۱۳۹۴ھ یومِ عاشورہ کو شب میں تقریباً ساڑھے گیارہ بجے دس بارہ منٹ کے نزع کے ساتھ دمِ آخر ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن.

ہر آنکہ زاد ناچار بایدش نوشید زجام دہر مئے کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانْ.

کُلُّ شَیْءٍ ھَالِكٌ اِلَّا وَجْھَهٗ لَهُ الْحُکْمُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ.

انتقال کی خبر سے قصبہ کی ہر سمت کی عورتیں اور بالخصوص اعزہ واقارب کی مستورات کا صبح ہی سے ہجوم ہو گیا تھا، فون کی اطلاع سے دہلی، میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور سے متعدد اکا برملت اسی دن دیو بند پہنچ گئے۔ غسل حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ نے دیا، جن سے مرحومہ کو اور مرحومہ سے ان کو بہت گہرا اور خصوصی تعلق تھا۔ نمازِ جنازہ میں دوڈھائی ہزار علماء، صلحاء، طلباء اور بہت سے بیرونی حضرات شریک تھے اور ہر ایک نے اس تصور سے نماز ادا کی کہ جیسے وہ خود اپنی ماں کے جنازے میں شریک ہیں، جنازہ کو کندھا دینے میں بھی ہر ایک کی بالخصوص طلبائے دارالعلوم کی سعی پیش قدمی کی تھی، جس سے جنازہ بہت رک رک کر دیر سے قبرستان تک پہنچ سکا، مکان سے ملحقہ بازار بند ہو گیا اور ہر دوکاندار نے یہی کہا کہ آج ہماری ماں کا انتقال ہو گیا ہے، الیکشن کے حلقوں نے اس دن پروپیگنڈہ اور لاؤڈ اسپیکر سب روک دیئے دارالعلوم میں بھی پورے دو دن تعطیل رہی اور برابر ختم قرآن وکلمہ طیبہ میں حضرات اساتذہ وطلبہ شغف کے ساتھ شریک ہوئے اور پورے دارالعلوم کا ایک عظیم جلسۂ تعزیت دارالحدیث کے ہال میں منعقد ہوا، جس میں تمام اساتذہ، طلبہ اور اہل دفاتر نے شرکت کی اور تجویز تعزیت پاس کی۔

دارالعلوم کے ہر شعبہ نے الگ الگ بھی مجالس ختم منعقد کیں اور جلسہ ہائے تعزیت کر کے تجاویز تعزیت بھجوائیں جو متعلقہ مسل میں شامل ہیں۔ مقامی حکام اور مختلف پارٹیوں کے ذمہ دار حضرات تعزیت کے لئے آتے رہے۔ بی، کے، ڈی پارٹی کے ممبران کا تحریری تعزیت نامہ اس کے متعدد ممبران خود لے کر آئے، جبکہ دارالعلوم میں ختم قرآن شریف کا اجتماع ہو رہا تھا، ملکی ہائی کمان کی طرف سے مسز اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند، مرکزی حکومت کے وزیر داخلہ شری دکشت، سابق وزیر اعلیٰ

کیرالا وحال ممبر پارلیمنٹ شری اجیت پرشاد جین، گورنر یوپی مسٹر اکبر علی خاں، وزیر اعلیٰ یوپی مسٹر بھوگنا، ڈپٹی اسپیکر ہریانہ اسمبلی اور متعدد ممبرانِ پارلیمنٹ نے تحریری پیغاماتِ تعزیت بھیجے، ہندوستان کے عام مدارس میں تعطیلات کردی گئیں اور ختم قرآن وایصالِ ثواب کا اہتمام کیا گیا، ملک کی مختلف سیاسی وغیر سیاسی انجمنوں نے تجاویز تعزیت ارسال کیں۔

بہر حال ان کا صدمہ ملک گیر طریق پر محسوس کیا گیا، تعزیتی تار اور خطوط بہت کثیر مقدار میں موصول ہوتے رہے جن کی کئی مسلیں بن گئیں جو ملک گیر پیمانہ پر متعارف دینی اور اخلاقی حلقوں میں ان کے صلاح وتقویٰ سے اس رابطہ کی دلیل ہے کہ جو ہر قلب میں جاگزیں تھا۔ حجاز مقدس، حرمین شریفین میں بھی ایصالِ ثواب ہوا، متعدد مخلصین نے بہ نیتِ ایصالِ ثواب عمرے بھی کئے، غیر ممالک سے بھی جو خطوط اور تار تعزیت کے سلسلے سے آئے ان میں مرقوم ہوتا تھا کہ امی جان کے انتقال سے ہم سب دلگیر ہیں، عام طور پر ملک اور بیرون ملک میں سب انھیں امی جان ہی کے لقب سے یاد کرتے تھے، وہی لقب تعزیت میں بھی استعمال ہوتا رہا۔

بطن کی بیماری اور وہ بھی خون آلود ہونے کی وجہ سے انشاء اللہ مرنے کے بعد حسب بشارتِ نبوی مقامِ شہادت سے ہمکنا رہوئیں، انتقال کے دن اطراف وجوانب کے متعدد عزیزوں اور دوستوں نے خواب میں دیکھا کہ انتقال ہوگیا اور اس پر ہی بہت سے دوست احباب سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ، دہلی وغیرہ سے چل پڑے اور دیو بند پہنچ گئے۔ انتقال کے بعد بہت سے لوگوں نے مبشرات (سچے خواب) بیان کئے جو انشاء اللہ ان کی وہاں کی مقبولیت کی علامت ہے۔

میرا تاثر قدرتی تھا اور ساٹھ سالہ رفاقت کے بعد فطری بھی تھا، صبر وتحمل حق تعالیٰ کی دین تھی، تاہم اس تاثر میں یہی واقعاتِ مذکورہ بصورتِ اشعار بھی بے ساختہ قلم پر آگئے جو مرحومہ کو خطاب کر کے لکھے گئے تھے، ان میں شاعری نہیں ہے اور نہ ہی میں شاعر ہوں، صرف جذبات وتاثرات کی بے ساختہ ترجمانی ہے۔

عزیزوں کی مجلس میں کئی بار یہ نظم پڑھی گئی اور سب ہی ہر بار چشم نم ہوتے رہے، سب کا اصرار ہوا کہ یہ واقعات منثور اور منظوم ہر عزیز کے پاس بطور یادگار باقی رہیں تو دلوں کی تسلی کا باعث ہوگا،

اس لئے یہ نظم اوراس سے پہلے کی یہ نثر کی چند سطریں جو فی الجملہ مرحومہ کے مختصر حالات پر مشتمل ہیں باصرارِ اعزہ طبع کرالی گئی ہیں جو ہدیۂ احباب واعزہ ہیں۔

یہ اجمالی کیفیت اس لئے لکھدی گئی ہے کہ بعد میں آنے والے عزیز واقرباء اور احباب فی الجملہ ان کی زندگی سے واقف ہوسکیں اور دعاء میں یادرکھیں، اسی وجہ سے یہ تحریر محافظ خانہ دارالعلوم میں بھی بضمن مسل متعلقہ پیغاماتِ تعزیت بحفاظت رکھوادی گئی ہے جو بعد میں حسبِ ضرورت تاریخ کا کام دے سکے گی۔

بس اتنی سی حقیقت ہے فریبِ خوابِ ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

محمد طیب

۱۵؍محرم الحرام ۱۳۹۴ھ مطابق ۸؍فروری ۱۹۷۴ء

بروز سہ شنبہ

خطاب بہ رفیقہ حیات حنیفہ خاتون رحمہا اللہ تعالیٰ

المتوفیہ ۱۰ محرم الحرام ۱۳۹۴ھ یوم عاشورا یکشنبہ

اے ساٹھ سالہ مونسِ جاں تو نہیں جب آج
ہونا مرا بھی خاک ہی ہوگا ترے بغیر

اے مونسِ حیات اگر تو نہیں حیات
جینا ہے پھر تو موت سے بدتر ترے بغیر

اے شمع بزم تجھ سے ہے خالی اگر یہ بزم
اندھیر ہے چمکتی یہ دنیا ترے بغیر

اے گل بہار جب نہیں گلشن میں سیر گل
رنگِ خزاں ہے روئے گلستاں ترے بغیر

گل ہی نہیں تو سیر چمن کا ہے گل چراغ
سیر چمن نہیں تو چمن کیا ترے بغیر

مالی بھی ہے، چمن بھی ہے، بادِبہار بھی
روحِ بہار پر نہیں ملتی ترے بغیر

یہ زندگی اور اس کی یہ سب خوشگواریاں
کیا قیمت ان کی ہیچ ہے سب کچھ ترے بغیر

یہ گھر اور اس کی ساری معیشت کی یہ اثاث
بے کار ہے یہ عیش کا ساماں ترے بغیر

جب تو نہیں یہاں تو مجھے مل سکے گا کیا
تسکینِ قلب و روح کا ساماں ترے بغیر

گھر سے مرا یہ خاص علاقہ تجھی سے تھا
پھر کیا ہے گھر میں میرا ٹھکا نا ترے بغیر

گلزار ہو یہ گھر تری اولاد سے سدا
اپنے کو پا رہا ہوں میں تنہا ترے بغیر

تیری خلوصِ دل سے وہ راحت رسانیاں
ممکن نہیں ہیں اور نہ ہوں گی ترے بغیر

تیری یگانگت وہ ملنساریاں تری!
آتی رہیں گی یاد ہمیشہ ترے بغیر

تیری شگفتگی وہ تری جودتِ مزاج
زندہ دلی کی بات کہاں اب ترے بغیر

تیری ذکاوت اور ذہانت کا خاص رنگ
مخصوص تھا تجھی سے کہاں پھر ترے بغیر

آنکھیں جو تجھ سے رہتی تھیں دن رات شاد کام
روتی رہیں گی خون کے آنسو ترے بغیر

دانائیوں کی بات بصیرت کے رنگ سے
نادر مثال تھی نہ ملے گی ترے بغیر

طرزِ سخن ہر ایک کے دل کو جو موہ لے
مسحورکن کلام کہاں اب ترے بغیر

جذبِ نفوس کا تھا تری ذات میں اثر
ڈھونڈیں کہاں کشش کا یہ ساماں ترے بغیر

تجھ سے جڑا ہوا تھا قبیلوں کا فرد فرد
کیا جانئے کہ بعد میں کیا ہو ترے بغیر

بے لوث زندگی سے تری سب تھے متحد
الفت کا یہ نظام کہاں پھر ترے بغیر
قسمت تھی تیری یا تھی وہ برسات رزق کی
کل کیا ہو، کون جانے کہ کیا ہو ترے بغیر
تھا نظمِ خانہ تجھ سے محبت کا اک نظام!
ڈھیلی ہیں آج نظم کی کڑیاں ترے بغیر
جس گھر میں تھا نظامِ محبت ترا رواں
اس کے ہے گوشہ گوشہ میں رخنہ ترے بغیر
افکار و غم میں جب بھی کبھی مبتلا ہوا
کوئی ہوا نہ درد کا درماں ترے بغیر
پیچیدگی میں گھر کی گھرا جب کبھی یہ گھر
سلجھاؤ کا نہ تھا کوئی ساماں ترے بغیر
اولاد کو ملا کے محبت سے باندھنا
تیرا ہی کام تھا، جو نہ ہوتا ترے بغیر
بچوں کو اپنے راہِ محبت پہ ڈالنا
کرتا کوئی بھی کچھ، یہ نہ ہوتا ترے بغیر
تیری ہی تربیت سے تھی اولاد ساری ایک
یہ روحِ اتحاد کہاں پھر ترے بغیر
روتے ہیں تجھ سے زیادہ تری شفقتوں کو آج
الفت کا خاص رنگ کہاں پھر ترے بغیر
اپنے خلاف پر وہ تحمل کی خوئے خوش
ایسی مثال لائیں کہاں سے ترے بغیر

تیری چوالیس آل اور اولاد کا یہ دھن
تیری مفارقت سے ہے سوزاں ترے بغیر

سب ہند و پاک کے یہ ترے لختہائے دل
سوزِ دروں سے آج ہیں بریاں ترے بغیر

کیا کچھ گذر رہی ہے میرے دل پہ دل میں ہے
کس سے کہوں میں دل کی یہ پپتا ترے بغیر

وہ زندگیٔ باہمہ وبے ہمہ تری
تھی اک مثال جو نہ ملے گی ترے بغیر

اس پر خدا کے ساتھ جو تھا خاص ربطِ دل
ہے فرقۂ اناث میں عنقاء ترے بغیر

خوفِ خدا کے ساتھ ہی شفقت بھی خلق پر
کس نے کیا ہے ان کو بہم یوں ترے بغیر

گھر کے معاملات میں منکر کی روک تھام
معروف کی لگن یہ نہ دیکھی ترے بغیر

غیبت سے اجتناب ، مطاعن سے احتراز
تقویٰ کا یہ شعار کہاں تھا ترے بغیر

بروقت ہر نماز باوقاتِ خاص ذکر
یہ نظم و ضبط ذکر ہے سونا ترے بغیر

تیری ہزار دانہ کی تسبیح سُبحہ راں
اس کا ہر ایک دانہ ہے بریاں ترے بغیر

وہ تیرے وردِ پاک کے اوراق اور صحف
ان کا ورق ورق ہے پریشاں ترے بغیر

دائم تلاوت اور وظائف کا التزام
یہ استقامت آج ہے حیراں ترے بغیر

وہ اہتمامِ خاص ادائے زکوٰۃ کا
اتنی تڑپ سے ہم نے نہ پایا ترے بغیر

رمضان کا احترام ، تراویح کا نظام
گھر میں جماعت ایسی نہ دیکھی ترے بغیر

پایا ہے سات بار رفاقت کا حج میں لطف
اب لطف کیا کہ عمرہ و حج ہو ترے بغیر

تھا یہ سفر فریضۂ دینی جو عام ہے
کتنے ہی تھے سفر جو نہ ابھرے ترے بغیر

کچھ اک حضر ہی میں نہ تھی مقبولیت تری
سفروں کی دعوتیں بھی نہ آئیں ترے بغیر

کوئی بھی ہندوپاک کا ایسا نہیں مقام
جس میں سفر کی گشت ہوئی ہو ترے بغیر

برما(۱) کی وادیوں میں وہ گلگشت جانفزا
شہروں کا لطفِ سیر نہیں تھا ترے بغیر

رنگون ، مانڈلے کا سفر مولمیں کی سیر
ہوتیں نہ پُر بہار یہ سیریں ترے بغیر

افریقہ (۲) و عرب سے مکرر تھیں دعوتیں
مطلوبیت یہ عام کہاں تھی ترے بغیر

---

(۱) یہ سفرنامہ شائع ہو چکا ہے۔

(۲) افریقہ سے ایک شادی میں خصوصیت سے مرحومہ کو دعوت آئی ، کاغذاتِ سفر مکمل ہو چکے تھے کہ مرضِ موت کا حملہ ہوا اور بیماری ممتد ہو کر بجائے سفر افریقہ کے سفر آخرت پیش آ گیا۔

ایران (۳) سے تھی دعوتِ تہران و زاہدان
پر سیر آخرت کی تھی مضطر ترے بغیر

تیری شگفتگی سے سفر اور حضر میں عام
گرویدگی کہیں یہ نہ دیکھی ترے بغیر

ایسے ہی غم بھی آج ترا ملک گیر ہے
اندھیر ہے فضاء و خلا میں ترے بغیر

ہو انجمن کہ مدرسہ و خانقاہ ہو
رنجور و پرُالم ہیں ادارے ترے بغیر

ہر جا ہوئے ہیں ختم، مدارس میں چھٹیاں
بیتاب تھے ثواب کے خرمن ترے بغیر

اتنے خطوطِ تعزیت، اتنے غموں کے تار
آئے نہ تھے کبھی بھی یہ پہلے ترے بغیر

طوفان تھا غموں کا دلوں میں چھپا ہوا
ابھرا ، مگر ابھر نہ سکا کچھ ترے بغیر

امّی کے لفظ سے ہی عزا تار ہو کہ خط
ہے کون آج مادرِ ملت ترے بغیر

اب تو نہیں تو لطف نہیں زندگی میں کچھ
جب تو نہیں تو کون ہو مونس ترے بغیر

مقبولیت یہ عام یہ گرویدگیٔ تام
نسبت سے دین سے تھی، کہاں اب ترے بغیر

(۳) زاہدان (ایران) سے حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب نے (جو احقر کے متعلقین میں سے ہیں) دعوت دی، پروگرام یہ تھا کہ حجاز وافریقہ کے سفر میں واپسی ایران کے راستے سے ہو مگر بوجہ مذکور یہ سفر باوجود تیاری کے نہ ہو سکا۔

وہ پختگئ دین ، وہ مضبوطئ یقین
اپنے گھروں میں کیا ہی ملے گی ترے بغیر

شاہانہ ٹھاٹھ سے وہ ترا داخلہ یہاں
جمتا نہ تھا یہ رنگِ امیری ترے بغیر

زمزم سے تر کفن میں ہے اب واپسی تری
بیتاب تھا یہ طرزِ فقیری ترے بغیر

شاہی قبا میں فقروقناعت کا رنگ ڈھنگ
تیرا ہی کام تھا جو نہ چلتا ترے بغیر

شاہی ، گدائی تیری جدائی کو دیکھ کر
دونوں ہیں غم سے سربگریباں ترے بغیر

تیرے جگر کے دکھ سے تھی سب کے جگر میں ٹیس
تیرے جگر کے خون سے ہیں خوں ترے بغیر

یومِ شہادت (۱) اور شہادت کا یہ مقام
حیران پھر رہا تھا کہ گذرے ترے بغیر

تیری سعادتوں نے شہادت کو جالیا
بے تاب ورنہ رہتی شہادت ترے بغیر

اب تو ہے اور حظِ شہادت کی لذتیں
یاں ہم ہیں اور کربِ جدائی ترے بغیر

سرپر تجھے اٹھایا تھا اربابِ علم نے
یہ عزوافتخار کہاں تھا ترے بغیر

---

(۱) یومِ عاشورہ ۱۰ رمحرم ۱۳۹۴ھ یومِ وفات ہے جو یومِ شہادتِ حسینؓ ہے۔

لائے تھے طالب علم ہی کندھوں پہ پالکی (۱)
ان پر ہی تھا پلنگ بھی کب اٹھتا ترے بغیر

ڈولہ کھٹولہ دونوں ہی کندھوں پہ ان کے تھا
رفعت یہ دوجہاں کی کہاں تھی ترے بغیر

ان میں جو شادی اور غمی کی تھی یہ کشش
تیری کشش سے تھی جو نہ ہوتی ترے بغیر

یہ طالب علم تیری ہیں روحانی ذریت
آخر انھیں قرار کب آتا ترے بغیر

دن رات ہیں لگے ہوئے ایصالِ اجر میں
یہ اجر کیوں بھی پاس وہ رکھتے ترے بغیر

اجرِ کثیر ، حظِ شہادت ، ضیاءِ قبر
محشر کا نور کیسے رہے گا ترے بغیر

تیرے لئے تو کھل گئیں جنت کی کھڑکیاں
سوزِ دروں میں ہم ہیں کہ ہیں اور ترے بغیر

وہ درد جو فراق میں تجھ سے ملا ہمیں
کچھ دردِ دل کا ہے وہی درماں ترے بغیر

سینہ سے ہم لگائے ہوئے بیٹھے ہیں غم ترا
غم ہی ترا ہے تیری جگہ اب ترے بغیر

حاصل تجھے ہوں برزخ و محشر کی راحتیں
بے جان زندگی ہے کہ ہم ہوں ترے بغیر

غمزدہ **محمد طیب** (۱۰ رمحرم ۱۳۹۴ھ، یوم المزید)

(۱) ۱۳۳۴ھ یومِ بارات میں رامپور سے واپسی پر دیوبند سے چھ میل آگے بڑھ کر دو تین سو طلبہ اپنے کندھوں پر خود پالکی اٹھائے ہوئے بارات کے ساتھ گھر تک پہنچے تھے۔

تعزیت کیلئے آنے والے مقامی حضرات

دیوبند کی ہر مسلم برادری کے معززین نے انتہائی خلوص کے ساتھ تعزیت وہمدردی فرمائی اور غمزدہ دلوں کو تسلی دی، اسی کے ساتھ معزز ہندو بھائیوں نے اس غم کو اپنا غم سمجھا، حتیٰ کہ تمام سیاسی پارٹیوں نے اس روز لاؤڈ سپیکر پر الیکشنی پروپیگنڈہ بند کر کے شرکتِ غم کا اظہار کیا۔

آنے والے معززین میں جناب چودھری ملکھان سنگھ صاحب، جناب چودھری مہابیر سنگھ صاحب مع رفقاء، ڈاکٹر سناور صاحب، منیجر صاحب شوگرمل دیوبند، راجکمار وکیل صاحب کے علاوہ اور بھی مختلف ہندو بھائی تشریف لائے، نیز تمام سیاسی پارٹیوں نے تجاویز تعزیت میں ہمدردی ظاہر فرمائی۔

دہلی سے آنے والے حضرات

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ندوۃ المصنّفین، دہلی

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب (مع اہلیہ محترمہ)

جناب محترم یونس سلیم صاحب (سابق ڈپٹی منسٹر ریلوے حکومتِ ہند)

جناب مولانا اسعد مدنی صاحب صدر جمعیۃ علمائے ہند

جناب مولانا سید انیس الحسن صاحب (مع اہلیہ محترمہ)

جناب سید اختر ہاشمی صاحب

جناب صاحبزادہ محمد مستحسن صاحب فاروقی، ایڈیٹر آستانہ، دہلی

جناب محمد وسیم صاحب فاروقی

جناب مولانا مفتی ضیاء الحق صاحب صدر جمعیۃ علماء صوبہ دہلی

جناب مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی، دہلی

جناب مولانا محمد سلیم صاحب ابن حاجی محمد صالح صاحب (علی جان والے)

جناب مولانا وحید الدین صاحب قاسمی، دہلی

جناب مخمور عثمانی صاحب دیوبندی، دہلی

سہارنپور سے آنے والے حضرات

جناب حافظ انوار الاسلام صاحب مالک بھارت برش کمپنی

جناب قاری عبد الرحمٰن صاحب سرائے شاہ نور، سہارنپور

جناب مولوی طلحہ صاحب ابن حضرت شیخ الحدیث

جناب مولانا مفتی مظفر حسین صاحب مظاہر علوم سہارنپور

جناب مولانا مفتی جمیل الرحمٰن صاحب ناظم شاخ مظاہر علوم سہارنپور

میرٹھ سے آنے والے حضرات

حضرت مولانا آل حسن صاحب

نواب صاحب باغپت

حکیم عزیز الرحمٰن صاحب

حکیم محمد الیاس صاحب

حکیم محمد ادریس صاحب

حافظ محمد الیاس صاحب

حکیم بنیاد علی صاحب

دیگر مختلف مقامات سے بروقت تشریف لانے والے حضرات

جناب مولانا عبد الحفیظ صاحب مدرسہ رحیمیہ مظفر نگر

جناب حاجی احمد بخش صاحب سابق ایم، ایل، اے مظفر نگر

جناب منشی لئیق احمد صاحب مدرسہ خادم العلوم سردھنہ

جناب حاجی عبدالمجید صاحب کھتولی

حکیم محمد اسلام صاحب میرٹھ

جناب مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب ومولانا شفیق احمد صاحب بجنور

جناب مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنور

حکیم محمد ذکی صاحب خورجہ

جناب مہربان صاحب کھوکنی۔

ہریانہ اسمبلی کی ڈپٹی اسپیکر خاتون، اہلیہ مرحومہ کی تعزیت کے لئے تشریف لائیں جو اصل میں دیوبند ہی کے ایک ہندو خاندان کی بیٹی ہیں، وہ الیکشن کے سلسلے سے دیوبند پہنچیں اور انھیں انتقال کی خبر معلوم ہوئی تو وہ قیام گاہ پر اترنے سے پیشتر سیدھی تعزیت کے لئے غریب خانہ پر اچانک پہنچ گئیں جن کا شکریہ ادا کیا گیا۔

تار اور خط سے تعزیت کرنے والے حضرات

مسز اندرا گاندھی وزیر اعظم

مسٹر اوما شنکر دکشت، وزیر داخلہ

مسٹر اکبر علی خاں صاحب گورنر یوپی

مسٹر بھوگنا وزیر اعلیٰ یوپی

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی الفرقان لکھنؤ

جناب مولانا محمد سعید صاحب سملکی مہتمم جامعہ ڈابھیل، سورت

جناب مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد، میرٹھ

جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی، دہلی

جناب مولانا ڈاکٹر مصطفیٰ صاحب لکھنؤ

جناب مولانا ابوسعود صاحب مہتمم دارالعلوم سبیل الرشاد، بنگلور

جناب مولانا برہان الدین صاحب، ندوۃ العلماء لکھنؤ

جناب مولانا محمد ہاشم صاحب فرنگی محل لکھنؤ

جناب مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی بھوپال

جناب مولانا محمد یوسف صاحب امیر جماعت اسلامی دہلی

جناب مولانا عبدالرؤف صاحب مہتمم مدرسہ اشاعت العلوم، بریلی

جناب سیٹھ محمد جان صاحب کلکتہ

جناب ناظم صاحب مدرسہ امدادیہ بمبئی

جناب ناظم صاحب عبدالعزیز صاحب اورنگ آباد

جناب مولانا عبدالوحید صاحب ایڈیٹر نئی دنیا دہلی

جناب حکیم محمد علی صاحب غوری جے پور

جناب میجر احمد سعید خاں صاحب خورجہ

جناب محترم جناب حکیم عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد دواخانہ دہلی

جناب مولانا قاضی سجاد حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ فتح پوری، دہلی

جناب صوفی عبدالرحمٰن صاحب بمبئی

جناب سجاد صدیقی صاحب بمبئی

جناب محمد بھائی بمبئی

جناب ناظم صاحب جامع العلوم کانپور

جناب مولانا عبدالعلیم صاحب، دارالمبلّغین، لکھنؤ

جناب ناظم صاحب مدرسہ نوریہ، بڑوت

جناب مولانا عبدالماجد صاحب، دریاباد

جناب حکیم عبدالقوی صاحب مدیر صدق، لکھنؤ

جناب مولانا منت اللہ صاحب امیر شریعت بہار واڑیسہ

جناب مولوی محمد ولی صاحب مونگیر

جناب شبیہ الحسن صاحب گنگوہ

جناب مولانا احمد اشرف صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ راندیر

جناب بشیر احمد صاحب خیر آباد

جناب قدسیہ بیگم صاحبہ صاحبزادی نواب صاحب بھوپال

جناب ضیاء الحسن صاحب احمد آباد

جناب مولانا عبدالرحمٰن جامعہ نظامیہ حیدر آباد

جناب مولانا محمد سعید صاحب مہتمم جامعہ حسینیہ راندیر

جناب مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی صدر المدرسین جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

جناب حاجی محمد احمد صاحب سورت

جناب راؤ محمد حسین صاحب کرنال

جناب مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب دام مجدہٗ مہتمم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جناب حاجی محمد صدیق صاحب میمنی مکہ مکرمہ

جناب عبدالقادر، محمد رفیق کانپور

جناب حاجی محمد عمر صاحب صدر مجلس تاجران چرم حیدر آباد

جناب حاجی عبدالصمد صاحب احمد آباد

جناب سید محمد علی صاحب ایڈوکیٹ حیدر آباد

جناب حکیم مشتاق احمد صاحب کٹھوری (گلاؤٹھی)

جناب مولانا ارشاد احمد صاحب مبلغ دارالعلوم دیوبند از ہبلی

جناب ناظم صاحب دارالعلوم ناندیر اور حضرات اساتذہ کرام مدرسہ ہذا

جناب حاجی آدم احمد صاحب بنگلور

جناب حکیم شکیل احمد صاحب لکھنؤ

جناب حکیم محبوب علی خاں صاحب حیدر آباد

نمائندہ اخبار ویرار جن دیو بند

جناب حاجی رئیس الدین صاحب اٹاوہ

جناب سکریٹری صاحب جمعیۃ علماء ناٹال افریقہ

جناب مولانا اسماعیل نانا صاحب جوہانسبرگ

جناب مولوی جلیل احمد صاحب ناظم جمعیۃ علماء صوبہ یوپی سیوہارہ

جناب مولانا قاری فیاض احمد صاحب مہتمم مدرسہ مخزن العلوم دلدارنگر غازیپور

جناب مولانا عتیق الرحمٰن صاحب ڈبروگڈھ

جناب مولانا عمر دراز بیگ صاحب مالک اخبار جدت مراد آباد

جناب حاجی عبدالواجد صاحب مہتمم مدرسہ امدادیہ مراد آباد

جناب مولانا محمد حامد صاحب صدیقی حیدر آباد

جناب مولوی وصی الدین صاحب گورکھپور

جناب نواب عبدالرحمٰن خاں صاحب سکندر پاشا حیدر آباد

جناب ناظم صاحب مدرسہ بیت العلوم سرائے میر واساتذہ مدرسہ ہذا

جناب محمد محتشم صاحب لیبیا

جناب ناظم صاحب مدرسہ عربیہ رائے پور مدھیہ پردیش

جناب اسماعیل منصوری بمبئی

جناب مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی

جناب مولانا ظہور احمد صاحب مدرس مدرسہ کرنال

جناب مولانا انعام الحق دار العلوم مئو

جناب شاہ محمد سعید ابن حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحبؒ، بھوپال

جناب بابو محمد اسحاق صاحب لہریا سرائے دربھنگہ

جناب سی رشید احمد پریامیٹ مدراس

جناب قاضی عبدالملک صاحب رامپور

جناب ایچ، ایم حسین صاحب سکندرآباد، حیدرآباد

جناب حاجی محمد حنیف حاجی جمال صاحب احمد نگر

جناب حکیم محمد تقی صاحب احمد نگر۔

جناب مہتمم صاحب دارالعلوم حسینیہ ہندوپور وغیرہ وغیرہ۔

سیکڑوں ذمہ دارانِ مدارس، مکاتب، انجمن، واقف کار، ناواقف، متوسلین، معتقدین مسلم، غیر مسلم ہیں جن کے خطوط، تار اور پیغاماتِ تعزیت کی نقل بھی مشکل ہے اور تفصیلی پتے لکھنے بھی مشکل ہیں صرف منتخب نام ذکر کر دیئے گئے ہیں۔ احاطہ دارالعلوم میں اس حادثہ کا اس حد تک صدمہ اور غم محسوس کیا گیا کہ حضرات اساتذہ اور طلباء کا عام اجلاس اور تجویز تعزیت الگ منظور ہوئی، مجلس تعلیمی نے علیحدہ تجویز منظور کی، حضرات نظماء شعبہ جات اور کارکنانِ دفاتر کی طرف سے الگ تجویز منظور کی گئی، جامعہ طبیہ نے الگ تجویز منظور کی، النادی العربی نے مستقل طلبہ کا اجتماع کر کے الگ تجویز منظور کی، جنازہ میں اتنا بڑا مجمع حضرات اکابر دارالعلوم کے علاوہ نہیں دیکھا گیا، جنازہ کو کندھا دینا مشکل تھا، بہر حال مرحومہ کی مقبولیت عام تھی۔ (رحمها الله رحمة واسعة)

سلسلہ تالیفات وافاداتِ حکیم الاسلامؒ

مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی خدمات پر مشتمل

ایک اچھوتی اور نادر تحریر
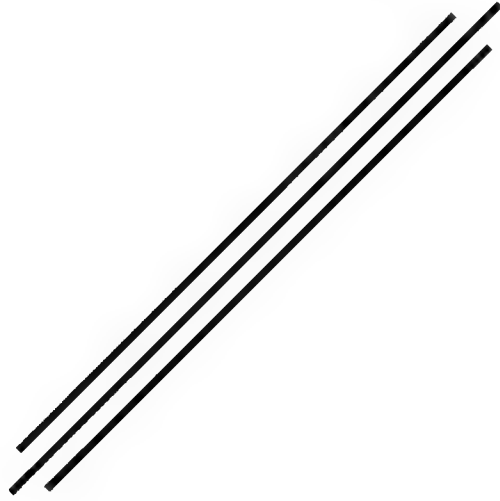
علمائے ہند کی شاندار

تاریخ کا ایک ورق

علمائے ہند

کی شاندار تاریخ کا ایک ورق

بانی دارالعلوم دیوبند اور بانی دارالعلوم حرم صولتیہ مکہ معظّمہ

ذیل کا مضمون حضرت مہتمم صاحب مدظلہٗ کے قلم سے رسالہ ندائے حرم کراچی بابت ماہ رجب ۱۳۷۰ھ میں شائع ہوا تھا، چونکہ اس مضمون سے دارالعلوم کی بناء اور اس علمی اور دینی درسگاہ کی تاریخ کا پس منظر بڑی حد تک واضح ہوتا ہے اس لئے ہم نے ضروری سمجھا کہ اپنے قارئین کو بھی اس مضمون کے مطالعہ کا موقعہ دیں۔ امید ہے کہ ناظرین کرام دلچسپی کے ساتھ اس مضمون کو پڑھیں گے۔ (مدیر ماہنامہ دارالعلوم)

یہ مضمون ہم نے ماہنامہ دارالعلوم دیوبند شمارہ شوال ۱۳۷۰ھ سے لیا ہے۔ محمد عمران قاسمی بگیانوی

ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کے زوال اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقبال کا دور مسلمانوں کے لئے جہاں سیاسی اور دولتی حیثیت سے انتہائی ابتلاء اور آزمائش کا تھا، وہیں مذہبی اور علمی حیثیت سے بھی کچھ کم صبر آزما نہیں تھا۔ یہ انقلاب محض حکومت کا انقلاب نہ تھا بلکہ حقیقتاً تہذیب وکلچر، مذہب وملت اور دین ومعاشرہ کے انقلاب کے جراثیم بھی اپنے دامن میں لے کر آیا تھا۔ ہندوستان کے علمی اداروں کا چراغ گل ہو رہا تھا اور مسلمانوں پر جہل ونادانی کی بلا مسلط ہوتی چلی جا رہی تھی۔ نئی طاقت اسلام کی حامی نہ تھی بلکہ مسیحیت کو اپنے دامنوں میں لے کر آئی تھی، پادریوں کے فلک شگاف نعرے اور مناظروں کی مبارزت طلبی کے آوازے فضاءِ ہند میں گونجنے شروع ہو گئے تھے اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی جہالت سے فائدہ اٹھا کر مسیحیت کے چراغ میں برابر تیل ڈالا جا رہا تھا۔

غرض مسلمانوں کا دین ودنیا، مذہب واقتدار بلکہ حیثیتِ عرفی تک معرضِ زوال میں آچکی تھی، اور ضرورت تھی کہ ماضی کے تصورات کو چھوڑ کر مستقبل کی فکر کی جائے، اس لئے جہاں ہندوستان کے

ریاست پسند طبقے نے مسلمانوں کے رسمی اقتدار کو سنبھالنے کی فکر کی وہیں علمائے اسلام نے اس بڑھتی ہوئی جہالت اور اس کے زیر سایہ بڑھتی ہوئی مسیحیت اور لادینیت کی روک تھام کی، بلاءِ جہل سے بچانے کے لئے قومی مدارس کا سلسلہ شروع کیا اور مسیحیت کا طلسم توڑنے کے لئے عیسائیوں کی تحدی اور چیلنجوں کو قبول کر کے باطل شکن مناظروں کا دروازہ کھولا گیا۔ قلمی ،لسانی اور قلبی جہاد سے ان بڑھتے ہوئے فتنوں کی روک تھام کی گئی تا کہ بے خبر مسلمانوں کو کذب و باطل کے جال میں پھنسنے سے بچایا جائے اور اس طرح اسلامی ملت اور شریعت دشمنانِ حق کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہے۔

اس سلسلہ میں ہمیں دو عظیم المرتبت شخصیتیں افقِ ہند پر آفتاب و ماہتاب کی طرح درخشاں نظر آتی ہیں جنہوں نے اپنے متماثل اور باہمدگر متشابہ کارناموں اور ایک دوسرے کے اشبہ طرزِ عمل سے مسلمانانِ ہند کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو سہارا دیا اور پار لگایا۔

ایک حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانیٔ دارالعلوم دیوبند اور دوسرے حضرت مجاہد جلیل مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی بانیٔ دارالعلوم حرم صولتیہ مکہ معظمہ (قدس اللہ اسرارہما)۔

ان دونوں بزرگ ہستیوں نے ایک ہی لائن پر کام کیا، ایک ہی نصب العین پیش کیا، ایک ہی قسم کے اصول پر گامزن ہوئے اور ایک ہی اندازِ فطرت سے مسلمانانِ ہندوستان کی رہنمائی کی۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (احقر کے جد امجد) ضلع سہارنپور کے ایک قصبہ نانوتہ میں ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے، آپ کا سلسلۂ نسب تقریباً چوالیس واسطوں سے حضرت قاسم ابن محمد ابن ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے، آپ کے مورثِ اعلیٰ بلخ سے ہندوستان وارد ہوئے اور اپنی قابلیت سے شاہ جہانی دربار میں باریاب ہو کر عہدہ و مناصب حاصل کئے اور قصبہ نانوتہ کی جاگیر دربارِ شاہی کی طرف سے مرحمت ہوئی۔

حضرت قاسم العلوم نے دہلی کے مشہور شاہی مدرسہ (حال موسوم بہ عربک کالج) میں تعلیم پائی، فن حدیث محدثِ ہند حضرت شاہ عبدالغنی قدس سرہٗ سے حاصل کیا اور ولی اللّٰہی خاندان کے روحانی چشم و چراغ بنے اور آپ کے بزرگوں نے آپ کو شاہ اسماعیل شہید ثانی کا لقب دیا۔ فنون کی مہارت

اپنے عم بزرگوار مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی قدس سرہ' سے پیدا کی جو دہلی کے شاہی مدرسہ میں استاذ تھے اور تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کی دولت آفتابِ طریقت حضرت شیخ العرب والعجم مولانا حاجی امداد اللہ صاحب فاروقی تھانوی قدس سرہ' سے حاصل کی اور آخر کار علم لدنی میں لسان الغیب ثابت ہوئے۔ غیبی حقائق سے دین کے تمام گوشے واشگاف کئے، اصولِ اسلام کو مبرہن کیا اور اپنے مخصوص طرزِ استدلال سے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی جو حکمتِ ولی اللّٰہی کا نقشِ ثانی ہے۔

ہندوستان میں عیسائیوں، آریوں اور دوسرے مذاہبِ باطلہ کے جتھوں میں مناظروں، تقریروں اور تصانیف کے ذریعہ حق کی منادی کی اور بالآخر اپنے علم وعمل کو متعدی اور دوامی بنانے کے لئے آپ نے اپنی ایک جامع ترین یادگار جو آج اطراف واکنافِ عالم کے لئے ایک چشمۂ آبِ حیواں ہے یعنی ''دارالعلوم دیوبند'' قائم کر کے اپنے علمی وعملی اور اخلاقی کارناموں کو زندۂ جاوید فرمادیا۔

ٹھیک اسی طرح حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی ضلع مظفر نگر کے ایک قصبہ کیرانہ میں پیدا ہوئے، آپ کا سلسلۂ نسب حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہوا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے۔ مولانا مرحوم کے مورثِ اعلیٰ شیخ عبدالرحمٰن گازرونی غازی تھے جو سلطان محمدؒ کے فاتح لشکر کے ساتھ ہندوستان آئے، اسی سلسلۂ نسب کی سنہری کڑی نواب مقرب الخاقان (عرف نواب مقرب خاں) ہیں جو جہانگیر کے زمانے میں امیر البحر تھے۔ نواب صاحب کی دعوت پر خود جہانگیر کیرانہ آیا، نواب صاحب کی بہترین یادگار کیرانہ کا ایک عظیم الشان پختہ تالاب ہے۔ کیرانہ میں نواب صاحب کا دربار تھا اور اس کا محلِ وقوع محلّہ دربار ہی کے نام سے موسوم ہو گیا۔

مولانا مرحوم نواب صاحب کے خیر الخلف خاندان سے تھے اور ان کی پیدائش اسی محلّہ دربار میں ہوئی، آپ کی اعلیٰ تعلیم دہلی کے شاہی مدرسہ مذکورہ میں ہوئی۔ آپ کا شمار ہندوستان کے ان معدودے چند علماء میں ہے جنہوں نے دین وملت کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین ٹھہرالیا تھا۔ مذاہبِ باطلہ کے رد میں تقریروں، تحریروں اور مناظروں سے محیر العقول کارنامے انجام دیئے اور اپنی

دینی وملی خدمات کو دوامی بنانے کیلئے آپ نے مرکزِ اسلام، بلدِ امین ''مکہ مکرمہ'' میں ایک دارالعلوم بنام ''مدرسہ صولتیہ'' محرم ۱۲۹۲ھ میں قائم فرمایا۔ جس کا مقصد باشندگانِ حرم اور بالخصوص ہندی مسلمان مہاجرین کی تعلیم وتربیت تھا جو بطور ان کی یادگار کے آج تک قائم اور روبہ ترقی ہے۔

بہرحال ان دونوں بزرگوں کی مجموعی زندگی اور اس کی تاریخ یکسانی لئے ہوئے ہے جس نے ہندوستان کی ظلمتوں میں روشنی پھیلائی اور کتنے ہی تاریک دلوں کو ایمانی شعاعوں سے منور کیا۔

اس دور میں سب سے اہم ترین مقصد اسلام کی حفاظت اور دین وملت کا تحفظ تھا، کیونکہ ۱۸۵۷ء میں ملت کی شوکت ختم ہو چکی تھی، ساکھ اٹھ چکی تھی، وسائلِ حیات پر اغیار کا قبضہ ہو چکا تھا اور مذہب وملت دونوں ہی بے سہارا رہ گئے تھے، ایسے وقت میں تحفظِ دین ہی سب سے بڑا جہاد تھا اور اس کے ذریعہ مسلمانوں کو سنبھال لے جانا ہی سب سے بڑی سیاست تھی۔

اس تحفظِ دین کی لائنوں پر ان ہر دو بزرگواروں کی چال البتہ یکسانی لئے ہوئے اور باہم متماثل اور متشابہ تھی، مثلاً ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ رُست وخیز میں حضرت قاسم العلومؒ اپنی محبتِ دینی، غیرتِ ملی اور تحفظِ اسلام کی خاطر اولاً تلوار بدست اور سربکف ''شاملی'' کے میدانِ جہاد میں اترے، جہاد کیا جوہرِ شجاعت دکھائے، شاملی کی تحصیل فتح کر لی، مگر یہ ہنگامہ مسلمانوں کی شکست اور انگریزوں کی فتح پر منتج ہوا۔

انگریزی تسلط پر حضرت قاسم العلوم کا وارنٹ جاری ہوا، اس دور میں مکان، مسجدوں اور دیہات میں جہاں جہاں بھی حضرت کا دورہ ہوتا رہا وہیں پولیس محاصرے کرتی پھرتی رہی اور تلاشیاں لیتی رہی مگر اس انتہائی دوڑ دھوپ کے باوجود بھی حضرت نہ اس کے ہاتھ آئے نہ گرفتار کئے جا سکے۔ ایک بار مسجد چھتہ دیوبند میں تھے، مخبر نے خبر دی، مسجد کا محاصرہ پولیس نے کر لیا، خود سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مسجد میں آ کر حضرت سے ہی سے پوچھا کہ مولانا محمد قاسم کہاں ہیں؟ حضرت نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر فرمایا کہ ابھی یہیں تھے دیکھ لیجئے، دیہات میں بھی یہ صورتیں پیش آتی رہیں کہ کپتان پولیس مخبری کے بعد تحقیق کے لئے آتا تو خود حضرت ہی ان کے سامنے اطمینان سے آتے گفتگو فرماتے، غلط گوئی بھی نہ کرتے اور اپنا پتہ بھی نہ دیتے۔ یہاں تک کہ امن عام کا اعلان ہو گیا،

انگریزوں کا اقتدار جم جانے کے بعد جب حضرت والا کو مسیحیت کی بڑھتی ہوئی رو سے اندیشہ ہوا کہ وہ کہیں مسلمانوں کو بہا نہ لے جائے جبکہ مادی اقتدار بھی اس کی پشت پر ہے اور شوکت کی نظر فریبیاں بھی اس کے ساتھ ہیں، نیز پادری علی الاعلان اسلام کے خلاف زہر اگلنے لگے ہیں، جس سے ناواقف مسلمانوں کے بہک جانے کا خطرہ ہے، تو آپ نے خصوصیت سے ادھر توجہ فرمائی۔ عیسائیوں کے اعتراضات کے سلسلے میں تقریرات کا سلسلہ شروع فرمایا اور ان کے وسوسوں کو اپنے مضبوط طرزِ استدلال سے پادر ہوا ثابت کیا۔ بحثیں کیں بلکہ ملک کے تمام مذاہب کے جتھوں ہندو، سناتن، آریہ وغیرہ کے بھرے مجمع میں اسلام کی منادی کی، اعلانِ حق کیا اور دنیا پر اتمامِ حجت کر کے اسلام کی حقانیت عیاں کر دی۔ مباحثہ شاہجہاں پور آپ کا مشہور عالم کارنامہ اور علمی شاہکار ہے، جس میں ذمہ دارانِ مذاہب کے روبرو ان پر اتمامِ حجت فرماتے ہوئے انہیں پیغامِ الٰہی واضح طریق پر پہنچا دیا۔

پنڈت دیانند سرسوتی بانیٔ مذہب آریہ، پنڈت اندرمل وکیل سناتن دھرم، پادری اسکاٹ اور پادری نولس وکلاء مذہب عیسوی وغیرہ کو اپنے باطل شکن بیانات سے اعترافِ شکست پر مجبور کر دیا اور انہیں چار و ناچار حقانیتِ اسلام کا اعتراف کرتے ہوئے یہاں تک بھی اقرار کرنا پڑا کہ اگر دنیا میں کسی شخص کی تقریر پر ایمان لا جا سکتا ہے تو وہ مولانا محمد قاسم صاحب ہیں، حتیٰ کہ پنڈت دیانند سرسوتی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ''مولبی کاسم'' (مولوی قاسم) ایک بڑا وِدوان ہی نہیں بلکہ اس کے پیٹ میں خدا بولتا ہے۔

ٹھیک اسی نہج پر حضرت اقدس مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی علیہ الرحمۃ نے جب محسوس کیا کہ پاپایانِ مسیحیت اسلام کے خلاف اپنی دریدہ دہنی میں حدود سے متجاوز ہونے لگے ہیں، بہادر شاہ کے آخری دور اور مسلمانوں کی اجتماعی مغلوبیت اور پستی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مسیحیوں کا مایۂ ناز پاپا یعنی فنڈر جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر روزانہ عصر مغرب کے درمیان ناواقف عوام کے سامنے دین مسیحی کے فضائل بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کی مزعومہ کمزوریوں کو بڑے دھڑلے کے ساتھ بیان کرتا ہے تو آپ نے جرأتِ ایمانی کے ساتھ پہلے تو پادری فنڈر کے علمی موقف کا اندازہ کرنے

کے لئے اس سے تحریری مراسلت فرمائی اور بالآخر ماہ رجب ۱۲۷۰ھ (جس کو آج پوری ایک صدی ہو چکی ہے) اکبر آباد (آگرہ) میں وہ مشہور عالم مناظرہ کیا جو مولانا کے ردِ عیسائیت کا ایک شاہکار نمونہ تھا، حتیٰ کہ دین اسلام کی متیقن حقانیت کے سلسلے میں اپنی خداداد علمی قوت اور پادری کے مبطلانہ ضعف پر یقین واطمینان رکھتے ہوئے اس کی یہ شرط بھی مان لی کہ اگر مولانا مرحوم پادری فنڈر کے اعتراضات کا جواب نہ دے سکے تو وہ مذہبِ عیسوی قبول کر لیں گے اور اگر پادری فنڈر جواب سے عاجز رہ گیا تو وہ مسلمان ہو جائے گا۔

جلسہ کے مقرر شدہ حکم اونچے طبقہ کے انگریزی حکام، بااثر مقامی افراد اور ذی علم ہندو مسلمان اشخاص کی ایک جماعت تھی، رسالتِ نبوی کا اثبات، قرآنِ حکیم کا منزل من اللہ ہونا اور بلا کسی تحریف وتبدیل کے باقی رہنا، ابطالِ تثلیث اور تحریفِ انجیل وغیرہ مسائل موضوعِ بحث ٹھہرے۔ مولانا مرحوم نے دنیا کے تمام پادریوں کو چیلنج کرتے ہوئے پادری فنڈر کو للکارا اور تین دن کے مسلسل مناظرہ سے ہزار ہا اہل نظر انسانوں کے مجمع میں مسیحیوں کو اتنی کھلی شکست دی کہ مسیحیوں کے اس بڑے باپ کو منہ چھپا کر فرار کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا، بھرا مجمع موجود، حکم موجود، سامعین منتظر مگر پادری فنڈر غائب تھا۔ مولانا نے مستند دستاویزی ثبوت سے عیاں کر دیا کہ یہ انجیل نہ اصل انجیل ہے اور نہ اصل کے مطابق نقل ہی ہے۔ اس میں پادریوں کی خیانتیں اور وقتی ضرورتوں نیز ملکی وتمدنی تقاضوں سے انجیل میں ترمیمات اور کمی بیشی کے سارے پول اس انداز سے کھول کر رکھ دیئے کہ پادریوں کو منہ دکھانے کی جگہ نہ رہی اور پادری فنڈر کو "تا بہ دروازہ باید رسانید" کی مثل کے مطابق دروازے تک ہی نہیں بلکہ اس کے گھر تک لے جا کر چھوڑا، وہ روپوش ہو کر فرار ہوا تو سیدھا لندن جا کر ٹھہرا۔

آگرہ میں اس مناظرہ کے بعد ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ رست خیز برپا ہو گیا۔ مولانا مرحوم انگریزوں کے سخت مخالف تھے اور شاملی میدان میں مجاہدین کی جماعت میں صف آرا تھے، ان کے محلّہ دربار میں ہندو مسلمان پناہ لیتے تھے اور امن کے ساتھ انہیں چھپا کر رکھا جاتا تھا، کیونکہ ہندو مسلم اتفاق اخلاص کی سطح پر قائم تھا۔

انگریزوں کا تسلط ہو جانے کے بعد مولانا کا وارنٹ جاری ہو گیا مگر پولیس تلاش کے باجود

ناکام رہی، افسوس ہے کہ مسلمانوں میں ہی سے بعض خود غرض اور کوتاہ اندیش افراد نے مولانا کے بارے میں مخبری کی کہ وہ دربار کی مسجد میں نماز پڑھنے آئے ہیں، پولیس پہنچی محاصرہ کیا لیکن مولانا مرحوم کو موقعہ مل گیا اور وہ مسجد کے ایک حجرے سے نکل کر جس کا دروازہ کے محلّہ کے ایک مکان میں تھا اور اُدھر اس سے جنگل ملا ہوا تھا پنجیٹھ ایک گاؤں میں چلے گئے جو کیرانہ سے ایک کوس کے فاصلہ پر واقع ہے اور جس میں کیرانہ کے عثمانی اور انصاری شیوخ کی زمینداری ہے۔

مولانا اپنے ایک رشتہ دار کے یہاں مقیم تھے کہ اسی خائن مخبر نے (جو اپنوں ہی میں سے تھا) اس کی بھی مخبری کر دی، پولیس نے گاؤں پہنچ کر اس کاشتکار کے مکان کا محاصرہ کر لیا اور تلاشی لی اور وہ کاشتکار گاؤں کا مکھیا بھی تھا، اس کو جب فوج کی آمد کا علم ہوا تو اس نے حضرت مولانا مرحوم سے فرمایا کہ کھرپا لے کر کھیت میں گھاس کاٹنے چلے جائیں، گورہ فوج اسی کھیت پگڈنڈی سے گذری، حضرت مولانا مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ میں گھاس کاٹ رہا تھا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو کنکریاں اڑتی تھیں وہ میرے جسم پر لگ رہی تھیں اور میں ان کو اپنے پاس سے گذرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

آخر مولانا مرحوم بچتے بچاتے سورت کی بندرگاہ تک پہنچ گئے اور ایک بادبانی جہاز میں کسی نہ کسی طرح سوار ہو گئے، مگر ایک پولیس انسپکٹر نے مولانا کو پہچان لیا اور فوٹو سے چہرہ کی مطابقت کر کے فوٹو اور وارنٹ دکھلایا اور کہا کہ مجھے آپ کی گرفتاری کا حکم ہے مگر میں مسلمان ہوں، یہ لفظ اس کی زبان سے نکلا ہی تھا کہ جہاز نے لنگر اٹھا دیا اور جدہ کی طرف روانہ ہو گیا، مولانا کی زبان پر اس وقت یہ شعر تھا۔

نظر بچا کے بتوں کی چلا ہوں کعبہ کو
خدا کے ہاتھ ہے اب شرم و آبرو میری

پادری فنڈر ہندوستان سے فرار ہونے کے بعد لندن پہنچا مگر اس الزام میں کہ اس نے دین عیسوی کی اشاعت میں سیاسی قوت سے کام لیا ہے اپنے عہدہ سے معزول کر دیا گیا۔ وہ یہاں سے معزول ہونے کے بعد قسطنطنیہ پہنچا، سلطان عبدالعزیز کا عہد تھا، ٹرکی اور انگلستان کے تعلقات خوشگوار تھے، پادری فنڈر نے بارگاہ سلطانی میں باریاب ہو کر عرض کیا کہ ہندوستان میں میرا ایک مسلمان عالم سے مذہبی مناظرہ ہوا جس میں عیسائیت کو فتح اور اسلام کو شکست ہوئی مگر چونکہ

انگریزوں کا حال ہی میں ہندوستان پر قبضہ ہوا ہے اور انہیں اپنی سیاسی مصالح کے تحت مسلمانوں کی تالیف منظور تھی اس لئے مجھ پر عتاب ہوا اور میں اپنے عہدہ سے معزول کر دیا گیا۔ سلطان کی عنایت اگر میرے شامل حال ہو جائے اور وہ انگریزوں سے میری سفارش فرما دیں تو لندن کے چرچ میں پھر مجھے میرا مذہبی عہدہ مل سکتا ہے۔

سلطان عبدالعزیز کو چونکہ مذہبی معاملات سے دلچسپی تھی اس لئے ان کی خواہش ہوئی کہ پادری کے اس بیان کی تحقیق کی جائے، چنانچہ شریف مکہ کے نام فرمان جاری فرمایا کہ امسال موسم حج میں جو ہندوستانی علماء اور باخبر حجاج مل سکیں ان سے اس مناظرہ کی کیفیت معلوم کر کے اطلاع دی جائے۔ شریف مکہ امیر عبداللہ مرحوم کو اس مناظرہ کی پوری کیفیت معلوم ہو چکی تھی اور اس لئے وہ مولانا مرحوم پر بہت عنایت مبذول کرتے تھے۔

اس فرمان کے صادر ہوتے ہی شریف مکہ نے فوراً بارگاہِ خلافت میں مناظرہ کی مختصر کیفیت کے ساتھ یہ بھی اطلاع دی کہ وہ عالم جن سے ہندوستان میں پادری فنڈر کا مناظرہ ہوا ہے مکہ معظمہ میں موجود ہیں۔ اس طرح سلطان نے مناظرہ کی مفصل کیفیت بیان کرنے اور ہندوستان میں جدید حکومت اور انقلاب کے چشم دید واقعات کا براہِ راست علم حاصل کرنے کے غرض سے مولانا مرحوم کو قسطنطنیہ طلب کر لیا۔ مولانا مرحوم خاص اعزاز کے ساتھ سرکاری طور پر قسطنطنیہ تشریف لے گئے اور شاہی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرائے گئے۔

سلطان معظم شاہانہ عنایات کے ساتھ عموماً نماز عشاء کے بعد مولانا کو شرفِ باریابی بخشتے رہے اور ان کے علمی کمالات اور بیانِ واقعات سے مستفید ہوتے رہے۔ اس خاص وقت میں اکثر خیر الدین پاشا صدر اعظم ٹرکی اور شیخ الاسلام وغیرہ اکابر ملک شریک صحبت رہتے تھے۔ فنڈر کو جب مولانا کی آمد کی اطلاع ہوئی تو قسطنطنیہ سے قبل از شکست ہی فرار ہو گیا اور خموشی سے راتوں رات ایسا غائب ہوا کہ شاید پھر عمر بھر بھی اس نے یورپ کی کسی کھڑکی سے مسلم یورپ اور اسلامی ایشیاء کی طرف جھانکنے کی جرأت نہیں کی، ظاہر ہے کہ رحمت اللہ کے بعد عدو اللہ کی پیش ہی کیا چل سکتی تھی۔

جوں ہی موسیٰ آیا اور عصا ڈالا تو فرعون کا پتہ نہ رہا اور اسے ڈوبتے ہی بن پڑی۔

سلطان نے مولانا کی زبانِ فیض ترجمان سے مناظرہ کے حالات نہایت دلچسپی سے سنے اور نتیجہ سے بہت خوش ہوئے اور مولانا کو واپسی کے وقت خلعتِ فاخرہ کے ساتھ ''پایۂ حرمین شریفین'' کے بلند پایہ خطاب، تمغہ مجیدی درجہ دوم اور گرانقدر مالی وظیفہ سے سرفراز فرمایا۔

بہر حال وہاں حضرت قاسم العلوم نے پادری نولس اور اسکاٹ کو شکست فاش دے کر فرار پر مجبور کر دیا اور حسبِ بیانِ ثقات پادری میدان مباحثہ سے کرسیاں چھوڑ چھوڑ کر بھاگے اور زبان سے اعترافِ شکست کرتے ہوئے فرار ہوئے، اور یہاں مولانا رحمت اللہ صاحب نے پادری فنڈر کو شکستِ فاش دے کر بیک بینی ودو گوش فرار پر مجبور کر دیا جو ہندوستان تک چھوڑ کر بھاگا اور گھر سے ورے اسے پناہ نہ ملی۔

فرق اتنا ہے کہ وہاں جہاد پہلے ہوا اور مناظرہ بعد میں اور یہاں مناظرہ پہلے ہوا اور جہاد بعد میں، جہاد میں دونوں حضرات مجتمع رہے اور مناظروں میں فصل رہا۔ پھر بعد جہاد وتسلط انگریز وہاں بھی وارنٹوں کے باوجود گورنمنٹ ان کی گرفتاری پر قدرت نہ پاسکی اور یہاں بھی وارنٹ کے ہوتے ہوئے حکومت کی بے بسی نمایاں رہی۔ اور یہ ان دونوں بزرگوں کے حال پر اللہ کا فضل تھا جن سے اسے آئندہ کام لینا تھا۔

اس لسانی اور سنانی جہاد کے بعد قلمی جہاد کی نوبت آئی تو اِدھر حضرت قاسم العلومؒ نے ردِ عیسائیت پر جامع ترین بیانات اپنے رسائل ومکاتیب میں زیبِ قلم فرما کر آنے والوں کے لئے اپنے مخصوص علم کا نادرِ روزگار ذخیرہ بطور ترکہ میراث چھوڑا، اور اپنی معرکۃ الآرا تحریرات حجۃ الاسلام، تقریر دلپذیر، گفتگوئے مذہبی، مباحثہ شاہجہانپور اور اسرار الطہارۃ وغیرہ میں ردِ عیسائیت اور ردِ مذاہب باطلہ کے وہ وہ محکم ومضبوط اور عقلی اصول تحریر فرمائے کہ ان کی موجودگی میں عیسائیت وغیرہ کے لئے حجت کے ساتھ پنپنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ نیز اسلامی اصول وکلیات کا ایسے فلسفیانہ اور عارفانہ انداز اور ایسے سائنٹفک طریقوں سے اثبات فرمایا کہ ایک کٹر سے کٹر ملحد اور دہریہ کو بھی ماننے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے۔

اور اُدھر اسی طرح حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے دورانِ قیام قسطنطنیہ میں سلطان ٹرکی

کے ارشاد وایماء اور صدرِ اعظم کی خواہش پر مناظرہ کے واقعات اور پادریوں کے تمام ان اعتراضات کے متعلق جو وہ اسلام پر کرتے ہیں ایک نہایت ہی مبسوط کتاب بنام ''اظہار الحق'' عربی میں مرتب کر کے سلطان کی خدمت میں پیش کی جس میں تاریخی اور دستاویزی ثبوت سے انجیل کی تحریفات کا پردہ چاک کیا، عقلی اور نقلی دلائل سے موجودہ عیسائیت کی دھجیاں بکھیر دیں اور اسلامی دنیا کو صدی بھر کے لئے عیسائی دسیسہ کاریوں سے مطمئن فرما دیا۔ یہ کتاب ۱۲۸۰ھ میں قسطنطنیہ میں چھپی۔

پھر صدر اعظم کے حکم سے بعض ترکی علماء نے اس کا ترجمہ ترکی زبان میں کیا جو ''ابراز الحق'' کے نام سے وہاں شائع ہوا۔ نیز حکومت عثمانیہ ہی کی طرف سے یورپ کی متعدد زبانوں میں اس کتاب کے ترجمے شائع کئے گئے جن کو پادریوں نے خاص اہتمام سے تلف کرنے کی سعی کی مگر اطفاءِ نورِ حق کے ارادے ناکام رہے اور اِتمامِ نورِ حق ہو کر رہا (ولو کرہ الکافرون) متعدد منصف مزاج عیسائیوں اور انگریزوں نے اس سے متاثر ہو کر دامن اسلام میں پناہ لی اور یہ کتاب کفار کے علی الرغم زبانوں کے مختلف پیرایوں اور لباسوں میں جلوہ گر ہوتی رہی اور ایشیاء اور یورپ کے بڑے بڑے ممالک نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

ٹرکی اور یورپ سے یہ کتاب مصر میں پہنچی اور وہاں متعدد بار طبع اور شائع ہوئی، ہندوستان میں مولوی غلام محمد بھانجاراندیری نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے گجراتی زبان میں اس کا ترجمہ کیا جو صوبہ گجرات میں شائع ہوا اور وہاں کی ہدایت کا باعث ہوا۔

آج سے اکہتر (۷۱) سال قبل جب ''اظہار الحق'' کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو ٹائمنز آف لندن نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''لوگ اگر اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے تو دنیا میں مذہبِ عیسوی کی ترقی کے لئے میدان باقی نہیں رہے گا۔''

نواب اسماعیل خاں صاحب مرحوم رئیس دتاؤلی ضلع علی گڈھ نے ٹائمنز آف لندن کا یہ تبصرہ مکہ معظّمہ میں مولانا مرحوم کی خدمت میں خاص اہتمام سے پیش فرمایا تھا۔

اس کے علاوہ مولانا نے نو کتابیں اور تصنیف فرمائیں ۱۲۶۹ھ میں ''ازالۃ الاوہام'' (فارسی)

جو نصاریٰ کے رد میں ہے جس کا ایک نسخہ ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانہ میں موجود ہے، اسی سن میں دوسری کتاب ''ازالۃ الشکوک'' اردو دو جلدوں میں تحریر فرمائی جس کی پہلی جلد مولانا مرحوم کے شاگرد رشید مولانا عبدالوہاب صاحب بانی مدرسہ باقیات الصالحات مدراس نے طبع کرائی اور دوسری جلد جناب مہتمم صاحب مدرسہ موصوف نے چھپوائی۔ تیسری کتاب ''اعجازِ عیسوی'' تصنیف فرمائی جس میں بائبل کا مکمل طور پر محرف ہونا ثابت فرمایا ہے، یہ کتاب پہلی بار آگرہ میں اور دوسری بار مطبع رضوی دہلی میں طبع ہوئی ہے۔ چوتھی کتاب ''اصح الاحادیث فی ابطال التثلیث'' ہے جس میں دلائلِ عقلیہ ونقلیہ سے تثلیث کو باطل محض کر کے چھوڑا ہے۔

مطبع رضوی دہلی میں صرف ایک بار طبع ہوئی ہے۔ پانچویں کتاب ''بروقِ لامعہ'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے اثبات میں ہے جو ہنوز طبع نہیں ہوئی، چھٹی کتاب ''**البحث الشریف فی اثبات التنسیخ والتحریف**'' ۱۲۷۰ھ میں لکھی گئی جس میں تحریفِ انجیل پر محققانہ بحث کی گئی ہے اور فخر المطابع دہلی میں طبع ہوئی ہے۔ ساتویں کتاب ''معدل اعوجان المیز ان'' ہے جو پادری فنڈر کی تالیف میزان الحق کا محققانہ جواب ہے، چھپنے کی نوبت ہی نہیں آئی، آٹھویں کتاب ''تقلیب المطاعن'' ہے جو پادری لاسمندر کی کتاب ''تحقیق دین حق'' کا محققانہ رد ہے، چھپنے کی نوبت ہی نہیں آئی، نویں کتاب ''معیار التحقیق'' ہے جو پادری صفدر علی کی تالیف ''تحقیق الایمان'' کا دنداں شکن جواب ہے، چھپنے کی نوبت ہی نہیں آئی، اور دسویں کتاب یہ ''اظہار الحق'' مذکور ہے جو ردِ نصاریٰ میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ **تلك عشرة كاملة.**

بہرحال ان دونوں اکابر قاسم ورحمت کے اس کارنامہ (تحفظِ دین حق وردِ مذاہبِ باطلہ) میں بھی کلیتًا یکسانی پائی جاتی ہے، ایک قاسمِ علم ومعرفت ہیں جن کے علوم وکمالات نے مشرق ومغرب کو رنگ دیا اور صبغۃ اللہ سے مشرق ومغرب تک کے لوگ منصبغ ہو گئے، جس سے ''**انما انا قاسم واللہ یعطی**'' کا ظہور ہوا اور دوسرے رحمتِ باری ہیں جو اہل عرب اور اہل عجم پر بارش بن کر برسے اور دلوں کی جلی ہوئی کھیتیوں کو سیراب کر دیا جس سے ''**فانظر الی اثار رحمۃ اللہ کیف یحی الارض بعد موتھا**'' کا ظہور ہوا۔ گویا دونوں ہی آسمانی برکات کے نزول وظہور کی آیت اور نشانی

ثابت ہوئے۔

اس ردِ مذاہبِ باطلہ اور عیسائیت کی مغربی آندھیوں سے قلعۂ اسلام کو محفوظ کر دینے کے بعد ان دونوں بزرگواروں کے دلوں میں منجانب اللہ پھر یہ داعیہ ابھرا کہ مثبت پہلو میں مسلمانوں کے اصل ایمان کو محفوظ رکھ کر اس کی ترقی کے لئے اور ساتھ ہی اس نورِ ایمانی کے متعدی اور دوررس بنانے کے لئے ایسے تعلیمی مرکز قائم کئے جائیں جن کا موضوع اسلامی مقاصد کی تکمیل، مسلمانانِ ایشیاء اور خصوصاً مسلمانانِ ہند کی علمی وعملی تربیت اور ان کا اخلاقی نشو ونما ہو، اور ان میں ایسے سرفروش مجاہد افراد پیدا کئے جائیں جو علم وزبان اور لسان وجنان سے اسلام کے سچے خادم اور اس کے جانباز سپاہی ثابت ہوں، تاکہ وہ قلبی دولت جوان بزرگواروں کے قلوب کو منجانب اللہ عطا ہوئی ہے ان کے ان سچے جانشینوں اور وارثوں تک منتقل ہو سکے اور اس کا سلسلہ رہتی دنیا تک قائم رہے۔

چنانچہ اس جذبہ کے ماتحت حضرت قاسم العلوم نے تو دیوبند (ضلع سہارنپور، یوپی) میں ۱۲۸۳ھ میں ایک دارالعلوم کی بنیاد ڈالی جس میں دیوبند کے محلّہ دیوان کے چند باخیر متمول شیوخ نے اپنی زمینیں مدرسہ کے لئے عطا کیں، پھر مقامی اور بیرونی اہل خیر کے عطایا شامل ہوئے اور رفتہ رفتہ مدرسہ کے لئے عمارات کا سلسلہ شروع ہوا، اور اس طرح اس دارالعلوم کی بنیاد پڑی جو بعد میں دنیائے اسلام کا مذہبی مرکز اور طالبانِ علمِ نبوت کا مرجع بنا، جس سے علم واخلاق کی نہریں اطرافِ عالم میں بہہ نکلیں اور آج تقریباً ڈیڑھ ہزار طلبا، دوسو اہلکارانِ دفاتر اور چالیس اساتذہ پر مشتمل ایک جامعہ کی حیثیت میں قائم ہے اور بیس شعبوں پر اپنے نظم کو منقسم کئے ہوئے ہے۔ ہندو بیرونِ ہند افغانستان، پاکستان، ترکستان، انڈونیشیا، ایران، حجاز وغیرہ کے طلبۂ دین کو اپنی نورانی شعاعوں سے منور کر رہا ہے اور جس میں علمی ودینی تکمیل کے علاوہ معاشی ضروریات کی تکمیل کا مقصد بھی صنعت وحرفت کے ایک مستقل محکمہ کی صورت سے پورا کیا جا رہا ہے۔

ٹھیک اسی جذبہ کے ماتحت جبکہ ہندوستان کے تاریخی انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد تنصر ونصرانیت کے آثار سے بچنے اور بچانے کے لئے ہندوستان کی ایک مقدس جماعت نے حجاز کی طرف رخ کیا تو انہی میں مولانا رحمت اللہ صاحبؒ بھی مہاجر کی حیثیت سے مکہ معظّمہ حاضر ہوئے اور مرکز اسلام مکہ

معظّمہ میں ایک دینی دار العلوم کی بنیاد ڈالی۔

دار العلوم کے لئے سب سے پہلا مسئلہ زمین کا تھا، سوارضِ مقدس میں زمین مل جانے کا مسئلہ عجب انداز سے خداساز طریقہ پر حل ہوا۔ حرم شریف میں تعمیری مرمت کی ضرورت پیش آئی، اس میں کام کرنے کے لئے تقریباً ۱۶ مقدس علماء منتخب کئے گئے، جن میں مولانا رحمت اللہ صاحبؒ بھی شامل تھے۔ مولانا کی یہ خصوصیت رہی کہ آپ اس مدتِ مرمت میں صائم بھی رہے اور محرم بھی، اور بحالتِ احرام وصیام اس مقدس مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا۔ ختم تعمیر پر سلطان کی طرف سے ان تمام علماء کو خلعت عطا کئے گئے مگر مولانا نے مدرسہ صولتیہ کے پاک منصوبہ کے پیش نظر بجائے خلعت کے مدرسہ کے لئے زمین طلب کی اور ذاتی منافع پر اس دینی منفعتِ عام کو ترجیح دی۔

حکومت نے بھی برضا ان کی اس پاک خواہش کا احترام کرتے ہوئے مدرسہ کے لئے مطلوبہ زمین عطا کر دی اور اس طرح مولانا کے حسنِ نیت، عزمِ صادق اور ایثار کے طفیل منجانب اللہ زمین مدرسہ کا مسئلہ حل ہوگیا۔ اس کے بعد مصارفِ تعمیر کا اہم سوال تھا تو وہ بھی مولانا ہی کے پاک جذبہ سے حل ہوا جس کی صورت یہ ہوئی کہ مولانا کی حسنِ نیت اور اخلاص کی برکت سے ۱۲۹۱ھ میں کلکتہ کی ایک متمول بیوہ صولت النساء بیگم اپنے داماد اور بھائی کی معیت میں بارادہ حج مکہ مکرمہ حاضر ہوئیں اور کسی ذریعہ سے مولانا کے حالات اور ان کے افادی جذبات سے مطلع ہوکر مولانا سے ملیں اور مکان مدرسہ کی تعمیر کے لئے مبلغ تیس ہزار روپیہ کا عطیہ لوجہ اللہ پیش کیا جس سے اس دار العلوم کی قدیم عمارت تیار ہوئی اور مدرسہ نے اپنے پاکیزہ مقصد باشندگانِ حرم (مہاجر ہو یا غیر مہاجر) کی اولاد کی دینی تعلیم کی عملی تکمیل شروع کر دی، اسی دیندار خاتون کے نام نامی پر مدرسہ کا نام ''مدرسہ صولتیہ'' رکھا گیا، ساتھ ہی طلبہ کی معاشی ضروریات کی تکمیل کے لئے شریف پیشے اور صنعت وحرفت کی تعلیم کا سلسلہ بھی شروع کیا جو بحمد اللہ حسنِ اسلوب سے قائم ہے۔

بعد میں مختلف شاندار عمارتیں بڑھتی رہیں ایک خوشنما مسجد ہندی طرز پر تعمیر ہوکر تیار ہوئی، دار الحدیث کا خوشنما ہال تیار ہوا جو دیدہ زیب اور قابل دید ہے، عملہ میں اضافہ ہوا اور مدرسہ کے کاروبار بانی کے حسنِ نیت کے اثر سے روبہ ترقی رہے اور ہیں۔

اسی ضمن میں یہ عرض کرنا بھی دلچسپی اور افادہ سے خالی نہ ہوگا کہ دار العلوم حرم صولتیہ مکہ مکرمہ کا ایک اساسی فیض دار العلوم دیوبند کو بھی پہنچا اور وہ یہ کہ قاری عبداللہ صاحب مہاجر کی جو کیرانہ کے متصل ہی کسی گاؤں کے رہنے والے تھے اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے گویا ہم وطن تھے، مکہ ہی کے قیام میں ایک اعلیٰ ترین قاری و مجود ہو چکے تھے۔ انہیں مولانا مرحوم نے صولتیہ میں مجود دار العلوم مقرر کیا جن سے مکی اور خصوصاً ہندی طلباء بہت زیادہ فیض یاب ہوئے اور انہیں ہندی فیض یافتوں کے ذریعہ ہندوستان میں فن تجوید کی اشاعت ہوئی۔

چنانچہ قاری عبداللہ صاحب کے اعلیٰ ترین شاگرد حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب الٰہ آبادی نے الٰہ آباد میں تجوید قرآن کی تعلیم اور مشق قراءت کا سلسلہ شروع فرمایا اور سینکڑوں افراد ان کے فیض سے بہترین مجود بنے، جنہوں نے ہندوستان میں اس فن کو رواج دیا۔ انہیں میں مولانا قاری عبدالوحید خاں صاحب الٰہ آبادی بھی تھے جو قاری عبدالرحمٰن صاحب کے تلمیذ رشید تھے اور دار العلوم دیوبند میں بحیثیت صدر القراء بلائے گئے، جنکے ماتحت یہ فن تجوید و قراءت کا ایک مستقل شعبہ کھولا گیا۔

یہ عجیب لطیفہ ہے کہ اس شعبہ کا ظاہری محرک احقر راقم الحروف کی مکتب نشینی کا سلسلہ ہوا، میرے مکتب میں بٹھلائے جانے کے سوال پر والد مرحوم اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مشورہ سے طے پایا کہ مجھے ابتداء ہی سے کسی قاری سے قرآن شریف کی تعلیم دلائی جائے تاکہ قراءت وتلاوت اور ادائیگی ابتداء ہی سے صحیح رہے، شدہ شدہ منصوبہ اس روپ میں آگیا کہ کیوں نہ دار العلوم ہی میں ایک شعبۂ تجوید قائم کر دیا جائے؟ جس میں یہ بھی پڑھے اور دوسرے طلبا کے لئے بھی تجوید و قراءت میسر آجائے۔ بالآخر یہ ہی طے ہوا کہ شخصی تعلیم کے لئے قاری بلوانے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ دار العلوم ہی میں تجوید کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ آخر کار اسی نصب العین نے عملی جامہ پہنا اور جناب مولانا قاری عبدالوحید خاں صاحب تلمیذ مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب تلمیذ مولانا قاری عبداللہ صاحب مہاجر مکی مجود مدرسہ صولتیہ دار العلوم دیوبند میں بلا لئے گئے اور ان کا یا دار العلوم دیوبند کے شعبہ تجوید کا سب سے پہلا شاگرد جس نے الف با سے تجوید شروع کی یہی راقم الحروف ہوا۔

اس بناء پر میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے دار العلوم میں رہ کر بھی شرفِ تلمذ کی پہلی نسبت دار العلوم حرم

صولتیہ مکہ مکرمہ سے حاصل ہے، بالفاظِ دیگر میں ابتدائے مکتب نشینی ہی میں بیک وقت دارالعلوم دیوبند کا بھی تلمیذ تھا اور دارالعلوم حرم صولتیہ کا بھی (وکفٰی بی فخرًا)۔

آج بحمد اللہ یہ دارالعلوم حرم صولتیہ پوری آب وتاب سے تعلیم دین کا کام کررہا ہے۔ تقریباً پانچ چھ سو کے درمیان طلبہ ہیں، کثیر انتظامی عملہ ہے اور اساتذہ کا ایک بڑا عدد مصروفِ تعلیم ہے۔ آج مولانا الشیخ محمد سلیم اس کے ذمہ دار ناظم اور رئیس عمومی ہیں جن کی سرپرستی اور ذمہ داری میں دارالعلوم صولتیہ ترقی کررہا ہے۔ ممدوح حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے برادر اکبر کی اولاد کے سلسلے میں ہیں اور ان کے خلفِ صالح ہیں، کیونکہ مولانا کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ بہرحال تاسیس ادارہ کے سلسلے میں ان دونوں بزرگوں حضرت قاسم العلوم اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے کاموں میں یکسانی پائی جاتی ہے۔

پھر ان دونوں درسگاہوں کے اصولِ اساسی بھی اتنے یکساں اور اس قدر باہم متشابہ ہیں کہ ان دونوں بزرگوں کے منور دماغوں کی یکسانی اور ان کے ایک ہی مشکوٰۃِ نور سے ماخوذ ہونے کی کھلی دلیل ہیں۔ مثلاً ان دونوں دارالعلوموں کے بارے میں ان دونوں بزرگوں کا بنیادی اصول یہ تھا کہ حکومتِ وقت سے کبھی امداد نہ لی جائے بلکہ گورنمنٹ سے مستغنی بن کر عام مسلمانوں کے چندوں اور عطیات سے ان قومی مرکزوں کا کام چلایا جائے۔

چنانچہ حضرت قاسم العلوم نے بنائے دارالعلوم کے جو آٹھ اساسی اصول اپنے قلم مبارک سے لکھے ہیں ان میں سے اہم ترین اصول یہی ہے کہ اس مدرسہ میں حکومت کی امداد کبھی نہ لی جائے، اسی اصول کے ماتحت آج تک دارالعلوم دیوبند نے کبھی بھی حکومت سے نہ امداد کی درخواست کی اور نہ بلا درخواست ہی جب کبھی حکومت نے خود امداد دینے کی خواہش کی تو اسے کبھی قبول ہی کیا، بلکہ شکریہ کے ساتھ ہمیشہ اصول کا حوالہ دے کر معذرت کردی۔

چنانچہ حضرت والد صاحب مرحوم کے زمانہ اہتمام میں ''سرجیمس مسٹن'' گورنر یوپی نے تقریباً ۱۳۲۸ھ میں دارالعلوم دیوبند کے معائنہ کے وقت اپنی اسپیچ میں کہا کہ ''اگر دارالعلوم میری گورنمنٹ کی امداد کی پیش کش قبول کرلے تو میں اسے جاری کرنا اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا''، لیکن ایڈریس میں

پہلے ہی اس سے معذرت کر دی گئی تھی۔ خود احقر کے ابتدائی زمانہ اہتمام یعنی ۱۳۴۸ھ میں نواب سر احمد سعید خاں صاحب گورنر وقت صوبہ یوپی دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے اور احقر سے بحیثیت مہتمم دارالعلوم موقت اور دوامی امداد اور بھاری امداد دینے کی از خود تحریک فرمائی لیکن اسی اساسی اصول کا حوالہ دے کر شکریہ کے ساتھ معذرت کر دی گئی حالانکہ ان کی ذاتِ گرامی بلکہ ان کے بزرگوں سے دارالعلوم اور اکابرِ دارالعلوم کے ہمیشہ گہرے تعلقات رہے ہیں اور الحمدللہ اب تک ہیں، خود ان کی ذات سے اپیل کر کے چندہ لیا گیا مگر حکومت کی امداد ان کے مخلصانہ واسطے سے بھی قبول نہ کی گئی۔

بعینہٖ یہی اصول حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے بھی اپنی بناء (دارالعلوم حرم صولتیہ) کی اساس پر قرار دیا اور حکومتِ وقت سے استغنا ہی پر مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ حالانکہ وہاں کی مقامی حکومت مسلم حکومت تھی جو شریف مکہ کی زیر امارت قائم تھی اور اس حکومت کی مافوق حکومت خلافتِ ترکیہ تھی جو مذہباً و مشرباً دارالعلوم حرم صولتیہ کی ہمنوا تھی اور پھر سلطان ٹرکی اور شریف مکہ مولانا مرحوم پر حد درجہ مہربان بلکہ ان کے معتقد بھی تھے لیکن ذاتی تعلقات کی خوش گواری کے باوجود حکومتوں سے استغنا کے اصول کی ہمیشہ حفاظت کی گئی۔

سلطان عبدالحمید خاں مرحوم نے اپنے دورِ حکومت میں سلطنتِ عثمانیہ سے دارالعلوم حرم صولتیہ کے لئے ایک معقول امداد منظور فرمائی لیکن بانی مدرسہؒ نے اپنے حکیمانہ دماغ اور دور اندیشانہ فراست سے سلطنتِ اسلامیہ کی بھی اس گرانقدر اور مستقل امداد کو نتائج کے پیش نظر قبول کرنے سے بصد شکریہ معذرت فرما دی۔

حضرت مولانا محمد سعید صاحب مرحوم (نبیرہ برادر اکبر حضرت مولانا مرحوم و مہتمم سابق دارالعلوم حرم صولتیہ) نے مجھ سے خود بیان فرمایا کہ موجودہ حکومتِ مکہ نے بھاری امداد دارالعلوم کے لئے منظور فرمائی لیکن انہوں نے اصول کی پابندی، اپنی خداداد ذہانت و فراست کے تحت بصد شکریہ اور بحسن ردقبولیت سے انکار کر دیا اور آج دارالعلوم دیوبند کی طرح دارالعلوم حرم صولتیہ مکہ معظّمہ کا کاروبار بھی مسلمانوں اور بیشتر مسلمانانِ ہندو پاکستان کے عام عطیات اور چندوں پر چل رہا ہے اور

اسی کو یہ دونوں ادارے اپنی راستی اور استقامت کی دلیل سمجھتے ہوئے اس پر قانع اور شاکر ہیں۔

جس سے واضح ہے کہ تاسیس مدارس کے ملتے جلتے اور یکساں جذبات کے ساتھ ان کے اساسی اصول وضع کرنے میں بھی دونوں بزرگواروں کے جذبات یکسانی ہی کے ساتھ کام کر رہے تھے۔

بہر حال اصولِ عمل، طریقِ عمل، نصب العین اور کارناموں کے لحاظ سے یہ دونوں بزرگ ایک اصل کی دو شاخیں نظر آتے ہیں، جنہوں نے ہندوستان کی ڈولتی ہوئی کشتی کی مذہبی اور علمی حیثیت سے ناخدائی کی اور گرتے ہوؤں کو سنبھال لے گئے۔ اور اس بے کسی کے دور میں اس حد تک سہارا دے گئے کہ چند ہی دن میں مسلمان ان کی دکھائی ہوئی شاہراہ پر چل کر پنپ گئے بلکہ قوی اور مضبوط ہو گئے اور ان کا دماغی اور علمی سرمایہ اغیار کی دستبرد سے محفوظ ہو گیا، سوائے ان کے جو اس پگڈنڈی سے الگ ہو گئے اور ان سے اپنا دامن جدا کر لیا۔

۱۸۵۷ء کے ہندوستان کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس روزِ بد کی تاریکیوں میں ان اکابر جیسے آفتاب و ماہتاب اس کے سر پر چمکتے رہے اور بالآخر ان کی روشنی میں اس کی ساری ظلمتیں کافور ہوتی رہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دورِ ظلمات میں بھی اگر روشنی کا کوئی مینار ہے تو وہ انہی اکابر کا نقش قدم ہے اور اس پر چلنے اور چلتے رہنے کے بعد کسی قسم کی مایوسی کی کوئی وجہ مسلمانوں کے لئے باقی نہیں رہتی۔

اس مقبولیتِ عامہ اور مرکزیتِ تامہ کے ساتھ ہر دو بزرگوں کا غناء و توکل اور اسبابِ دنیا سے بے نیازی بھی کچھ یکساں ہی انداز کی تھی جو ان ہی جیسے اہل اللہ کے شایانِ شان تھی، حضرت قاسم العلوم کی طلبی محض حکومتی اور دولتی مراکز مثل ریاست بھوپال وغیرہ سے ہوئی کہ حضرت وہاں پہنچ کر علمی اور دینی قیادت فرمائیں، مشاہرے بھی وقت کے لحاظ سے بھاری بھاری پیش کئے گئے لیکن انہوں نے اپنے استغناء کی حفاظت فرماتے ہوئے یہی جواب دیا کہ ؎

ما آبروئے فقر وقناعت نمی بریم

حتیٰ کہ خود اپنے ہی قائم فرمودہ ادارے دارالعلوم دیوبند کی بھی کبھی ملازمت قبول نہیں فرمائی، نہ کوئی عہدہ لیا تابہ معاوضہ چہ رسد؟

اسی طرح حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے بھی دارالعلوم صولتیہ کو خود اپنی حوصلہ مندی اور

اولوالعزمی سے قائم فرمایا اس کے لئے سرتاپا خدمت وعمل رہے اور اس کے مصارف کے لئے تحصیل سرمایہ کی انتھک سعی بھی فرمائی ،لیکن خود اپنے لئے نہ کبھی کوئی معاوضہ قبول فرمایا نہ دارالعلوم حرم سے کوئی ادنیٰ مالی منفعت حاصل کی ۔

اُولٰئِكَ اٰبـآئِي فَجِئْنِيْ بِمِثْلِهِمْ

اِذَا جَمَعْتَنَا يَاجَرِيْرُ الْمَجَامِع

بہرحال تحفظِ دین ، جہادِ لسان وسنان ، جہادِ جنان وارکان، تاسیس مراکز دین ،خدمتِ خلق اللہ، تربیتِ عالم، تعلیم طلاب ، خیر خواہیٔ بنی نوع ، ایثار وتواضع کے ساتھ معاملات ، بڑا ہوتے ہوئے چھوٹوں سے بھی اپنے کو چھوٹا سمجھنا، ان حضرات کی باقیات صالحات ہیں ۔اسی لئے وہ ۱۸۵۷ء کے بعد غمزدہ مسلمانوں کی منجھدار میں پڑی ہوئی کشتی کے ناخدا اور بکھر ہوئے قافلوں کو مجتمع کرنے کے قافلہ سالار بنائے گئے تھے۔

بالآخر علم وفضل کے یہ دونوں خزانے اپنی اپنی تکوینی اور اختیاری خدمات کی تکمیل کر کے رفیق اعلیٰ سے جا ملے ۔حضرت قاسم العلوم ۱۲۹۷ھ میں رہ گذرِ دنیا سے عالمِ جاودانی کو روانہ ہوئے اور دارالعلوم دیوبند کے قرب وجوار میں اپنی وصیت کے مطابق گورِ غریباں میں آرام فرما ہوئے اور حسبِ مکاشفہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ (مہتمم اول دارالعلوم دیوبند خلف ارشد حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ) ایک نبی کی قبر میں دفن ہوئے ،اور ادھر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے اس دارفانی کو چھوڑ کر عالم باقی کی طرف رحلت فرمائی توارضِ مقدس حرم مکی میں جہاں ہزار ہا انبیاء علیہم السلام کی خاکِ پاک اور اجسادِ طیبہ محفوظ ہیں، آرام فرما ہوئے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

علمائے ہند

کی شاندار تاریخ کا ایک ورق

بانی دارالعلوم دیوبند اور بانی دارالعلوم حرم صولتیہ مکہ معظّمہ

ذیل کا مضمون حضرت مہتمم صاحب مدظلہٗ کے قلم سے رسالہ ندائے حرم کراچی بابت ماہ رجب ۱۳۷۰ھ میں شائع ہوا تھا، چونکہ اس مضمون سے دارالعلوم کی بناء اور اس علمی اور دینی درسگاہ کی تاریخ کا پس منظر بڑی حد تک واضح ہوتا ہے اس لئے ہم نے ضروری سمجھا کہ اپنے قارئین کو بھی اس مضمون کے مطالعہ کا موقعہ دیں۔ امید ہے کہ ناظرین کرام دلچسپی کے ساتھ اس مضمون کو پڑھیں گے۔ (مدیر ماہنامہ دارالعلوم)

یہ مضمون ہم نے ماہنامہ دارالعلوم دیوبند شمارہ شوال ۱۳۷۰ھ سے لیا ہے۔ محمد عمران قاسمی بگیانوی

ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کے زوال اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقبال کا دور مسلمانوں کے لئے جہاں سیاسی اور دولتی حیثیت سے انتہائی ابتلاء اور آزمائش کا تھا، وہیں مذہبی اور علمی حیثیت سے بھی کچھ کم صبر آزما نہیں تھا۔ یہ انقلاب محض حکومت کا انقلاب نہ تھا بلکہ حقیقتاً تہذیب وکلچر، مذہب وملت اور دین ومعاشرہ کے انقلاب کے جراثیم بھی اپنے دامن میں لے کر آیا تھا۔ ہندوستان کے علمی اداروں کا چراغ گل ہو رہا تھا اور مسلمانوں پر جہل ونادانی کی بلا مسلط ہوتی چلی جا رہی تھی۔ نئی طاقت اسلام کی حامی نہ تھی بلکہ مسیحیت کو اپنے دامنوں میں لے کر آئی تھی، پادریوں کے فلک شگاف نعرے اور مناظروں کی مبارزت طلبی کے آوازے فضاءِ ہند میں گونجنے شروع ہو گئے تھے اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی جہالت سے فائدہ اٹھا کر مسیحیت کے چراغ میں برابر تیل ڈالا جا رہا تھا۔

غرض مسلمانوں کا دین ودنیا، مذہب واقتدار بلکہ حیثیتِ عرفی تک معرضِ زوال میں آچکی تھی، اور ضرورت تھی کہ ماضی کے تصورات کو چھوڑ کر مستقبل کی فکر کی جائے، اس لئے جہاں ہندوستان کے

ریاست پسند طبقے نے مسلمانوں کے رسمی اقتدار کو سنبھالنے کی فکر کی وہیں علمائے اسلام نے اس بڑھتی ہوئی جہالت اور اس کے زیر سایہ بڑھتی ہوئی مسیحیت اور لادینیت کی روک تھام کی، بلاءِ جہل سے بچانے کے لئے قومی مدارس کا سلسلہ شروع کیا اور مسیحیت کا طلسم توڑنے کے لئے عیسائیوں کی تحدی اور چیلنجوں کو قبول کر کے باطل شکن مناظروں کا دروازہ کھولا گیا۔ قلمی، لسانی اور قلبی جہاد سے ان بڑھتے ہوئے فتنوں کی روک تھام کی گئی تاکہ بے خبر مسلمانوں کو کذب وباطل کے جال میں پھنسنے سے بچایا جائے اور اس طرح اسلامی ملت اور شریعت دشمنانِ حق کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہے۔

اس سلسلہ میں ہمیں دو عظیم المرتبت شخصیتیں افقِ ہند پر آفتاب و ماہتاب کی طرح درخشاں نظر آتی ہیں جنہوں نے اپنے متماثل اور باہمدگر متشابہ کارناموں اور ایک دوسرے کے اشبہ طرزِ عمل سے مسلمانانِ ہند کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو سہارا دیا اور پار لگایا۔

ایک حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانیٔ دارالعلوم دیوبند اور دوسرے حضرت مجاہد جلیل مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی بانیٔ دارالعلوم حرم صولتیہ مکہ معظّمہ (قدس اللہ اسرا ہما)۔

ان دونوں بزرگ ہستیوں نے ایک ہی لائن پر کام کیا، ایک ہی نصب العین پیش کیا، ایک ہی قسم کے اصول پر گامزن ہوئے اور ایک ہی اندازِ فطرت سے مسلمانانِ ہندوستان کی رہنمائی کی۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (احقر کے جد امجد) ضلع سہارنپور کے ایک قصبہ نانوتہ میں ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے، آپ کا سلسلۂ نسب تقریباً چوالیس واسطوں سے حضرت قاسم ابن محمد ابن ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے، آپ کے مورثِ اعلیٰ بلخ سے ہندوستان وارد ہوئے اور اپنی قابلیت سے شاہ جہانی دربار میں باریاب ہو کر عہدہ ومناصب حاصل کئے اور قصبہ نانوتہ کی جاگیر دربارِ شاہی کی طرف سے مرحمت ہوئی۔

حضرت قاسم العلوم نے دہلی کے مشہور شاہی مدرسہ (حال موسوم بہ عربک کالج) میں تعلیم پائی، فن حدیث محدثِ ہند حضرت شاہ عبدالغنی قدس سرہٗ سے حاصل کیا اور ولی اللّٰہی خاندان کے روحانی چشم وچراغ بنے اور آپ کے بزرگوں نے آپ کو شاہ اسماعیل شہید ثانی کا لقب دیا۔ فنون کی مہارت

اپنے عم بزرگوار مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی قدس سرہ' سے پیدا کی جو دہلی کے شاہی مدرسہ میں استاذ تھے اور تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کی دولت آفتابِ طریقت حضرت شیخ العرب والعجم مولانا حاجی امداد اللہ صاحب فاروقی تھانوی قدس سرہ' سے حاصل کی اور آخر کار علم لدنی میں لسان الغیب ثابت ہوئے۔ غیبی حقائق سے دین کے تمام گوشے واشگاف کئے، اصولِ اسلام کو مبرہن کیا اور اپنے مخصوص طرزِ استدلال سے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی جو حکمتِ ولی اللّٰہی کا نقشِ ثانی ہے۔

ہندوستان میں عیسائیوں، آریوں اور دوسرے مذاہبِ باطلہ کے جتھوں میں مناظروں، تقریروں اور تصانیف کے ذریعہ حق کی منادی کی اور بالآخر اپنے علم وعمل کو متعدی اور دوامی بنانے کے لئے آپ نے اپنی ایک جامع ترین یادگار جو آج اطراف واکنافِ عالم کے لئے ایک چشمۂ آبِ حیواں ہے یعنی ''دارالعلوم دیوبند'' قائم کر کے اپنے علمی وعملی اور اخلاقی کارناموں کو زندۂ جاوید فرمادیا۔

ٹھیک اسی طرح حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی ضلع مظفر نگر کے ایک قصبہ کیرانہ میں پیدا ہوئے، آپ کا سلسلۂ نسب حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہوا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے۔ مولانا مرحوم کے مورثِ اعلیٰ شیخ عبدالرحمٰن گازرونی غازی تھے جو سلطان محمدؒ کے فاتح لشکر کے ساتھ ہندوستان آئے، اسی سلسلۂ نسب کی سنہری کڑی نواب مقرب الخاقان (عرف نواب مقرب خاں) ہیں جو جہانگیر کے زمانے میں امیر البحر تھے۔ نواب صاحب کی دعوت پر خود جہانگیر کیرانہ آیا، نواب صاحب کی بہترین یادگار کیرانہ کا ایک عظیم الشان پختہ تالاب ہے۔ کیرانہ میں نواب صاحب کا دربار تھا اور اس کا محلِ وقوع محلّہ دربار ہی کے نام سے موسوم ہو گیا۔

مولانا مرحوم نواب صاحب کے خیر الخلف خاندان سے تھے اور ان کی پیدائش اسی محلّہ دربار میں ہوئی، آپ کی اعلیٰ تعلیم دہلی کے شاہی مدرسہ مذکورہ میں ہوئی۔ آپ کا شمار ہندوستان کے ان معدودے چند علماء میں ہے جنہوں نے دین وملت کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین ٹھہرالیا تھا۔ مذاہبِ باطلہ کے رد میں تقریروں، تحریروں اور مناظروں سے محیر العقول کارنامے انجام دیئے اور اپنی

دینی وملی خدمات کو دوامی بنانے کیلئے آپ نے مرکزِ اسلام، بلدامین ''مکہ مکرمہ'' میں ایک دارالعلوم بنام ''مدرسہ صولتیہ'' محرم ۱۲۹۲ھ میں قائم فرمایا۔ جس کا مقصد باشندگانِ حرم اور بالخصوص ہندی مسلمان مہاجرین کی تعلیم وتربیت تھا جو بطور ان کی یادگار کے آج تک قائم اور روبہ ترقی ہے۔

بہرحال ان دونوں بزرگوں کی مجموعی زندگی اور اس کی تاریخ یکسانی لئے ہوئے ہے جس نے ہندوستان کی ظلمتوں میں روشنی پھیلائی اور کتنے ہی تاریک دلوں کو ایمانی شعاعوں سے منور کیا۔

اس دور میں سب سے اہم ترین مقصد اسلام کی حفاظت اور دین وملت کا تحفظ تھا، کیونکہ ۱۸۵۷ء میں ملت کی شوکت ختم ہو چکی تھی، ساکھ اٹھ چکی تھی، وسائلِ حیات پر اغیار کا قبضہ ہو چکا تھا اور مذہب وملت دونوں ہی بے سہارا رہ گئے تھے، ایسے وقت میں تحفظِ دین ہی سب سے بڑا جہاد تھا اور اس کے ذریعہ مسلمانوں کو سنبھال لے جانا ہی سب سے بڑی سیاست تھی۔

اس تحفظِ دین کی لائنوں پر ان ہر دو بزرگواروں کی چال البتہ یکسانی لئے ہوئے اور باہم متماثل اور متشابہ تھی، مثلاً ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ رُست وخیز میں حضرت قاسم العلومؒ اپنی محبتِ دینی، غیرتِ ملی اور تحفظِ اسلام کی خاطر اولاً تلوار بدست اور سربکف ''شاملی'' کے میدانِ جہاد میں اترے، جہاد کیا جوہر شجاعت دکھائے، شاملی کی تحصیل فتح کر لی، مگر یہ ہنگامہ مسلمانوں کی شکست اور انگریزوں کی فتح پر منتج ہوا۔

انگریزی تسلط پر حضرت قاسم العلوم کا وارنٹ جاری ہوا، اس دور میں مکان، مسجدوں اور دیہات میں جہاں جہاں بھی حضرت کا دورہ ہوتا رہا وہیں پولیس محاصرے کرتی پھرتی رہی اور تلاشیاں لیتی رہی مگر اس انتہائی دوڑ دھوپ کے باوجود بھی حضرت نہ اس کے ہاتھ آئے نہ گرفتار کئے جا سکے۔ ایک بار مسجد چھتہ دیوبند میں تھے، مخبر نے خبر دی، مسجد کا محاصرہ پولیس نے کر لیا، خود سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مسجد میں آ کر حضرت سے ہی سے پوچھا کہ مولانا محمد قاسم کہاں ہیں؟ حضرت نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر فرمایا کہ ابھی یہیں تھے دیکھ لیجئے، دیہات میں بھی یہ صورتیں پیش آتی رہیں کہ کپتان پولیس مخبری کے بعد تحقیق کے لئے آتا تو خود حضرت ہی ان کے سامنے اطمینان سے آتے گفتگو فرماتے، غلط گوئی بھی نہ کرتے اور اپنا پتہ بھی نہ دیتے۔ یہاں تک کہ امن عام کا اعلان ہو گیا،

انگریزوں کا اقتدار جم جانے کے بعد جب حضرت والا کو مسیحیت کی بڑھتی ہوئی رو سے اندیشہ ہوا کہ وہ کہیں مسلمانوں کو بہانہ لے جائے جبکہ مادی اقتدار بھی اس کی پشت پر ہے اور شوکت کی نظر فریبیاں بھی اس کے ساتھ ہیں، نیز پادری علی الاعلان اسلام کے خلاف زہر اگلنے لگے ہیں، جس سے ناواقف مسلمانوں کے بہک جانے کا خطرہ ہے، تو آپ نے خصوصیت سے ادھر توجہ فرمائی۔ عیسائیوں کے اعتراضات کے سلسلے میں تقریرات کا سلسلہ شروع فرمایا اور ان کے وسوسوں کو اپنے مضبوط طرزِ استدلال سے پادرہوا ثابت کیا۔ بحثیں کیں بلکہ ملک کے تمام مذاہب کے جتھوں ہندو، سناتن، آریہ وغیرہ کے بھرے مجمع میں اسلام کی منادی کی، اعلانِ حق کیا اور دنیا پر اتمامِ حجت کر کے اسلام کی حقانیت عیاں کردی۔ مباحثہ شاہجہاں پور آپ کا مشہور عالم کارنامہ اور علمی شاہکار ہے، جس میں ذمہ دارانِ مذاہب کے روبروان پر اتمامِ حجت فرماتے ہوئے انہیں پیغامِ الٰہی واضح طریق پر پہنچادیا۔

پنڈت دیانند سرسوتی بانیٔ مذہب آریہ، پنڈت اندرمل وکیل سناتن دھرم، پادری اسکاٹ اور پادری نولس وکلاء مذہب عیسوی وغیرہ کو اپنے باطل شکن بیانات سے اعترافِ شکست پر مجبور کر دیا اور انہیں چاروناچار حقانیتِ اسلام کا اعتراف کرتے ہوئے یہاں تک بھی اقرار کرنا پڑا کہ اگر دنیا میں کسی شخص کی تقریر پر ایمان لا جاسکتا ہے تو وہ مولانا محمد قاسم صاحب ہیں، حتیٰ کہ پنڈت دیانند سرسوتی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ''مولبی کاسم'' (مولوی قاسم) ایک بڑا وِدوان ہی نہیں بلکہ اس کے پیٹ میں خدا بولتا ہے۔

ٹھیک اسی نہج پر حضرت اقدس مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی علیہ الرحمۃ نے جب محسوس کیا کہ پاپایانِ مسیحیت اسلام کے خلاف اپنی دریدہ دہنی میں حدود سے متجاوز ہونے لگے ہیں، بہادر شاہ کے آخری دور اور مسلمانوں کی اجتماعی مغلوبیت اور پستی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مسیحیوں کا مایۂ ناز پاپا یعنی فنڈر جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر روزانہ عصر مغرب کے درمیان ناواقف عوام کے سامنے دین مسیحی کے فضائل بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کی مزعومہ کمزوریوں کو بڑے دھڑلے کے ساتھ بیان کرتا ہے تو آپ نے جرأتِ ایمانی کے ساتھ پہلے تو پادری فنڈر کے علمی موقف کا اندازہ کرنے

کے لئے اس سے تحریری مراسلت فرمائی اور بالآخر ماہ رجب ۱۲۷۰ھ (جس کو آج پوری ایک صدی ہوچکی ہے) اکبرآباد (آگرہ) میں وہ مشہور عالم مناظرہ کیا جو مولانا کے ردِ عیسائیت کا ایک شاہکار نمونہ تھا، حتیٰ کہ دین اسلام کی متیقن حقانیت کے سلسلے میں اپنی خداداد علمی قوت اور پادری کے مبطلا نہ ضعف پر یقین واطمینان رکھتے ہوئے اس کی یہ شرط بھی مان لی کہ اگر مولانا مرحوم پادری فنڈر کے اعتراضات کا جواب نہ دے سکے تو وہ مذہبِ عیسوی قبول کرلیں گے اور اگر پادری فنڈر جواب سے عاجز رہ گیا تو وہ مسلمان ہوجائے گا۔

جلسہ کے مقرر شدہ حکم اونچے طبقہ کے انگریزی حکام، بااثر مقامی افراد اور ذی علم ہندو مسلمان اشخاص کی ایک جماعت تھی، رسالتِ نبوی کا اثبات، قرآنِ حکیم کا منزل من اللہ ہونا اور بلا کسی تحریف وتبدیل کے باقی رہنا، ابطالِ تثلیث اور تحریفِ انجیل وغیرہ مسائل موضوعِ بحث ٹھہرے۔ مولانا مرحوم نے دنیا کے تمام پادریوں کو چیلنج کرتے ہوئے پادری فنڈر کو للکارا اور تین دن کے مسلسل مناظرہ سے ہزار ہا اہل نظر انسانوں کے مجمع میں مسیحیوں کو اتنی کھلی شکست دی کہ مسیحیوں کے اس بڑے باپ کو منہ چھپا کر فرار کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا، بھرا مجمع موجود، حکم موجود، سامعین منتظر مگر پادری فنڈر غائب تھا۔ مولانا نے مستند دستاویزی ثبوت سے عیاں کر دیا کہ یہ انجیل نہ اصل انجیل ہے اور نہ اصل کے مطابق نقل ہی ہے۔ اس میں پادریوں کی خیانتیں اور وقتی ضرورتوں نیز ملکی وتمدنی تقاضوں سے انجیل میں ترمیمات اور کمی بیشی کے سارے پول اس انداز سے کھول کر رکھ دیئے کہ پادریوں کو منہ دکھانے کی جگہ نہ رہی اور پادری فنڈر کو ”تا بہ دروازہ باید رسانید“ کی مثل کے مطابق دروازے تک ہی نہیں بلکہ اس کے گھر تک لے جا کر چھوڑا، وہ روپوش ہوکر فرار ہوا تو سیدھا لندن جا کر ٹھہرا۔

آگرہ میں اس مناظرہ کے بعد ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ رست خیز برپا ہوگیا۔ مولانا مرحوم انگریزوں کے سخت مخالف تھے اور شاملی میدان میں مجاہدین کی جماعت میں صف آرا تھے، ان کے محلّہ دربار میں ہندو مسلمان پناہ لیتے تھے اور امن کے ساتھ انہیں چھپا کر رکھا جاتا تھا، کیونکہ ہندو مسلم اتفاق اخلاص کی سطح پر قائم تھا۔

انگریزوں کا تسلط ہوجانے کے بعد مولانا کا وارنٹ جاری ہوگیا مگر پولیس تلاش کے باجود

ناکام رہی، افسوس ہے کہ مسلمانوں میں ہی سے بعض خودغرض اور کوتاہ اندیش افراد نے مولانا کے بارے میں مخبری کی کہ وہ دربار کی مسجد میں نماز پڑھنے آئے ہیں، پولیس پہنچی محاصرہ کیا لیکن مولانا مرحوم کو موقعہ مل گیا اور وہ مسجد کے ایک حجرے سے نکل کر جس کا دروازہ کے محلّہ کے ایک مکان میں تھا اور اُدھر اس سے جنگل ملا ہوا تھا پنجیٹھ ایک گاؤں میں چلے گئے جو کیرانہ سے ایک کوس کے فاصلہ پر واقع ہے اور جس میں کیرانہ کے عثمانی اور انصاری شیوخ کی زمینداری ہے۔

مولانا اپنے ایک رشتہ دار کے یہاں مقیم تھے کہ اسی خائن مخبر نے (جو اپنوں ہی میں سے تھا) اس کی بھی مخبری کر دی، پولیس نے گاؤں پہنچ کر اس کاشتکار کے مکان کا محاصرہ کر لیا اور تلاشی لی اور وہ کاشتکار گاؤں کا مکھیا بھی تھا، اس کو جب فوج کی آمد کا علم ہوا تو اس نے حضرت مولانا مرحوم سے فرمایا کہ کھرپا لے کر کھیت میں گھاس کاٹنے چلے جائیں، گورہ فوج اسی کھیت پگڈنڈی سے گذری، حضرت مولانا مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ میں گھاس کاٹ رہا تھا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو کنکریاں اڑتی تھیں وہ میرے جسم پر لگ رہی تھیں اور میں ان کو اپنے پاس سے گذرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

آخر مولانا مرحوم بچتے بچاتے سورت کی بندرگاہ تک پہنچ گئے اور ایک بادبانی جہاز میں کسی نہ کسی طرح سوار ہو گئے، مگر ایک پولیس انسپکٹر نے مولانا کو پہچان لیا اور فوٹو سے چہرہ کی مطابقت کر کے فوٹو اور وارنٹ دکھلایا اور کہا کہ مجھے آپ کی گرفتاری کا حکم ہے مگر میں مسلمان ہوں، یہ لفظ اس کی زبان سے نکلا ہی تھا کہ جہاز نے لنگر اٹھا دیا اور جدہ کی طرف روانہ ہو گیا، مولانا کی زبان پر اس وقت یہ شعر تھا۔

نظر بچا کے بتوں کی چلا ہوں کعبہ کو
خدا کے ہاتھ ہے اب شرم وآبرو میری

پادری فنڈر ہندوستان سے فرار ہونے کے بعد لندن پہنچا مگر اس الزام میں کہ اس نے دین عیسوی کی اشاعت میں سیاسی قوت سے کام لیا ہے اپنے عہدہ سے معزول کر دیا گیا۔ وہ یہاں سے معزول ہونے کے بعد قسطنطنیہ پہنچا، سلطان عبدالعزیز کا عہد تھا، ٹرکی اور انگلستان کے تعلقات خوشگوار تھے، پادری فنڈر نے بارگاہ سلطانی میں باریاب ہو کر عرض کیا کہ ہندوستان میں میرا ایک مسلمان عالم سے مذہبی مناظرہ ہوا جس میں عیسائیت کو فتح اور اسلام کو شکست ہوئی مگر چونکہ

انگریزوں کا حال ہی میں ہندوستان پر قبضہ ہوا ہے اور انہیں اپنی سیاسی مصالح کے تحت مسلمانوں کی تالیف منظور تھی اس لئے مجھ پر عتاب ہوا اور میں اپنے عہدہ سے معزول کر دیا گیا۔ سلطان کی عنایت اگر میرے شامل حال ہو جائے اور وہ انگریزوں سے میری سفارش فرما دیں تو لندن کے چرچ میں پھر مجھے میرا مذہبی عہدہ مل سکتا ہے۔

سلطان عبدالعزیز کو چونکہ مذہبی معاملات سے دلچسپی تھی اس لئے ان کی خواہش ہوئی کہ پادری کے اس بیان کی تحقیق کی جائے، چنانچہ شریف مکہ کے نام فرمان جاری فرمایا کہ امسال موسم حج میں جو ہندوستانی علماء اور باخبر حجاج مل سکیں ان سے اس مناظرہ کی کیفیت معلوم کر کے اطلاع دی جائے۔ شریف مکہ امیر عبداللہ مرحوم کو اس مناظرہ کی پوری کیفیت معلوم ہو چکی تھی اور اس لئے وہ مولانا مرحوم پر بہت عنایت مبذول کرتے تھے۔

اس فرمان کے صادر ہوتے ہی شریف مکہ نے فوراً بارگاہِ خلافت میں مناظرہ کی مختصر کیفیت کے ساتھ یہ بھی اطلاع دی کہ وہ عالم جن سے ہندوستان میں پادری فنڈر کا مناظرہ ہوا ہے مکہ معظمہ میں موجود ہیں۔ اس طرح سلطان نے مناظرہ کی مفصل کیفیت بیان کرنے اور ہندوستان میں جدید حکومت اور انقلاب کے چشم دید واقعات کا براہِ راست علم حاصل کرنے کے غرض سے مولانا مرحوم کو قسطنطنیہ طلب کر لیا۔ مولانا مرحوم خاص اعزاز کے ساتھ سرکاری طور پر قسطنطنیہ تشریف لے گئے اور شاہی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرائے گئے۔

سلطان معظم شاہانہ عنایات کے ساتھ عموماً نماز عشاء کے بعد مولانا کو شرفِ باریابی بخشتے رہے اور ان کے علمی کمالات اور بیانِ واقعات سے مستفید ہوتے رہے۔ اس خاص وقت میں اکثر خیرالدین پاشا صدر اعظم ٹرکی اور شیخ الاسلام وغیرہ اکابر ملک شریک صحبت رہتے تھے۔ فنڈر کو جب مولانا کی آمد کی اطلاع ہوئی تو قسطنطنیہ سے قبل از شکست ہی فرار ہو گیا اور خموشی سے راتوں رات ایسا غائب ہوا کہ شاید پھر عمر بھر بھی اس نے یورپ کی کسی کھڑکی سے مسلم یورپ اور اسلامی ایشیاء کی طرف جھانکنے کی جرأت نہیں کی، ظاہر ہے کہ رحمت اللہ کے بعد عدو اللہ کی پیش ہی کیا چل سکتی تھی۔ جوں ہی موسیٰ آیا اور عصا ڈالا تو فرعون کا پتہ نہ رہا اور اسے ڈوبتے ہی بن پڑی۔

سلطان نے مولانا کی زبانِ فیض ترجمان سے مناظرہ کے حالات نہایت دلچسپی سے سنے اور نتیجہ سے بہت خوش ہوئے اور مولانا کو واپسی کے وقت خلعتِ فاخرہ کے ساتھ ''پایۂ حرمین شریفین'' کے بلند پایہ خطاب، تمغۂ مجیدی درجہ دوم اور گرانقدر مالی وظیفہ سے سرفراز فرمایا۔

بہرحال وہاں حضرت قاسم العلوم نے پادری نولس اور اسکاٹ کو شکست فاش دے کر فرار پر مجبور کردیا اور حسبِ بیانِ ثقات پادری میدان مباحثہ سے کرسیاں چھوڑ چھوڑ کر بھاگے اور زبان سے اعترافِ شکست کرتے ہوئے فرار ہوئے، اور یہاں مولانا رحمت اللہ صاحب نے پادری فنڈر کو شکستِ فاش دے کر بیک بینی ودو گوش فرار پر مجبور کردیا جو ہندوستان تک چھوڑ کر بھاگا اور گھر سے ورے اسے پناہ نہ ملی۔

فرق اتنا ہے کہ وہاں جہاد پہلے ہوا اور مناظرہ بعد میں اور یہاں مناظرہ پہلے ہوا اور جہاد بعد میں، جہاد میں دونوں حضرات مجتمع رہے اور مناظروں میں فصل رہا۔ پھر بعد جہاد وتسلط انگریز وہاں بھی وارنٹوں کے باوجود گورنمنٹ ان کی گرفتاری پر قدرت نہ پاسکی اور یہاں بھی وارنٹ کے ہوتے ہوئے حکومت کی بے بسی نمایاں رہی۔ اور یہ ان دونوں بزرگوں کے حال پر اللہ کا فضل تھا جن سے اسے آئندہ کام لینا تھا۔

اس لسانی اور سنانی جہاد کے بعد قلمی جہاد کی نوبت آئی تو اِدھر حضرت قاسم العلومؒ نے ردِعیسائیت پر جامع ترین بیانات اپنے رسائل ومکاتیب میں زیبِ قلم فرما کر آنے والوں کے لئے اپنے مخصوص علم کا نادرِ روزگار ذخیرہ بطور ترکہ میراث چھوڑا، اور اپنی معرکۃ الآرا تحریرات حجۃ الاسلام، تقریر دلپذیر، گفتگوئے مذہبی، مباحثہ شاہجہانپور اور اسرار الطہارۃ وغیرہ میں ردِعیسائیت اور ردِ مذاہب باطلہ کے وہ وہ محکم ومضبوط اور عقلی اصول تحریر فرمائے کہ ان کی موجودگی میں عیسائیت وغیرہ کے لئے حجت کے ساتھ پنپنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ نیز اسلامی اصول وکلیات کا ایسے فلسفیانہ اور عارفانہ انداز اور ایسے سائنٹفک طریقوں سے اثبات فرمایا کہ ایک کٹر سے کٹر ملحد اور دہریہ کو بھی ماننے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے۔

اور اُدھر اسی طرح حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے دورانِ قیام قسطنطنیہ میں سلطان ٹرکی

کے ارشاد وایماء اور صدرِ اعظم کی خواہش پر مناظرہ کے واقعات اور پادریوں کے تمام ان اعتراضات کے متعلق جو وہ اسلام پر کرتے ہیں ایک نہایت ہی مبسوط کتاب بنام ''اظہار الحق'' عربی میں مرتب کر کے سلطان کی خدمت میں پیش کی جس میں تاریخی اور دستاویزی ثبوت سے انجیل کی تحریفات کا پردہ چاک کیا، عقلی اور نقلی دلائل سے موجودہ عیسائیت کی دھجیاں بکھیر دیں اور اسلامی دنیا کو صدی بھر کے لئے عیسائی دسیسہ کاریوں سے مطمئن فرمادیا۔ یہ کتاب ۱۲۸۰ھ میں قسطنطنیہ میں چھپی۔

پھر صدر اعظم کے حکم سے بعض ترکی علماء نے اس کا ترجمہ ترکی زبان میں کیا جو ''ابراز الحق'' کے نام سے وہاں شائع ہوا۔ نیز حکومت عثمانیہ ہی کی طرف سے یورپ کی متعدد زبانوں میں اس کتاب کے ترجمے شائع کئے گئے جن کو پادریوں نے خاص اہتمام سے تلف کرنے کی سعی کی مگر اطفاءِ نورِ حق کے ارادے ناکام رہے اور اِتمامِ نورِ حق ہو کر رہا (ولو کرہ الکافرون) متعدد منصف مزاج عیسائیوں اور انگریزوں نے اس سے متاثر ہو کر دامن اسلام میں پناہ لی اور یہ کتاب کفار کے علی الرغم زبانوں کے مختلف پیرایوں اور لباسوں میں جلوہ گر ہوتی رہی اور ایشیاء اور یورپ کے بڑے بڑے ممالک نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

ٹرکی اور یورپ سے یہ کتاب مصر میں پہنچی اور وہاں متعدد بار طبع اور شائع ہوئی، ہندوستان میں مولوی غلام محمد بھانجارا ندیری نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے گجراتی زبان میں اس کا ترجمہ کیا جو صوبہ گجرات میں شائع ہوا اور وہاں کی ہدایت کا باعث ہوا۔

آج سے اکہتر (۷۱) سال قبل جب ''اظہار الحق'' کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا تو ٹائمنر آف لندن نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''لوگ اگر اس کتاب کو پڑھتے رہیں گے تو دنیا میں مذہبِ عیسوی کی ترقی کے لئے میدان باقی نہیں رہے گا۔''

نواب اسماعیل خاں صاحب مرحوم رئیس دتاوَلی ضلع علی گڈھ نے ٹائمنر آف لندن کا یہ تبصرہ مکہ معظّمہ میں مولانا مرحوم کی خدمت میں خاص اہتمام سے پیش فرمایا تھا۔

اس کے علاوہ مولانا نے نو کتابیں اور تصنیف فرمائیں ۱۲۶۹ھ میں ''ازالۃ الاوہام'' (فارسی)

جو نصاریٰ کے رد میں ہے جس کا ایک نسخہ ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانہ میں موجود ہے، اسی سن میں دوسری کتاب ''ازالۃ الشکوک'' اردو دو جلدوں میں تحریر فرمائی جس کی پہلی جلد مولانا مرحوم کے شاگرد رشید مولانا عبدالوہاب صاحب بانی مدرسہ باقیات الصالحات مدراس نے طبع کرائی اور دوسری جلد جناب مہتمم صاحب مدرسہ موصوف نے چھپوائی۔ تیسری کتاب ''اعجازِ عیسوی'' تصنیف فرمائی جس میں بائبل کا مکمل طور پر محرف ہونا ثابت فرمایا ہے، یہ کتاب پہلی بار آگرہ میں اور دوسری بار مطبع رضوی دہلی میں طبع ہوئی ہے۔ چوتھی کتاب ''اصح الاحادیث فی ابطال التثلیث'' ہے جس میں دلائلِ عقلیہ ونقلیہ سے تثلیث کو باطل محض کر کے چھوڑا ہے۔

مطبع رضوی دہلی میں صرف ایک بار طبع ہوئی ہے۔ پانچویں کتاب ''بروقِ لامعہ'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے اثبات میں ہے جو ہنوز طبع نہیں ہوئی، چھٹی کتاب ''**البحث الشریف فی اثبات التنسیخ والتحریف**'' ۱۲۷۰ھ میں لکھی گئی جس میں تحریفِ انجیل پر محققانہ بحث کی گئی ہے اور فخر المطابع دہلی میں طبع ہوئی ہے۔ ساتویں کتاب ''معدل اعوجان المیزان'' ہے جو پادری فنڈر کی تالیف میزان الحق کا محققانہ جواب ہے، چھپنے کی نوبت ہی نہیں آئی، آٹھویں کتاب ''تقلیب المطاعن'' ہے جو پادری لاسمندر کی کتاب ''تحقیق دین حق'' کا محققانہ رد ہے، چھپنے کی نوبت ہی نہیں آئی، نویں کتاب ''معیار التحقیق'' ہے جو پادری صفدر علی کی تالیف ''تحقیق الایمان'' کا دنداں شکن جواب ہے، چھپنے کی نوبت ہی نہیں آئی، اور دسویں کتاب یہ ''اظہار الحق'' مذکور ہے جو ردِ نصاریٰ میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ **تلك عشرة كاملة.**

بہر حال ان دونوں اکابر قاسم ورحمت کے اس کارنامہ (تحفظِ دین حق وردِ مذاہبِ باطلہ) میں بھی کلیتًا یکسانی پائی جاتی ہے، ایک قاسمِ علم ومعرفت ہیں جن کے علوم وکمالات نے مشرق ومغرب کو رنگ دیا اور صبغۃ اللہ سے مشرق ومغرب تک کے لوگ منصبغ ہو گئے، جس سے ''**انما انا قاسم واللہ یعطی**'' کا ظہور ہوا اور دوسرے رحمتِ باری ہیں جو اہل عرب اور اہل عجم پر بارش بن کر برسے اور دلوں کی جلی ہوئی کھیتیوں کو سیراب کر دیا جس سے ''**فانظر الی اثار رحمة الله کیف یحی الارض بعد موتها**'' کا ظہور ہوا۔ گویا دونوں ہی آسمانی برکات کے نزول وظہور کی آیت اور نشانی

ثابت ہوئے۔

اس ردِ مذاہبِ باطلہ اور عیسائیت کی مغربی آندھیوں سے قلعۂ اسلام کو محفوظ کر دینے کے بعد ان دونوں بزرگواروں کے دلوں میں منجانب اللہ پھر یہ داعیہ ابھرا کہ مثبت پہلو میں مسلمانوں کے اصل ایمان کو محفوظ رکھ کر اس کی ترقی کے لئے اور ساتھ ہی اس نورِ ایمانی کے متعدی اور دور رس بنانے کے لئے ایسے تعلیمی مرکز قائم کئے جائیں جن کا موضوع اسلامی مقاصد کی تکمیل، مسلمانانِ ایشیاء اور خصوصاً مسلمانانِ ہند کی علمی و عملی تربیت اور ان کا اخلاقی نشو ونما ہو، اور ان میں ایسے سرفروش مجاہد افراد پیدا کئے جائیں جو علم وزبان اور لسان و جنان سے اسلام کے سچے خادم اور اس کے جانباز سپاہی ثابت ہوں، تا کہ وہ قلبی دولت جوان بزرگواروں کے قلوب کو منجانب اللہ عطا ہوئی ہے ان کے ان سچے جانشینوں اور وارثوں تک منتقل ہو سکے اور اس کا سلسلہ رہتی دنیا تک قائم رہے۔

چنانچہ اس جذبہ کے ماتحت حضرت قاسم العلوم نے تو دیوبند (ضلع سہارنپور، یوپی) میں ۱۲۸۳ھ میں ایک دارالعلوم کی بنیاد ڈالی جس میں دیوبند کے محلّہ دیوان کے چند باخیر متمول شیوخ نے اپنی زمینیں مدرسہ کے لئے عطا کیں، پھر مقامی اور بیرونی اہل خیر کے عطایا شامل ہوئے اور رفتہ رفتہ مدرسہ کے لئے عمارات کا سلسلہ شروع ہوا، اور اس طرح اس دارالعلوم کی بنیاد پڑی جو بعد میں دنیائے اسلام کا مذہبی مرکز اور طالبانِ علمِ نبوت کا مرجع بنا، جس سے علم واخلاق کی نہریں اطرافِ عالم میں بہہ نکلیں اور آج تقریباً ڈیڑھ ہزار طلبا، دوسو اہلکارانِ دفاتر اور چالیس اساتذہ پر مشتمل ایک جامعہ کی حیثیت میں قائم ہے اور بیس شعبوں پر اپنے نظم کو منقسم کئے ہوئے ہے۔ ہند و بیرونِ ہند افغانستان، پاکستان، ترکستان، انڈونیشیا، ایران، حجاز وغیرہ کے طلبۂ دین کو اپنی نورانی شعاعوں سے منور کر رہا ہے اور جس میں علمی و دینی تکمیل کے علاوہ معاشی ضروریات کی تکمیل کا مقصد بھی صنعت وحرفت کے ایک مستقل محکمہ کی صورت سے پورا کیا جا رہا ہے۔

ٹھیک اسی جذبہ کے ماتحت جبکہ ہندوستان کے تاریخی انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد تنصر ونصرانیت کے آثار سے نچنے اور بچانے کے لئے ہندوستان کی ایک مقدس جماعت نے حجاز کی طرف رخ کیا تو انہی میں مولانا رحمت اللہ صاحبؒ بھی مہاجر کی حیثیت سے مکہ معظّمہ حاضر ہوئے اور مرکز اسلام مکہ

معظّمہ میں ایک دینی دارالعلوم کی بنیاد ڈالی۔

دارالعلوم کے لئے سب سے پہلا مسئلہ زمین کا تھا، سوارضِ مقدس میں زمین مل جانے کا مسئلہ عجب انداز سے خداساز طریقہ پر حل ہوا۔ حرم شریف میں تعمیری مرمت کی ضرورت پیش آئی، اس میں کام کرنے کے لئے تقریباً ۱۶ مقدس علماء منتخب کئے گئے، جن میں مولانا رحمت اللہ صاحبؒ بھی شامل تھے۔ مولانا کی یہ خصوصیت رہی کہ آپ اس مدتِ مرمت میں صائم بھی رہے اور محرم بھی، اور بحالتِ احرام وصیام اس مقدس مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا۔ ختمِ تعمیر پر سلطان کی طرف سے ان تمام علماء کو خلعت عطا کئے گئے مگر مولانا نے مدرسہ صولتیہ کے پاک منصوبہ کے پیش نظر بجائے خلعت کے مدرسہ کے لئے زمین طلب کی اور ذاتی منافع پر اس دینی منفعتِ عام کو ترجیح دی۔

حکومت نے بھی برضا ان کی اس پاک خواہش کا احترام کرتے ہوئے مدرسہ کے لئے مطلوبہ زمین عطا کر دی اور اس طرح مولانا کے حسنِ نیت، عزمِ صادق اور ایثار کے طفیل منجانب اللہ زمین مدرسہ کا مسئلہ حل ہوگیا۔ اس کے بعد مصارفِ تعمیر کا اہم سوال تھا تو وہ بھی مولانا ہی کے پاک جذبہ سے حل ہوا جس کی صورت یہ ہوئی کہ مولانا کی حسنِ نیت اور اخلاص کی برکت سے ۱۲۹۱ھ میں کلکتہ کی ایک متمول بیوہ صولت النساء بیگم اپنے داماد اور بھائی کی معیت میں بارادہ حج مکہ مکرمہ حاضر ہوئیں اور کسی ذریعہ سے مولانا کے حالات اور ان کے افادی جذبات سے مطلع ہو کر مولانا سے ملیں اور مکان مدرسہ کی تعمیر کے لئے مبلغ تیس ہزار روپیہ کا عطیہ لوجہ اللہ پیش کیا جس سے اس دارالعلوم کی قدیم عمارت تیار ہوئی اور مدرسہ نے اپنے پاکیزہ مقصد باشندگانِ حرم (مہاجر ہو یا غیر مہاجر) کی اولاد کی دینی تعلیم کی عملی تکمیل شروع کر دی، اسی دیندار خاتون کے نام نامی پر مدرسہ کا نام ''مدرسہ صولتیہ'' رکھا گیا، ساتھ ہی طلبہ کی معاشی ضروریات کی تکمیل کے لئے شریف پیشے اور صنعت وحرفت کی تعلیم کا سلسلہ بھی شروع کیا جو بحمد اللہ حسنِ اسلوب سے قائم ہے۔

بعد میں مختلف شاندار عمارتیں بڑھتی رہیں ایک خوشنما مسجد ہندی طرز پر تعمیر ہو کر تیار ہوئی، دارالحدیث کا خوشنما ہال تیار ہوا جو دیدہ زیب اور قابل دید ہے، عملہ میں اضافہ ہوا اور مدرسہ کے کاروبار بانی کے حسنِ نیت کے اثر سے روبہ ترقی رہے اور ہیں۔

اسی ضمن میں یہ عرض کرنا بھی دلچسپی اور افادہ سے خالی نہ ہوگا کہ دار العلوم حرم صولتیہ مکہ مکرمہ کا ایک اساسی فیض دار العلوم دیوبند کو بھی پہنچا اور وہ یہ کہ قاری عبداللہ صاحب مہاجر کی جو کیرانہ کے متصل ہی کسی گاؤں کے رہنے والے تھے اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے گویا ہم وطن تھے، مکہ ہی کے قیام میں ایک اعلیٰ ترین قاری وجود ہو چکے تھے۔ انہیں مولانا مرحوم نے صولتیہ میں مجود دار العلوم مقرر کیا جن سے مکی اور خصوصاً ہندی طلباء بہت زیادہ فیض یاب ہوئے اور انہیں ہندی فیض یافتوں کے ذریعہ ہندوستان میں فن تجوید کی اشاعت ہوئی۔

چنانچہ قاری عبداللہ صاحب کے اعلیٰ ترین شاگرد حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب الٰہ آبادی نے الٰہ آباد میں تجوید قرآن کی تعلیم اور مشق قراءت کا سلسلہ شروع فرمایا اور سینکڑوں افراد ان کے فیض سے بہترین مجود بنے، جنہوں نے ہندوستان میں اس فن کو رواج دیا۔ انہیں میں مولانا قاری عبدالوحید خاں صاحب الٰہ آبادی بھی تھے جو قاری عبدالرحمٰن صاحب کے تلمیذ رشید تھے اور دار العلوم دیوبند میں بحیثیت صدر القراء بلائے گئے، جنکے ماتحت یہ فن تجوید وقراءت کا ایک مستقل شعبہ کھولا گیا۔

یہ عجیب لطیفہ ہے کہ اس شعبہ کا ظاہری محرک احقر راقم الحروف کی مکتب نشینی کا سلسلہ ہوا، میرے مکتب میں بٹھلائے جانے کے سوال پر والد مرحوم اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مشورہ سے طے پایا کہ مجھے ابتدا ہی سے کسی قاری سے قرآن شریف کی تعلیم دلائی جائے تا کہ قراءت وتلاوت اور ادائیگی ابتدا ہی سے صحیح رہے، شدہ شدہ منصوبہ اس روپ میں آ گیا کہ کیوں نہ دار العلوم ہی میں ایک شعبۂ تجوید قائم کر دیا جائے؟ جس میں یہ بھی پڑھے اور دوسرے طلبا کے لئے بھی تجوید و قراءت میسر آ جائے۔ بالآخر یہ ہی طے ہوا کہ شخصی تعلیم کے لئے قاری بلوانے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ دار العلوم ہی میں تجوید کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ آخر کار اسی نصب العین نے عملی جامہ پہنا اور جناب مولانا قاری عبدالوحید خاں صاحب تلمیذ مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب تلمیذ مولانا قاری عبداللہ صاحب مہاجر مکی مجود مدرسہ صولتیہ دار العلوم دیوبند میں بلا لئے گئے اور ان کا یا دار العلوم دیوبند کے شعبہ تجوید کا سب سے پہلا شاگرد جس نے الف با سے تجوید شروع کی یہی راقم الحروف ہوا۔

اس بناء پر میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے دار العلوم میں رہ کر بھی شرفِ تلمذ کی پہلی نسبت دار العلوم حرم

صولتیہ مکہ مکرمہ سے حاصل ہے، بالفاظِ دیگر میں ابتدائے مکتب نشینی ہی میں بیک وقت دارالعلوم دیوبند کا بھی تلمیذ تھا اور دارالعلوم حرم صولتیہ کا بھی (و کفٰی بی فخرًا)۔

آج بحمد اللہ یہ دارالعلوم حرم صولتیہ پوری آب وتاب سے تعلیم دین کا کام کررہا ہے۔ تقریباً پانچ چھ سو کے درمیان طلبہ ہیں، کثیر انتظامی عملہ ہے اور اساتذہ کا ایک بڑا عدد مصروفِ تعلیم ہے۔ آج مولانا الشیخ محمد سلیم اس کے ذمہ دار ناظم اور رئیس عمومی ہیں جن کی سرپرستی اور ذمہ داری میں دارالعلوم صولتیہ ترقی کررہا ہے۔ ممدوح حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے برادر اکبر کی اولاد کے سلسلے میں ہیں اور ان کے خلفِ صالح ہیں، کیونکہ مولانا کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ بہرحال تاسیس ادارہ کے سلسلے میں ان دونوں بزرگوں حضرت قاسم العلوم اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے کاموں میں یکسانی پائی جاتی ہے۔

پھر ان دونوں درسگاہوں کے اصولِ اساسی بھی اتنے یکساں اور اس قدر باہم متشابہ ہیں کہ ان دونوں بزرگوں کے منور دماغوں کی یکسانی اور ان کے ایک ہی مشکوٰۃِ نور سے ماخوذ ہونے کی کھلی دلیل ہیں۔ مثلاً ان دونوں دارالعلوموں کے بارے میں ان دونوں بزرگوں کا بنیادی اصول یہ تھا کہ حکومتِ وقت سے کبھی امداد نہ لی جائے بلکہ گورنمنٹ سے مستغنی بن کر عام مسلمانوں کے چندوں اور عطیات سے ان قومی مرکزوں کا کام چلایا جائے۔

چنانچہ حضرت قاسم العلوم نے بنائے دارالعلوم کے جو آٹھ اساسی اصول اپنے قلم مبارک سے لکھے ہیں ان میں سے اہم ترین اصول یہی ہے کہ اس مدرسہ میں حکومت کی امداد کبھی نہ لی جائے، اسی اصول کے ماتحت آج تک دارالعلوم دیوبند نے کبھی بھی حکومت سے نہ امداد کی درخواست کی اور نہ بلا درخواست ہی جب کبھی حکومت نے خود امداد دینے کی خواہش کی تو اسے کبھی قبول ہی کیا، بلکہ شکریہ کے ساتھ ہمیشہ اصول کا حوالہ دے کر معذرت کردی۔

چنانچہ حضرت والد صاحب مرحوم کے زمانہ اہتمام میں ''سر جیمس مسٹن'' گورنر یوپی نے تقریباً ۱۳۲۸ھ میں دارالعلوم دیوبند کے معائنہ کے وقت اپنی اسپیچ میں کہا کہ ''اگر دارالعلوم میری گورنمنٹ کی امداد کی پیش کش قبول کرلے تو میں اسے جاری کرنا اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا''، لیکن ایڈریس میں

پہلے ہی اس سے معذرت کر دی گئی تھی۔ خود احقر کے ابتدائی زمانہ اہتمام یعنی ۱۳۴۸ھ میں نواب سر احمد سعید خاں صاحب گورنر وقت صوبہ یوپی دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے اور احقر سے بحیثیت مہتمم دارالعلوم موقت اور دوامی امداد اور بھاری امداد دینے کی ازخود تحریک فرمائی لیکن اسی اساسی اصول کا حوالہ دے کر شکریہ کے ساتھ معذرت کر دی گئی حالانکہ ان کی ذاتِ گرامی بلکہ ان کے بزرگوں سے دارالعلوم اور اکابرِ دارالعلوم کے ہمیشہ گہرے تعلقات رہے ہیں اور الحمدللہ اب تک ہیں، خود ان کی ذات سے اپیل کر کے چندہ لیا گیا مگر حکومت کی امداد ان کے مخلصانہ واسطے سے بھی قبول نہ کی گئی۔

بعینہ یہی اصول حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے بھی اپنی بناء (دارالعلوم حرم صولتیہ) کی اساس پر قرار دیا اور حکومتِ وقت سے استغنا ہی پر مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ حالانکہ وہاں کی مقامی حکومت مسلم حکومت تھی جو شریف مکہ کی زیر امارت قائم تھی اور اس حکومت کی مافوق حکومت خلافتِ ترکیہ تھی جو مذہباً و مشرباً دارالعلوم حرم صولتیہ کی ہمنوا تھی اور پھر سلطان ٹرکی اور شریف مکہ مولانا مرحوم پر حد درجہ مہربان بلکہ ان کے معتقد بھی تھے لیکن ذاتی تعلقات کی خوش گواری کے باوجود حکومتوں سے استغنا کے اصول کی ہمیشہ حفاظت کی گئی۔

سلطان عبدالحمید خاں مرحوم نے اپنے دورِ حکومت میں سلطنتِ عثمانیہ سے دارالعلوم حرم صولتیہ کے لئے ایک معقول امداد منظور فرمائی لیکن بانی مدرسہؒ نے اپنے حکیمانہ دماغ اور دوراندیشانہ فراست سے سلطنتِ اسلامیہ کی بھی اس گرانقدر اور مستقل امداد کو نتائج کے پیش نظر قبول کرنے سے بصد شکریہ معذرت فرمادی۔

حضرت مولانا محمد سعید صاحب مرحوم (نبیرہ برادر اکبر حضرت مولانا مرحوم و مہتمم سابق دارالعلوم حرم صولتیہ) نے مجھ سے خود بیان فرمایا کہ موجودہ حکومتِ مکہ نے بھاری امداد دارالعلوم کے لئے منظور فرمائی لیکن انہوں نے اصول کی پابندی، اپنی خداداد ذہانت و فراست کے تحت بصد شکریہ اور بحسن رد قبولیت سے انکار کر دیا اور آج دارالعلوم دیوبند کی طرح دارالعلوم حرم صولتیہ مکہ معظّمہ کا کاروبار بھی مسلمانوں اور بیشتر مسلمانانِ ہندو پاکستان کے عام عطیات اور چندوں پر چل رہا ہے اور

اسی کو یہ دونوں ادارے اپنی راستی اور استقامت کی دلیل سمجھتے ہوئے اس پر قانع اور شاکر ہیں۔

جس سے واضح ہے کہ تاسیس مدارس کے ملتے جلتے اور یکساں جذبات کے ساتھ ان کے اساسی اصول وضع کرنے میں بھی دونوں بزرگواروں کے جذبات یکسانی ہی کے ساتھ کام کر رہے تھے۔

بہرحال اصولِ عمل، طریقِ عمل، نصب العین اور کارناموں کے لحاظ سے یہ دونوں بزرگ ایک اصل کی دو شاخیں نظر آتے ہیں، جنہوں نے ہندوستان کی ڈولتی ہوئی کشتی کی مذہبی اور علمی حیثیت سے ناخدائی کی اور گرتے ہوؤں کو سنبھال لے گئے۔ اور اس بے کسی کے دور میں اس حد تک سہارا دے گئے کہ چند ہی دن میں مسلمان ان کی دکھائی ہوئی شاہراہ پر چل کر پنپ گئے بلکہ قوی اور مضبوط ہو گئے اور ان کا دماغی اور علمی سرمایہ اغیار کی دستبرد سے محفوظ ہو گیا، سوائے ان کے جو اس پگڈنڈی سے الگ ہو گئے اور ان سے اپنا دامن جدا کر لیا۔

۱۸۵۷ء کے ہندوستان کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس روزِ بد کی تاریکیوں میں ان اکابر جیسے آفتاب و ماہتاب اس کے سر پر چمکتے رہے اور بالآخر ان کی روشنی میں اس کی ساری ظلمتیں کافور ہوتی رہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دورِ ظلمات میں بھی اگر روشنی کا کوئی مینار ہے تو وہ انہی اکابر کا نقش قدم ہے اور اس پر چلنے اور چلتے رہنے کے بعد کسی قسم کی مایوسی کی کوئی وجہ مسلمانوں کے لئے باقی نہیں رہتی۔

اس مقبولیتِ عامہ اور مرکزیتِ تامہ کے ساتھ ہر دو بزرگوں کا غناء و توکل اور اسبابِ دنیا سے بے نیازی بھی کچھ یکساں ہی انداز کی تھی جو ان ہی جیسے اہل اللہ کے شایانِ شان تھی، حضرت قاسم العلوم کی طلبی محض حکومتی اور دولتی مراکز مثل ریاست بھوپال وغیرہ سے ہوئی کہ حضرت وہاں پہنچ کر علمی اور دینی قیادت فرمائیں، مشاہرے بھی وقت کے لحاظ سے بھاری بھاری پیش کئے گئے لیکن انہوں نے اپنے استغناء کی حفاظت فرماتے ہوئے یہی جواب دیا کہ۔

ما آبروئے فقر وقناعت نمی بریم

حتیٰ کہ خود اپنے ہی قائم فرمودہ ادارے دارالعلوم دیوبند کی بھی کبھی ملازمت قبول نہیں فرمائی، نہ کوئی عہدہ لیا تا بہ معاوضہ چہ رسد؟

اسی طرح حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے بھی دارالعلوم صولتیہ کو خود اپنی حوصلہ مندی اور

اولوالعزمی سے قائم فرمایا اس کے لئے سرتاپا خدمت وعمل رہے اور اس کے مصارف کے لئے تحصیل سرمایہ کی انتھک سعی بھی فرمائی، لیکن خود اپنے لئے نہ کبھی کوئی معاوضہ قبول فرمایا نہ دارالعلوم حرم سے کوئی ادنیٰ مالی منفعت حاصل کی ۔

اُولٰٓئِکَ اٰبَآئِي فَجِئْنِيْ بِمِثْلِهِمْ

اِذَا جَمَعْتَنَا يَاجَرِيْرُ الْمَجَامِع

بہرحال تحفظِ دین، جہادِ لسان وسنان، جہادِ جنان وارکان، تاسیس مراکز دین، خدمتِ خلق اللہ، تربیتِ عالم، تعلیم طلاب، خیرخواہیٔ بنی نوع، ایثار وتواضع کے ساتھ معاملات، بڑا ہوتے ہوئے چھوٹوں سے بھی اپنے کو چھوٹا سمجھنا، ان حضرات کی باقیات صالحات ہیں۔ اسی لئے وہ ۱۸۵۷ء کے بعد غمزدہ مسلمانوں کی منجھدار میں پڑی ہوئی کشتی کے ناخدا اور بکھرے ہوئے قافلوں کو مجتمع کرنے کے قافلہ سالار بنائے گئے تھے۔

بالآخر علم وفضل کے یہ دونوں خزانے اپنی اپنی تکوینی اور اختیاری خدمات کی تکمیل کر کے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ حضرت قاسم العلوم ۱۲۹۷ھ میں رہ گذرِ دنیا سے عالمِ جاودانی کو روانہ ہوئے اور دارالعلوم دیوبند کے قرب وجوار میں اپنی وصیت کے مطابق گورِ غریباں میں آرام فرما ہوئے اور حسبِ مکاشفہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ (مہتمم اول دارالعلوم دیوبند خلف ارشد حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ) ایک نبی کی قبر میں دفن ہوئے، اور ادھر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے اس دارفانی کو چھوڑ کر عالم باقی کی طرف رحلت فرمائی تو ارضِ مقدس حرم مکی میں جہاں ہزار ہا انبیاء علیہم السلام کی خاکِ پاک اور اجسادِ طیبہ محفوظ ہیں، آرام فرما ہوئے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

یادِ خلیل

تذکرہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری رحمہ اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کا یہ مضمون ہم نے ماہنامہ القاسم (دارالعلوم دیوبند) شمارہ جمادی الثانی ۱۳۴۶ھ سے لیا ہے۔ محمد عمران قاسمی بگیانوی

ذَهَبَ الَّذِيْنَ أُحِبُّهُمْ		فعليك يا دنيا السلام
لا تذكرين العَيْشَ لِيْ		فالعَيْش بعد هُمُ حَرام
انى رضيع وِصَالِهِمْ		والطفل يولمهم الفطام

دنیا میں کتنے ہی قانون بنے اور بگڑے کتنے ہی آئین و دفعات جاری ہوئے اور پھر منسوخ ہوئے لیکن قدرت کا وہ ایک قانون جو ہمیشہ نا قابل تغیر و تبدیل رہا اور جس نے کبھی انقلاب قبول نہ کیا وہ خود قانونِ انقلاب ہے۔ اس قانون نے دنیا کو کبھی فرصت نہ دی کہ وہ اپنے کسی ایک حال پر باقی رہ سکے اور تغیر و تبدل کی زد سے بچ جائے۔ زمین اور اُس کے تمام ذرے پھر آسمان اور اس کے سارے ستارے یعنی عالم تکوین کا کرہ و دائرہ انقلاب ہی کی تحریک سے چکر کھا رہا ہے۔

خدا کی مخلوق کی اشرف ترین نوع (انسان) کے افراد ہوں یا اقوام و امم، انفرادی شخصیتیں ہوں یا اجتماعی انجمنیں اور پھر ان پر گذرنے والے عام حالات ہوں یا کیفیات، کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے کہ اُس نے انقلاب کی جابرانہ گرفت سے بچ کر تمکین و بقا کی سطح پر اپنا قدم جما دیا ہو۔

مادی صفوں میں نگاہ دوڑاؤ تو کائناتِ انقلاب خبر دیتی ہے کہ دنیا میں کتنے ہی تخت بچھے اور اُلٹ دیئے گئے، سلطنتیں قائم ہوئیں اور مٹیں، کتنی ہی قومیں اور شخصیتیں جبروت و اقتدار کی مالک

ہوئیں اور پھر وہ اپنی جلوہ آرائیوں کی نمائش کر کے جب اپنی اجل مسمّٰی کے دائرہ پر گھوم چکیں تو اسی قانونِ انقلاب نے ان سے دوسروں کے لئے جگہ خالی کرالی اور انہیں گوشۂ گمنامی میں چھپا دیا۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔

سب سے عجیب تر یہ کہ وہ روحانیت نواز امتیں اور معنویت کی علمبردار شخصیتیں بھی جو وابستۂ حق ہو کر ابدقراری کا تمغہ حاصل کرتیں اور حیٌّ لایموت میں مشغول ہو کر دائم الحیات بن جاتی ہیں، اس انقلاب کے ردوبدل سے نہ بچ سکیں۔ یہ انقلابی ہاتھ ان کو بھی اسی طرح منقلب کرتا اور ایک عالم سے دوسرے عالم میں گھماتا رہتا ہے جس طرح وہ لطیف ہواؤں کو گردش میں رکھتا اور سورج کی روشنی کو چکر میں ڈالے رہتا ہے۔ بڑے بڑے اولوالعزم پیغمبر، ورثاء انبیا اور اجلہ اخیار علم وعرفان کے بادل بن کر اُفق عالم پر چھا گئے پھر انہوں نے قلوب کی مردہ زمینوں کو روحانی حیات سے مالا مال کیا لیکن بالآخر جب اس روحانی برسات کا موسم ختم ہوا تو پھر انقلابی ہوائیں چلیں اور انہوں نے ان بادلوں کو اپنے ٹھکانوں کی طرف منتقل کر دیا۔

اسی لیل ونہار کی گردشوں اور تصریفِ ریاح کے چکروں میں اس انقلاب کا بھی معائینہ کرو کہ تقریباً ایک صدی پیشتر جبکہ ہندوستان کی اسلامی آبادی کے چپہ چپہ پر جہالت وضلالت کی تیز وتند آندھیاں چل رہی تھیں اور ہر ایک روحانی خطہ پر خاک اڑ رہی تھی یعنی علم ومعرفتہ کی تازگی سے قلوب محروم ہو چکے تھے اور سنت وبدعت یا توحید وشرک کا امتیاز مٹ گیا تھا تو خدائے کریم کی وسیع رحمت نے ولی اللّٰہی خاندان سے چند ولی نمایاں کئے اور گنگوہ ونانوتہ کی خاک نے وہ امانت ادا کی جس کو مودعِ ازل نے اس پر آشوب وقت کے لئے اس خاک میں چھپا رکھا تھا۔

حضرت مولانا رشید احمد وحضرت مولانا محمد قاسم قدس اللہ اسرار ہما نے عالم وجود میں قدم رکھا اور گہوارۂ روحانیت میں تربیت پا کر اُٹھے تو ہندوستان کے ظلمت کدے کو از سرنو آباد کیا اور اس کے خرابات کی پھر دوبارہ تعمیر کی۔

قال اللّٰہ وقال الرسول کی آوازوں سے گنبدِ عالم گونج اُٹھا اور دربارِ رشیدی وقاسمی کی جواہر ریزیوں سے ہندوستان کی مفلس آبادی پھر مالا مال ہوگئی۔ خستہ دلوں کو مرہم مل گیا اور شکستہ

خاطروں کو پھر جمعیت میسر آ گئی۔

ان اکابر کی معنوی برکتیں، روحانی طاقتیں اور عرفانی کششیں جب جوش میں اُمڈیں تو کبھی وہ درسِ قرآن وسنت کی صورت میں نمایاں ہوئیں اور بھی تزکیہ قلوب اور تصفیۂ اخلاق کی شکل میں، کہیں انہوں نے شریعت کا علم بلند کیا اور کہیں طریقت وحقیقت کو الواحِ قلوب پر رقم کیا۔ یعنی شریعت وطریقت کی آمیزش سے ایک ایسا طریق وسط اور جادۂ اعتدال قائم کیا کہ جس میں عشق بھی تھا اور عقل بھی، وارفتگی بھی تھی اور ضبط بھی، سرشاری بھی تھی اور ہوشیاری بھی۔

پس انہوں نے نہ تو عشق ومحبت کے ایسے دیوانے پیدا کئے جو عقل ودانائی کو کھو کر صرف جذب وجنون ہی میں رہ گئے ہوں اور نہ عقل وہوش کے ایسے ٹرے غلام تیار کئے جو عشق ومحبت کھو کر الحاد وزندقہ اور خودرائی میں پھنس گئے ہوں۔ بلکہ انہوں نے مدارس بھی قائم کئے اور خانقاہیں بھی، زاہد بھی تیار کئے اور عارف بھی، عالم بھی بنائے اور محقق بھی، مقرر وواعظ بھی دکھلائے اور خلوت نشیں وعزلت گزیں بھی۔

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام وسنداں باختن

غرض اتباعِ سنت کے دائرہ میں مقید ہو کر نشر واشاعت کے مختلف وسائل سے خدا کے دین کو پھیلایا اور اُس کے بندوں پر حجت تمام کر دی۔

بالآخر برسات کا یہ دور ختم ہوا اور اسی دہری انقلاب اور تکوینی تغیر کے محرک نے انہیں بھی ایک حرکت دی اور پست سے بالا کی طرف کھینچ لیا۔ لیکن ان کی برکاتِ باقیہ اور صدقاتِ جاریہ جنہوں نے دربارِ رشیدی وقاسمی کی روشنی کو پھیکا نہ ہونے دیا مختلف صورتوں میں نمایاں رہیں، ہم کسی کو حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری، کسی کو حضرت مولانا عبدالرحیم رائپوری اور کسی کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن محدث دیوبندی وغیرہ پکارتے تھے۔ دنیا کبھی اُن کی ضیا پاشیوں سے مستنیر ہوتی تھی اور کبھی ان کے آبِ حیات سے سیراب، علم حدیث وفقہ کی گرم بازاری، علومِ قرآن وسنت کی گرما گرمی، حقائق ومعارف کی جولانی، مہماتِ باطنی کی ہماہمی ان کے نام سے باقی اور روز افزوں

ترقی پر تھی۔

لیکن اے صد آہ وہزار حسرت کہ اسی انقلابی آسمان نے ایک چکر کھایا کہ رائپور کا آفتاب غروب ہوگیا، اس کے فراق کا زخم ابھی مندمل نہ ہوا تھا کہ دیوبند کا موسم بہار ختم ہوا، اور یہ صدمہ ابھی پرانا بھی نہ ہوا تھا کہ جماعت کا وہ آخری سہارا جو سلسلۂ اسباب کے بہت سے سہارے مٹ جانے کے بعد باقی رہا تھا مٹ گیا اور وہ ہستی جو اَب مرجع کل تھی اسی انقلاب کی نذر ہوگئی۔

ہم آج سے ایک ماہ پیشتر جس مقدس ہستی کو محدث بے نظیر، فقیہ بے بدل، رئیس الاتقیا حضرت مولانا خلیل احمد مدظلہٗ کہا کرتے تھے آج بصد اندوہ غم حضرت خلیل احمد قدس اللہ سرہٗ کہہ رہے ہیں۔

در بزمِ عیش یک دو قدح درکش و برد
یعنی طمع مدار وصالِ دوام را

اکابر مرحومین کی پاکیزہ نشانیوں اور بہترین یادگاروں میں سے حضرت مولانا موصوف ایک نہایت ہی قابل فخر وذکر یادگار تھے۔ انہیں کی یہ محبوبیت تھی کہ خود اُن کے شیخ ومربی حضرت مولانا رشید احمد قدس اللہ سرہٗ نے ان کی نسبت یہ قابل فخر کلمات فرمائے تھے کہ **الخلیل خلیلی**۔

حضرت مولانا قدس سرہٗ حضرت گنگوہیؒ کے ارشد تلامذہ اور اولین خلفاء میں سے تھے۔ علم وفضل، حدیث دانی اور جامعیت کے ساتھ خصوصیت سے تمام جماعت کے آپ مسلم فقیہ تھے۔ آپ کا دینی انہماک اور علمی شغف دنیا جانتی ہے کہ کیسا تھا؟ تمام عمر مشغلہ نشر علوم واشاعتِ دین میں تقویٰ وطہارت کے ساتھ گزار دی۔ رات دن زبان پر **قال اللہ وقال رسول اللہ** کا نغمہ روح نواز تھا۔ درسِ حدیث وفقہ کو زندگی کا شعار بنا لیا۔ اہل اہوا وبدعات کے رد میں تصانیف فرمائیں۔ حمایت ومدافعتِ دین کی خاطر مناظرے کئے اور بالآخر اس ضعفِ پیری اور نقاہتِ امراض میں بھی جبکہ درسِ حدیث چھوٹ گیا تھا شغلِ حدیث نہ چھوٹا۔

صحاح ستہ کی مشہور دقیق کتاب ابوداؤد کی شرح لکھ کر وہ خدمت انجام دی کہ گویا وہ درسِ حدیث سے اسی لئے فارغ کئے گئے تھے کہ اس اہم فریضہ (شرح ابوداؤد) کو انجام دیں۔ تاکہ اُن کے علوم کے دقائق اور فقیہانہ نکتہ سنجیاں صرف انہیں تلامذہ تک محدود نہ رہ جائیں جو چند دن ان کے

شرف صحبت سے مستفیض ہوئے، بلکہ عام علمی حلقوں اور دور اُفتادہ مخلصوں، علماء وطلبہ اور مدرسین مدارس کے افراد بھی اُن کے گراں بہا علوم سے مستفید ہوسکیں۔

پھر یہ کیا عجیب مقبولیت ہے کہ جب ابوداؤد سامنے رکھ کر شرح حدیث نبوی کی خدمت انجام دینی شروع کی تو خود روضۂ نبوت کی طرف سے کششِ باطنی شروع ہوگئی اور اچانک حضرت مرحوم نے ہندوستان چھوڑ کر آستانۂ نبوت پر حاضر ہونے کا عزم فرمالیا۔ تاکہ یہ خدمتِ نبویؐ بارگاہِ نبویؐ ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ چنانچہ شوال المکرّم ۱۳۴۴ھ میں حجاز کا قصد فرمایا۔ حضرت کی اہلیہ محترمہ اور سالے (برادرِ نسبتی) جناب حاجی مقبول احمد صاحب اور وہ رفیق خاص جو شرح ابوداؤد کے اہم کام میں تحریر مضامین، اقتباساتِ کتب اور ترتیبِ کتاب کے فرائض ابتدا ہی سے ساتھ رہ کر انجام دے رہے تھے یعنی عالم باعمل، صاحبِ تدین وتقویٰ مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی دام مجدہٗ ساتھ تھے۔

مناسکِ حج سے فارغ ہوکر مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا اور بدستور شرح حدیث اور تسہیل ابوداؤد کی خدمت جاری رکھی، یہاں تک کہ یہ عظیم الشان کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا اور اس خوشی ومسرت میں حضرت نے مدینہ کے عمائد وعلماء کی ضیافت فرمائی۔ مدینہ طیبہ کے عمائد کو ٹائپ شدہ دعوتی خطوط روزانہ فرمائے۔ ہندوستان میں بھی احباب وخدام کے نام وہ چھپے ہوئے خطوط آئے، اس حقیر ترین خادم کے نام بھی ایک خط تھا۔

حضرت مرحوم کی علم دوستی، طلبہ پروری اور شفقتِ استادانہ کی یہ ایک نادر مثال ہے کہ اس شرح ابوداؤد کی تکمیل میں جس طرح آپ نے لوجہ اللہ متاعب برداشت کی وہیں ایک اور زبردست ایثار فرمایا کہ کتاب کے تمام حقوق اور منافع مدرسہ مظاہر علوم کو عطا فرمائے۔ گویا مالی حیثیت سے اگر مدرسہ نے حضرت کی کچھ خدمت انجام دی تو اس کا صلہ پالیا اور دینی وروحانی حیثیت سے حضرت نے مدرسہ کو جو بے بہا فوائد پہنچائے وہ سرتاسر بے بدل اور احسان ہی احسان رہے۔

حبِ نبوی اور حبِ دیارِ نبوی کا غلبہ آخر میں اتنا بڑھ گیا کہ ہندوستان آنے کے ہی بلکہ مدینہ سے باہر نکلنے کے خیال سے بھی گھبراتے تھے۔ شہدائے اُحد کی زیارت کے مشتاق تھے مگر اس خیال سے سفر نہیں فرمایا کہ کہیں جنت البقیع کی خاک سے جدا نہ ہو جاؤں؟ اُدھر سے بھی مقبولیت تھی کہ دائمی

طور پر دیارِ حبیب ہی میں بسر کرنے کے لئے نشیمن دیا گیا اور جنت البقیع کی خاک نمناک نے بصد رغبت وقبول اپنی آغوشِ شفقت میں لے لیا۔

دوسرے حج سے فارغ ہو کر تقریباً ۱۵-۱۶ ماہ قیام کے بعد حقیقتاً جوارِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مسکن گزیں ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

ہاں حسرت ان دور افتادوں کے لئے ہے جو ۱۶ ماہ پیشتر ہی جسمانی مفارقت میں مبتلا کر دیئے گئے تھے، راقم الحروف کو چونکہ حضرت مرحوم سے ایک خاص رابطۂ تلمذ وخادمی حاصل ہے اور وہ یہ کہ حضرت نے تعلقاتِ نسبی اور روابطِ نسبی کی بنا پر بہت ہی پیار اور شفقت سے اس حقیر کو صحاحِ ستہ اور اُن کے علاوہ تقریباً حدیث کی بیس مشہور کتابوں میں اجازت دی اور اپنے دستِ مبارک سے دستخط ومہر فرما کر سندِ حدیث عطا فرمائی، اس لئے عام خدام ومتوسلین کی طرف سے اظہارِ درد کرتے ہوئے بالخصوص اپنی طرف سے تمام وابستگانِ حضرتِ مرحوم اور بالخصوص حضرت مولانا حافظ محمد عبد اللطیف صاحب دام مجدہ، وبرادر مکرم مولانا محمد زکریا صاحب کی خدمت میں مخلصانہ تعزیت پیش ہے، حق تعالیٰ ہم خدام کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

آخر میں یہ بھی عرض ہے کہ متوسلین میں سے اگر کسی صاحب کے پاس حضرت مولانا مرحوم کے حالات جمع ہوں یا لکھنے کا ارادہ رکھتے ہوں تو ہمیں بھی ان سے ضرور مستفیض فرمائیں۔

نورالانور

تذکرہ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

الحمدللّٰہِ وسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی.

دارالعلوم دیوبند نے اپنی نوّے سالہ زندگی میں علم وفضل کے ایسے ایسے رجال پیدا کئے ہیں کہ ان آخر کی صدیوں میں دور دور تک تاریخ ان کی مثال پیش کرنے سے عاجز نظر آتی ہے۔ ہر ایک اپنے فن، کردار، سیرت اور بلند ذوقی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہی تھا۔ جو حضرات نصف صدی پیشتر گذر چکے ہیں ان سے شاید نئی دنیا واقف نہ ہو، اور ممکن ہے کہ تعارف کرانے کے باوجود وہ ان سے متعارف نہ ہو سکے لیکن ماضی قریب کے مشاہیر دیوبند کی ایک بڑی جماعت نے جو اپنی شہرۃ العامہ کے لحاظ سے محتاجِ تعارف نہیں، ان کے علم وسیرت کی مثالیں بھی دور دور تک نہیں ملتیں۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ، حضرت مولانا احمد حسن محدث امروہیؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا عبدالحق مفسر حقانیؒ، حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ وغیرہ حضرات اپنے شہرۂ آفاق علم وفضل اور کردار وسیرت کے لحاظ سے عزت وشہرت کی اونچی سطح پر پہنچے ہیں۔ قلم وزبان انہیں عام طور پر جانتے پہچانتے ہیں، پھر ایسی تعداد کی تو کوئی شمار ہی نہیں جو مشاہیر میں نہیں، لیکن اپنی مضبوط علمی واخلاقی سیرت کے ساتھ وہ زمینوں سے زیادہ آسمانوں میں مشہور ہیں اور وہاں اچھے القاب سے یاد کئے جاتے ہیں، اور زمین کے کتنی ہی خطوں کے ایمانوں کو نبھائے ہوئے ہیں۔

بہرحال دارالعلوم دیوبند ایک شجرۂ طیبہ ہے، جس کے خوش ذائقہ اور خوشبودار پھل پھول سے دنیائے اسلام کا دل ودماغ معطر اور پُر کیف بنا ہوا ہے، اور اس آخری صدی میں اس کی جماعت

مجموعی حیثیت سے اٹھی تو اس نے مجددانہ اور اسلامی علم وعمل کو غیر اسلامی اثرات کی آمیزشوں اور شرک وبدعات کے لوث سے پاک کر کے نکھار دیا اور ستھرا کر کے دنیا کے آگے رکھ دیا۔

دیوبند کی ان آفتاب وماہتاب ہستیوں میں نہایت تیز اور شفاف روشنی کا ایک جلیل المرتبت ستارہ حضرت الاستاذ، علامہ دہر، فرید عصر، حافظ الدنیا، محدثِ وقت مولانا السید محمد انور شاہ الکشمیری صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند کی مبارک ہستی بھی ہے جو مجموعی حیثیت سے آیۃ من آیات اللہ اور اپنے غیر معمولی علم وفضل کے لحاظ سے دین کا ایک روشن مینارہ تھے، اور آپ کی ذات بلامبالغہ عالم جلیل، فاضل نبیل، تقی ونقی، محدث ومفسر ومتکلم، ادیب وشاعر، صوفی صافی اور فانی فی السنۃ ذات تھی۔

لیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

آپ ۱۳۱۰ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے جب کہ منشی فضل حق صاحب دیوبندی کا دورِ اہتمام تھا اور ۱۳۱۴ھ میں تمام علوم وفنون کی تکمیل سے فارغ ہوکر جب کہ حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کا زمانۂ اہتمام تھا، یہاں سے واپس ہوئے۔ چند سال مدرسہ امینیہ دہلی میں مسندِ درس پر متمکن ہے اور وہاں سے اپنے وطن کشمیر تشریف لے گئے، وہاں سے بہ نیتِ ہجرت حجازِ مقدس کے قصد سے روانہ ہوئے۔ دیوبند میں اپنے اساتذہ وشیوخ سے ملنے کے لئے اترے۔

آپ کے شیوخ واساتذہ نے جو آپ کے جوہروں کو جانے اور پہچانے ہوئے تھے، یہ دیکھتے ہوئے کہ دارالعلوم کی مسندِ درس کے شایانِ شان یہ ایک ہستی ہے جسے دارالعلوم نے گویا اپنے ہی لئے پیدا کیا ہے، آپ کو دیوبند میں روک لیا اور آپ نے بھی غایتِ تواضع وانکسارِ نفس سے اپنے اساتذہ کی بات اونچی رکھتے ہوئے قیامِ دیوبند کا ارادہ فرمالیا۔

حضرت ممدوح کے ٹھہرانے سے ابتدائی منصوبہ اور مقصد یہ تھا کہ ترمذی اور بخاری کی شرح حضرت ممدوح سے لکھوائی جائے، لیکن عملاً یہ معاملہ آگے نہیں بڑھا، جس کی وجوہ نامعلوم ہیں، شاید یہ ہوں کہ درس کی مصروفیات بڑھ گئیں، واللہ اعلم۔

بہر حال آپ نے بامتثالِ اکابر دارالعلوم میں درس شروع فرمادیا، البتہ غلبہ زہد وقناعت سے

مشاہرہ لینے پر راضی نہ ہوئے اور لوجہ اللہ کام شروع کر دیا۔ اس اصرار پر ان کے اکابر نے بھی سکوتِ رضا سے کام لیا اور تنخواہ کا مسئلہ کلیتاً انہی کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

لیکن حضرت والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ نے اس کے بعد یہ گوارہ نہیں کیا کہ طعام و ضروریاتِ طعام کے مصارف خود ان کے سر ڈالے جائیں اور فرمایا کہ اگر مدرسہ سے حضرت ممدوح لینا نہیں چاہتے تو ان کے سر میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

تیسری متعین صورت یہ ہے کہ کھانا میرے ساتھ کھائیں، اسے حضرت ممدوح نے منظور فرمالیا اور اسی طرح تقریباً دس برس تک یہ صورت قائم رہی۔ حضرت والد ماجد علیہ الرحمہ نے بھی اپنی معروف آبائی اور روایتی مہمان نوازی سے آپ کو مثل اپنے اہل بیت کے سمجھا اور نہایت انشراح و انبساط کے ساتھ یہ دور پورا ہوا۔

اس دور میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو بھی حضرت شیخ الہند اور حضرت والد ماجدؒ نے یاد فرمایا اور قیامِ دیوبند پر مجبور کیا، ممدوح بھی یہاں رک گئے اور وہ بھی اس پوری مدت میں حضرت والد ماجد ہی کے مہمان رہے۔ یہ دستر خوان بظاہر کھانے کا دستر خوان ہوتا تھا لیکن حقیقتاً اہل علم و فضل کی ایک پاکیزہ مجلس ہوتی تھی، جس میں حضرت والد ماجدؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ، حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور اکثر و بیشتر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور متعدد دوسرے اکابر و اساتذۂ دارالعلوم شریک رہتے تھے۔ علمی مسائل میں مکالمے ہوتے، بحثیں ہوتیں، معارف و حقائق کھلتے اور خصوصیت سے حضرت شاہ صاحب اور مولانا سندھی مختلف علوم و فنون کے کافی دلچسپ مباحث چھیڑتے اور آخر کار بزرگانِ مجلس کی طرف سے کبھی مزاحی رنگ میں اور کبھی سنجیدہ اور متین رنگ میں فیصلے اور مکالمے سنائے جاتے۔ حاضرانِ وقت خدام و طلبہ کو شاید درس و تدریس کی لائن سے برسہا برس میں وہ تحقیقات ہاتھ نہ لگ سکتی تھیں جو اس حلقۂ طعام میں پکی پکائی ایک دم مل جاتی تھیں۔ ان دونوں بزرگوں میں حاضر الوقت اکابر کے کمالِ ادب و احترام کے ساتھ سلسلۂ مسائل حق گوئی میں کوئی ادنیٰ اضمحلال یا تہاون پیدا نہ ہوتا تھا، اور ہر ایک دوسرے کے خلاف برملا اور بہت صاف ریمارک کرتا۔

اس طرح کھانے پینے کا یہ دستر خوان مائدۂ علم وفضل بن جاتا، اوراس دستر خوان پر صرف بدنی غذا ہی جمع نہ ہوتی تھی بلکہ روحانی غذاؤں کے قسم قسم کے الوان جمع ہو جاتے تھے اور دستر خوان اس شعر کا مصداق بن جاتا۔

بہارِ عالم حسنش دل وجاہ تازہ میدارد برنگ اصحابِ صورت رابہ اربابِ معنی را

حضرت شاہ صاحبؒ میں غذا کے بارے میں لطافت تھی مگر شوقینی نہ تھی۔ غذاؤں کے تنوع اور کھانے کے الوان کی طرف طبیعت جھکی ہوئی نہ تھی جو مل گیا کھالیا جو آ گیا شکر و رضا سے اسے قبول کرلیا۔ میری جدہ محترمہ رحمۃ اللہ علیہا (جن کی مہمان نوازی اپنے دور میں مشہور تھی) اور خود حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے بھی اس بارہ میں یہ کہہ کر شہادت دی تھی کہ:

''ہماری مہمان نوازی تو احمد کی والدہ کی بدولت ہے۔''

کبھی کبھی حضرت شاہ صاحبؒ سے میری معرفت یہ کہلا کر بھیجتیں کہ حضرت کبھی تو اپنے مرغوب کھانے کی فرمائش کر دیا کیجئے، تو متاثرانہ لب ولہجہ سے جواب دیتے کہ میری طرف سے سلامِ گذارش کیجئے اور یہ عرض کیجئے کہ:

''دستر خوان پر ہمہ نعمت موجود ہوتے ہوئے میں کاہے کی فرمائش کروں، مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں میری جنت کی نعمتیں یہیں تو نہیں تمام کی جارہی ہیں۔''

قیامِ دیو بند کی یہ صورت قائم ہو جانے پر حضرت شاہ صاحب نے باشارۂ اکابر درس وتدریس کا مستقل سلسلہ جاری تو فرمادیا لیکن ہجرت کی پاک نیت سے دست بردار نہ ہوئے، اور برابر حاضریٔ حرمِ نبوی وحرمِ الٰہی کا جذبہ آپ کو دیو بند چھوڑنے کی طرف مائل کرتا رہتا تھا جس کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا، اور یہ اکابر بلطائف تدبیر اسے ٹلاتے جاتے۔ لیکن خطرہ انہیں بھی رہتا تھا کہ نہ معلوم کس وقت یہ جذبہ غالب ہو جائے اور دارالعلوم کو ایسی جامع اور مستقبل کی بڑی بڑی امیدوں کی محور ہستی سے دستبردار ہونا پڑ جائے۔ اسلئے یہ حضرات بھی انہیں مستقل جمادینے کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔

آخر کار انہیں پابند بنانے کے لئے ان بزرگوں نے ان کے پیروں میں بیڑی ڈالنے کی تدبیر سوچ ہی لی اور ارادہ کیا کہ حضرت ممدوح کا نکاح کر دیا جائے۔ گو اس سے حضرت ممدوح کو انکار تھا مگر بلطائفِ تدبیر انہیں راضی کر کے گنگوہ کے سادات کے ایک خاندان میں نکاح کر دیا گیا۔ میری

دادی صاحبہؒ اور حضرت والد ماجد قدس سرہٗ نے اس کی کفالت فرمائی، اور نکاح کی اس تقریب کو اسی طرح انجام دیا جس طرح وہ اپنی اولاد کی کوئی بھاری تقریب کر سکتے تھے۔ بھوپال بارات گئی، علماء کی ایک جماعت ساتھ تھی، بڑی پُر مسرت فضا میں نکاح ہوا، دلہن آئی تو حضرت جدہ مرحومہ نے اسی طرح گھر میں اتارا جیسے اپنے گھر کی دلہن اتاری جاسکتی تھی۔ ولیمہ کی لمبی چوڑی دعوت کی اور احقر کے زنانہ مکان کے بالا خانے پر حضرت شاہ صاحبؒ مع اہلیہ محترمہ فروکش ہوئے۔

اس پر تقریباً ایک دو سال ہی گذرے تھے کہ اولاد کی امید ہوئی، ہمارے گھر میں اس کی وہی خوشی تھی جو اپنے گھر میں اہل بیت کی اولاد ہونے کی ہوتی ہے، اس وقت تک میری شادی نہیں ہوئی تھی، گھر میں عرصہ مدید گذر چکا تھا کوئی بچہ نہیں تھا، جس کی سب کو تمنا تھی۔ اس امید سے کہ حضرت ممدوح کے یہاں بچہ ہونے والا ہے سب گھر والوں کو بالخصوص میری دادی صاحبہ مرحومہ کو بے حد خوشی تھی۔ اور جیسا کہ عورتوں کا قاعدہ ہوتا ہے انہوں نے عقیقہ کی تقریب کا سامان بھی شروع کر دیا تھا کہ اچانک حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کو مشورہ دیا گیا اور ممکن ہے کہ خود ان کے قلب میں ہی یہ داعیہ از خود پیدا ہوا، انہوں نے حضرت جدہٗ مرحومہ سے عرض کیا کہ دس سال تک تو میں تنہا تھا اب دو سال سے متأہل ہوں اور آپ ہی کے یہاں مقیم ہوں، اب اولاد کی امید ہے تو اب میں ایک اور دو کے ساتھ ایک عائلہ کا بار ڈالنے اور ڈالتے رہنے میں شرمندگی محسوس کرتا ہوں، مجھے اجازت دی جائے کہ الگ مکان لے کر رہوں، حضرت ممدوحہ اور والد ماجد اس پر راضی نہیں ہوئے، لیکن اُدھر سے اصرار بڑھا تو انہوں نے بادلِ ناخواستہ اسے قبول فرمالیا اور حضرت شاہ صاحبؒ دیوان کے محلّہ کے ایک مکان میں فروکش ہوگئے۔

اس صورتِ واقعہ کے بعد ذمہ دارانِ مدرسہ کے لئے موقع آ گیا کہ وہ تنخواہ لینے کے لئے حضرت ممدوح پر اصرار کریں، چنانچہ کیا، اور تاہل کی زندگی اور اس کے وسیع ہوتے رہنے کی صورتِ حال کے ماتحت طوعاً وکرہاً حضرت ممدوح کو بھی یہ اصرار قبول کر کے تنخواہ لینے پر راضی ہوجانا پڑا، اور اب ایک گھرستی کی طرح ان کی عائلی زندگی کا دور شروع ہوگیا۔

اس مکان کی رہائش کے بعد اسی میں عزیزم مولوی ازہر شاہ سلمہٗ کی بہن عابدہ مرحومہ پیدا ہوئی

اور پھر میاں از ہر شاہ سلمہ معرضِ وجود میں آئے۔ تجرد سے تاہل ہوا تھا اور اب تاہل سے عائلی اور خاندانی زندگی کی داغ بیل پڑگئی اور زندگی کے علائق ایک ایک کر کے بڑھتے رہے، اس کا قدرتی نتیجہ وہی نکلا جو ایک تدبیر کے اختیار کرنے والے بزرگوں نے سوچا تھا کہ حضرت شاہ صاحب مقید ہو گئے، اور ہجرت کرنے کا وہ جذبہ سست پڑ گیا، اور بالآخر ترک کر دینا پڑا اور باطمینانِ خاطر دارالعلوم میں مسند نشین درس ہو کر علمی افادات میں مشغول ہو گئے۔

اسی دوران میں حضرت شیخ الہندؒ نے حجازِ مقدس کا قصد فرمایا اور شہرت ہوئی کہ حضرت بہ نیت ہجرت تشریف لے جا رہے ہیں، یہ شہرت تو غلط ثابت ہوئی لیکن تشریف بری محقق تھی، مگر شیخ زمانہ اور دارالعلوم کے شیخ الحدیث کا دارالعلوم سے جانے کا ارادہ کرنا کوئی معمولی حادثہ نہ تھا، زمانہ بھی پرآشوب ہو گیا تھا، حضرت کی نسبت برطانوی حکومت کو شکوک وشبہات پیدا ہو چکے تھے اور حضرت شیخ الہند اور دارالعلوم کے بہی خواہوں کو ایک تو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں گورنمنٹ آپ کو تھام نہ لے، اور اوپر سے سب سے بڑا خطرہ دارالعلوم کی ایسی فردِ فرید شخصیت، نمونہ اکابر واسلاف اور یگانہ رُوزگار ہستی سے محروم ہو جانے کا تھا، جو کچھ کم حادثہ نہ تھا لیکن دارالعلوم کے ذمہ دار مبصرین نے حضرت شاہ صاحبؒ کو دارالعلوم میں روک کر پہلے ہی آنے والے خطرہ کی روک تھام کر لی تھی اور حضرت شاہ صاحبؒ جیسی یکتائے زمانہ ہستی کو دارالعلوم میں لا کر بٹھا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت شیخ کی دارالعلوم سے اس عارضی جدائی اور مخصوص روحانی برکات سے برائے چندے محرومی کا اثر تو ضرور ہوا لیکن علمی حلقہ کے خلاء کا خطرہ رو براہ نہ آسکا۔ مسند بھری بھرائی گویا موجود تھی، اگر شیخ الہند برائے چندے سامنے نہ رہے تو شیخ کے مثل سامنے تھے۔

چنانچہ حضرت کے تشریف لے جانے کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے قائم مقام صدر مدرس کی حیثیت سے درسِ ترمذی و بخاری کو سنبھال لیا اور علمی پیاسوں کو یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ علم کے ایک بحرِ ذخار سے محروم ہو گئے ہیں، بلکہ انہیں محسوس ہوا کہ اگر سمندر سامنے نہیں رہا تو اس سمندر سے نکلا ہوا ایک عظیم الشان دریا ان کے سامنے ہے جو اپنی بعض امتیازی خصوصیات کے ساتھ بدل الغلط نہیں بلکہ بدلِ صحیح ہے جس سے بلا تامل علوم کے پیاسے سیراب ہونے لگے اور آبِ حیات سے قدیم

وجدید سیرابی میں انہیں کوئی زیادہ فرق محسوس نہ ہوا۔

بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ کے درسِ حدیث میں کچھ ایسی امتیازی خصوصیات نمایاں ہوئیں جو عام طور سے دروس میں نہ تھیں، اور حضرت شاہ صاحب کا اندازِ درس درحقیقت دنیائے درس وتدریس میں ایک انقلاب کا باعث ثابت ہوا۔

اولاً آپ کے درسِ حدیث میں رنگِ تحدیث غالب تھا، فقہ حنفی کی خدمت وتائید وترجیح بلاشبہ ان کی زندگی تھی، لیکن رنگ محدثانہ تھا، فقہی مسائل میں کافی سیرحاصل بحث فرماتے لیکن اندازِ بیان سے یہ کبھی مفہوم نہ ہوتا تھا کہ آپ حدیث کو فقہی مسائل کے تابع کررہے ہیں اور کھینچ تان کر حدیث کو فقہ حنفی کی تائید میں لانا چاہتے ہیں، بھلا اس کا قصد وارادہ تو کیا ہوتا؟ بلکہ واضح ہوتا تھا کہ آپ فقہ کو بحکم حدیث قبول کررہے ہیں، حدیث فقہ کی طرف نہیں لے جائی جارہی ہے بلکہ فقہ حدیث کی طرف لایا جارہا ہے۔ وہ آرہا ہے اور کلیتًا حدیث کے موافق پڑتا جارہا ہے، بالفاظِ دیگر گویا حدیث کا سارا ذخیرہ فقہ حنفی کو اپنے اندر سے نکال نکال کر پیش کررہا ہے، اور اُسے پیدا کرنے کیلئے نمودار ہوا ہے۔

۱۳۳۰ھ میں علامہ رشید رضا ''مدیر المنار'' مصر جب بسلسلہ صدارت اجلاسِ ندوۃ العلماء لکھنؤ ہندوستان آئے اور دارالعلوم دیوبند کی دعوت پر دارالعلوم میں بھی تشریف لائے، حضرت شیخ الہند کی موجودگی میں خیر مقدم کا عظیم الشان جلسہ نودرہ ہال میں منعقد ہوا۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنی برجستہ عربی تقریر میں ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے دارالعلوم کے علمی مسلک پر روشنی ڈالی، جس کا اہم جزیہ تھا کہ ہم تمام مختلف فیہ مسائل میں فقہ حنفی کے مسائل کو ترجیح دیتے ہیں اور تمام متعارض روایات کی تطبیق وترجیح کے سلسلہ میں فقہ حنفی کی تائید حاصل کرتے ہیں، تو علامہ رشید رضا نے حضرت شاہ صاحب کی تقریر کے دوران ہی میں تعجب آمیز لہجہ سے کہا کہ:

''کیا سارہ ذخیرۂ روایاتِ حدیث صرف فقہ حنفی ہی کی حمایت کے لئے اتارا گیا ہے۔''

اس پر حضرت شاہ صاحب نے تقریر کے رُخ کو پھیرتے ہوئے اس متعجبانہ استفسار کے جواب کی طرف رُخ کرکے فرمایا کہ ہمیں تو ہر حدیث میں وہی نظر آتا ہے جو ابوحنیفہؒ نے سمجھا اور کہا ہے اور اس پر بطور دلیل حنفیہ شافعیہ کے مشہور مختلف فیہ مسائل کی مثالیں دیتے ہوئے تطبیق روایات اور ترجیح

راجح کے اپنے اصول بیان فرمائے، اور واضح کیا کہ ان اصول کے تحت ہمیں ذخیرۂ حدیث سے کس طرح فقہ حنفی نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔

فقہ حنفی کی عظمتِ شان کو نمایاں کرتے ہوئے دکھلایا کہ ہم محض قیاسی طور پر نہیں بلکہ نصوصِ حدیث کے سارے ہی ذخیرہ میں عیاناً وہ بنیادیں آنکھوں سے دیکھتے ہیں جن پر فقہ حنفی کی تعمیر کھڑی ہوئی ہے۔

بہرحال درسِ حدیث میں آپ کے یہاں محدثانہ رنگ غالب تھا اور حدیث کو فقہ حنفی کے مؤید کے حیثیت سے نہیں بلکہ اس کے منشاء کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا اور ہاتھ در ہاتھ اس کے دلائل وشواہد سے اس دعویٰ کو مضبوط بنایا جاتا تھا۔

متونِ حدیث کی معتمد کتابوں کا ڈھیر آپ کے سامنے ہوتا تھا اور تفسیر الحدیث بالحدیث کے اصول پر کسی حدیث کے مفہوم کے بارہ میں جو دعویٰ کرتے اسے دوسری احادیث سے مؤید اور مضبوط کرنے کے لئے درس ہی میں کتب پر کتب کھول کھول کر دکھاتے جاتے تھے۔ اور جب ایک حدیث کا دوسری احادیث کی واضح تفسیر سے مفہوم متعین ہوجاتا تھا تو نتیجتاً وہی فقہ حنفی کا مسئلہ نکلتا تھا، اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ حدیث فقہ حنفی کو پیدا کررہی ہے، یہ ہرگز مفہوم نہیں ہوتا تھا کہ فقہ حنفی کی تائید میں خواہ مخواہ توڑ مروڑ کر حدیثوں کو پیش کیا جارہا ہے۔

یعنی گویا اصل تو مذہبِ حنفی ہے محض مؤیدات کے طور پر روایاتِ حدیث سے اسے مضبوط بنانے کے لئے یہ ساری جدوجہد کی جارہی ہے، نہیں! بلکہ یہ کہ حدیث اصل ہے لیکن جب بھی اس کے مفہوم کو اس کے فحویٰ اور سیاق وسباق نیز دوسری احادیث باب کی تائید ومدد سے اسے مشخص کردیا جائے تو اس میں سے فقہ حنفی نکلتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس لئے طلبائے حدیث حضرت ممدوح کے درس سے یہ ذوق لے کر اٹھتے تھے کہ ہم فقہ حنفی پر عمل کرتے ہوئے حقیقتاً حدیث پر عمل کررہے ہیں، اور حدیث کا جو مفہوم ابوحنیفہؒ نے سمجھا ہے وہی درحقیقت شارع علیہ السلام کا منشاء ہے، جس کو روایتِ حدیث ادا کررہی ہے، بلکہ یہ سمجھ میں آتا تھا کہ اس روایتِ حدیث سے امام ابوحنیفہؒ اپنا کوئی مفہوم پیش نہیں کرتے بلکہ صرف پیغمبر علیہ السلام کا مفہوم پیش کررہے ہیں اور خود اس

حدیث میں محض ایک جویا اور ناقل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

غرض حضرت شاہ صاحب کے درسِ حدیث میں ایک خصوصیت تو یہ تھی کہ تحدیث واخبار کے سلسلہ میں فقہ حنفی کی تائید ہوتی نظر نہیں آتی تھی، بلکہ فقہ حنفی حدیث سے نکلتا ہوا نظر آتا تھا جس سے حدیث مؤیدِ فقہ نہیں بلکہ منشاءِ فقہ ثابت ہوتی تھی۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ یاد آیا جو اس مقام کے مناسبِ حال ہے اور وہ یہ کہ حضرت شاہ صاحبؒ سے ایک بار ایک مناظرہ میں جو حضرت ممدوح اور ایک عالم اہل حدیث کے مابین ہوا، اہل حدیث عالم نے پوچھا کیا آپ ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں؟ فرمایا نہیں، میں خود مجتہد ہوں اور اپنی تحقیق پر عمل کرتا ہوں۔

اس نے کہا کہ آپ تو ہر مسئلہ میں فقہ حنفی ہی کی تائید کر رہے ہیں پھر مجتہد کیسے؟ فرمایا یہ حسن اتفاق ہے کہ میرا ہر اجتہاد کلیتًا ابوحنیفہ کے اجتہاد کے مطابق پڑتا ہے، اس طرزِ جواب سے سمجھانا یہی منظور تھا کہ ہم فقہ حنفی کو خواہ مخواہ بنانے کے لئے حدیث کا استعمال نہیں کرتے بلکہ حدیث میں سے فقہ حنفی کو نکلتا ہوا دیکھ کر اس کا استخراج سمجھا دیتے ہیں اور طریق استخراج پر مطلع کر دیتے ہیں۔

بہر حال اکابرِ دیوبند کے مذاق کے مطابق حضرت شاہ صاحبؒ مقلد بھی تھے مگر اس تقلید میں محقق بھی تھے۔ وہ مسائل میں پابندِ فقہ حنفی بھی تھے مگر اس پابندی کو مبصرانہ تحقیق سے اختیار کئے ہوئے تھے، جیسے مسئلہ تقدیر میں اہل سنت کا مذہب بندہ کے جبر واختیار کو جمع کر کے یہ کہنا ہے کہ وہ مختار ضرور ہے مگر مجبور فی الاختیار ہے۔ اسی طرح مسائلِ فقہیّہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کا رنگ یہ تھا کہ وہ مقلد ضرور ہیں مگر محقق فی التقلید ہیں اور تمام اجتہادی مسائل میں جہاں تقلید کرتے ہیں وہاں مسائل کی تمام حدیثی اور قرآنی بنیادوں کی تحقیق بھی ذہن میں رکھتے ہیں۔

ایک امریکن مصنف نے اپنی معروف کتاب ''ماڈرن ان انڈیا'' میں زیرِ عنوان ''دیوبند کا اسلام'' اہل دیوبند کا یہی جامع اضداد طریقہ اپنے مختصر عنوان میں اس طرح ادا کیا ہے کہ:

''حیرت ناک بات یہ ہے کہ یہ لوگ (اہل دیوبند) اپنے کو مقلد کہتے ہیں مگر ساتھ ہی ہر مسئلہ کو پورے محققانہ انداز سے کہتے ہیں اور مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے ایسی تنقیح وتحقیق کرتے ہیں کہ اس دعوائے

تقلید کے ساتھ وہ بے ساختہ مجتہد بھی نظر آنے لگتے ہیں''۔ (انتھی بمعناہ)

حاصل اس کا بھی وہی ہے کہ یہ حضرات مجتہد فی التقلید اور محقق فی الاتباع ہیں کورانہ تقلید یا جامد اتباع کے جال میں پھنسے ہوئے نہیں اور لم یخروا علیھا صما و عمیانا کے سچے مصداق ہیں۔

بہر حال یہ عنوان حضرت شاہ صاحبؒ کے درس میں اس لئے کافی بکھرا ہوا نظر آتا تھا کہ ان کا غالب رنگ محدثانہ تھا اور ہر ہر مسئلہ میں حدیثی مسئلہ کی تائید حدیث سے ہی کرتے جاتے تھے۔ لیکن نتیجہ میں پہنچ کر وہ مسئلہ فقہ حنفی کا مسئلہ بن جاتا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس مسئلہ کا منشاء فلاں حدیث ہے جسے امام ابوحنیفہؒ نے باتباعِ حدیث، حدیث سے نکال کر پیش کر دیا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ حضرت ممدوح کے علمی تبحر اور علم کے بحرِ ذخائر ہونے کی وجہ سے درسِ حدیث صرف علومِ حدیث ہی تک محدود نہ رہتا تھا اس میں استطراداً لطیف نسبتوں کے ساتھ ہر علم وفن کی بحث آتی تھی، اگر معانی و بلاغت کی بحث آجاتی تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا علم معانی کا یہ مسئلہ اسی حدیث کے لئے واضع نے وضع کیا تھا۔ معقولات کی بحثیں آجاتیں اور معقولیوں کے کسی مسئلہ کا رد فرماتے تو اندازہ ہوتا کہ یہ حدیث معقولات کے مسئلہ ہی کی تردید کے لئے قلبِ نبوی پر وارد ہوئی تھی۔

غرض اس نقلی اور روایتی فن (حدیث) میں نقل وعقل دونوں کی بحثیں آتیں اور ہر فن کے متعلقہ مقصد پر ایسی سیر حاصل اور محققانہ بحث ہوتی کہ علاوہ بحث حدیث کے وہ فنی مسئلہ فی نفسہٖ اپنی پوری تحقیق کے ساتھ منقح ہو کر سامنے آجاتا تھا۔

سال بھر تک یکسانی کے ساتھ مسائل پر یہ محققانہ بحثیں جاری رہتیں، یہ ضرور تھا کہ ششماہی امتحان کے بعد عصر سے مغرب تک کا وقت طلبہ کا مزید لیتے تھے جس سے رجب کے اواخر تک یعنی امتحان سالانہ شروع ہونے سے پہلے پہلے ترمذی و بخاری یکساں شانِ تحقیق کے ساتھ ختم ہو جاتی تھیں۔

میں نے ان مختلف الانواع تحقیقات کو دیکھ کر ایک املائی کاپی تیار کی، جس کے چوڑے اوراق میں چھ سات کالم بنائے اور ہر کالم کے اوپر والے سرے پر فنون کے عنوان ڈال دیئے، یعنی مباحثِ حدیث، مباحثِ تفسیر، مباحثِ عربیت (نحو صرف) مباحثِ فلسفہ ومنطق، مباحثِ ادبیات (جن

میں اشعارِ عرب اور فصاحت وبلاغت کی بحثیں آتی تھیں) مباحثِ تاریخ وغیرہ، پھر فنونِ عصریہ کے لئے ایک کالم رکھا، کیونکہ موجودہ دور کے فنون جیسے سائنس، فلسفۂ جدید اور ہیئتِ جدید وغیرہ کے مباحث بھی بذیل بحثِ حدیث درس میں آتے تھے۔ میں کالم واران مباحث کو املا کرتا تھا، ان فنی مباحث کے کالموں کے بعد کاپی کے کنارہ کا کالم حضرت ممدوح کی رائے اور محاکمہ کا تھا جس کے سرنامہ پر عنوان تھا قال الاستاذ اس میں وہ فیصلے درج کرلیا کرتا تھا جو مسائل کی تدقیق وتنقیح کے بعد بطورآخری نتیجہ کے حضرت یہ کہہ کرارشادفرمایا کرتے تھے کہ ''میں کہتا ہوں۔''

افسوس کہ یہ بیاض جوتقریباً چارسو پانچ سوصفحہ پر مشتمل تھی، ایک کرم فرما طالب علم نے مستعار مانگی اور میں نے اپنی طالب علمانہ ناتجربہ کاری سے چندروز کے لئے ان کے حوالہ کردی، انہوں نے وہی کیا جو کتاب کو عاریتہً مانگنے والے طلبہ کرتے ہیں۔ یعنی چند دن کے بعد میرے مطالبہ پر فرمایا کہ میں تو دے چکا ہوں آپ کو یاد نہیں رہا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان مغالطّوں سے عاجز ہوکر میں نے اس ذخیرہ سے صبر کرلیا۔ جس کو کافی عرق ریزی اور محنت سے تیار کیا تھا۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ چوری کا یہ علم خود ان کے کام بھی آیا یا ان کے پاس سے بھی یوں ہی نکل گیا جیسے انہوں نے میرے ہاتھ سے نکالا تھا، یہ سانحہ یاد آنے پر میں اس کے سوا اور کیا کہوں کہ اللہ انہیں جزا دے۔

بہرحال حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا درسِ حدیث محض حدیث تک محدود نہ تھا بلکہ فقہ، تاریخ، ادب، کلام، فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضی اور سائنس وغیرہ تمام علومِ جدیدہ وقدیمہ پر مشتمل ہوتا تھا، اوراس لئے اس جامع درس کا طالب علم اس درس سے ہر علم وفن کا مذاق لے کر اٹھتا تھا اور اس میں یہ استعداد پیدا ہوجاتی تھی کہ وہ بضمن کلامِ خدا اور رسول ہر فن میں محققانہ انداز سے کلام کرجائے، یہ درحقیقت درس کی لائن کا ایک انقلاب تھا جو زمانہ کی رفتار کو دیکھ کر الاستاذ الامام الکشمیری نے اختیار فرمایا۔ چنانچہ کبھی کبھی تحدیث بالنعمۃ کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ ''بھائی اس زمانہ کے علمی فتنوں کے مقابلہ میں جس قدر ہوسکا ہم نے سامان جمع کردیا ہے'' بالخصوص فقہ حنفی کے ماخذ ومناشی کے سلسلہ میں حدیثی ذخیرہ کافی ہی نہیں کافی سے زائد جمع فرمادیا۔

پھر بھی قیامِ ڈابھیل کے زمانہ میں آخری سال جس کے بعد پھر درس دینے کی نوبت نہیں آئی

اور وصال ہوگیا، درسِ حدیث میں فقہی و حدیثی تحقیقات کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا، اور ترجیح مذہبِ حنفی اور تطبیق روایات میں عمر بھر کے علم کا نچوڑ پیش فرمایا جس کو املاء کرنے والوں نے املاء کیا۔

''تائید مذہب حنفی'' کے اس غیر معمولی اہتمام کی توجیہ کرتے ہوئے گاہ گاہ فرماتے کہ عمر بھر ابوحنیفہ کی نمک حرامی کی ہے، اب مرتے وقت جی نہیں چاہتا کہ اس پر قائم رہوں، چنانچہ کھل کر پھر ترجیح مذہب کے سلسلے میں اچھوتے اور نادر روزگار علوم ومعارف اور نکات ولطائف ارشاد فرمائے، جس سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ منجانب اللہ آپ پر مذہب حنفی کی بنیادیں منکشف ہوگئی تھیں اور ان میں شرح صدر کی کیفیات پیدا ہو چکی تھیں۔ جس کے اظہار پر گویا آپ مامور یا مجبور تھے، ان علوم ومعارف کے ذخیرہ کو حضرت ممدوح کے دو رشید شاگردوں مولانا محمد یوسف بنوری اور مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی نے الواحِ اوراق میں جمع کر کے اہل علم پر ایک ناقابل مکافات احسان فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ ان دونوں محقق فاضلوں کو جزائے خیر عطا فرمائے اور حضرت شاہ صاحب کی روحانیت سے ان کی نسبت کو زیادہ قوی فرمائے۔ آمین

حضرت ممدوح کا یہ جملہ کہ عمر بھر ابوحنیفہ کی نمک حرامی کی، شاید اس طرف مشیر ہے کہ حضرت ممدوح جہاں روایاتِ حدیث میں تطبیق وتوفیق روایات کا اصول اختیار فرمائے ہوئے تھے وہیں روایاتِ فقہیہ میں بھی آپ کا اصول تقریباً تطبیق وتوفیق ہی کا تھا۔ یعنی مذاہبِ فقہاء کے اختلاف کی صورت میں حنفیہ کا وہ قول اختیار فرماتے جس سے خروج عن الخلاف ہو جائے اور دونوں فقہ باہم جڑ جائیں، اگرچہ قول مفتیٰ بہ بھی نہ ہو اور مسلکِ معروف کے مطابق بھی نہ ہو۔ نظر صرف اس پر تھی کہ دو فقہی مذہبوں میں اختلاف جتنا کم سے کم رہ جائے وہی بہتر ہے، ظاہر ہے کہ اس میں بعض مواقع پر خود امام کا قول بھی چھوٹ جاتا اور صاحبین کا قول زیر اختیار آجاتا تھا، یعنی فقہ حنفی کے دائرے سے باہر نہیں جاتے تھے، مگر ابوحنیفہؒ کے بلا واسطہ قول سے کبھی کبھی باہر نکل جاتے تھے، خواہ بواسطۂ صاحبین ابوحنیفہ ہی کا قول ہو، شاید اس کو حضرت ممدوح نے ابوحنیفہ کی نمک حرامی سے تعبیر فرمایا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخر عمر میں اس توسع سے رجوع کر کے کھلے طور پر مذہب کے معروف ومفتیٰ بہ حصے بلکہ اقوالِ ابی حنیفہؒ کے اختیار وترجیح کی طرف طبیعت آچکی تھی اور یہ بلا شبہ اس کی دلیل ہے کہ امام

ابوحنیفہ کی خصوصیات کے بارہ میں حق تعالیٰ نے انہیں شرح صدر عطا فرمادیا تھا اور وہ بالآخر اسی ٹھیٹھ لکیری پر جم کر چلنے لگے تھے جس پر ان کے شیوخ سرگرمِ رفتار رہ چکے تھے۔

میں نے حضرت شیخ الہندؒ کا مقولہ سنا ہے فرماتے تھے کہ جس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ منفرد ہوتے ہیں اور ائمہ ثلاثہ میں کوئی ان کی موافقت نہیں کرتا اس میں میں ضرور بالضرور پوری قوت سے ابوحنیفہ کا اتباع کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ میں ضرور کوئی ایسا دقیقہ ہے جس تک امام ہی کی نظر پہنچ سکی ہے اور پھر حق تعالیٰ اس دقیقہ کو منکشف بھی فرمادیتا تھا۔ یہ مقولہ امام ابوحنیفہؒ کے اس مسلک کے ذیل میں فرمایا کہ قضائے قاضی ظاہراً و باطناً نافذ ہوجاتی ہے، فرمایا کہ اس مسئلہ میں میں بالضرور ابوحنیفہؒ ہی کی پیروی کروں گا، کیونکہ اس میں صرف امام ہی متفرد ہیں اور یہ تفرد اس کی دلیل ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی ایسی دقیق بنیاد ان پر منکشف ہوئی ہے جہاں تک دوسروں کی نگاہیں نہیں پہنچ سکی ہیں۔

اسی قسم کا مضمون حضرت نانوتوی قدس سرہ' کے بارے میں میں نے حاجی امیر شاہ خاں صاحب مرحوم سے سنا ہے کہ حضرت والا نے مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی سے گفتگو فرماتے ہوئے کہا تھا کہ میں ابوحنیفہ کا مقلد ہوں، صاحبِ ہدایہ اور درمختار کا مقلد نہیں ہوں، اس لئے میرے مقابلہ میں بطور معارضہ جو قول بھی آپ پیش کریں وہ ابوحنیفہ کا ہونا چاہئے، دوسروں کے اقوال کا میں جوابدہ نہیں ہوں گا۔ اس سے بھی یہی نکتہ نکلتا ہے کہ فقہ حنفی میں اصل بنیادی قول ان حضرات کے نزدیک خود امام کا ہوتا تھا اور وہی درحقیقت فقہ حنفی کی اساس ہونے کا حق بھی رکھتا تھا۔

پس ممکن ہے کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ' پر آخری عمر میں یہی نکتہ منکشف ہوا ہو جو ان کے شیوخ پر منکشف ہوا تھا۔ اس کے خلاف توسع کو وہ ابوحنیفہ سے نمک حرامی کرنے کی تعبیر سے اس مقصد کو ظاہر فرمارہے ہوں۔

اسی کے ساتھ درسِ حدیث کے سلسلہ میں مذاہبِ اربعہ کے اختلافات بیان کرتے ہوئے کبھی کبھی مناظرانہ صورتِ حال بھی پیدا ہوجاتی تھی۔ ان مناظرانہ مباحث اور فرعیاتی اختلافات سے کتاب وسنت کے ہزارہا مکنون علوم واشگاف ہوتے تھے جو اس اختلاف کے بغیر حاصل ہونے ممکن نہ تھے، اور پھر ان فرعیات کا تزاحم اور تزاحم کے بعد قولِ فیصل حضرت ممدوح کے قلب ولسان سے

ظاہر ہوتا تو ظرف کی خصوصیات لگ جانے سے عجیب وغریب اور نئے نئے علوم پیدا ہوتے پھر ان تزاحمات میں محاکمہ اور ترجیح کے سلسلہ سے جو تنقیحات بیان ہوتیں وہ خود مستقل علوم ومعارف کا ذخیرہ ہوتی تھیں۔

غرض ایجابی اور سلبی دونوں قسم کے علوم کی نیرنگیاں حلقۂ درس کو ایک رنگین گلدستہ بنائے ہوئے تھیں، جس میں رنگ رنگ کے علمی پھول چنے ہوئے ہوتے تھے۔ تفننِ علوم کی رنگینیوں کے ساتھ آپ کے درس میں ایک خاص شوکت بھی ہوتی تھی۔ کلام میں تمکّن اور قوت، الفاظ میں شوکت وحشمت اور کلام کے وقت حضرت ممدوح کی ہیئتِ کذائی کچھ ایسے انداز کی ہوجاتی تھی جیسے کوئی بادشاہ اپنا حاکمانہ فرمان سنا رہا ہے، بالخصوص ائمہ مجتہدین کے متبعین علماء کے کلام پر بحث وتنقید چھڑ جاتی تو اس وقت معارضانہ اور ناقدانہ کلام کی شوکت اور بھی زیادہ ابھری ہوئی دکھلائی دیتی تھی، نگاہیں تیز ہوجاتیں، آواز قدرے بلند ہوجاتی اور گردن اٹھا کر بولتے تو ایک عجیب پُر شوکت اور رُعب افزا کلام معلوم ہوتا تھا۔

بعض مواقع پر مثلاً حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کے تفردات کا ذکر آتا تو پہلے ان کے علم وفضل اور تفقہ وتبحر کو سراہتے، ان کی عظمت وشان بیان فرماتے اور پھر ان کے کلام پر بحث ونظر سے تنقید فرماتے جس میں عجیب متضاد کیفیات جمع ہوتی تھیں، ایک طرف ادب وعظمت اور دوسری طرف ردّ وقدح یعنی بے ادبی اور جسارت کے ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ سے بھی بچتے اور راجح اور صواب میں کتمانِ صواب سے بھی دور رہتے۔ کبھی کبھی علمی جوش میں آ کر برنگِ مزاح بھی ردّ وقدح فرماتے تھے، جو بجائے خود ہی ایک مستقل علمیہ لطیفہ ہوتا تھا۔

ایک بار غالباً استواء علی العرش کے مسئلہ پر کلام فرماتے ہوئے حافظ ابن تیمیہ اور ان کے مسلک اور دلائل کا تذکرہ آیا تو پہلے اسے شرح وبسط سے بیان فرمایا پھر ان کے علم کی عظمت وشان کو کافی وقیع اور عقیدت بھرے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ حافظ ابن تیمیہ جبالِ علوم میں سے ہیں، ان کی رفعتِ شان اور جلالتِ قدر کا یہ عالم ہے کہ اگر میں ان کی عظمت کو سر اٹھا کر دیکھنے لگوں تو ٹوپی پیچھے کی طرف گر جائے گی اور پھر بھی نہ دیکھ سکوں گا، لیکن بایں ہمہ مسئلہ استواء علی العرش میں وہ

اگر یہاں آنے کا ارادہ کریں گے تو درس گاہ میں نہیں گھسنے دوں گا، یا کبھی ان اکابر متقدمین کے کسی موہم یا شرح طلب کلام کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے کہ ہر شخص اپنی ہی جلالتِ شان کے مطابق کلام کرتا ہے، اسے کیا خبر ہوتی ہے کہ بعد میں ہم جیسے گھس کھدے بھی آنے والے ہیں جو اس کلام کی عظمت میں غلطاں وپیچاں ہو کر رہ جائیں گے۔

بہر حال درس کا انداز ایک عجیب نیرنگی کا رنگ لئے ہوئے تھا جو بالکل انوکھی تھی، جس میں علوم وفنون بھی ہوتے تھے، تائید وتنقید بھی ہوتی تھی، علوم ومعارف کے ساتھ علمی مزاح اور لطائف وظرائف بھی ہوتے تھے، جس سے ہر استعداد کا طالب علم لطف اندوز ہوتا تھا، حتیٰ کہ کبھی کبھی خود طلبہ کے ساتھ علمی رنگ کا مزاح فرما لیتے تھے۔

عصر مغرب کے درمیان ایک دن بخاری کا درس زور وشور سے ہو رہا تھا، احقر بھی اس سال بخاری میں تھا اور شریکِ درس بھی تھا کہ اچانک کتاب بند کر دی اور فرمانے لگے کہ جب بھائی شمس الدین رخصت ہو گئے تو اب درس کا کیا لطف رہا، جاؤ تم بھی گھر کا رستہ لو۔

ہم سب حیران ہوئے کہ کون بھائی شمس الدین اور وہ آئے کب تھے اور رخصت کب ہو گئے؟ ہماری حیرانی کو دیکھ کر سورج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو غروب ہو رہا تھا فرمایا کہ جاہلین دیکھتے نہیں، وہ بھائی شمس الدین جا رہے ہیں، اب کیا اندھیرے میں سبق پڑھو گے؟ کیا وہ لطف کا سبق ہو گا؟

ایک بار پچھلی صف میں سے کسی طالب علم نے سوال کیا مگر مہمل انداز سے فرمایا کہ جاہل تجھے معلوم نہیں کہ میں اسنادِ متصل کرنا بھی جانتا ہوں، جانتا ہے کس طرح اسناد متصل ہو گی؟ میں اس اپنے پاس والے کو تھپڑ ماروں گا وہ اپنے پاس والے کو مارے گا وہ اپنے پاس والے کو رسید کرے گا، یہاں تک کہ تھپڑ کا یہ فعلی سلسلۂ سند تجھ تک پہنچ جائے گا۔ یہ تہدید بھی تھی اور حکیمانہ رنگ سے فنی اصلاحات میں ایک مزاح بھی تھا، جس سے طلبہ کی تنشیط (نشاط میں لانا) مقصود تھا۔

ایک دفعہ مسائلِ فقہیّہ کے ذیل میں نابالغ کی امامت کا ذکر آ گیا کہ اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی، فرمانے لگے کہ مسئلہ تو یہی ہے مگر بعض نابالغوں کے پیچھے ہو بھی جاتی ہے (اس زمانہ میں

حضرت ممدوح ہی مسجد دارالعلوم میں امامت کرتے تھے) فرمانے لگے کہ تم نے کبھی پیر نابالغ کو بھی دیکھا ہے؟ جو ساٹھ برس کا بھی ہو اور نابالغ بھی؟ جاہلین وہ ساٹھ برس کا نابالغ میں ہوں (اس وقت تک حضرت ممدوح کی شادی نہیں ہوئی تھی) اشارہ اسی طرف تھا۔

ایک دفعہ ملا علاء الدین میرٹھی جو اس زمانہ میں قلفی کا برف بیچا کرتے تھے اور آج کل وہ دودھ مٹھائی کی دوکان کرتے ہیں، نہایت دیندار اور وضع دار آدمی ہیں، قلفی برف کا مٹکا لے کر دارالاہتمام میں پہنچ گئے جہاں حضرت والد ماجد کے پاس اس وقت حضرت شاہ صاحب اور چند اکابر مدرسین تشریف فرماتھے۔ حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ملاجی کو روک کر برف کی قلفیاں کھولنے کے لئے فرمایا، یہ سب حضرات قلفیاں تناول فرماتے رہے، کھانے کے دوران میں حضرت شاہ صاحب نے ملاجی سے پوچھا کہ آپ اس برف کی تجارت میں ماہانہ کتنا پیدا کر لیتے ہیں؟ کہا کہ ساٹھ روپیہ ماہوار۔ اس زمانہ میں حضرت شاہ صاحب کی تنخواہ بھی ساٹھ روپیہ ماہوار تھی۔ مسکرا کر فرمانے لگے تو پھر تمہیں دارالعلوم کی صدر مدرسی کی ضرورت نہیں۔

بہر حال حضرت شاہ صاحب کا حلقۂ درس اور ساتھ ہی دوسری مجالس علم وکمال کے ساتھ ظرافت سے بھی معمور ہوتی تھیں جو اُن کی زندہ دلی اور فقہِ نفس کی دلیل تھی، اور اس ذیل میں کتنے ہی علوم ومعارف بیساختہ نکلے ہوئے اربابِ مجلس کے ہاتھ پلے پڑ جاتے تھے۔ مگر اس کے باوجود مجلس شرعی آداب سے بھرپور ہوتی تھی جس میں غیر متعلق یا فضول اور لایعنی باتوں کا کوئی وجود نہ ہوتا تھا۔

اگر کسی شخص نے کسی کی برائی یا فضول بات شروع کی تو معاً فرماتے کہ بھائی ہمیں اسکی فرصت نہیں ہے، کوئی مسئلہ پوچھنا ہو تو پوچھو ورنہ جاؤ، ہمارا وقت ایسی باتوں کے لئے فارغ نہیں۔ وقت کی بہت زیادہ قدر اور حفاظت فرماتے تھے۔

اوقات کا بڑا حصہ مطالعۂ کتب میں گذرتا تھا، ذوقِ مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ طبعی اور شرعی ضروریات کے علاوہ کوئی وقت کتب بینی یا افادہ سے خالی نہ رہتا تھا۔ ایک دفعہ فرمایا کہ فتح الباری کا (جو تیرہ جلدوں کی کتاب ہے) تیرہویں مرتبہ مطالعہ کر رہا ہوں اور یہ بھی فرمایا کہ میں درس کے لئے کبھی مطالعہ نہیں دیکھتا، مطالعہ کا مستقل سلسلہ ہے اور درس کا مستقل، اس لئے ہر سال درس میں نئی نئی

تحقیقات آتی رہتی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس درس کے لئے مطالعہ کی ضرورت کیا تھی جب وقت کے تمام گوشے مطالعہ سے پر تھے، گویا مطالعہ لامحدود تھا تو محدود مطالعہ کی ضرورت بھی کیا تھی؟ کتبِ درسیہ اور بالخصوص کتبِ حدیث کے فنی مباحث طبیعتِ ثانیہ بن چکے تھے اور ہمہ وقت کے مطالعہ سے ان میں روز بروز بسط وانبساط کی کیفیات پیدا ہوتی چلی جارہی تھیں اور مباحثِ درس گھٹنے یا قائم رہنے کے بجائے خود ہی یوماً فیوماً بڑھتے رہتے تھے، تو انہیں جزوی مطالعہ سے بڑھانے کے کوئی معنی بھی نہ تھے۔ بلکہ شاید یہ مقررہ جزوی مطالعہ علوم کے بڑھتے ہوئے بسط میں کچھ نہ کچھ حارج اور حد بندی ہی کا سبب بن جاتا۔

پھر یہ عام مطالعہ محض کتبِ درسیہ یا شروح وحواشی اور منہیاتِ درس تک ہی محدود نہ تھا بلکہ تمام فنون کی ہر میسر آمدہ کتاب تک پھیلا ہوا تھا، جن میں کسی علم وفن کی تخصیص نہ تھی۔ ذہن کسی ایک فن کے ساتھ مقید نہ تھا بلکہ مطلقاً علم کے بارے میں ھل من مزید کا ذوق رکھتا تھا اور حدیث ''منھو مان لا یشبعان'' کا صحیح مصداق تھا۔

مصر تشریف لے گئے تو اوقات کا بڑا حصہ کتب خانہ خدیویہ کی کتب کے مطالعہ میں صرف ہوتا، حجاز حاضر ہوئے تو حرمین کے کتب خانے کنگھال ڈالے اور فرائض وتطوعات کے بعد گویا آپ کی عبادت یہ تبحر اور کتب بینی تھی۔ مرضِ وفات میں اطباء نے مطالعہ کی ممانعت کردی لیکن جب بھی موقع ملا جب ہی کتب بینی شروع کردی، اطباء نے کہا کہ حضرت اس سے مرض بڑھ جائے گا، فرمانے لگے کہ بھائی یہ کتب بینی خود ہی میرا مستقل مرض ہے اور لا علاج ہے۔ مطالعہ کے سلسلہ میں فنونِ عصریہ فلسفۂ جدید حتیٰ کہ فن رمل اور جفر کی کتابوں کو بھی مطالعہ سے نہ چھوڑا۔

جب بھوپال شادی کے سلسلے میں تشریف لے گئے تو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی ایک جماعت نے عصری فنون کی کچھ بحثیں چھیڑ دیں، آپ نے انھی فنون کی اصطلاحات میں بحوالۂ کتب جوابات دیئے اور فرمایا کہ یہ نہ سمجھنا کہ ہم لوگ اس فن سے نابلد ہیں، ہم ان عصری فنون کی کتابوں کا مطالعہ بھی کافی کئے ہوئے ہیں اور ان فنون کی بنیادوں کو بھی جانتے ہیں، یہی صورت مسائلِ حاضرہ کے مطالعہ کی بھی تھی۔

سفر پنجاب کے سلسلہ میں جب لاہور پہنچے تو یہ زمانہ سود کی تحریک کا تھا، مسلمانوں کی ایک جماعت اقتصادی وجوہ سے سودی بینکوں کا قیام مسلمانوں کے لئے ضروری سمجھ رہی تھی۔ مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری رسالہ ''سود مند'' نکال رہے تھے اور جواز کا پرچار شدومد سے کیا جارہا تھا۔ لاہور پہنچنے پر حضرت کی قیام گاہ پر لوگ ملنے کے لئے آنے لگے، مجمع ہوگیا۔ مولانا ظفر علی خاں بھی آگئے اور جوازِ سود کے بارے میں اقتصادی دلائل سے بھری ہوئی ایک تقریر کی جس میں ضرورتِ سود پر کلام کیا گیا تھا۔

مقصد یہ تھا کہ حضرت ممدوح بھی اس کی تائید میں کچھ فرمادیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے ساری بسیط تقریر سن کر جواب میں فرمایا کہ بھائی جسے جہنم میں جانا ہو وہ خود جائے ہماری گردن کو پل نہ بنائے کہ اس سے لانگھ کر پہنچے، اور اس کے بعد سودی کاروبار کے مضرات اور اس تحریک کے غلط ہونے پر سیر حاصل بحث فرمائی جس سے لوگوں کے خیالات کی کافی حد تک اصلاح ہوئی۔

علامہ اقبال مرحوم کے خیالات کی بہت حد تک اصلاح حضرت ممدوح کے ارشادات سے ہوئی، ان کے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط سوالات وشبہات سے پُر آتے تھے اور حضرت ان کے شافی جوابات لکھتے جس سے ان کے قلب کی راہ بنتی چلی گئی۔

غرض کثرتِ مطالعہ صرف درسی علوم کی کتب تک محدود نہ تھا، عصری علوم وفنون کا مطالبہ بھی جاری رہتا تھا، جس سے نوتعلیم یافتہ نوجوان طبقہ بھی مرعوب اور مستفید تھا۔

میں نے ۱۳۵۲ھ میں اپنے ایک عربی قصیدے ''نونیة الاحاد'' کے طبع کرانے کا ارادہ کیا۔ اس قصیدہ میں امت کے مشاہیر علم وفن کی مختصر سوانح نظم ونثر میں جمع کی گئی ہے، جسے اس زمانہ میں طبع کرایا گیا تھا، اور اب چھوٹی خوبصورت تقطیع پر برخوردار مولوی حافظ قاری محمد اسلم سلمہٗ نے اپنے ادارہ تاج المعارف کی طرف سے دوبارہ طبع کرایا ہے۔ اس قصیدہ میں ابوالحسن کذاب کا نام بھی مشاہیر کے سلسلے میں آیا ہے کہ یہ صفتِ کذب اور دروغ گوئی میں مشہور اور یکتائے روزگار تھے، مجھے ان کی تاریخ نہ ملی جو اس قصیدہ میں درج کرتا۔ اس صورت میں ہم لوگوں کی آخری دوڑ یہ ہوتی تھی کہ حضرت شاہ صاحب تک پہنچ جاتے تھے اور اس سلسلہ میں بلامحنت ومشقت علم کا نایاب اور وسیع ذخیرہ

لے کر گھر آ جاتے تھے جو برسہا برس کے ذاتی مطالعہ سے بھی حاصل ہونا دشوار تھا۔

میں اپنے اس معمول بہ دستور کے مطابق حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں ان کے دولت خانے حاضر ہوا، مرضِ وفات اپنی آخری حد پر پہنچ چکا تھا اور دو تین ہفتہ بعد ہی وصال ہونے والا تھا، کمزور بے حد ہو چکے تھے لیٹنے بیٹھنے میں بے حد تکلف ہوتا تھا، اطلاع کرنے پر مجھے حسبِ معمول گھر میں بلا لیا اور عادت تھی کہ جب بھی میں پہنچتا تو کسی نہ کسی چیز سے تواضع فرماتے۔ فوراً چائے بنانے کا حکم دیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت ممدوح کا دارالعلوم سے کوئی تعلق نہیں تھا، اور میں اس زمانہ میں عہدۂ اہتمام دارالعلوم پر تھا، لیکن حضرت ممدوح کے اس رسمی تعلق کے انقطاع بلکہ اس سے بھی پہلے فتنۂ ۱۳۴۲ھ کے زمانہ میں میرا تعلق ان سے وہی رہا جو پہلے تھا، حتیٰ کہ آمد و رفت بھی منقطع نہیں ہوئی۔ اسے حضرت شاہ صاحبؒ بھی محسوس فرماتے اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے، پھر یہ تعلق کوئی رسمی یا دنیوی نہ تھا جو قطع ہو جاتا بلکہ روحانی تھا اور قدیم تھا جو ناممکن الانقطاع تھا، گو درمیانی مدت میں قضا و قدر سے وہ مستور اور مغلوب سا ہو گیا تھا اور تکوینی طور پر اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِيْ فتنہ زا منظر کا ظہور ضرور ہوا، تاہم یہ سب سطحی بات تھی قلبی طور پر محبت و عقیدت کا علاقہ بدستور قائم تھا اور اس میں جتنا کچھ رخنہ پڑ گیا تھا مرورِ ایام سے اس میں بھی اضمحلال آ چکا تھا، اس لئے از اول تا آخر میرے لئے حضرت ممدوح کے قلب مبارک میں کافی گنجائش تھی جس کا ظہور میری گاہ بگاہ حاضری پر ہوتا رہتا تھا، اس موقع پر بھی حسبِ معمول اس بزرگانہ شفقت سے پیش آئے، چائے وغیرہ سے فراغت کے بعد متوجہ ہوئے، فرمایا مولوی صاحب کیسے تشریف لائے؟

میں نے عرض کیا حضرت! ابوالحسن کذاب کا ترجمہ نہیں ملتا اس کے بارے میں نشان معلوم کرنے حاضر ہوا ہوں، فرمایا ادب و تاریخ کی کتابوں میں فلاں فلاں مواقع کا مطالعہ کر لیجئے، تقریباً آٹھ دس کتابوں کے نام لے دیئے، اور ان کے مظان و مواقع کی نشاندہی فرما دی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے اس شخص کی پوری تاریخ معلوم کرنی نہیں ہے صرف اس کی صفتِ کذب و دروغ گوئی کے حالات معلوم کرنے ہیں، مگر ان کا کوئی عنوان کسی کتاب میں نہیں ملتا کہ اس کے نیچے ان خاص واقعات کا مطالعہ کر لوں۔

فرمایا مولوی صاحب آپ نے بھی کمال کیا، صفت کذب کونسی صفتِ مدح ہے کہ لوگ اس پر عنوانات قائم کرکے اس کے واقعات دکھلائیں، ایسی مذموم صفات وافعال کا تذکرہ ضمناً اور استطراداً آجاتا ہے، عنوان ہمیشہ کمالات پر قائم کئے جاتے ہیں نہ کہ نقائص وعیوب پر، ان کتب میں فلاں فلاں مقام دیکھ لیجئے، ضمناً اس کی صفتِ کذب کا بھی تذکرہ کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گا۔

میں نے عرض کیا کہ حضرت! مجھے تو کتابوں کے اتنے اسماء بھی یاد نہ رہیں گے چہ جائیکہ ان کے مظان اور مواقع محفوظ رہیں۔ نیز انتظامی مہمات کے بکھیڑوں میں اتنی فرصت بھی نہیں کہ چند جزوی مثالوں کیلئے اتنا طویل وعریض مطالعہ کروں، بس آپ ہی اس شخص کے کذبات اور دروغ گوئی سے متعلقہ واقعات کی دو چار مثالیں بیان فرمادیں، میں انہیں کو آپ کے حوالہ سے جزوِ کتاب بنادوں گا۔ اس پر مسکرا کر ابوالحسن کذاب کی تاریخ اس کے سن ولادت سے سن وار بیان فرمانی شروع کردی جس میں اسکے جھوٹ کے عجیب وغریب واقعات بیان فرماتے رہے، آخر میں سنِ وفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ شخص مرتے مرتے بھی جھوٹ بول گیا، پھر اس جھوٹ کی تفصیل بیان فرمائی۔

حیرانی یہ تھی کہ یہ بیان ایسے طرز سے ہورہا تھا کہ گویا حضرت ممدوح نے آج کی شب میں مستقلاً اسی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے جو اس بسط سے سن وار واقعات بیان فرمائے ہیں۔

میں نے تعجب آمیز لہجہ میں عرض کیا کہ حضرت شاید کسی قریبی ہی زمانہ میں اس کی تاریخ دیکھنے کی نوبت آئی ہوگی؟ سادگی سے فرمایا جی نہیں، آج سے تقریباً چالیس سال کا عرصہ ہوتا ہے جب میں مصر گیا ہوا تھا، خدیوی کتب خانہ میں مطالعہ کے لئے پہنچا، اسی میں ابوالحسن کذاب کا ترجمہ سامنے آگیا اور اس کا مطالعہ دیر تک جاری رہا۔ بس اسی وقت جو باتیں کتاب میں دیکھیں حافظہ میں محفوظ ہوگئیں اور آج آپ کے سوال پر مستحضر ہوگئیں، جن کا میں نے اس وقت تذکرہ کیا۔

اللہ اکبر! یہ واقعات حدیث وتفسیر اور فقہ واصول کے ان مباحث سے تعلق نہ رکھتے تھے جو ان کے متداول فنون اور روزمرہ کے مشاغل میں سے تھے، بلکہ ایک غیر متعلق بات اور وہ بھی چالیس سالہ مدت کی ذہن میں آئی ہوئی اور اوپر سے وہ بھی کسی اہتمام سے نہیں محض اتفاقی طور پر اور سرسری انداز سے ذہن میں آئی ہوئی چیز تھی، اس کا اتنا استحضار عام معتاد حافظہ سے بالاتر کرامتی حافظہ سے

ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ جس علم وفن میں بھی گفتگو فرماتے تبحر واستحضار کی یہی نوعیت ہوتی تھی، کہ گویا اس مسئلہ کو ابھی دیکھ کر اور ذہن میں سمیٹ کر آرہے ہیں۔ مولانا احمد سعید صاحبؒ صدر جمعیۃ علماء دہلی کا حضرت ممدوح کو ''چلتا پھرتا کتب خانہ'' کہنا حقیقتاً اظہارِ حقیقت پر مبنی ہے اور حضرت ممدوح اس لقب کے جائز طور پر ہی نہیں بلکہ واجبی طور پر مستحق ہیں۔

وفورِ مطالعہ اور اس کے ساتھ قوتِ حافظہ ایسا ہی ہے جیسے سرمایہ دار سرمایہ کے ساتھ سخی دل بھی ہو، بخیل سرمایہ دار ہو تو بے فیض اور بے نتیجہ ہے۔ جیسے بعض کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے لیکن قوتِ حافظہ نہ ہونے کے سبب ان کا وقتی شوقِ مطالعہ تو پورا ہو جاتا ہے مگر خود ان کو یا دوسروں کو اس مطالعہ کی کاوشوں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کا جس درجہ مطالعہ وسیع تھا اسی درجہ حافظہ بھی قوی تھا۔ گویا ذہن وحافظہ ہر وقت تیار رہتا تھا کہ آنکھیں یا کان کچھ لائیں تو وہ فوراً اسے جمع کر لیں، بلاشبہ حضرت ممدوح کے اس غیر معمولی حافظہ سے حفاظِ سلف کی یاد تازہ ہوتی تھی، انہیں غیر متداول بلکہ غیر معروف کتب کی عبارتیں بھی اس درجہ مستحضر رہتی تھیں کہ وقت پڑنے پر بے تکلف پیش کر دیا کرتے تھے، اور علماء حیرت زدہ ہو کر رہ جاتے تھے۔

تحریکِ خلافت کے دور میں جب امارتِ شرعیہ کا مسئلہ چھڑا تو مولوی سبحان اللہ خاں صاحب گورکھپوری نے اس مسئلہ میں اپنے بعض نقاطِ نظر کی تائید میں بعض سلف کی عبارت پیش کی جو ان کے نقطۂ نظر کی تو مؤید تھی مگر مسلکِ جمہور کے خلاف تھی، یہ عبارت وہ لے کر خود دیوبند تشریف لائے اور مجمع علماء میں اسے پیش کیا، تمام اکابر دارالعلوم حضرت شاہ صاحب کے کمرہ میں جمع تھے۔ حیرانی یہ تھی کہ نہ اس عبارت کو رد ہی کر سکتے تھے کہ سلف میں سے ایک بڑی شخصیت کی عبارت تھی اور نہ اسے قبول ہی کر سکتے تھے کہ مسلکِ جمہور کے صراحۃً خلاف تھی۔ یہ عبارت اتنی واضح اور صاف تھی کہ اسے کسی تاویل وتوجیہ سے بھی مسلکِ جمہور کے مطابق نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حضرت شاہ صاحب استنجاء کے لئے تشریف لے گئے تھے، وضو کے لئے واپس ہوئے تو اکابر نے عبارت اور مسلک کے تعارض کا تذکرہ کیا اور یہ کہ ان دونوں باتوں میں تطبیق وتوفیق نہیں بن پڑتی۔ حضرت ممدوح حسبِ عادت

حسبنا اللہ کہتے ہوئے بیٹھ گئے اور عبارت کو ذرا غور سے دیکھ کر فرمایا کہ اس عبارت میں جعل اور تصرف کیا گیا ہے اور دو سطروں کو ملا کر ایک کر دیا گیا ہے، درمیان کی ایک سطر چھوڑ دی گئی ہے۔ اسی وقت کتب خانہ سے کتاب منگائی گئی، دیکھا گیا تو واقعی اصل عبارت میں سے پوری ایک سطر درمیان میں سے حذف ہوئی تھی، جوں ہی اس ساقط کردہ سطر کو عبارت میں شامل کیا گیا عبارت کا مطلب مسلکِ جمہور کے موافق ہو گیا اور سب کا تحیر رفع ہو گیا۔

بہر حال حافظہ وانتقالِ ذہنی کے لحاظ سے حضرت ممدوح آیۃ من آیات اللہ تھے، جس کی نظیر ان قریبی زمانوں میں نہیں ملتی۔ حضرت ممدوح کی اس تبحر پسندی اور ذوقِ زیادتِ علم کا نتیجہ یہ تھا کہ طلباء میں بھی وہی ذوقِ تبحر پیدا ہونے لگا، ہر طالب علم کوشش کرتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ کتب کا مطالعہ کرے، زیادہ سے زیادہ تحقیق کے ساتھ مسئلہ کی تہہ تک پہنچے، اس دور میں ہر چھوٹے بڑے کا یہ ذہن بن گیا تھا اور اس کے آثار زمانہ طالب علمی ہی میں نمایاں ہونے لگے تھے۔

چنانچہ اس زمانہ کے متعدد طلبائے دورۂ حدیث نے اچھے اچھے قابل قدر رسالے اور مضامین سے اپنے علمی تبحر کا ثبوت دیا، میں نے ادب وتاریخ کے سلسلہ میں رسالہ ''مشاہیر امت'' لکھا، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب حال ساکن پاکستان نے ''**ختم النبوۃ فی القرآن**'' اور ''**ختم النبوۃ فی الحدیث**'' کا رسالہ دو جلدوں میں مرتب کیا، مولانا ادریس کاندھلوی نے ''**التصریح بما تواتر فی نزول المسیح**'' لکھا، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی نے بھی کئی رسالے لکھے، اور تقریباً دو تین سال کے عرصہ میں احاطۂ دار العلوم سے اٹھارہ انیس رسالے شائع ہوئے۔

یہ درحقیقت وہی ذوق تھا جو حضرت ممدوح کے درسِ حدیث سے طلبہ لے کر اٹھتے تھے اور علمی طور پر اپنے اندر زمانہ طالب علمی ہی میں ایک ایسی قوت محسوس کرنے لگتے تھے کہ گویا وہ تمام علوم و فنون پر حاوی ہیں اور علم ان کے اندر سے خود بخود ابھر رہا ہے، وہ کتب بینی محض عنوان تلاش کرنے کے لئے کر رہے ہیں۔

حضرت ممدوح کے یہاں علم کے اس غیر معمولی شغف وانہماک و ہمہ وقت کے شغل کے باوجود عمل بالسنۃ اور اتباعِ سلف کے اہتمام میں ذرہ برابر بھی کمی اور کوتاہی نہ ہوتی تھی۔ ہم بہت سی سنتیں

ان کے عمل کو دیکھ کر معلوم کرلیا کرتے تھے۔کھانا کھانے کے بعد تولیہ یا رومال سے ہاتھ پونچھنے کے بجائے ہمیشہ حسبِ معمولِ نبویؐ پاؤں کے تلوؤں سے ہاتھ پونچھ لیتے تھے۔اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے،کھانے میں ہمیشہ تین انگلیاں استعمال کیا کرتے تھے،اور دونوں ہاتھ مشغول رکھتے تھے،بائیں ہاتھ سے روٹی اور داہنے ہاتھ سے اسے توڑ توڑ کر استعمال کرتے تھے،لقمے ہمیشہ چھوٹے چھوٹے استعمال کیا کرتے تھے۔

یہی صورت لباس کی تھی، پاجامہ نیم ساق سے کبھی نیچا نہ ہوتا تھا،عمامہ کا استعمال زیادہ ہوتا تھا،سردیوں میں اکثر و بیشتر سبز یا سیاہ رنگ کا عمامہ استعمال فرماتے تھے،زہد وتقویٰ حضرت ممدوح کے روشن اور کھلے ہوئے چہرے پر برستا تھا۔ایک غیر مسلم شخص نے کسی موقعہ پر حضرت ممدوح کا سرخ وسفید رنگ، کشادہ پیشانی اور ہنس مکھ چہرے نیز چہرہ کی مجموعی وجاہت وعظمت کو دیکھ کر کہا تھا کہ:

"اسلام کے حق ہونے کی ایک مستقل دلیل یہ چہرہ بھی ہے"۔

جمعہ کے لئے جاتے تو فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ کا منظر سب کو نظر آتا،سعی اور دوڑ کی شان تیز رفتار اور لمبے لمبے قدم ڈالنے کی چال سے نمایاں ہوتی تھی۔حسبنا اللّٰہ تکیۂ کلام تھا،اٹھتے بیٹھتے اکثر و بیشتر حسبنا اللّٰہ فرماتے اور ایسے ہی موقعہ بموقعہ اللّٰہ اجل فرماتے رہتے تھے۔درس میں بعض اوقات غایتِ خشیت سے آنکھوں میں نمی آجاتی، جسے ضبط کرنے کی کوشش کرتے تھے۔انشاء وقصائد اور وعظ میں خوف وخشیت کے اشعار اکثر تر آنکھوں کے ساتھ پڑھتے جس سے چہرہ مظہر خشیتِ الٰہی نظر آتا تھا اور سامعین کی آنکھیں تر ہوجاتی تھیں۔ٹھیک طریقۂ نبوی کے مطابق کن انکھیوں سے نہ دیکھتے اور جدھر متوجہ ہوتے پورے متوجہ ہوتے تھے۔

ادبِ علم کا یہ عالم تھا کہ خود ہی فرمایا کرتے تھے کہ میں مطالعہ میں کتاب کو اپنا تابع کبھی نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ خود کتاب کے تابع ہو کر مطالعہ کرتا ہوں۔چنانچہ سفر وحضر میں ہم لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ لیٹ کر مطالعہ کررہے ہوں یا کتاب پر کہنی ٹیک کر مطالعہ میں مشغول ہوں، بلکہ کتاب کو سامنے رکھ کر مؤدب انداز سے بیٹھتے،گویا کسی شیخ کے آگے بیٹھے ہوئے استفادہ کررہے ہیں۔

یہ بھی فرمایا کہ"میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک دینیات کی کسی کتاب کا مطالعہ

بے وضو نہیں کیا'' سبحان اللہ! کہنے کو تو یہ بات بہت چھوٹی سی نظر آتی ہے لیکن اس پر استقامت اور دوام ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ وہی کر سکتا ہے جسے حق تعالیٰ نے ایسے کاموں کے لئے مؤفق اور میسر کر دیا ہے، اور وہ گویا بنایا ہی اس لئے گیا ہے کہ اس سے دینی آداب کے عملی نمونے پیش کرائے جائیں۔ کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہٗ۔

ہر کسی را بہر کارے ساختند　　میل اورا در ولیش انداختند

ادبِ شیوخ واکابر کا یہ عالم تھا کہ ان کے سامنے کبھی آنکھ اٹھا کر یا آنکھ ملا کر گفتگو نہ فرماتے۔

فتنہ ۱۳۴۲ھ میں جب معاملہ حدود سے بڑھنے لگا اور حضرت ممدوح نے مدرسہ میں آنا اور درس دینا چھوڑ دیا جس سے طلبہ میں انتشار پھیل گیا اور اسٹرائک کی صورت پیدا ہوئی تو حضرت والد ماجدؒ نے بلا واسطہ اس مسئلہ کو سلجھانے کی سعی فرمائی اور ایک دن اچانک صبح کے وقت حضرت ممدوح کے مکان پر تن تنہا پہنچ گئے۔ اطلاع ہونے پر ایک دم گھبرا کر حضرت ممدوح باہر تشریف لائے اور اسی سابقہ نیاز مندی کے ساتھ بہت ہی مؤدبانہ انداز سے پردہ کرا کر گھر میں لے گئے، گردن جھکا کر عرض کیا کہ حضرت اس وقت اچانک کیسے تکلیف فرمائی؟

حضرت والد ماجد نے فرمایا کہ حضرت مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میرا بھی آپ پر کوئی حق ہے؟ فرمایا ہے۔ اور یہ ہے کہ اگر آپ میری کھال کی جوتیاں بنا کر پہنیں تو مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔ والد ماجد نے فرمایا کہ بارک اللہ! بس تو میری گذارش یہ ہے کہ آپ ان قصوں کو چھوڑ دیں اور مدرسہ چلیں اور میرے ساتھ چلیں، فرمایا بہت اچھا حضرت نے چند معاملات پیش فرمائے کہ حضرت انہیں یوں کر دیا جائے۔

والد ماجد نے فرمایا کہ آپ کا منصب مطالبہ کرنے کا نہیں، مطالبے پورے کرنے کا ہے، آپ اپنے قلم سے جو مناسب سمجھیں چل کر خود کر دیں، اس پر ساتھ ہو لئے اور مدرسہ میں پہنچ گئے۔ سب کو حیرت اور بے انتہا مسرت ہوئی کہ سارا فتنہ ختم ہو گیا، والد ماجد نے فرمایا کہ یہ سب مطالبے آپ خود ہی جاری کر دیں اور درس شروع کرا دیں۔ فرمایا کہ حضرت اتنی اجازت دیں کہ ظہر کے بعد حاضر ہو کر درس شروع کروں، فرمایا مضائقہ نہیں۔ حضرت ممدوح تشریف لے گئے مگر پھر ظہر کے بعد

تشریف نہیں لائے اور معلوم ہوا کہ لوگوں نے مجبور کر کے روک دیا۔ مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ زمانہ اختلاف میں ادب وتوقیر اور تسلیم ورضا کا بذات خود یہ عالم تھا جو اس واقعہ میں آپ نے دیکھا۔

تقریری افادہ کے ساتھ تحریری افادہ یعنی تصنیف کا بھی آپ میں کافی ذوق تھا، حدیث میں متعدد نافع اور نادرۂ روزگار رسالے تالیف فرمائے اور علمی ترکہ میں چھوڑے جیسے ''**نیل الفرقدین فی مسئلة رفع الیدین، فصل الخطاب فی مسئلة ام الکتاب، رفع السترعن مسئلة الوتر، اکفار الملحدین، خاتم النبیین** (فارسی) مرضِ وفات میں رو کر فرمایا کہ ہم نے عمر ضائع کی اور کوئی کام آخرت کے لئے نہ کیا، یہ رسالہ ''خاتم النّبیین'' اس لعین قادیانی کے رد میں لکھا ہے، توقع ہے کہ شاید یہ رسالہ میری نجات کا ذریعہ ہو جائے۔

دارالعلوم کے سنینِ قیام میں سے تقریباً اواخر سنین میں کلامی مسائل کی طرف توجہ ہوئی، ابتدائی ایام میں کلامی مسائل میں زیادہ ذوق سے کلام نہیں فرماتے تھے، نقل وروایت کا غلبہ تھا آخر عمر میں یہ ذوق ابھرا تو خارج اوقات میں دوپہر کے ابتدائی حصہ میں کتاب شروع کرائی۔ احقر بھی اس میں شریک تھا، اس میں بالخصوص حضرت نانوتوی قدس سرہ' کی کتب کے حوالہ سے کلامی مسائل میں ان کے علوم بیان فرماتے اور ان کی شرح فرماتے اور آخر کار ان علوم کے عنوانات منضبط کرنے کے لئے عربی کا ایک بلیغ قصیدہ خود ہی موزوں فرمایا جو ''ضرب الخاتم علی حدوث العالم'' کے نام سے چھپ چکا ہے، اس کے ایک ایک شعر میں بہت سے مسائل کھپا دیئے ہیں، ساتھ ہی ان کی تشریحات کے لئے مآخذوں کے حوالے دیتے گئے ہیں، جن میں تمام کتبِ معقول وفلسفہ کے حوالوں کے ساتھ علومِ قاسمیہ کی کتب مثلاً تقریر دل پذیر، انتصار الاسلام، مباحثہ شاہ جہانپور وغیرہ کے حوالے بکثرت ملتے ہیں۔ خط نہایت پاکیزہ تھا، حروف موتیوں کی طرح کاغذ پر جڑے ہوئے نظر آتے تھے اور بہت خوبصورت ہوتے تھے۔ باریک قلم سے لکھتے تھے اور مختصر نویسی کے ساتھ لکھنے کی عادت تھی، اکثر تحریریں اشارات ہوتے تھے جن کو صاحبِ ذوق ہی سمجھ سکتا تھا۔

فنِ ادب اور شاعری کا ذوق بہت بلند پایا تھا، دارالعلوم میں عام اجتماعات یا کسی بڑی شخصیت کے قدوم یا کسی اہم حادثہ کے وقوع پر قصائد قلم بند فرماتے اور انہیں مجمع میں سناتے، پڑھنے کا طرز

نہایت دلکش تھا، ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے جس سے سامعین پر گہرا اثر پڑتا تھا۔ عربی اور فارسی کی بلاغت اعلیٰ مقام تک پہنچی ہوئی تھی۔ فرماتے کہ مقاماتِ حریری جیسی کتاب ایک گھنٹہ میں چار ورق برجستہ لکھ سکتا ہوں لیکن ہدایہ جیسی عبارت چار مہینوں میں بھی چار سطر نہیں لکھ سکتا، اردو سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا لیکن کلام بہرحال بلیغ ہوتا تھا مگر عربیت آمیز۔

اس اردو سے اجنبیت کی وجہ سے ہم لوگوں میں اردو کی ایک گونہ تحقیر قائم ہوگئی تھی، اردو کی کتابوں کو دیکھنا عیب سا معلوم ہوتا تھا حتیٰ کہ خود اپنے اسلاف صالحین کے علوم ومعارف سے بھری ہوئی اردو تصنیفیں دیکھنے میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوگئی تھی، خواہ اسے محسوس کر کے یا از خود داعیۂ قلب سے، ایک دن تفسیر بیان القرآن اردو از حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے بارے میں فرمایا کہ اردو میں اتنی چست تفسیر آج تک نظر سے نہیں گذری، اس تفسیر نے بہت سی پرانی تفاسیر سے مستغنی کر دیا ہے۔ اس کے بعد سے ہم لوگ اردو کی کتابیں دیکھنا بھی گویا جائز سمجھنے لگے تھے، اور یہ کہ اردو زبان بھی کوئی ایسی چیز ہے جس سے علم کا تعلق ہو سکتا ہے۔

اثنائے سالِ تعلیمی میں گاہ بگاہ سفر بھی فرماتے تھے اور سال بھر میں سفروں کی تعداد خاصی ہو جاتی تھی، اس میں بعض سفر لمبے لمبے بھی ہوتے تھے جیسے پنجاب وسرحد وغیرہ کے اسفار، ردّ قادیانی کے سلسلہ میں پنجاب کے مستقل دورے بھی فرمائے، خاص قادیان کا سفر بھی ہوا، جس میں ایک بڑی جماعت ساتھ تھی اور ہم لوگ بھی ہم رکاب تھے، اور سفروں میں بھی احقر کا ساتھ رہا ہے۔

تقریر علمی ہوتی تھی جس سے علماء استفادہ کر سکتے تھے، لیکن عوام بصد عقیدت سن کر برکت حاصل کرتے تھے۔ کھوٹہ ضلع راولپنڈی کے سفر میں احقر اور مولانا ادریس کاندھلوی حال شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور، اور دوسرے بعض اور مستفیدین بھی ساتھ تھے۔ حضرت مولانا مرتضٰی حسن صاحبؒ بھی ہمراہ تھے۔ راولپنڈی پہنچے، بڑے بڑے اجتماعات ہوئے اور بڑی بڑی عالمانہ تقریریں ہوئیں، مجلسی خوش مذاقی اور ظرافت کے سلسلہ میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ حضرت مولانا مرتضٰی حسن صاحب مرحوم وظیفہ پڑھ رہے تھے کہ ناشتہ آ گیا، حضرت ممدوح نے زور سے فرمایا کہ شیخ وظیفہ کا مقصد آ چکا ہے دستر خوان پر آ جائیے۔

کھوڑہ کے اسی سفر میں حضرت ممدوح نے مجھے ''فقیر صاحب'' کا خطاب عطا فرمایا۔ صورتِ واقعہ یہ ہوئی کہ بارش بہت زیادہ ہوگئی، جلسہ گاہ شہر سے میل بھر کے فاصلہ پر تھی، راستہ میں بھی بارش آ گئی اور میں سر سے پیر تک پانی میں مع کپڑوں کے نچڑ گیا، جلسہ گاہ کے قریب ایک مسجد میں پہنچ کر بھیگے ہوئے کپڑے اتارے، ایک صاحب نے اپنی چادر لنگی کے طور پر دی اور ایک صاحب نے اوڑھنے کے لئے دوسری چادر دے دی، میں لنگی باندھ کر اور چادر اوڑھ کر ننگے سر ننگے پاؤں حضرت شاہ صاحب کے ساتھ جلسہ گاہ میں پہنچا۔ حکم فرمایا کہ اس وقت جلسہ میں تقریر تجھی کو کرنا ہوگی، چنانچہ مجھے اسٹیج پر کھڑا کر کے خود ہی میرے تعارف کی تقریر کی اور فرمایا کہ:

''یہ فقیر صاحب جو آپ کے سامنے حلہ میں ننگے سر ننگے پاؤں کھڑے ہیں فلاں کے بیٹے اور فلاں کے پوتے ہیں، علمی سواد خاصا رکھتے ہیں، مجمع میں بولنے کا ڈھنگ انہیں آ گیا ہے، یہ جیسے باہر سے فقیر نظر آتے ہیں ویسے ہی اندر سے بھی فقیر صاحب ہی ہیں، آپ ان کی تقریر سے فائدہ اٹھائیں گے۔''

ملتان میں بھی شیخ زکریا بہاؤ الدین ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے احاطہ میں جلسہ ہوا، میں ساتھ تھا تو مجھے تقریر کرنے کا حکم دیا، اور جب میں تقریر ختم کر چکا تو اس تقریر کی تائید میں بار بار میرا ذکر فرما فرما کر خود بھی تقریر فرمائی اور کافی حوصلہ بڑھایا۔ اصاغر کی حوصلہ افزائی کی خاص عادت تھی جس سے چھوٹے اپنے حوصلہ سے زیادہ کام کر جاتے تھے اور ان میں ترقی پذیری کی امنگ پیدا ہو جاتی تھی۔

درس وتدریس کے ساتھ ارشاد وتلقین کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، بیعت بھی فرما لیتے تھے۔ اپنے اکابر سے سنا ہے کہ حضرت گنگوہی قدس سرہ‘ کی طرف سے مجازِ بیعت بھی تھے۔ دیوبند کے بھی بعض لوگ بیعت تھے، الہ دین دیوبندی جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے دیکھنے والوں میں تھا، حضرت ممدوح ہی سے بیعت تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ کے وصال کے بعد میں نے اور جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی پاکستان مقیم کراچی نے بھی ساتھ ہی ساتھ حضرت ممدوح کی طرف رجوع کیا، ہمیں طریق چشتیہ کے مطابق اذکار تلقین فرمائے اور ہم اس میں کھلی تاثیر وتصرف محسوس کرتے تھے۔

علم واخلاق کے ان اونچے مقامات کے ساتھ سیاسیات سے بھی آپ کو لگاؤ تھا اور ملکی معاملات

میں شرعی اصول پر جچی تلی رائے ظاہر فرماتے تھے۔

جمعیۃ علمائے ہند کے سالانہ اجلاس پشاور کی صدارت فرمائی، خطبہ صُدارت ارشاد فرمایا، جس میں وقت کے تمام مسائل پر بحث فرمائی۔ انگریزوں سے کافی تنفر تھا، ایک دفعہ مرض الوفات میں ۱۹۴۷ء کے انقلاب سے سولہ سترہ سال پہلے عزیزی مولوی حامد الانصاری غازی کو مخاطب کر کے فرمانے لگے کہ بھائی ہمیں اب یقین ہو گیا ہے کہ انگریز ہندوستان سے نکل جائے گا کیونکہ اس نے قدرتی اشیاء پر بھی ٹیکس عائد کر دیئے ہیں۔ ہوا پر ٹیکس، فضا پر ٹیکس، پانی پر ٹیکس، نمک پر ٹیکس، جن چیزوں کو قدرت نے آزاد رکھا تھا ان پر پابندی عائد کرنا قدرت کا مقابلہ ہے، جس کے بعد زیادہ دیر تک بقا نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہمیں یقین ہے کہ اب انگریز کے جانے کے دن قریب آ گئے ہیں۔

حضرت ممدوح کی ان گونا گوں علمی، عملی اور اخلاقی خصوصیات کے سبب خود ان کے اکابر ان کی عظمت کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ استاذ ہونے کے باوجود توقیر کے کلمات ان کے بارہ میں استعمال فرماتے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے کہ جب مولوی انور شاہ میرے پاس آ کر بیٹھتے ہیں تو میرا قلب ان کی علمی عظمت کا دباؤ محسوس کرتا ہے۔ میرے والد ماجد باوجود استاذ ہونے کے ان کی انتہائی توقیر فرماتے تھے اور غائبانہ بھی ان کے لئے کلماتِ تعظیم استعمال فرماتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس کی عظمت اس کے بڑوں کے دل میں بھی ہو اسکی عظمت اس کے چھوٹوں کے دلوں میں کتنی ہوگی؟ ایک مقتدر ہستی، ایک یگانۂ روزگار ہستی کے فضائل و مناقب ان سطور میں کیا آ سکتے ہیں، بڑی بڑی تصنیفیں بھی ایسے لوگوں کی سوانح کے لئے کافی نہیں ہو سکتیں۔

اس لئے یہ مضمون تو کیا ان کی سمائی کر سکتا ہے لیکن اس کی نگارش بطور سوانح کے ہوئی ہی نہیں، یہ سطریں صرف بطور تذکرۂ کاملین اپنے دل کی تسلی یا اپنے استاد زادہ عزیز مولوی سید ازہر شاہ قیصر سلمہ اللہ تعالیٰ مدیر ماہنامہ ''دارالعلوم'' کے ایماء کی تعمیل کے لئے لکھی گئی ہیں، ورنہ کجا سوانح خاتم المحدثین اور کجا یہ اجہل الجاہلین؟ بس **جهد المقل دموعه** کے طور پر یہ بضاعتِ مزجاۃ (جو آج بتاریخ ۱۰ ذی قعدہ ۱۳۷۳ھ کو بعد نماز صبح بیٹھ کر لکھنی شروع کی اور مسلسل لکھتے لکھتے ٹھیک گیارہ بجے دن کو ختم کر دی) بطور ایک ہدیۂ ناچیز عزیز محترم و ممدوح کی خدمت میں پیش ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ **والحمدللہ اولاً و اٰخراً۔**

ایک جامع شخصیت

تذکرہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ

نوٹ: شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ پر لکھی گئی حضرت حکیم الاسلام کی یہ تاثراتی تحریر ہم نے الجمعیۃ کے شیخ الاسلام نمبر سے اخذ کی ہے۔ محمد عمران قاسمی بگیانوی

آج تو قاسم وامداد سب ہی مرتے ہیں
اس کا کیا ذکر برباد ہوئے تم یا ہم

آہ! صد آہ! کل تک جنہیں ہم مولانا مدنی مدظلہ کہا کرتے تھے آج مولانا مدنی قدس سرہ کہہ رہے ہیں، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز نے ۸۱ سال کی عمر میں دارِ دنیا سے دارِ آخرت کی طرف رحلت فرمائی اور وابستگان کو غم واندوہ میں تڑپتا ہوا چھوڑ کر اپنے مقامِ کریم میں جا داخل ہوئے۔

حضرت شیخ ایشیاء کی سب سے بڑے جامعہ (دارالعلوم دیوبند) کے شیخ اکبر جمعیۃ علمائے ہند کے صدر، جماعتِ دیوبند کے عظیم روحانی رہنما اور جماعتِ دیوبند کی سوسالہ تاریخ کی اس صدی میں آخری کڑی تھے۔ ۱۸۵۷ء میں دارالعلوم دیوبند کے قیام سے جس تعلیمی، دینی، روحانی اور اجتماعی تحریک کا آغاز ہوا تھا اس کے کئی انقلابوں اور دوروں کی تکمیل مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات پر ہو کر اس ۱۹۵۷ء ہی پر انتہا ہوگئی اور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک سو برس کے عرصہ میں اس تحریک کا ایک دور مکمل ہو کر ختم ہوگیا۔

حضرت ممدوح کی وفات اس صدی کا سب سے بڑا سانحہ اور ایک عظیم علمی نقصان ہے جس کی

تلافی بظاہر اسباب مشکل ہے، جامع ہستیاں دیر سے بنتی ہیں اور اُٹھ جاتی ہیں تو اُن کی جگہ لمبی مدت تک خالی پڑی رہتی ہے ؎

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ وَر پیدا

حضرت ممدوح کی ہستی نادرِ روزگار ہستی، عزم وثبات، ہمت مردانہ، اٹل ارادہ علم وبصیرت اور ایمانی فراست کا ایک متحرک پیکر تھی، آپ نے آج کے لادینی اور مادی دور میں جن دینی اخلاقی اور علمی اصولوں کا دائرہ خواص وعوام کے لئے وسیع کیا اور انسانیت کی جن قدروں کو اُجاگر کیا دنیا اُن پر ہمیشہ فخر کرے گی۔

شیخ الاسلام اسلامی علوم ومعارف اور ایشیائی فنون وآداب کے علمبردار تھے اور آپ کی ہمتِ ظاہری وباطنی سے ملک اور ملک سے باہر ہزاروں علماء اُس علمی امانت کے امین بن گئے جو اس مرکزِ علم وفن (دارالعلوم دیوبند) سے آپ کی بدولت نشر ہوتی رہی۔ آپ اپنے اساتذہ وشیوخ کے ابتداہی سے معتمد علیہ اور مرکزِ توجہ رہے اور بلا استثناء اُن کے تمام اکابر وشیوخ انہیں اطمینان واعتماد اور امید بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے، اس لئے آپ مختلف ماہرفن اساتذہ وشیوخ کی علمی وعملی یادگار تھے۔ قرآن وحدیث، فقہ وتفسیر، ادب وخطابت، منطق وفلسفہ کی مہارت وحذاقت آپ کے قول وفعل سے نمایاں رہتی تھی۔ آپ کی اس جامعیت نے علمی دنیا کو جو فائدہ پہنچایا اُس پر صدیوں کام ہوتا رہے گا اور دنیا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتی رہے گی۔

باطنی سلسلوں میں پارسائی، پاکیزگیٔ نفس، تقویٰ وطہارت، ضبطِ اوقات، تکمیل معمولات اور باوجود متفرق دینی وقومی مشاغل کے اُن کی ہمہ وقت پابندی آپ کا ایک سہل ممتنع مشغلہ تھا۔ حب الوطنی آپ کے نزدیک ایک سیاسی نظریہ ہی نہیں بلکہ ایک علمی اور اخلاقی، اور خود اُن کے الفاظ میں ایک دینی جذبہ کی حیثیت سے آپ کا جوہر نفس تھی اور دین کی یہ تعلیم کہ ''ایک اچھا مسلمان اور ایک اچھا شہری بھی ہو'' آپ کی ذاتِ گرامی میں عملی صورت سے ہر وقت نمایاں رہتی تھی۔

مادی دنیا سامانِ راحت بہم پہنچا سکتی ہے مگر انسانی ضمیر کو مطمئن نہیں کرسکتی، سائنس اچھے سامان پیدا کرسکتی ہے مگر اچھے انسان نہیں بنا سکتی، جب تک کہ ایمانی سائنس اُس کی رہنما اور مربی نہ

بنے۔ حضرت ممدوح کی ذات ان دونوں سائنسوں کا ایک معتدل امتزاج تھی۔ آپ ایک وقت اگر دنیا کے مادی پلیٹ فارموں اور سیاسی اسٹیجوں کی جلوتوں میں نمایاں نظر آتے تھے تو دوسرے وقت ذکر اللہ کی خلوتوں، درسِ حدیث وقرآن کی مسندوں پر بھی جلوہ فرما رہتے تھے اور دونوں لائنوں میں بھرپور قوت کے ساتھ رواں دواں تھے۔ ایک شعبہ سے دوسرا شعبہ اُن کی توجہ کی جامعیت کو پراگندہ نہیں کر سکتا تھا۔ دینی زندگی کے ساتھ قومی زندگی اور اسلامی زندگی کے ساتھ بین الاقوامی زندگی اپنوں کی تربیت کے ساتھ دوسروں کی رعایت اور اپنوں سے احتساب کے ساتھ دوسروں کے لئے توسع اُن کے کام کا نصب العین تھا، اسی لئے آپ نے درس وتدریس، باطنی تربیت اور روحانیت کے پاکیزہ مشاغل کے ساتھ قومی جدوجہد کا میدان بھی سر کیا اور عملاً ان دونوں اضداد کو جمع کر دکھلایا۔

اسی جامعیت کے اصول کو آپ نے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا اور آپکے ہزاروں شاگردوں نے جو ہندوبیرونِ ہند میں پھیلے ہوئے ہیں اس پر کام کیا اسی لئے آپ کی مقبولیت ملک کے ہر طبقہ اور ہر قوم میں عام تھی، حتیٰ کہ جن حضرات کو آپ سے اختلافِ رائے بھی تھا اُن کے قلوب بھی حضرت ممدوح کی عزت وعظمت سے بھرپور تھے اور وہ آپ کے کمالاتِ ظاہر وباطن کے معترف رہے۔

حضرت ممدوح کا فیضان نہ صرف ہندوستان کی چہار دیواری تک محدود رہا بلکہ عرب وعجم میں پھیلا، آپ نے دارالعلوم دیوبند سے تحصیل علم سے فراغت پا کر حرم نبویؐ میں درس قرآن وحدیث اور تدریس علوم وفنون کا آغاز فرمایا اور اٹھارہ برس اس سرچشمۂ علوم نبوت میں بیٹھ کر علومِ نبوت کی خدمت کی، جس سے عرب وعجم کے لوگ سیراب ہوئے اور آپ کے تلامذہ ایشیائے کوچک سے لے کر یورپین ٹرکی تک پہنچے اور آخرکار عمر کے آخری حصہ میں تینتیس برس کامل دارالعلوم دیوبند کی صدارتِ تدریس پر فائز رہ کر مشرق ومغرب کے لوگوں کو علوم کے آبِ حیات سے سیراب فرمایا۔

ان دینی سلسلوں کے ساتھ حضرت محترم ایک عظیم سیاسی رہنما اور ایک زبردست انقلابی مجاہد تھے، جنہوں نے عدمِ تشدد کے اصول پر ہندوستان میں انقلاب لانے کی سرگرمیوں میں قائدانہ حصہ لیا، آپ اس سلسلہ میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے تاریخی سیاسی فلسفہ اور حکمت کے امین اور اپنے اُستاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کے

حکیمانہ جوشِ عمل کے علمبردار تھے، جس سے آپ کو پوری قوم نے جانشین شیخ الہند تسلیم کیا اور آخر کار اسی لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔

آپ کا نظریہ تھا کہ علم کا نتیجہ رہبانیت نہیں ہے بلکہ علم کو سیاست کے میدان میں رہنما ہونا چاہئے، اس سے اسلام کا مذہب کی حیثیت سے اور مسلمانوں کا ملت کی حیثیت سے وقار قائم رہ سکتا ہے نیز یہ کہ ہندوستانی مسلمان اپنی ملی حیثیت کے تحفظ کے ساتھ ہندوستانی قومیت کا ایک اہم عنصر ہیں۔

اس مرکب نظریہ کے ساتھ ملک کی آزادی انہیں ہر عزیز چیز سے بڑھ کر عزیز تھی، یہ آزادی نہ صرف ملک کی آزادی کی حد تک انہیں عزیز تھی بلکہ اس لئے بھی کہ ہندوستان کی آزادی کو وہ ایشیاء اور مشرق کی کتنی ہی پسماندہ اور کمزور ملکوں اور قوموں کی آزادی کا پیش خیمہ اور دروازہ جانتے تھے، جس میں داخل ہوئے بغیر ایشیاء کے قصر آزادی میں داخلہ ناممکن تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے آزاد ہو جانے پر ایشیاء بلکہ مشرق کے کتنے ہی چھوٹے بڑے ملک یکے بعد دیگرے آزادی کی دولت سے مالا مال ہوتے گئے اور ہو رہے ہیں۔

پھر اس مشرقی آزادی کی وہ روح جو اُن کی روح میں پیوست تھی صرف سطحی آزادی نہ تھی بلکہ یہ کہ دنیا سے مغربی ممالک کا تسلط و اقتدار ختم ہوئے بغیر دنیا میں پھیلی ہوئی اخلاقی انارکی، لا مذہبیت، دہریت، الحاد، بے دینی اور بے قیدی جس نے مشرق کے روحانی چمنستان کو اُجاڑ اور اخلاقی تعمیروں کو ویرانہ بنا رکھا ہے، کبھی نہیں مٹ سکتی، اور اس فاسد مادہ کے استیصال کے بغیر دنیا کی حقیقی تندرستی اور اُس کا اصلی سکھ اور چین کبھی واپس نہیں آسکتا۔

انہیں یقیناً یہ احساس ضرور تھا کہ اس عمومی تنقیہ اور مسہل میں اجزائے فاسدہ کے ساتھ اجزائے اصلیہ پر بھی زد پڑے گی، لیکن یہ تنقیہ کا ایک طبعی تقاضہ ہوگا۔ اگر تنقیہ ضروری ہے تو اس جزوی محرومی پر صبر بھی ضروری ہے۔

بہر حال ان کی آزادی کی جدوجہد سیاسی تھی اور اس کی روح اخلاقی، اسی لئے جہاں آزادی کی جنگ اُن کے دست و بازو کا اثر تھی وہیں اخلاق کی تعمیر سے قلوب کی تربیت اور فطرتِ الٰہیہ کی عطا فرمودہ حدود و قیود کے دائروں میں انہیں محدود و مقید کرتے رہنے کی جدوجہد بھی اُن کے عمل کا ایک

مستقل محاذ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مشرق ومغرب کے مزاج الگ الگ ہیں لیکن مغربی اقتدار کے غلبہ سے مشرق کے مزاج کو فاسد کردیا ہے، اگر یہ بیماری رفع ہوگئی تو بعد چندے مشرق کے اصل مزاج کی صحت عود کر آئے گی۔

یہی وہ نظریہ تھا جس پر شیخ الاسلام نے اپنے بزرگوں کی ظاہری وباطنی رہنمائی میں کام کیا اور علم وتحقیق کا ایک نیا باب کھولا، اس طاقتور نصب العین کے تحت انہوں نے ہر طرف سے نظر بند کر کے مغربی طاقتوں پر ایک زبردست وار کیا اور تیشہ چلا دیا۔ اس زور آزمائی اور کشاکش کا نتیجہ بہر حال اخلاقی قوتوں کی بیداری اور ایشیاء ومشرق کے مزاج میں تبدیلی کی صورتوں میں رونما ہوا۔ کمزور ملک آزاد ہونے لگے اور حریت طلبی کا حوصلہ اُن میں خاطر خواہ اُبھر آیا، آج مغرب کی طاقتیں اگر کلیتاً نہیں ٹوٹیں تو اُن کے توڑنے والے اور اس نظریہ کو لے کر آگے چلنے والے ضرور پیدا ہو گئے ہیں۔

بہر حال حضرت شیخؒ کی مساعی کا مرکز ملک کی آزادی، ایشیاء کی آزادی اور آخر کار اخلاق وانسانیت کی آزادی تھی، یہ نظریہ اُن کا عقیدہ تھا جو انہیں وراثت میں اُن کے شیوخ سے ہاتھ آیا تھا کہ مغرب کی ان مادی طاقتوں کی برقراری کی صورت میں اخلاقی قوتیں اور انسانیت کی جوہری قدریں کبھی نہیں اُبھر سکتیں۔

اسی لئے وہ ایک طرف اگر کانگریس کے سرگرم ممبر تھے تو دوسری طرف جمعیۃ علمائے ہند کے صدر بھی تھے، اور اگر وہ کانگریس کے خاص سیاسی پلیٹ فارم پر ایک سرگرم سپاہی کی حیثیت سے کام کرتے تھے تو جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم پر ایک سرگرم دینی قائد کی حیثیت سے رونما تھے، اور جہاں یہ دو پلیٹ فارم اُن کی سرگرمیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے وہیں دارالعلوم دیوبند کی صدارتِ تدریس پر بیٹھ کر شرعی علوم اور کتاب وسنت کی ترویج میں بھی اُسی درجہ منہمک تھے۔ اور اسی کے ساتھ اپنی خانقاہ کے صدر نشین بھی تھے جس میں متوسلین کی علمی اور اخلاقی اصلاح وتربیت اور انہیں صحیح معنی میں مسلم قانت بنانا اُن کا نصب العین تھا، کوری سیاست کے لئے کانگریس کا پلیٹ فارم کافی تھا اور خالص دیانت کے لئے مدرسہ وخانقاہ کی چہار دیواری بس کافی تھی۔ لیکن ان سب کو بیک وقت جوڑے رکھنے کا مطلب اس کے سوا دوسرا نہیں تھا کہ ان کا نصب العین مرکب تھا۔ جس کی سطحی سیاسی اور ماہیت

اخلاقی تھی۔اس مجموعہ کو سامنے رکھ کر جس نے بھی اُن کی بابت رائے قائم کی وہی رائے صحیح اور واقعاتی رائے ثابت ہوئی۔

بہرحال حضرت شیخ اس دورِ الحاد و بے دینی میں روشنی کا ایک مینار تھے۔اور اگر بقول امیر امان اللہ خاں سابق بادشاہ افغانستان ''شیخ الہند مولانا محمد حسنؒ ایک نور'' تھے تو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اس نور کی ضیاء اور چمک تھے۔

یہ نور اُن سے منتشر ہو کر اُن کے ماحول اور ملک میں پھیلا۔ان کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں رحیم مادہ کی قوتیں کارفرما ہوتی تھیں۔منکرات پر جلال کے ساتھ نکیر فرماتے تھے اور عجیب تر یہ ہے کہ اس جوش وجلال کے باوجود نہ اُن کی محبوبیت میں فرق آتا تھا نہ مطلوبیت میں، کہنے والے بلکہ ملامت کرنے والے اپنا کام کرتے رہتے تھے جو سطح کے پیش نظر ہوتا تھا اور وہ اپنا کام کرتے تھے جو حقیقت کے پیش نظر پوری قوت سے جاری رہتا تھا۔

۵؍دسمبر کے نصف النہار کے قریب یہ جامع دولت ہم سے چھن گئی اور دو بجے کے قریب روح پرفتوح اس جسدِ خاکی کو چھوڑ کر رہ گرائے عالمِ جاوداں ہوگئی۔رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃً۔

زندگی بھی خوب گذری اور موت بھی پاکیزہ رہی، بعد مردن چہرہ پر نورانیت اور چمک غیر معمولی تھی۔روشنی میں چہرہ کی چمک دمک اور اُس کا جمال نگاہوں کو سیر نہیں ہونے دیتا تھا،لبوں پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی جس کی کیفیت الفاظ میں نہیں آسکتی جو یقیناً مقبولیت عنداللہ اور اس کے ساتھ موت کے وقت بشاشت وطمانینت کی کھلی علامت تھی۔جو مقبولیت زندگی میں تھی وہی موت کے بعد بھی ہے مزار ہر وقت زیارت گاہ بنا رہتا ہے۔حتیٰ کہ رات کو ایک ایک بجے بھی جانے والے گئے تو مزار پر لوگوں کو پایا۔

اسی محبوبیت کا نتیجہ ہے کہ وصال کی خبر آناً فاناً ہوا پر دوڑ گئی۔دنیا کے بڑے بڑے ممالک نے ریڈیو پر وصال کی خبر نشر کی اور ہندو بیرونِ ہند سے تعزیتی فون، تار اور خطوط کا تانتا بندھ گیا، وصال کے بعد ایک بجے شب تک خدا ہی جانتا ہے انسانوں کا ہجوم کہاں سے ٹوٹ پڑا کہ دارالعلوم کا وسیع احاطہ ہجوم سے ابل پڑا، ہجوم اور جنازہ پر کنٹرول دشوار ہوگیا،لوگ جس شخصیت کے اردگرد پروانہ وار

جمع رہتے تھے اب اُس کی ظاہری علامت پر پروانہ وار ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ وابستگانِ حق اور محبوب القلوب ہستیاں زندگی اور موت دونوں ہی میں محبوب القلوب رہتی ہیں اور دوسرے لفظوں میں اللہ والے حقیقتاً مرتے ہی نہیں صدیاں گذر جانے پر بھی دلوں میں اُن کی روح دوڑتی رہتی ہے اور ان کی محبوبیت بدستور قائم رہتی ہے، جس کی بنا اُن کا پیکر یا جثہ نہیں ہوتا جو مٹ جاتا ہے بلکہ اُن کی معنویت ہوتی ہے، جس کے لئے کبھی فنا نہیں۔ اس لئے موت اُس پر اثر انداز نہیں ہوتی اور وہ مرکر بھی باقی رہتے ہیں۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

آج حضرت مدنی ہم میں موجود نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ہم میں غیر موجود بھی نہیں، جبکہ اُن کا مشن موجود، ان کا نمونہ عمل موجود، ان کا علم موجود، اُن کے مجاہدانہ کارنامے موجود اور ان کی محبوبیت موجود ہے۔ اس لئے پسماندوں کے لئے جہاں حسی جدائی ایک مصیبتِ عظیمہ ہے وہیں ان کی معنوی معیت وجہِ سکون وقرار بھی ہے۔ اس لئے پسماندوں کے لئے باوجود صد ہزار غم کسی مایوسی کا موقع نہیں ہے، اُن کی معنویت موجود، اُس سے استفادہ اور اس کا افادہ رفیق راہ بن سکتا ہے، دل کی تسلی کے لئے سب سے بڑی چیز قرآن حکیم ہے جو زبانوں پر جاری ہو کر دلوں کے لئے وجہ قرار و تسلی ہوگا اور ایصالِ ثواب کے ذریعہ حضرت مرحوم کے لئے وجہِ سرور اور انبساط ہوگا۔ اس لئے صدمہ رسیدہ قلوب اپنے اور اُن کے حق میں سکون وراحت کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

اس دنیا سے گذر جانے والا کتنی ہی بڑی شخصیت ہو پھر بھی اسے اپنے عزیزوں اور تعلق والوں سے آس بندھی رہتی ہے کہ کون اسے دعاء وایصالِ ثواب میں یاد رکھتا ہے۔ اس لئے غم غلط کرنے اور حضرتِ اقدس کی آس کو پورا کرنے کا طریقہ غمِ محض، یا غم کو لے کر بیٹھ جانا نہیں ہوسکتا، بلکہ غم کو غلط کر کے ان مقاصد کے لئے کمر بستہ رہنا اور کام میں لگ جانا ہی ہوگا۔

حق تعالیٰ شانہٗ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مراتب ودرجات بلند فرمائے اور اعلیٰ علیّین میں انہیں مقام بلند عطا فرمائے اور وابستگان کو صبر جمیل اور اجر جزیل اور ذوقِ تعمیل عطا فرمائے۔

یہ چند منتشر سطریں حضرت مدنی قدس سرہ العزیز کی مناقب سرائی کے لئے نہیں لکھی گئی ہیں کہ

ان سطروں میں اُن کے مناقب کب آسکتے تھے، بلکہ محض غم زدہ دل کو ہلکا اور ساتھ ہی ایک مقدس ہستی کے مقدس ذکر اور یاد سے ''اذکروا محاسن موتاکم'' کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے عرض کی گئی ہیں۔

امید ہے کہ ہندوستان کے دینی مدارس اور دینی اداروں میں ایصالِ ثواب کا اہتمام کیا جائے گا اور حضرتِ مرحوم کی اس آخری خدمت میں کسی قسم کا دریغ روا نہ رکھا جائے گا، نیز ان کے نقش پا کو محو نہ ہونے دیا جائے گا بلکہ ہمہ جہتی قوتوں سے اُسے برقرار رکھنے کی سعی کی جائے گی۔

ان سطورِ تعزیت یا منثور مرثیہ کو میں ان دو اشعار پر ختم کرتا ہوں جن پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاذِ اکبر حضرت نانوتوی قدس سرہ' کے منظوم مرثیہ کو ختم کیا تھا۔ ان دو شعروں کے درمیان میں دو شعر میں نے اپنی طرف سے اضافہ کر دیئے ہیں ؎

ہے اسیرانِ غم قاسمِ خیر و برکات
ولے فقیرانِ سرِ کوئے رشید جانم

اے فدایانِ جمالِ رُخِ شیخ مدنی
ولے محبانِ حسین احمد ذیشان وحشم

اے عزیزانِ حرم خانہ ٔ شیخ الاسلام
ولے قربان سراپردۂ آں شیخ حرم

پیروی کرتے رہو سعی کو ہاتھوں سے نہ دو
بدمے یا درمے یا قدمے یا بقلم

علامہ کی یاد

تذکرہ جامع المعقول والمنقول حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ

صدر المدرسین دار العلوم دیوبند

حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر المدرسین دار العلوم دیوبند کی وفات حسرت آیات، جو ۲۴ رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ یومِ چہارشنبہ کو تقریباً ساڑھے گیارہ بجے دن سے نہ صرف دار العلوم دیوبند بلکہ ہندوستان کے تمام مدارسِ دینیہ اور نہ صرف مدارس بلکہ تمام علمی حلقوں کے لئے ایک سانحۂ عظیمہ ہے جسکو علمی حلقے کبھی فراموش نہ کرسکیں گے۔ کیونکہ حضرتِ مرحوم نہ صرف علمی کمالات کا ایک بے نظیر مجموعہ ہی تھے بلکہ علمی مجسّموں کے رہنما اور استاذ الاساتذہ بھی تھے۔

حضرت مرحوم کی اصل پنجاب ہے۔ ان کے پردادا آج سے تقریباً کئی سو برس پہلے ضلع جھنگ سے ہندوستان آئے اور جونپور میں آ کر بس گئے۔ ایک عرصہ کے بعد وہاں اسبابِ معیشت تنگ ہو جانے کے بعد ان کے خاندان کا کچھ حصّہ بہار میں جا کر آباد ہو گیا اور مولانا کے دادا اپنے خاندان سمیت بلیا میں جا کر آباد ہو گئے۔ اس طرح مولانا کی اصل پنجاب ہے۔

چنانچہ اسی شعبان ۱۳۸۷ھ میں جب کہ حضرت مرحوم کو مراد آباد کے مدرسہ حیات العلوم کے سالانہ جلسہ میں مدعو کیا گیا اور آپ باوجود بیماری اور ضعف ونقاہت کے محض داعیانِ جلسہ کی دلداری کی خاطر عازمِ مراد آباد ہوئے تو لکسر کے اسٹیشن پر اپنے صاحبزادہ مولوی قاری محمد نعمان صاحب مدرس تجوید دار العلوم دیوبند کو بلا کر سوال فرمایا، تم کہاں سے آئے؟ وہ اس سوال پر حیران رہ گئے، سوال ہی سمجھ میں نہیں آیا، ان کی حیرانی دیکھ کر خود ہی فرمایا کہ مقصد یہ ہے کہ تمہاری اصل کہاں سے ہے، اس پر انھوں نے عرض کیا کہ جناب ہی فرمادیں گے، تو اس پر یہ ساری تفصیل ذکر فرمائی جس کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے۔

حضرت مولانا کی یہ نسبی اصل ہے۔ حسبی طور پر آپ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کے لئے حاضر ہوئے، سلسلۂ تلمذِ حدیث میں مشکوٰۃ شریف میرے والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی اور بقیہ کتبِ حدیث میں خصوصیت سے ترمذی مجازی حضرت اقدس مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی جو اس دور میں دارالعلوم میں مدارِ حدیث تھے۔

تعلیم کے بعد حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے بیعت ہوئے اور مجاز بھی ہوئے۔ اس طرح آپ سلسلہ چشتیہ کے مشائخ میں سے تھے، لیکن غلبہ ہمیشہ درس وتدریس کا رہا، سلسلۂ طریقت کی طرف زیادہ متوجہ نہ تھے۔ عمر کے ان آخری چھ سات سال میں ادھر توجہ فرمائی اور درسی معمولات کے ساتھ اذکار و وظائف کے معمولات بھی پوری پابندی کے ساتھ ادا فرماتے تھے اور بیعت وارشاد کا سلسلہ بھی جاری فرمایا۔ میرٹھ وغیرہ میں آپ کے متوسلین کی خاصی تعداد موجود ہے اور بعض کو مجاز بھی قرار دیا ہے۔

حضرت ممدوح اپنے آغازِ تدریس ہی سے اساطینِ درس کی فہرست میں شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ ابتداء ہی سے ہر فن کی اونچی کتابیں سپرد ہوتی رہیں جنھیں انھوں نے آغازِ کار ہی سے اعلیٰ سطح پر پڑھایا۔

حضرتِ مرحوم معقولات حضرت مولانا فاروق صاحب چڑیا کوٹی سے پڑھ کر دارالعلوم میں آئے تھے اور ان فنون میں کامل دستگاہ تھی۔ دارالعلوم میں پہنچ کر جب معقولات سے اوپر کے عارفانہ حقائق ان کے سامنے آئے تو ان کی معقولات کا رخ اسی طرف پھر گیا اور اکثر حجۃ اللہ، قاضی صدر، الشمس بازغہ وغیرہ میں مضمونِ کتاب کی توضیح کر کے فرماتے کہ اس بارہ میں مولانا مرحوم (حضرت نانوتوی رحمہ اللہ) کی یہ رائے اور تحقیق ہے اور پھر اسے مزے لے لے کر فرماتے جو درحقیقت معقولی مسائل میں فیصلہ کن حقیقت ہوتی تھی۔ حضرتِ مرحوم کی نظر حکمتِ قاسمیہ پر بہت گہری تھی اور اکثر درس اور مجالس میں ان علوم پر تقریریں فرماتے تھے جس سے سامعین میں شرحِ صدر کی کیفیات پیدا ہو جاتی تھیں۔

ابتداء میں معقولات کا رنگ غالب تھا، بعد میں ان معقولات کی محسوس حقائق جب اکابر کی

کتب سے سامنے آئیں تو رنگ بدل گیا اور آخر میں ان سب سے بالاتر ہوکر قرآن وحدیث کے درس میں انہماک بڑھ گیا، لیکن وہ معقولی اور پھر عرفانی رنگِ معقولات بھی قائم رہا، جس نے فلسفہ کے بجائے حکمت کا رنگ اختیار کرلیا۔

فنون کی جامعیت یہ تھی کہ فنونِ متداولہ منطق، فلسفہ ہیئت، ریاضی، طب جونسے فن کا مسئلہ سامنے آتا تو اس میں ایسا محققانہ کلام فرماتے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہر مسئلہ کی تحقیق کا حق ادا کرچکے ہیں اور اس میں ایک منقح اور نکھری ہوئی رائے قائم کئے ہوئے ہیں۔ اخذِ مضامین کی نوعیت یہ تھی کہ درسیات میں دقیق سے دقیق کتاب کی عبارت کے اگر طالب علم نے دو صفحے بھی ایک دم پڑھ دیئے تو اسے روکتے نہ تھے، بلکہ ان پورے صفحات کی ایک بلیغ اور جامع تقریر چند منٹ میں فرما کر پھر کتاب پر اُسے منطبق فرماتے تھے۔ ہم لوگ ان کی مجلس میں بیٹھ کر باہم اگر کسی مسئلہ پر تفریحی گفتگو ہی کرتے اور بعض اوقات مزاح وخوش طبعی کا رنگ اختیار کرلیتی تو روکنے کے بجائے اسے غور سے سنتے اور جس کی بات کچھ غالب نظر آتی اس کی تائید کرکے اسے داد دیتے تھے، اور پھر اس کے بارہ میں اپنی تحقیق یا اپنے اکابر کی تحقیق کا ذکر فرما کر اس تفریحی بات کو بھی علمی بنادیتے تھے۔

تلامذہ میں سے کسی فاضل نے جو اپنے مقام پر مدرسی کے عہدہ پر بھی ہوتا، اگر کوئی بات چلی ہوئی بھی کہتا تو بے تکلفی اور محبانہ انداز میں اسے ’’ارے بدھو‘‘ کہہ کر اس کے کلام کا تجزیہ فرماتے اور اس کی بلادت اور بے خبری پر اسے بہت ہی مزاحی انداز میں مطلع فرمادیتے جو حقائق بیانی سے بھی زیادہ علمی دلچسپی لئے ہوئے ہوتا تھا اور علمی مجلس ایک دفعہ کو تفریحی مجلس بن جاتی۔

مزاج میں یکسوئی کا غلبہ تھا۔ درس کے علاوہ تمام وقت قیام گاہ ہی پر گذرتا تھا، لیکن اس کے باوجود معاملات پر نظر وسیع رہتی تھی، جیسے وہ معاملہ کے تمام نشیب وفراز سے واقف ہیں، اور پھر اس میں نکھری ہوئی رائے ظاہر فرمادیتے تھے۔

تواضع اور کسر نفسی آخر عمر میں زیادہ بڑھ گئی تھی، اگر مجلس نشینوں میں سے کسی کے بارے میں انھیں یہ خیال گذر گیا کہ وہ ان کی کسی بات سے دل گرفتہ ہوگیا ہے تو بسا اوقات اس کے گھر پہنچ کر کھلے لفظوں میں معافی مانگتے۔ وہ حیران ہوتا کہ وہ ان کی کسی بات سے دل گرفتہ نہیں ہوا اور نہ اسے

اس کی جرأت تھی ، فرماتے کہ بہر حال مجھے یہ خیال گذرا ، اس لئے میں معافی مانگنے آیا ہوں۔

بہر حال اس علم جامع کے ہوتے ہوئے اخلاقی قدریں بھی بلند تھیں۔ تحمل ، بردباری ، ہضم نفس ، غنا اور یکسوئی ، معاملات میں پیش پیش رہتے تھے۔ بزرگوں کی سیرت اور ذوقِ اکابر پر کافی نظر تھی ، نہ صرف تاریخی طور پر بلکہ آپ بیتی کے انداز سے اس بارے میں اپنے بلا واسطہ مسموعات و مشاہدات پیش فرمادیا کرتے تھے۔

علوم وفنونِ دینیہ میں آپ کا امتیازی مقام جس سے دارالعلوم کے تمام اساتذہ آپ کے شاگرد یا شاگردانِ شاگرد ہیں ، جو زمانہ تدریس میں بھی ان سے مستفید ہوتے رہتے تھے ، عصر سے مغرب تک اپنے مکان پر نشست فرماتے تھے اور اساتذہ کی ایک تعداد نوبت بنوبت حاضر ہوتی رہتی تھی۔ یہ احقر بھی حضرتِ مرحوم کے تلامذہ میں سے ہونے کا فخر رکھتا ہے۔ میں نے سلم ، ملاحسن ، مرقات اور بعض اور کتابیں حضرتِ مرحوم ہی سے پڑھیں۔ میری طالب علمی کے زمانہ ہی سے آپ کو مجھ سے ایک خاص بزرگانہ لگاؤ اور ربط و تعلق تھا۔

نسبتوں کا احترام جزوِ نفس تھا۔ ابتداءِ طالب علمی میں ہی جب کبھی میں مکان پر حاضر ہوتا تو معاملہ ایسا فرماتے جیسے ان کا کوئی مخدوم آ گیا ہے اور یہ تقریباً لازم سا تھا کہ میرے حاضر ہونے پر کوئی نہ کوئی کھانے پینے کی چیز ضرور لا کر رکھتے۔ طالب علمی کے دور کے ختم ہونے پر جب میں ان کی مجلس میں روزانہ حاضر ہونے لگا اور تقریباً ۲۰-۲۵ سالہ میرا یہ معمول تھا کہ میں عصر مغرب کے درمیان ان کی خدمت اور مجلس میں حاضر رہتا تھا ، تو انھوں نے اب بھی وہی سلسلۂ خورد و نوش جاری رکھنے کا پر داز ڈالا ، میں نے ادب سے عرض کیا کہ یہ میری روزانہ کی حاضری ہے ، میری مؤدبانہ درخواست ہے کہ اس سلسلہ کی پابندی کو ختم فرمادیا جائے۔ جناب پر تو یہ پابندی ہرگز بھاری نہ ہوگی مگر مجھے ضرور بھاری محسوس ہوگی۔ اس پر یہ پابندی تو ختم فرمادی لیکن یہ سلسلہ کسی نہ کسی حد تک پھر بھی قائم رکھا کہ میں کسی لمبے سفر سے واپس آتا ، یا کبھی کبھی اس کے بغیر بھی اپنی دلی امنگ کے ساتھ اس مجلس کو مجلس خورد و نوش بنادیتے تھے جس میں سارے حاضرین شریک رہتے تھے۔

دل نہایت وسیع پایا تھا ، کھلا کر خوش ہوتے تھے اور اس کے موقعے تلاش فرماتے رہتے تھے۔

اس ذیل میں علمی مسائل پر گفتگو بھی ہوتی۔ عادت یہ تھی کہ اگر میں نے یا کسی نے کوئی علمی سوال اٹھایا تو نہ صرف یہ کہ زبانی اس کی تحقیق فرماتے بلکہ اسی وقت کتابیں اپنے کتب خانہ سے منگا کر حوالہ بھی دکھلا دیتے تھے، جس سے سائلین کے علم میں مزید بصیرت پیدا ہو جاتی تھی۔

سوال کے جواب میں لمبی تقریر کو پسند نہ فرماتے تھے، جواب نہایت مختصر اور بلیغ مگر حاوی وشامل ہوتا تھا۔

مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی فاضل دیوبند وممبر مجلس شوریٰ دار العلوم وحال ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ فرماتے تھے کہ میں نے حضرت مولانا سے سوال کیا کہ آج جب کہ جیٹ طیاروں میں سفر ہونے لگے ہیں اور بالخصوص سریع السیر طیارات کے ذریعہ چاند کی مہم سر کرنے کی سعی جاری ہے، یہ طیارے گھنٹوں میں پوری دنیا کے کئی کئی چکر لگا آتے ہیں۔ اگر ایک شخص نے اس مختصر سے عرصہ میں طیارہ میں مثلاً چار پانچ مرتبہ طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب دیکھا تو جب کہ شرعی اصول پر ''وقت موجبِ صلوٰۃ'' ہے، کیا اسے ایک گھنٹہ میں مثلاً چار مرتبہ غروبِ آفتاب دیکھ کر نمازِ مغرب بھی چار مرتبہ ادا کرنی ہوگی؟ اصول کا تقاضا تو یہی ہے جبکہ وقت ہی موجبِ صلوۃ ہے۔

مولانا موصوف کا بیان ہے کہ حضرتِ مرحوم نے جواب میں دو جملے ارشاد فرمائے کہ:

> ''مولوی صاحب بے شک وقت موجب ہے مگر طلوع وغروب وقت نہیں ہے، علاماتِ وقت میں سے ہے، علامت موجب نہیں وقت موجب ہے۔ اس لئے اگر علامتیں متعدد ہو جائیں تو وقت کا متعدد ہونا ضروری نہیں ہے کہ وقتِ غروب نمازیں متعدد ہوں۔''

موصوف فرماتے تھے کہ ''وقت'' اور ''علامت'' کے اس جملہ سے مجھ پر اس بارے میں علم کا ایک دروازہ کھل گیا اور تمام شبہات جو ذہن نے پکار کھے تھے، اکدم کافور ہو گئے۔

بہر حال حضرت مولانا سائلوں کے جواب میں کبھی لمبی تقریر نہیں فرماتے تھے، جس سے نہ صرف شبہات ہی ختم ہو جاتے تھے بلکہ علم کی ایک وسیع راہ منکشف ہو جاتی تھی۔ یہی صورت تمام علومِ معقولہ ومنقولہ میں تھی، جس سے واضح تھا کہ ہر علم وفن ان کے ذہن میں منقح اور مسائل مستحضر تھے۔

لطیفہ کی بات ہے، کسی نے ذکر کیا کہ حضرت مدارسِ دینیہ کے نصاب میں تبدیلی کی ضرورت

ہے، یہ پرانا نصاب خواہ مخواہ پتھر کی ایک لکیر بن کر رہ گیا ہے۔ ہنس کر فرمایا کہ مولوی صاحب اس سلسلہ میں بنیادیں تین ہیں ایک معلم، ایک متعلّم اور ایک نصاب۔ معلم کے بارے میں لوگ زبان نہیں کھول سکتے کیونکہ اس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہے، جس سے سب دبتے ہیں۔ طالب علموں کے بارے میں کچھ نہیں بول سکتے کہ یہ بھڑون کا چھتّہ ہے جس سے لوگ خائف ہیں، بے زبان بیچارہ نصاب رہ جاتا ہے، اسلئے سب اسی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد نصاب کے بارہ میں تحقیقی تقریر فرمائی۔

ذکاوت امتیازی شان کی تھی، سوال کے پہلے ہی جملہ سے سائل کا منشاء اور خود سائل کو سمجھ جاتے تھے اور سوال پورا ہونے سے پہلے دو لفظوں میں منقّح اور واضح جواب فرما دیتے تھے جس سے نفسِ مسئلہ بھی حل ہو جاتا اور سائل خود کو بھی سمجھ لیتا تھا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔

ذوقِ اکابر سے بھرپور تھے، مسلک کے شدت سے پابند تھے۔ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی جس کی زد مسلک اور ذوقِ اکابر پر پڑتی ہو برداشت نہیں فرماتے تھے۔ احقر نے مسلکِ دیوبند کے بارے میں ایک تحریر مرتب کی اور جستہ جستہ اس کے حصے زبانی عرض کئے جن پر کچھ تنقید فرمائی، تب میں نے وقت لیا اور اول سے آخر تک تحریر پڑھ کر سنائی جس میں اور اساتذہ بھی شریک ہوئے، اس پر کہیں کہیں تنقیدات فرما کر الفاظ میں کچھ ردوبدل کرایا جس سے اس کے بارہ میں اطمینان ہوا۔

شفقت کا مجسمہ تھے، کوئی شاگرد یا سائل اگر خلافِ مزاج کوئی عنوان اختیار کرتا تو ہم لوگ تو اس سے برا اثر لیتے مگر حضرت مولانا کے چہرے پر ذرہ برابر اثر نہ ہوتا تھا بلکہ اسی شفقت سے اس سے مخاطب ہوتے کہ اسے یہ خیال ہی نہیں گذر سکتا تھا کہ اس نے خطاب میں کوئی غیر موزوں طرز اختیار کیا ہے۔

اس تیس چالیس سال کے عرصہ میں دارالعلوم اور دوسرے دینی اور فروعی مدارس میں جس قدر بھی علماء تعلیم دین اور تربیتِ اخلاق کر رہے ہیں، تقریباً ان کے تلامذہ ہیں، اس لئے آج کے دور میں وہ بلاشبہ استاذ العلماء اور استاذ الاساتذہ تھے۔ اسی لئے ان کا صدمہ بھی ہمہ گیر انداز میں تمام حلقوں میں نمایاں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا کی وفات ایک شخصیت کی وفات نہیں جسے یہ کہہ کر چند آنسو بہالئے جائیں کہ ایک شخصیت ختم ہوگئی بلکہ حقیقتاً یہ ایک دور ایک طبقہ کا اختتام ہے، اس لئے قلوب کا حزن واندوہ درحقیقت ایک دور کے خاتمہ پر ہے اور اس لئے جتنا بھی انھیں یاد کرکے لوگ چشم نم ہوں برمحل ہے۔ وجہ سکون یہ ہے کہ انھوں نے بکثرت اپنے تلامذہ چھوڑے ہیں جو ان کے علم کے وارث ہیں اور وہ ورثہ انشاء اللہ تقسیم ہوتا رہے گا۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے علم کے پردہ میں آج بھی زندہ ہیں جب کہ ان کا علم زندہ ہے۔ کیا عجب ہے کہ انھیں وارثوں میں چند دن کے بعد وہ شخصیتیں نمایاں ہوں جن سے ان کی یاد غم آلودہ ہونے کے بجائے مسرت آگیں بن جائے۔ آخر جب ان کے اکابر دنیا سے رخصت ہوئے تھے تو انھیں بھی یہی مہلکہ پیش آیا تھا، لیکن حق تعالیٰ نے ان جیسی شخصیتیں بنا کر ان کے اکابر کو زندۂ جاوید فرما دیا، آج ہم کیوں مایوس ہوں اور کیوں غم میں پڑیں کہ ان کی یاد آئندہ بھی غم آلود رہے گی، یاد رہے گی مگر ان کے علمی وارثوں کے ذریعہ وہی یاد مسرتوں کا محور بن جائے گی جب کے سنت اللہ قدیم سے یوں ہی جاری ہے۔

موت نے جہاں پس ماندوں کے لئے جدائی کا غم چھوڑا ہے وہیں ان کے لئے اپنے اسوے سے ترقی کی راہیں بھی کھول دی ہیں، اور جہاں اپنے لافانی کمالات سے اور علمی وارثوں سے ذریعہ اپنے لئے اس اجر کو دوامی اور صدقہ جاریہ بھی بنایا ہے، اور اپنے علم وکمال کے لئے جواَب تک ایک خاص راہ سے نمایاں ہو رہا تھا، اس کے لئے بہت سی راہیں اور بہت سے مظاہر بھی پیدا کردیئے ہیں جواَب تک اگر ایک راہ سے نمایاں ہو رہا تھا تو اَب مختلف راہوں اور مختلف عنوانوں سے نمایاں ہوگا اور ان کے لئے دوامی طور پر بوقلموں ثوابوں اور غیر مختتم امور کا ذریعہ ثابت ہوگا، اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ وہ آج بھی اپنے چھوڑے ہوئے علم سے ہماری رہنمائی کریں گے اور تلامذہ کا سلسلۂ تلمذ ابدی طور پر قائم رہے گا۔

میں رجب کی ۲۷ ؍تاریخ کو حضرت ممدوح سے رخصت ہوکر بمبئی روانہ ہوا لیکن میں محسوس کررہا تھا کہ ان پر کچھ محویت کے آثار طاری ہیں جیسے ربودہ ہوتا ہے، اس میں کچھ مجھ سے جدا ہونے کا بھی اثر تھا مگر یہ کیفیت کچھ اس سے آگے کی تھی۔ خلافِ عادت کچھ کلمات بھی ایسے ادا ہونے لگے

جس سے سننے والا کچھ دوسرا ہی گمان کرسکتا تھا، جیسے فرمایا کہ ''دنیا کچھ رہنے کی جگہ نہیں رہتی جارہی ہے''، یا اپنے صاحبزادے قاری محمد نعمان صاحب سے فرمایا کہ ''سنو! میں اپنے بھائیوں میں ساتواں ہوں، مجھ سے پہلے چھ بھائی گذر چکے ہیں اوران میں اچھے اچھے عالم بھی تھے مگرسب انتقال کر گئے۔

فرمایا کہ یہ عجیب بات ہے کہ میرے والد سے لے کر بھائیوں اور بہنوں تک سب کا انتقال رمضان مبارک ہی میں ہوا ہے۔

قاری صاحب موصوف فرماتے تھے کہ میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی کہ کہیں اپنے بارے میں کچھ نہ فرماویں، لیکن سمجھنے والا کچھ سمجھ سکتا ہے کہ اس کا کیا مطلب تھا، وہی جو رمضان کی چوبیسویں تاریخ کو کھل گیا۔ چہارشنبہ یومِ وفات ہے، اسے بار بار پوچھتے تھے۔

بہرحال اندازہ ہوتا ہے کہ حضرتِ مرحوم کو اپنے بارے میں کچھ اندازہ ہو چکا تھا۔ بہرحال وہ دنیا سے تشریف لے گئے لیکن اپنا علمی ورثہ کافی مقدار میں چھوڑ گئے اور وارث بھی ہزاروں ہی کی تعداد میں چھوڑے ہیں جو ہندو بیرونِ ہند میں پھیلے ہوئے ہیں۔ حق تعالیٰ ہمیں ان کے علمی نقوش اور اخلاقی نقش قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور انھیں تا ابد زندۂ جاوید رکھے۔ آمین

نوٹ: حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمہ اللہ سے متعلق حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کی یہ تحریر ہم نے ماہنامہ دارالعلوم مارچ ۱۹۶۸ء سے لی ہے۔ محمد عمران قاسمی بگیانوی

ملکِ معظم شاہ فیصل مرحوم

اللہ تعالیٰ کی بیکراں رحمتیں نازل ہوں ملک معظم شاہ فیصل مرحوم پر جو ۱۲؍ربیع الاول ۱۳۹۵ھ (۲۵؍مارچ ۱۹۷۵ء) کو مرتبہ شہادت پر فائز ہو کر اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے اور عالمِ اسلام کو روتا ہوا چھوڑ گئے۔ ملتِ اسلامیہ اور انسانیت کا یہ ایسا عظیم سانحہ اور المیہ ہے کہ جس کی فوری تلافی بظاہر اسباب مشکل اور دشوار نظر آ رہی ہے۔

بہت مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

شاہ فیصل سعودی عرب کے ہر دلعزیز اور مقبول ترین فرمانروا، ایک بیدار مغز سیاست داں اور اس دور کی ایک عصر آفریں شخصیت تھے، جن کے سامنے صرف مقامی یا ملکی سیاست ہی دست بستہ نہیں کھڑی رہتی تھی بلکہ بین الاقوامی سیاست بھی ہاتھ باندھے ہر وقت حاضر رہتی تھی۔

وہ جانتے تھے کہ دنیا میں زندہ رہنے، زندہ رکھنے اور باوقار زندگی گزارنے کے لئے قوموں کو کیا کرنا چاہیے، انہیں ورثہ میں اگرچہ آمرانہ اور شخصی اختیار کی بادشاہی ملی تھی مگر ان کا مزاج جمہوریت سے ہم آہنگ تھا اور وہ ملک کی دولت اور اس کے وسائل کو اپنی ذاتی آسائشوں کے بجائے ملک کی فلاح و بہبود اور ترقی پر بڑی فیاضی سے صرف کرتے تھے۔ پھر ان کی فیاضی کا دائرہ سعودی عرب ہی تک محدود نہ تھا بلکہ عالمِ اسلامی کے منطقوں میں اسلامی اور غیر اسلامی ملک کے مسلمان اور مسلم ادارے سعودی عرب کی دولت سے مستفید ہوتے رہے ہیں، اسی کے ساتھ ان کی ذہنی ہمہ گیری سیاسی میدانوں میں عالم آشکارا رہی ہے۔ وہ نہ صرف اپنے ملک کی تعمیر و ترقی ہی اسلامی بنیادوں پر کر رہے تھے بلکہ اسلامی اتحاد اور دنیائے اسلام کے مسلمانوں کی دینی اصلاح اور دنیوی ترقی کے بھی بہت بڑے داعی تھے اور اس کے لئے انہوں نے تمام وہ وسائل اختیار کئے جو اُن کے لئے ممکن ہو سکتے تھے۔ ان کے ۱۳؍سالہ عہدِ حکومت میں ان کے تدبر سے عربوں میں نہ صرف دینی اور سیاسی بیداری ہی پیدا ہوئی بلکہ انہوں نے بین الاقوامی دنیا میں عربوں کو باوقار مقام دلانے کی جوز بردست

اور کامیاب مساعی انجام دی ہیں وہ اسلام کی تاریخ میں ہمیشہ یادرہیں گی۔

کسی بھی قوم کی ترقی کے لئے تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، ماضی میں عرب صدیوں تک تعلیم سے محروم رہے لیکن شاہ مرحوم اس کمی کو دور کرنے کے لئے بطور خاص متوجہ ہوئے اور تیرہ (۱۳) سال کی قلیل مدت میں سعودی عرب کے تعلیمی بجٹ میں جو غیر معمولی اضافہ ہوا اور تعلیم کے جو نتائج سامنے آئے وہ دنیا کے لئے حیرت ناک ہیں کہ انہوں نے صرف تعلیم ہی کی سرپرستی نہیں کی بلکہ ملک کے ذہن میں ایک عظیم انقلاب بپا کر دیا کہ بڑے بڑے تعلیمی ماہرین کے نزدیک یہ بڑی حیرتناک بات ہے اور کسی بھی ملک نے اتنے کم عرصہ میں تعلیمی سلسلہ میں اتنی زیادہ پیش رفت نہیں کی۔ عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے دینی تعلیم کو اصل سمجھتے ہوئے اس کے لئے مدینہ منورہ میں الجامعۃ الاسلامیہ کے نام سے ایک عظیم دینی تعلیم گاہ کا اجراء فرمایا جو ان کے دینی شغف کا آئینہ دار ہے۔ پھر وہ صرف سعودی عرب یا عرب ممالک ہی کے لئے ایک فیض رساں ادارہ نہیں ہے بلکہ دوسرے بہت سے ملکوں کے طلباء کے لئے بھی اس میں استفادہ کی گنجائشیں رکھیں، جس میں آج بھی مختلف غیر ممالک کے مسلم طلباء زیر تعلیم ہیں اور اس فیاضی کے ساتھ کہ ان کی آمد ورفت کے کثیر مصارف نیز ان کے زمانہ تعلیم کی تمام ضروریات کا ادارہ ہی کو کفیل بنادیا ہے، جس سے ان کی دینی حمیت کی ہمہ گیری نمایاں ہے۔

ساتھ ہی ملک کے داخلی اور اصلاحی کاموں کے علاوہ شاہ فیصل شہید دوسرے اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں کی گرانقدر امداد کر کے انہیں بھی اونچا اُٹھانے اور اسلامی افکار ونظریات سے دنیا کو متعارف کرانے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے اور تمام اسلامی منطقوں کو انہوں نے ہزاروں میل دور بیٹھ کر اپنا گرویدہ بنالیا، جو اُن کی ہمہ گیر دینی حمیت کے ساتھ ہمہ گیر سیاست کا بھی ایک کھلا نشان ہے۔ عرب ریاستوں کے باہمی اتحاد میں ان کی زرّیں خدمات ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں، حتیٰ کہ عرب فلسطین جنگ میں عربوں کی کامیابی بقول زعمائے مصر شاہ فیصل کے تدبر اور دولت کی رہین منت ہے، جس کے دروازے ہر سمت کھول دیئے گئے تھے۔

شاہ ممدوح نے مسجد حرام اور مسجد نبوی کی عظیم الشان توسیع کی تکمیل کا جو زرّیں کارنامہ انجام دیا

ہے اس نے سارے عالمِ اسلام کے دلوں کو جیت لیا اور آج تک وہ ان کے شکریہ میں رطب اللسان ہے۔ اس کے علاوہ حجاج کے آرام وسہولت کے لئے جن انتظامات کی داغ بیل ان کے والد بزرگوار اعلیٰ حضرت ملک معظم ابن سعود مرحوم نے ڈالی تھی اسے انہوں نے چڑھایا جو عالم اسلام کے لئے بجا طور پر فخر ومسرت کا باعث ہیں، شخصی طور پر بھی شاہ مرحوم ایک مثالی دیندار، کریم النفس، عدل پسند، اخوت دوست اور رحم دل بادشاہ تھے اور اگر یہ کہہ دیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ شاہی قبا میں ایک درویش چھپا ہوا تھا جس کی شاہی میں ہمہ وقت فقیری عیاں رہتی تھی۔

ہم سب مسلمانانِ ہندوپاک بارگاہِ رب العزت میں دست بدعاء ہیں کہ اللہ تعالیٰ شاہ فیصل مرحوم کو اپنی بے کراں رحمتوں سے نواز کر انہیں اعلیٰ علیّین میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور انہیں بنصِ حدیثِ نبوی روزِ قیامت امام عادل کی حیثیت سے ظلِ عرش کے تحت جگہ عطا فرمائے۔

آج ان کے جانشین انہیں کے بھائی اعلیٰ حضرت ملک معظم شاہ خالد سعود ہیں، جو یقیناً وہی میراث پائے ہوئے ہیں جو اس خاندان کا طغرائے امتیاز ہے۔ دعاء ہے کہ حق تعالیٰ انہیں ملک مرحوم کا سچا جانشین ثابت فرمائے اور انہیں اپنے برادرِ بزرگ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق ارزانی ہو۔ آمین

شاہ مرحوم کی بہت سی خصوصیات ہیں جو اُن کے ایک ایک قول وعمل سے وقتاً فوقتاً نمایاں ہوتی رہتی تھیں، ان کو سمیٹنے کے لئے ایک دفتر چاہئے، لیکن یہ ایک مختصر پیغام ہے سوانح حیات نہیں ہے، اس لئے بطور نمونہ یہ چند مثالی کردار بھی ان کی پاکیزہ زندگی کو نمایاں کرنے کے لئے کافی ہیں۔

سب خدامِ دارالعلوم اور ملتِ ہندیہ کے کروڑوں افراد اُن کے اس غم میں خاندان شاہی اور نجد وحجاز کے بسنے والوں کے ساتھ برابر کے شریک ہیں جیسا کہ پاکستان کے تمام باشندے اس غم میں ان کے دوش بدوش ماتم گسار ہیں، جو ایک وقتی یا ہنگامی غم نہیں بلکہ ایک تاریخی غم ہے جس کی کسک دلوں میں برابر قائم رہے گی۔

نوٹ: حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ کا یہ تعزیتی اور تاریخ مضمون ہم نے ماہنامہ دارالعلوم، دیوبند شمارہ اگست ۱۹۷۵ء سے لیا ہے۔ محمد عمران قاسمی بگیانوی

آہ! احمد غریب

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم.

احمدؐ کس قدر پیارا اور مقدس نام ہے کہ ایک عالم اس نام پر نثار، اس کا فدا کار اور اس پر قربان ہونے کے لئے تیار ہے۔ نام بھی خدا کا رکھا ہوا ہے اور ہے اس ذاتِ مقدس کے لئے جو سید البشر، افضل الخلائق اور امام الانبیاء ہیں، نام پیارا، رکھنے والا خدا، نام والا سید الاولین والآخرین۔

اگر سید البشر کے کسی غلام کا یہ مقدس نام ہو تو نام ہی کی کشش سے نام والا دلوں میں گھر کر لیتا ہے چہ جائیکہ نام کے مناسب ہی اس کا کردار اور عمل بھی ہو۔

سید احمدؐ غریب میمن مرحوم ممبئی والے اس نام کے حامل اور اس نام کے کاموں کے محور ومرکز تھے، نام احمدؐ لقب غریبؔ، ممبئی کے بڑے اور ہر دل عزیز تاجروں میں تھے۔ ان کے بڑے بھائی کا نام محمد تھا۔ چاروں بھائیوں میں صرف اب حافظ محمد صدیق زندہ ہیں، حق تعالیٰ انہیں اس مبارک گھرانے اور معزز خاندان کی سرپرستی کے لئے تادیر زندہ وسلامت رکھے۔ دو اوپر کے بڑے بھائی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموں سے سرفراز تھے، تیسرے صدیقیت کے لقب میں ممتاز ہوئے جو بقید حیات ہیں اور چوتھے مرحوم عبدیت کے منصب پر کامیاب گذر گئے۔ **لکل من اسمہ نصیب** کے اصول پر اس گھرانے کو غلامیٔ نبوت وصدیقیت کے تینوں مناصب منجانب اللہ ملے۔ **اَلْاَسْمَاءُ تَنزلُ مِنَ السَّمَاءِ۔**

لقب غریب تھا جیسا کہ گجرات اور مہاراشٹر میں عموماً ہر نام کے ساتھ ایک اٹک اور لقب لازمی طور پر ہوتا ہے۔ احمدؐ نام کے ساتھ غریبؔ کے لقب کا انتخاب گویا آسمانی انتخاب تھا، منشاءِ نبوت یہ ہے کہ ہر مسلمان دنیا میں غریب رہے، غریب کے معنی مفلسی اور ناداری کے نہیں بلکہ اوپرے اور ناشناسا کے ہیں، عموماً ایک سچا دیندار اور دوسروں کو سچائی پر لانے کا ساعی دنیا کے ماحول میں غریب اور اوپرا ہوتا ہے جیسے اسلام اپنے ابتدائی عہد میں مشرکوں کے ہجوم میں غریب اور اوپرا تھا۔ جسے نہ

کوئی پہچانتا تھا نہ پہچاننے کا ارادہ کرتا تھا، جیسا کہ اب دنیا کے اس آخری دور میں جب کہ فسق وفجور کا ہجوم ہے، اسلام اور اسلامی نسبتیں غریب اور اوپری ہو کر رہ گئی ہیں۔ بدأ الْاِسْلَامُ غَرِیبًا وَسَیَعُوْدُ غَرِیبًا فَطُوبٰی لِلْغُرباَءِ (اسلام دنیا میں اوپرا اور ناشنا سا ہی آیا تھا اور آخر میں اوپرا ہی ہو جائے گا اس لئے ایسے غرباء کو یعنی جو فساق وفجار میں اوپرے اور ناشناسا ہیں، مبارک ہو اور خوشخبری ہو)۔

سید احمد مرحوم اپنے دور میں اس غریب لقب کے صحیح مصداق اور سچا مفہوم تھے۔ وہ اپنی ذات سے متدین، اپنے اوراد کے پابند، بیسیوں حج کئے ہوئے اور ہر سال حج کے عازم اور خواہشمند، اس سال بھی حج کے عازم تھے جب کہ وہ بڑے حج پر (آخرت کو) سدھار گئے۔ لوگوں کو حق وصداقت کا پیغام دینے کے خوگر اور دنیا میں ہر پھیلی ہوئی برائی کا دفاع کرنے کے عملی طور پر حامی تھے۔ اس لئے بدوضع یا بے وضع آزاد منش لوگوں میں غریب مگر سچی بات برملا کہنے میں امیر اور صاحبِ قوت تھے۔ عبادتِ رب اور خدمتِ خلق ان کا خاص جذبہ تھا جس کے وہ عامل تھے۔ آخری دور میں تفسیر قرآن شریف پڑھنے اور احادیث کے علمی مفہوم کی تحصیل کے لئے مستقل طور پر علماء کی خدمات حاصل کئے ہوئے تھے۔

حج اور حجاجِ کرام سے تعلق کا خاص جذبہ کارفرما تھا۔ انجمن خدام النبی کے بانی تھے اور اس کی لائن سے حجاج کی بے مثال خدمات انجام دیں۔ اپنے پاس سے ہزار ہا روپیہ خرچ کر کے انجمن خدام النبی کا کام چلایا اور پھیلایا۔ البلاغ پرچہ نکالا تھا تو خالص دینی تبلیغ کے لئے خود اس میں مضمون اور ایڈیٹوریل لکھتے تھے۔ جو لوگ البلاغ پڑھتے ہیں وہ اس پرچہ کے دینی اور معیاری مضامین سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بانیٔ پرچہ کے دینی جذبات کس قدر عمیق اور ہمہ گیر تھے۔

آہ! صد حیف کہ اس ہر دل عزیز تاجر، ہر دل عزیز رہنما، ہر دل عزیز خلیق اور دیندار انسان نے کراچی میں ۴؍ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اچانک موت سے جسے حدیثِ نبوی میں مومن کے لئے رحمت کہا گیا ہے، ایک ہی زقند میں اپنے پروردگار کے آغوشِ رحمت میں پہنچ گئے۔ وہ کیا گئے کہ خدمتِ دین، خلقِ حسن، عبادتِ رب اور تبلیغِ دین کا ایک بڑا ذخیرہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔

بلاشبہ وہ خود تو راحت وفرحت کے لامحدود میدانوں میں پہنچ گئے لیکن دنیا والے احباب کو ہزاروں بے چینیوں میں مبتلا چھوڑ گئے۔ ان کے مرنے کا غم نہیں کہ یہ دن پہلے سے طے شدہ اور آنے والا تھا، غم ان سے جدائی اور فراق کا ہے کہ کتنے محبّ قلوب کو تڑپتا ہوا چھوڑ گئے۔ وہ ہنستے ہوئے گئے اور دنیا کو روتا ہوا چھوڑ گئے، جیسے دنیا میں آنے کے وقت وہ خود روتے ہوئے آئے تھے اور دنیا ہنس رہی تھی، وہ بلاشبہ اس ذیل کی حقیقت کے سچے مصداق تھے ؎

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو
ہمہ خنداں بودند تو گریاں

آں چناں زی کہ وقتِ مردنِ تو
ہمہ گریاں شوند تو خنداں

یہ اس لئے کہ مخلوق کی خدمت گویا ان کی تلاش میں اور وہ خدمت کی تلاش میں رہتے تھے۔ متعدد مسجدوں، ٹرسٹوں، یتیم خانوں، مسافر خانوں اسکولوں اور دینی مدرسوں اور جماعت خانوں کے ٹرسٹی اور صدر رہے، اور جس ادارہ میں گئے اسے اپنی خداداد صلاحیت اور ساتھ میں اخلاص وللّٰہیت کی وجہ سے پر رونق اور پر فیض بنا دیا۔

خلوص ومحبت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اخلاص کے پیکر اور ایثار کے مجسمہ تھے۔ اپنے عزیز وقت، دولت اور صحت کو اس قسم کی سماجی، دینی، تعلیمی اور قومی قسم کی ٹھوس خدمتوں پر صحیح معنی میں قربان کر دیا۔ آج اس قسم کے سیکڑوں قومی وملی اداروں کے در و دیوار نقش ونگار ان کی سچی یادگار اور زندۂ جاوید مثال ہیں، مگر نوحہ خواں اور گریہ کناں ہیں، بلاشبہ یہ سچی خدمات ان کے حق میں صدقاتِ جاریہ ہیں۔

اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے معزز مہمانان حجاج کرام کے لئے ان کی والہانہ اور مفید خدمات بے مثل اور ہمہ گیر ہیں۔ یقیناً وہ اس میدان کے شہسوار تھے، خصوصیت سے حج اور حجاج کے لئے ان کی والہانہ خدمات رشک انگیز تھی۔

اپنے گھرانے، خاندان، افرادِ کنبہ، خویش واقارب اور کتنے ہی مسلمانوں کو حج بھی کرایا اور ان

کے لئے ہزاروں سہولتیں بہم پہنچائیں جن کا پہنچنا حجاج کے لئے اس دور میں جوئے شیر کا لانا تھا۔ ان قیمتی خدمات اور ہمہ گیر قومی کارگزاریوں پر انہیں سید القوم کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مقاماتِ مقدسہ میں ان خدمات کی بدولت ان کا ایک مستقل حلقہ اثر قائم ہو گیا تھا، حتیٰ کہ انہوں نے اپنی تجارت کی ایک شاخ محض حج اور حجاج کی خدمت کے نقطہ نظر سے حجاز میں قائم کر دی تھی اور خود اس لائن سے بھی کتنے ہی عزیزوں اور دوستوں کی خدمات انجام دیں، حقیقت یہ ہے کہ ایسے دیدہ ور ہزاروں سال نرگس کے گریہ وبکا پر پیدا ہوتے ہیں ۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ وَر پیدا

یہ ناکارہ غالباً ۱۳۶۶ھ میں مع اپنی اہلیہ کے حج کے لئے گیا، خوش قسمتی سے احمد غریب مرحوم بھی اسی محمدی جہاز سے مع کئی عزیز واقارب کے حج کو جا رہے تھے۔ میرا ٹکٹ تھرڈ کلاس کا تھا تو موصوف نے یہ گوارہ نہ کیا کہ میں ان کے ہوتے ہوئے ڈیک میں رہوں۔ انہوں نے پہلے ہی دن اپنی سیٹ چھوڑ کر مجھے دے دی اور فرسٹ کلاس میں سفر کرنے پر مجبور کیا۔ خود اپنا کچھ بھی کیا ہو یقیناً انہوں نے بھی فرسٹ ہی کی سیٹ لی، مگر مقدم مجھے کیا۔ سفر اور وہ بھی سفر حج جس میں جدال تک متوقع رہتا ہے، یہ ایثار اور یہ اپنے اوپر دوسروں کی ترجیح شاذونادر ہی ملتی ہے، ساتھ ہی ذکاوت اور طبیعت کی جامعیت بھی ان میں امتیازی تھی، بقول ان کے برادرِ محترم جناب حافظ محمد صدیق صاحب سلمہٗ یہ انہی کی خصوصیت تھی کہ بیک وقت ان کا نفس تین تین کام بے تکلف انجام دے لیتا تھا، جب کہ فلاسفہ کا یہ مسلمہ مقولہ دنیا کے ذہن کا جزو بنا ہوا ہے کہ اَلنَّفْسُ لَا تَتَوَجَّهُ اِلٰی شیئین فِي اٰنٍ واحدٍ (ایک آن میں انسان کا نفس دو طرف متوجہ نہیں ہو سکتا) مگر وہ فون پر بات بھی کر رہے ہیں اور تجارت کے اہم امور میں ہدایت بھی دے رہے ہیں۔ حساب و کتاب کی جمع تفریق بھی برق رفتاری سے جاری ہے اور ملاقاتیوں سے گفتگو بھی جاری ہے اور انکے معاملات بھی طے کر رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ۵۳-۵۴ برس کی اس مختصر سی زندگی میں انہوں نے وہ اہم امور انجام کو پہنچا دیئے جو لمبی سے لمبی عمر میں عادۃً ایک آدمی انجام نہیں دے سکتا۔ ساتھ ہی ہر دلعزیزی یہ کہ مسلمانوں کے

علاوہ غیر مسلموں کا بھی اُنہیں نے پورا پورا اعتماد حاصل تھا۔ ان میں کوئی نزاع ہوتا تو فیصلہ احمد غریب سے کراتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے فیصلے بے لوث، دانش مندانہ اور معاملہ فہمی پر مبنی ہوتے ہیں۔ بمبئی جیسے عظیم شہر کے بازار کی ایسوسی ایشن میں نوے فیصدی غیر مسلم ہوتے لیکن صدر احمد غریب ہی بنائے جاتے اور رولنگ انہی کی چلتی تھی۔ بات پر انہی کی سب سے زیادہ دھیان دیا جاتا تھا۔

ان کی کوشش کبھی اپنی نمود ونمائش کی نہیں ہوتی تھی، نمود ونمائش کو ہمیشہ ناپسند کرتے تھے بلکہ کام کو آگے بڑھانے اور کارگزار افراد پیدا کرنے کی ہوتی تھی۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی ایک جماعت تیار ہو جائے جو صحیح معنوں میں کام کے میدان میں اپنے سلف کی خلف بنے۔ چنانچہ آج بھی ایسے متعدد ذمہ دار قسم کے افراد موجود ہیں جو انہیں اپنے مربی اور سرپرست کی حیثیت سے یاد کر کے روتے ہیں۔

ان تمام ہمہ گیر اور گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود اصول، ضابطہ اور وقت کی پابندی کے لئے مشہور تھے۔ کام کو بروقت انجام دینا اور دوسروں پر نہ چھوڑنا، خطوط کا بروقت جواب دینا ان کا خاص شیوہ تھا۔ میں نے خود بارہا اس کا تجربہ کیا کہ کتنا ہی اہم خط انہیں لکھا تو بواپسی اور بروقت بمبئی سے اس کا جواب پہنچ جانا یقینی اور قطعی بات تھی، جس میں کبھی تخلف نہ ہوتا تھا۔ اس سب کے باوجود خوش طبع ہنس مکھ اور منکسر المزاج بھی تھے۔ کاموں کی کثرت اور پھیلاؤ میں کیا مجال کہ کبھی انہیں جھنجھلاہٹ یا کبیدگی پیدا ہو جائے۔

صوم وصلاۃ کے پابند، دینداری میں بے مثال، حتیٰ کہ اوراد وظائف کے معمولات تک بھی کبھی قضا نہ ہوتے تھے۔ الحزب الاعظم اور دلائل الخیرات کا برسوں سے اہتمام تھا، ترجمہ کے ساتھ تلاوتِ قرآن کی پابندی ان کے یہاں معمول تھا۔ قرآن شریف کے حافظ نہ تھے مگر اپنے بھائی حافظ محمد صدیق صاحب سلمہٗ کو تراویح کی قراءت میں بھول چوک پر لقمہ دیتے تھے اور صحیح بتاتے تھے۔

قلم برداشتہ مضامین لکھنے کے عادی تھے میں نے ایک مرتبہ ان کی دوکان پر سورہ والتین کی تفسیر کرتے ہوئے ایک طویل مضمون بیان کیا، چند دنوں بعد البلاغ نظر سے گذرا تو پورا مضمون اس میں موجود، حیرت ہوئی کہ میں خود بھی لکھتا تو شاید اتنا جلد نہ لکھتا۔

اس سے پہلے ایک بار میں نے بیان کیا تھا کہ اسلام نے تین چیزوں کو ایمان واسلام کا مرکز قرار دیا ہے، رسول اللہ، کلام اللہ اور بیت اللہ۔ تو مرحوم نے البلاغ کے ٹائٹل صفحہ اول پر یہی تین عنوان ثبت کیے، رسول اللہ اور اس کے نیچے گنبد خضراء کا نقشہ دیا، بیت اللہ اور اس کے نیچے کعبہ معظّمہ کا نقشہ دیا اور کتاب اللہ اور اس کے نیچے کھلے ہوئے قرآن کا نقشہ دیا۔

بہر حال قوتِ اخذ اُن کی نہایت قوی تھی۔ طبیعت کی جامعیت یہ تھی کہ بیک وقت کامیاب تاجر بھی، انجمنوں کے صدر بھی، مضمون نگار بھی، رسالہ نگار بھی، رسالہ کے مدیر بھی، انجمن خدام النبی کے کرتا دھرتا بھی، خاندان کے بڑے اور سرپرست بھی، مشیر قوم اور اس کے سچے خادم بھی۔ حق تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ اور جامع درجات عطا فرمائے اور امید بلکہ یقین ہے کہ وہ ان درجات پر فائز ہو چکے ہیں۔

عزیز محترم مولانا حامد الانصاری غازی صدر جمعیۃ علمائے مہاراشٹر نے ان کے بارے میں ان کی وفات سے چار پانچ دن بعد جو خواب دیکھا وہ اسی کا شاہد عدل اور بشارت معلوم ہوتا ہے۔

انھوں نے دیکھا کہ موصوف ایک عظیم الشان سرسبز باغ میں ہیں جس میں عالیشان کوٹھی ہے اس میں سیر کر رہے ہیں، قد وقامت بلند، دوہرا بدن، چہرہ چوڑا چکلا، سرخ سفید اور ہشاش بشاش ہیں۔ غازی صاحب موصوف یہ نہیں سمجھ رہے ہیں کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے اس لئے کچھ معاملاتی سوال کر رہے ہیں تو احمد غریب دلی فرحت سے سوالات کے جوابات ہنس ہنس کر دے رہے ہیں اور ہنستے ہنستے دوہرے ہوئے جاتے ہیں۔ بے انتہا خوش اور مگن تھے۔ بلاشبہ یہ ایک بشارت ہے جو مقبول ہی کے لئے دیکھی اور سنی جا سکتی ہے۔

حق تعالیٰ انہیں روز افزوں، لازوال راحت وفرحت اور مسرت بخشے، جیسا کہ دنیا میں انہوں نے ہزاروں کے لئے راحت وفرحت کے سامان کئے۔ اللہ جل شانہ ان کی اولاد، امجاد، بالخصوص عزیز محمد فاروق سلمہٗ کو جو صورتاً اور سیرتاً باپ ہی کے نمونہ اور ان کے نقش قدم پر ہیں، صبر وعزم دے اور انہیں صحیح معنی میں اپنے والد بزرگوار کا سچا جانشین ثابت کرے۔

اب اس گھرانے کے مربی یا سرپرست یا کبیر دودماں مرحوم کے حقیقی بھائی جناب حافظ محمد

صدیق صاحب سلمہ، ہیں جو صلاح ورشد میں بعض حیثیات سے سب بھائیوں سے آگے ہیں۔ چنانچہ یہ کس قدر مسرت کی بات ہے کہ طریقت کی لائن پر آکر انہوں نے حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب دام مجدہ، خلیفہ ارشد حضرت اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ، سے بیعت کی اور الحمدللہ کہ حضرت مولانا ممدوح نے انہیں خلعتِ خلافت سے سرفراز فرمایا۔

بمبئی کی میمن برادری میں جس کی بہت سی پاکیزہ خصلتیں دنیا میں نمایاں اور معروف ہیں، یہ پہلا ہی موقعہ ہے کہ اس قوم کا ایک صالح اور سچا فرزند صاحبِ سجادہ ودلق بنا ہو۔ حافظ صاحب ممدوح حقیقتاً اس کے اہل تھے جو بلاشبہ حضرت مولانا ممدوح کی نظر انتخاب کی صحت وتوانائی کے شاہد عدل ہیں۔ حق تعالیٰ ان سے دین ودنیا دونوں کے فیض جاری فرمائے اور انہیں مقبول فرمائے۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد!

نوٹ: یہ مضمون ہم نے ماہنامہ دارالعلوم (دیوبند) کے شمارے ستمبر ۱۹۶۷ء سے نقل کیا ہے۔
محمد عمران قاسمی بگیانوی